سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
ری 2014
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
طلوع مہر: ایک نامور قلم کار کی سوانح حیات
پاپارازی: ایک اختلافی متنازع فوٹوگرافر کا زندگی نامہ
ایک دلچسپ سچ بیانی
www.paksociety.com

سرگزشت 15
قلم کا دھنی
ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارفِ خاص

گفت وشنید 16
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت 24
طلوعِ مہر
ڈاکٹر ساجد امجد
اس نے قلم کے ذریعے شہرت کے آسمانوں کو چھولیا

معلومات 49
جناح وے
امین بھایانی
قائد سے موسوم شکاگو میں قائم ایک سڑک کا تذکرہ

حادثات 53
کہرے کا قہر
صائمہ اقبال
کہرے اور ٹھنڈ نے لندن میں قیامت برپا کردی تھی

پیشہ 65
پاپارازی
ابن کبیر
وہ چھپ چھپ کر تصویریں کھینچنے میں شہرت رکھتا تھا

تذکرۂ خاص 81
ڈزنی
شکیل صدیقی
عجائبات سے بھری دنیا اس نے تخلیق کر دکھائی

روداد 97
جلاوطن
اے آر راجپوت
وہ فوجیوں کا سردار تھا قسمت نے بھیک منگوادی

سفر کہانی 106
ترکی نمی دانم
علی سفیان آفاقی
اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی

شکار کتھا 117
پہاڑیوں کا آدم خور
انجم فاروق ساحلی
پہاڑیوں میں اس نے موت کا بازار گرم کر دیا تھا

جرم وسزا 120
بعدِ قید
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک نامور مجرم کی انوکھی داستان دلچسپ بیان

فلم وصحافت 127
فلمی الف لیلہ
علی سفیان آفاقی
فلم وصحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب وروز

تحریر خاص 143
فروری
منظر امام
عیسوی سال کے دوسرے مہینے کے اہم ترین واقعات

معاشرت 150
سراب
کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

پہلی سچ بیانی 194
نفسیاتی
مظہر حسین
وہ عجیب وغریب فطرت کی حامل لڑکی تھی

دوسری سچ بیانی 211
تلافی
نوشابہ
اس نے جسے چاہا وہ اسے ملا مگر طلاق لینے کے بعد

تیسری سچ بیانی 227
قسمت
زبیدہ حیات
قسمت بھی کیسے عجیب و غریب کھیل کھیلتی ہے

چوتھی سچ بیانی 241
کامیاب
ف الف
وہ عاشق بننے چلا تھا اور بن گیا پیرِ کامل

پانچویں سچ بیانی 249
صندل
حسن رزاقی
جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں اس کا ثبوت ہے یہ جگ بیتی

چھٹی سچ بیانی 263
چاند کا داغ
صدف آصف
اس کے چاند چہرے پر ایک سفید داغ تھا

ساتویں سچ بیانی 270
انوکھے لوگ
خیال صدیقی
میاں نے خود بیوی کی شادی اس سے کرادی

آٹھویں سچ بیانی 277
دل کی دنیا
ناصر عزیز
وہ جعلساز تھا مگر حساس دل کا حامل بھی تھا

نویں سچ بیانی 282
کاروانِ زیست
نسرین
اس نے پیار کی خاطر کیسی قربانی دی کہ لوگ حیران رہ گئے

پارچے 000
پارچے
قارئین/ ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

ماہنامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع ونقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 24 ❖ شمارہ 03 ❖ فروری 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

مصور : شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمایندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمایندہ لاہور	فراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

کتنی عجیب بات ہے کہ ایک انسان کی جان جا رہی ہوتی ہے اور ڈاکٹرز ایکسیڈنٹل کیس میں مریض کو طبی امداد نہیں دیتے، صاف کہتے ہیں کہ یہ پولیس کیس ہے۔ پہلے پولیس سے رجوع کریں۔ جب رپورٹ درج ہو جائے گی تبھی ہم طبی امداد دیں گے۔ اس اثنا میں بہت سے مریض ڈاکٹرز کو استثنا دے کر ملکِ عدم کی راہ لے لیتے ہیں۔ کل لاہور میں ایک معروف قلم کار، شاعر و ڈراما نگار پر دہشت گردوں نے فائرنگ کردی۔ زخمی ہونے کے بعد وہ کمالِ پھرتی سے کار کو بھگا لے گیا مگر جب اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی تو وہ رک گیا۔ اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر ایک رحم دل شہری نے اسے نزدیکی اسپتال پہنچایا۔ وہ اسپتال ایشیا کے بڑے اسپتالوں میں سے ایک ہے۔ پچاسوں ڈاکٹرز ہر وقت موجود رہتے ہیں لیکن ان لوگوں نے یہ کہہ کر معذرت کرلی کہ یہ پولیس کیس ہے۔ جب تک پولیس رپورٹ درج نہیں کرلیتی ہم مریض کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ یہ کیسا قانون ہے، یہ کیسے مسیحا ہیں جو جانکنی میں مبتلا شخص کو بچانے کے بجائے مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہے ہمارے وطن کا حال بقول فیض۔

جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر جھکا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

معراج رسول

قلم کا دھنی

سرگزشت

وہ خاندان افغانستان سے آکر نجیب آباد یوپی میں بود و باش اختیار کرچکا تھا۔ وہیں اس کا جنم ہوا۔ عربی و فارسی مروجہ اور لازمی تعلیم سمجھی جاتی تھی اس لیے اسے بھی عربی و فارسی کی تعلیم دی گئی اور یہ فریضہ انجام دیا اس کے بڑے بھائی نے پھر جب وہ دس سال کا ہوا تو صفر 1324 میں اسے دارالعلوم دیوبند بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے دس سال کا عرصہ گزارا اور درس نظامی کی سند لے کر لوٹا اور لاہور آگیا۔ یہاں آکر شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی کے مشورے پر اورینٹل کالج میں داخلہ لے لیا پھر پنجاب یونیورسٹی سے 1914 میں منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ یہ امتحانات صرف زبانی امتحان میں دیے جاتے تھے یعنی ہر روز درس میں شامل رہنا ضروری نہیں تھا۔ اس لیے وہ امتحانات کی تیاری بھی کرتا رہتا اور فکر و فن کی آبیاری بھی کیونکہ اسے ادب کا چسکا لگ چکا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ جسے قلم تھما دیا گیا اور فنِ تحریر سے آگاہی دے دی گئی وہ کسی طور خود کا نہیں رہتا۔ بے خود بن جاتا ہے اور بے خودی میں صرف اور صرف دوسروں کا سوچتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے سرکاری نوکری کی بجائے ادب کی خدمت کو فوقیت دے دی۔ اس نے پہلی نوکری 1911 میں رسالہ ”نالۂ بلبل“ لدھیانہ میں کی۔ تنخواہ مقرر ہوئی کھانا اور کھانا یعنی نقد رقم کی کوئی صورت نہ تھی۔ دو سال وہاں رہا پھر وہ ”آفتاب اردو“ کی جانب کوچ کر گیا۔ لیکن کچھ ہی مہینوں بعد یعنی 1914ء کے اواخر میں ”تاج الکلام“ نجیب آباد میں جا پہنچا۔ اب اس کے پاس کئی سال کا تجربہ آچکا تھا، قلم کی روانی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس لیے اس نے بڑے پرچے کی طرف دیکھنا شروع کردیا۔ اس دور میں ”مخزن“ ایک شہرت یافتہ رسالہ تھا مگر وہ اپنے مالک کی طرح کہن سالی کا شکار تھا۔ رسالے پر بڑھاپا طاری تھا اور وہ بدحالی کا بھی شکار تھا پھر بھی اس نے مخزن سے منسلک ہونا منظور کرلیا۔ تنخواہ مقرر ہوئی پانچ روپے ماہانہ، وہ جی جان سے اس پرچے کو سنوارنے میں لگ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پرچہ اوج پر پہنچ گیا مگر وہ خود اس پرچے کا ساتھ نہ دے سکا اور اس نے 5 سال بعد پرچے کی ادارتی ذمے داری نبھانے سے معذرت کرلی مگر اب اس کی شہرت ملک گیر ہوچکی تھی۔ برصغیر کے کونے کونے میں وہ پہچانا جانے لگا تھا۔ لوگوں نے اس شہرت کو کیش کرنے کی کوششیں کیں اور میاں بشیر احمد بار ایٹ لا نے اسے ”ہمایوں“ کے لیے مستعار لے لیا۔ ہمایوں اس کی زیرِ ادارت آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے برصغیر کا معتبر رسالہ بن گیا۔ ہمایوں میں چھپنا ایک معیار تصور کیا جانے لگا۔ لوگ اس میں چھپنے والی تحریروں کے شیدائی تھے۔ گو کہ وہ خود بہت کم لکھتا تھا مگر اس کا قلم دوسروں کی تحریروں کو نکھارتا رہتا تھا اور قاری اسی نکھار کا دیوانہ تھا مگر یہ سلسلہ بھی دراز نہ رہا اور ٹھیک پانچ سال بعد اس نے ہمایوں سے بھی معذرت کرلی۔ اب وہ تھا اور دوستوں کا حلقہ مگر یہ عرصہ بھی طویل ثابت نہ ہوا اور لوگوں نے پھر تقاضا شروع کردیا کہ وہ کوئی پرچہ نکالے اور اس نے ”ادبی دنیا“ کے نام سے ایک نیا پرچہ نکال لیا۔ اس پرچے نے برصغیر میں ہلچل ہی مچا دی۔ پہلے ہی مہینے اتنی بڑی تعداد میں آرڈر موصول ہوا جو اس سے پہلے کسی پرچے کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ادبی دنیا کی سرکلیشن پچاس ہزار کے قریب پہنچ گئی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی کیونکہ بڑے سے بڑا رسالہ ہزار دو ہزار سے زیادہ نہیں چھپتا تھا۔ ادبی دنیا کی مقبولیت کا فائدہ اٹھانے کے لیے بے شمار رسالوں کے ساتھ لفظ دنیا جوڑا جانے لگا۔ وہ قلم کا دھنی تھا۔ اسے تحریر پر ملکہ حاصل تھا مگر انتظامی امور سنبھالنے کا تجربہ نہ تھا نتیجہ یہ نکلا کہ ادبی دنیا بھی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس حادثے پر رقیبوں نے خوب خوب خوشیاں منائیں۔ برصغیر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک یہ بات پھیل گئی کہ اس کی ”ادبی موت“ ہوچکی ہے۔ اس کا تشخص ختم ہو جائے گا مگر الٹا ہوا۔ کچھ دن تک اس نے آرام کیا اور پھر ایک نئے جوش اور ولولے سے اس نے ایک اور نیا پرچہ نکال لیا۔ 1933ء میں ادبی دنیا اسی کے ہاتھ سے نکلا تھا اور 1935ء میں اس نے ”شاہکار“ جاری کیا۔ یہ پرچہ ادبی دنیا جتنا کامیاب ثابت نہیں ہوا کیونکہ وہ وقت سیاسی کشمکش کے آغاز کا تھا۔ برصغیر میں طرح طرح کی تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں۔ پھر بھی شاہکار کو ایک وسیع حلقہ مل گیا تھا۔ اس کے خریدار پھیلتے جا رہے تھے مگر یہ پرچہ بھی بدانتظامی کی نذر ہوگیا اور بالآخر اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور پھر صرف لکھنے لکھانے میں وقت گزرتا رہا بالآخر 30 جنوری 1951ء میں مٹی کی چادر اوڑھ کر وہ سو گیا۔ ماں باپ نے تو اس کا نام احسان اللہ خان رکھا تھا مگر وہ ادب کی دنیا میں علامہ تاجور نجیب آبادی کے نام سے مشہور تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہرِ خیال

☆محمد عمران جونانی کا اظہارِ خیال کراچی سے ”سرگزشت دوسرے ڈائجسٹوں کی طرح خواتین کے لیے مخصوص نہیں پھر بھی ہر مرتبہ سرورق پر دوشیزہ کا قبضہ ہوتا ہے۔ آخر کیوں؟ معراج صاحب نے اداریہ میں درست لکھا ہے کہ ہمارا اسلامی تشخص دنیا کی نظروں میں کھٹکتا ہے، ایمان والے آزمائے نہ جائیں یہ ہو نہیں سکتا۔ اللہ ہمیں ثابت قدم رکھے اور اصلاحِ اعمال کی توفیق عطا فرمائے۔ نامور اشتراکی میں خواجہ احمد عباس کے بارے میں پڑھا۔ نامور علمی خاندانوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ ان کے کسی فرزند نے خاندانی روایات سے متضاد راہ اپنا کر دوسرے میدان میں نام کمایا۔ قاری شاکر قاسمی، وحید ظفر قاسمی کے بھتیجے فلم ایکٹر سعود کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ شہرِ خیال کے سینئر باسی خالد کبیر ماہرانہ انداز میں سالانہ تبصرہ کے ساتھ کرسیِ صدارت پر براجمان ہیں۔ صاحب آپ نے تو دریا کو کوزے میں بند کردیا۔ ایک زمانے میں ہمایوں خان دین پوری خان پور سے سالانہ تبصرہ لکھا کرتے تھے۔ وحید ریاست بھٹی نے بھی اپنے رواں قلم کے ساتھ خوب انصاف کیا اور دلچسپ انداز میں سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اندازِ بیاں اچھا ہے آپ نے جن تحریروں کو اول نمبر پر رکھا وہ واقعی اس کی حقدار تھیں۔ ناصر حسین نے لگے بندھے انداز سے ہٹ کر عمومی انداز میں 2013 کی تحریروں پر بات کی اور شہرِ خیال پر خاص طور سے روشنی ڈالی۔ پُراسرار تحریروں کی فہرست خاصے کی چیز ہے۔ آپ نے میرا انداز تحریر پسند کیا شکریہ قبول کریں۔ محمد عامر ساحل، آپ کے خط نے ایک مکمل تحریر کا مزہ دیا، ویسے آپ کا ذوق اچھا ہے، امید ہے کہ مطالعہ تھکن دور کردیتا ہوگا۔ طاہر الدین بیگ وہ پہلے ساتھی ہیں جنہوں نے دسمبر کے شمارے کا تذکرہ کیا۔ میں نے بھی اپنے خط میں تقریباً انہی تحریروں کو پسندیدہ لکھا تھا۔ سدرہ پانو اپنے مخصوص انداز میں مختصر خط کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کی قرآنی آیت والی بات قابلِ غور ہے۔ بشریٰ افضل نے سچ بیانیوں پر خاصی تفصیل سے بات کی، آپ سچ کہتی ہیں، بیٹا ہو یا بیٹی ماں باپ کے لیے سب برابر ہونے چاہئیں۔ اللہ سب کے نصیب اچھے کرے۔ قیصر عباس خان اگر مصروفیت مثبت ہو تو یہ بھی اللہ کی عطا ہے لیکن تھوڑا وقت ہر ماہ ہم لوگوں کے لیے ضرور نکالا کریں، محمد عزیز مئے عرصہ دراز کے بعد نظر آئے۔ بیٹیوں کی پرورش کے بارے میں آپ کا جذبہ قابلِ تقلید ہے، آنکھوں کے لیے گاجر کا جوس پیا کریں اور کوزہ مصری، بادام وسونف ہم وزن پیس کر کھانا بھی اکسیر ہے۔ بشریٰ افضل صاحبہ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو مکمل شفا دے۔ محسن علی نے آفاقی صاحب سے اشفاق احمد کے بارے میں لکھنے کی فرمائش کی ہے۔ اسے ہماری بھی آواز سمجھا جائے اس کے علاوہ آفاقی صاحب اگر امریش پوری، اوم پوری اور فاروق شیخ کے بارے میں بھی قلم اٹھائیں تو نوازش ہوگی۔ شاہد جہانگیر شاہد، آپ جیسے اہلِ قلم ناچیز کے خط کی حوصلہ افزائی کریں تو ہمت بڑھ جاتی ہے۔ احمد چوہان اور رانا حبیب کا جیل سے لکھا گیا خط حیران کرگیا۔ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر ہے، اللہ عافیت کے ساتھ رہائی نصیب کرے۔ سلیم رشید صاحب کے مکتوب کو بلاشبہ دسمبر کا سب سے بہترین خط قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیا روانی ہے آپ کے قلم میں۔ یوں لگا جیسے بالمشافہ ملاقات ہوگئی۔ ذوقِ مطالعہ بہت عمدہ ہے۔ اعجاز حسین صاحب آخر میں براجمان ہیں۔ آپ نے حج کے سفر کے بارے میں دو جملے لکھے اگر ممکن ہو تو مزید باتیں شیئر کریں۔ رانا محمد سجاد، مہوش رفیق، سعید احمد چانڈ، بہن طاہرہ گلزار وغیرہ غائب ہیں جلدی سے تشریف لائیں۔ نعیم صدیقی صاحب کی ہمہ جہت شخصیت سے ڈاکٹر صاحب نے تفصیلی ملاقات کروائی۔ ابن کبیر نے ایک مرتبہ پھر اپنے قلم کی لاج رکھ لی، جاپان کا ہندی فورڈ عزم وہمت اور خوش قسمتی کی داستان ہے۔ ابن کبیر چھوٹے چھوٹے پیرے میں مضمون باندھتے ہیں، دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ ہٹلر کو جدید دنیا کا عظیم محسن قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میری طرح لاکھوں افراد کی زندگی میں

موٹر بائیک ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرگزشت میں اکثر اوقات ایسے موضوعات شامل ہوتے ہیں جن کی فرمائش کا خیال تک ذہن میں نہیں ہوتا۔ منظر امام صاحب نے اب کے بہتر موضوع کا انتخاب کیا ”جنوری“ دلچسپ مضمون ہے۔ ایک بات عرض ہے کہ اس میں بہت سے واقعات اور عرس وغیرہ ایسے ہیں جن کی اصل ہجری اور عیسوی تاریخ کچھ اور ہے لیکن 2014ء میں وہ جنوری میں آرہے ہیں۔ آفاقی صاحب کا مطالعہ شعری ونثری کافی وسیع ہے لیکن فلمی الف لیلہ کی ابتدا... میں ہمیشہ ایک ہی قطعہ درج ہوتا ہے۔ اس مرتبہ ”سسرال“ کے تذکرہ نے محظوظ کیا۔ بندہ ویسے بھی پرانے لاہور کا عاشق ہے، تلاش ضرور کریں گے۔ اس کی CD دیکھنے کو دل کررہا ہے۔ شوکت رحمٰن خٹک صاحب کا خط دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یہ تو علم تھا کہ یوسف خان کے ایک بھائی ناصر خان بھی فلمی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ اتنے کامیاب تھے اور پاکستانی فلموں کے اولین ہیرو بھی وہی ہیں۔ موسیقار اعظم نوشاد کی داستان بھی مزہ دے گئی گانوں کی فہرست مع راگ نے چار چاند لگادیے۔ مدر انڈیا، بیجو باورہ، آن وغیرہ کے گانے سن کر آج بھی قدم خود بخود رک جاتے ہیں۔ جب انسان کے اندر آزاد ہونے کی آرزو جاگتی ہے یا بندیاں بری لگنے لگتی ہیں تو پھر ”یار عیار“ جیسے واقعات ہی رونما ہوتے ہیں، عشق، محبت، شخصی آزادی جیسے الفاظ سننے میں تو بہت اچھے ہیں لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے ورنہ اچانک رسی ہاتھ سے نکل جاتی ہے ہنستی بستی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔ کل ملا کر اس بار کی ہر تحریر تعریف کے قابل ہے۔

☆منشی محمد عزیز مئے نے لندن وہاڑی سے لکھا ہے ”سب سے پہلے تو ایک الجھن دور کردیں کہ اگر میں ایک ہی لفافے میں علمی آزمائش کا جواب، مقابلہ بیت بازی کے لیے شعر اور شہرِ خیال کے خط بھیجوں تو وہ تینوں چیزیں شائع ہوجائیں گی؟ (یقیناً شائع ہوں گی بس کاغذ الگ الگ ہو) اب چلیے تازہ شمارے کی طرف۔ 27 دسمبر کو حاصل پور گیا مگر 80 روپے کرایہ بھی ضائع گیا، 29 کو دوبارہ 80 روپے کرائے کی مد میں خرچ ہوئے اور بوجھل قدموں سے واپس ناکام لوٹا۔ آج یکم جنوری کو تیسری بار پھر 80 روپے خرچ کیے اور یوں ساٹھ روپے کا سرگزشت مجھے تین سو روپے میں پڑا لیکن آئندہ کے لیے تو ہر جھنجٹ سے جان چھوٹی۔ خط اور شعر شائع کرنے کا شکریہ۔ رسالہ چونکہ پڑھا نہیں ہے۔ صرف شہرِ خیال کے ساتھیوں سے ہیلو ہائے کی ہے۔ آپ کو تو یاد ہی ہوگا کہ ”سالانہ حساب کتاب“ آج سے دس پندرہ سال پہلے میں بھی مرتب کیا کرتا تھا جو کہ سسپنس کا ہوتا تھا۔ سرگزشت میں ہمایوں دین پوری آف خانپور کٹورہ بھیجا کرتے تھے۔ خالد کبیر، وحید ریاست بھٹی اور ناصر حسین! آپ تینوں کو بہت بہت مبارکباد کہ آپ کی سال بھر کی محنت نے قبولیت کا شرف پایا اور شہرِ خیال میں ابتدائی تینوں نشستیں آپ کے نام ہوئیں۔ لگے ہاتھوں مدیر صاحب سے ایک بات کہنا چاہوں گا کہ سرگزشت کے ایسے خاص عاشقوں کے لیے آپ کو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی انعام تو دینا چاہیے، چاہے وہ جس صورت میں بھی ہو۔ بہرحال تعریف کے تو چند الفاظ ہی کافی ہیں۔ انعام تو پھر انعام ہے۔ کیا خیال ہے ساتھیو؟ ایم اے خالق بھٹی صاحب! آپ کا نام شہرِ خیال میں کہیں نظر نہیں آرہا اور وہ اپنے ایک نوشاہی صاحب ہوا کرتے تھے، ان کا نام غالباً سید مستقیم نوشاہی تھا، وہ کہاں ہیں آج کل؟ بڑے بے مروت ہیں آپ لوگ کہ کبھی جھوٹے منہ نہیں پوچھا۔ عامر ساحل جی! اللہ آپ کی محبت سدا قائم رکھے (آمین) رانا شاہد جی! عمران جونانی کی قمر علی عباسی مرحوم کے ساتھ وابستہ یادیں میں نے بھی پڑھی تھیں۔ چلیے اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“

☆وحید ریاست بھٹی نے کلر سیداں راولپنڈی سے لکھا ہے ”آپ کو آپ کی پوری ٹیم اور قارئین سرگزشت کو ربیع الاول شریف اور سال 2014ء کی مبارکباد پیش کرنا چاہوں گا۔ سب سے پہلے آپ کا اداریہ نظر نواز ہوا کہ مہنگائی ہمارے وطن عزیز کی پہچان بن گئی ہے۔ کچھ نشانیاں اور بھی ہیں جن سے ہماری پہچان لاکھوں کے مجمع میں آسانی سے ہوجاتی ہے مثلاً، دہشت گردی، کرپشن، اقربا پروری، ناانصافی، لوٹ مار، جہالت، مذہبی دہشت گردی، سیاسی دہشت گردی، بجلی، تیل، گیس، آٹے، چینی، گھی اور دیگر کئی طرح کے بحران ہماری پہچان بن چکے ہیں، اللہ پاک خیر فرمائے۔ معراج انکل ہمیں سچ لکھنے اور پڑھنے پر مجبور نہ کیا کریں، ذرا مختلف قسم کے اداریے لکھا کریں۔ ذرا آگے بڑھے تو جناب خالد کبیر صاحب کو کرسیِ صدارت پہ براجمان پایا۔ انہوں نے بہت تحقیق وعرق ریزی سے سالانہ رپورٹ تحریر کی مزہ آگیا۔ دوسرے نمبر پر اس فقیر کا تجزیاتی جائزہ شاملِ اشاعت تھا اب آپ اور قارئین ہی بہتر طور پر جان سکتے ہیں کہ میں اپنے مقصد میں کہاں تک سرخرو ہوا جواب کا انتظار رہے گا۔ باقی دوستوں کے خطوط بھی پڑھے۔ ناصر حسین صاحب سے گزارش ہے کہ رابطہ قائم رکھنے کی کوشش کریں، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری سے گزارش ہے کہ اول تو اپنا مسئلہ شہرِ خیال میں نہ لے کر آئیں تو اچھا ہے۔ اب اگر دوستوں نے پُرخلوص مشورے دیے تو گلہ کیسا۔ باقی رہا مسئلہ فون کالز کا تو میرا نہیں خیال کہ قارئین سرگزشت گھٹیا میسجز کرسکتے ہیں۔ جناب آپ نے اس دفعہ بشریٰ افضل صاحبہ کے ایک نہیں دو خطوط شائع کردیے۔ (کمپیوٹر کی غلطی سے ایسا ہوگیا، ہم معذرت خواہ ہیں) محمد ایاز رانا صاحب کی تجویز کافی معقول ہے کہ ”رقص نمبر“ نکالا جائے معراج صاحب فلمی رقص پر میں آپ کو تحریر روانہ کردوں گا آپ اعلان تو فرمائیں۔ میری ذاتی تجویز یہ ہے کہ اس سال ”فلم نمبر“ سائنس نمبر، سیاست نمبر، الیکشن

WWW.PAKSOCIETY.COM

نمبر، قتل نمبر، انٹرنیٹ نمبر، کتاب نمبر، دنیا نمبر اور قرآن وحدیث نمبر وغیرہ میں سے کچھ شائع ہو جائے تو کرم فرمائی ہوگی۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر ''سفر مزاج'' پڑھی بہت لطف آیا۔ میں جب آٹھویں میں پڑھتا تھا تو نعیم صدیقی صاحب کی سیرت طیبہ پر معرکتہ الآرا کتاب محسن انسانیت مطالعہ کی تھی جسے میں آج 29 سال بعد بھی نہیں بھول سکا۔ ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد پیش کیجیے گا۔ اس کے بعد فلمی الف لیلہٰ پڑھی آفاقی انکل نے فلم جگنو کو نوشاد صاحب کے کھاتے میں ڈال دیا ہے جبکہ جگنو کا میوزک ''فیروز نظامی'' نے مرتب کیا تھا اس کے باوجود فلمی الف لیلہٰ کی سال کی پہلی قسط ہی سپر ہٹ رہی۔ انکل آفاقی سے گزارش ہے کہ گزشتہ ماہ دلیپ کمار کے بعد ایتابھ اور ایتابھ کے بعد اب شاہ رخ خان کا انٹرویو بھی ضرور شامل فرمائیں ہم بجوا انتظار ہیں۔ محترم انجم فاروق ساحلی کی تحریر ''تذکرہ چین'' بہت زبردست رہی ہماری طرف سے ڈھیروں مبارک باد عرض کر دیجئے گا۔ جناب منظر امام صاحب نے روٹین سے ہٹ کر تحقیق کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اس خوبصورت کوشش کے لیے بہت زیادہ سراہے جانے کے قابل ہیں۔ ابھی تو پورا مہینا پڑا ہے لہٰذا سرگزشت دھیرے دھیرے سردی کی دھوپ میں بیٹھ کر مونگ پھلی کھاتے ہوئے پڑھنے کا عزم کیے بیٹھے ہیں۔ سچ بیانیاں سب سے آخر میں پڑھتا ہوں لہٰذا تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ سچ بیانیوں سے یاد آیا ایک واقعہ پرسوں میرے ساتھ بھی پیش آیا اگر آپ مناسب سمجھیں تو ضرور شاملِ اشاعت فرمالیجیے گا۔ آج کل صحت بھی سردی کی وجہ سے متاثر ہے اپنے اللہ پاک سے تمام مسلمانوں کے ساتھ اس گناہگار کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد فرمالیجیے گا۔ شکریہ۔''

☆ قیصر عباس خان کاخط بھکر سے ''معراج رسول صاحب نے 2014 کے پہلے پرچے میں سال بھر کے بڑے مسئلے پر اپنا اداریہ لکھا۔ کیوں کہ غریب کا جینا مشکل ہے اور حکومتی وعدے پورے نہیں ہوتے۔ اب غریب کہاں جائے۔ دوسرے دہشت گردی حکومت کو کسی دوسرے مسائل کی طرف جانے نہیں دے رہی ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں' عاقبت نااندیش لوگ ہی اس عفریت کو طاقت دے رہے ہیں' ہمارے اپنے بھی ہم کو چوہے کی طرح یا دیمک کی طرح کھا رہے ہیں۔ جو کہ ہمارے ملک کا المیہ ہے اللہ پاک ہمارے پیارے ملک پاکستان کو ہر مشکلات سے محفوظ رکھے، آمین! سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ ڈاکٹر روبینہ صاحبہ کا دل دکھا بہت افسوس ہے کہ ایسا کیوں ہوا پتا نہیں۔ میسج کرنے والے کیوں بھول جاتے ہیں ان کے ساتھ ایسا ہوسکتا ہے اور ہوگا بھی ان کے کسی خون کے رشتے کے ساتھ۔ بھکر کے ایک اور دوست بھی تھے، پڑھ کر اچھا لگا۔ انور عباس شاہ کی تجویز اچھی تھی جو کہ پسند آئی میگزین والوں کو۔ محمد عامر ساحل صاحب نے خصوصی سلام ودعا دی مہربانی جناب کی، وعلیکم السلام اور محمد عامر ساحل صاحب نے لومیرج کی ہے۔ بہت اچھا لگا پڑھ کر۔ چلو ساحل صاحب کو اس دور میں محبت ملی۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔ رانا محمد شاہد آخر میں تھے لیکن محمد عمران جونانی احمد خان توحیدی تاخیر کے ناموں میں تھے۔ آپا طاہرہ گلزار بھی تاخیر میں تھیں۔ سال کے آخری پرچہ میں رانا اور طاہرہ گلزار نہیں تھے اور 2014ء کے شروع میں بھی طاہرہ گلزار صاحبہ کے تبصرے سے محروم رہے جو کہ ہم کو اچھا نہ لگا۔ پرانے قاری مطلب پرانے لکھنے والے تاخیر نہ کریں۔ ہم جیسے نئے لکھنے والے پڑھنا چاہتے ہیں۔ ہماری عرض ہے آپ تاخیر سے نہ لکھا کریں اور ہمارے ضلع بھکر کی ایک صنف نازک ساتھی جویریہ خان کے تبصرے سے بھی محروم رہے۔ اب کچھ جنوری کے پرچے کی کہانیوں کے متعلق رائے۔ سلطانہ بیگم والی سچ بیتی عام سی لگی۔ یہ ہمارے معاشرہ میں عام ہے۔ روشنی کہانی بہت اچھی کہانی لگی۔ اکرام کی داستان بہت اچھی پہلی نظر میں محبت پھر اس کے کہنے پر برا کام کو چھوڑنا اچھا لگا محبت کی صحیح عکاسی کی ہے اکرام نے۔ لاحاصل، اس کہانی میں ڈاکٹر بہت ظالم نکلا۔ محبت میں کسی کو مارنا ٹھیک نہیں' یہ جملہ غلط محبت اور جنگ میں سب جائز ہے محبت میں جان دینا ہے لینا نہیں۔ ڈاکٹر نے اپنے پیشہ سے غداری کی ہے جو کہ افسوس ہے۔ انتہا، اس کہانی میں محبت کی کون سی مثال ہے جو شوہر کی روح کو یا اپنے محبوب کی روح کو گھائل کرے۔ کمال ہے محبت میں خدا ملتا ہے اور یہاں خدا کی مخلوق پر ظلم ہے یہ محبت نہیں جلن ہے حسد ہے۔ عشق عشق ہے، اس کو پڑھ کر دل بہت افسردہ ہے بہت بڑی قربانی دی ہے اور وقت نے یا تقدیر نے بہت ظلم کیا ہے لیکن لڑکی نے عشق کی انتہا کر دی ہے۔ یارِ عیار، دوست کے نام پر آستین کا سانپ نکلا اور محبت میں بہک جانا ماحول یا دوستوں کی صحبت کی وجہ سے ہے، پر افسوس ہوا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے لیکن خود پر قابو نہیں رکھ سکتا۔ پھر حالات یا وقت کو کیا غلط کہیں۔ خودکشی کرنا ذیشان کا حق تھا کیونکہ حرام موت کا وہ مستحق تھا۔ انسانیت سے گرا ہوا کام کرتا تھا جو کہ ایک انسان کو زیب نہیں دیتا۔ باقی اچانک، بیتے ہوئے دن، محبت زندہ ہے میں دل چسپی تھی۔ اچانک میں نفسیات پر بات کی گئی ہے۔ بیتے ہوئے دن میں رقابت کی یاد تازہ ہوئی اور نہ ملنے کا فیصلہ اچھا کیا تھا انجم صاحب نے۔ محبت زندہ ہے، ڈاکٹر صاحبہ عورت تھیں ناں تب ہی آذر کا ساتھ دیا لیکن ڈاکٹر جواد اور شوہر نے ساتھ دیا ڈاکٹر صاحبہ غلطی سے محفوظ رہیں۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے رقمطراز ہیں ''خالد کبیر صاحب نے مجھے گزرے سال کا بہترین تبصرہ نگار قرار دیا۔ وحید ریاست بھٹی، سدرہ بانو ناگوری، بشریٰ افضل اور رانا محمد شاہد کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے حج کی مبارک باد کے ساتھ تحریر کو بھی سراہا ہے۔ لیکن اپنے تبصرہ کے ساتھ یہ پڑھ کر کہ آخر وقت موصول ہوا، افسوس ہوا، محکمہ ڈاک کا رونا رو رو کر

تھک گئے ہیں۔ پرچا لیٹ پہنچاتے ہیں اور رجسٹرڈ ڈاک ہونے کے باوجود خط کو مہمان بنائے رکھتے ہیں اور افراتفری میں مطالعہ کر کے اور مختصر تحریر لکھ کر خمیازہ ہم بھگتتے ہیں۔ ''سفر مزاج'' کے نعیم صدیقی ایک پسماندہ ضلع کے گاؤں میں پیدا ہوئے لیکن مقدر انہیں کھینچ کر شہر لے گیا، دنیاوی مال اسباب بنانے کی بجائے خود کو دین اور ملک کے لیے وقف کر دیا، جتنی تصانیف تخلیق کیں ان میں دوسروں کی رہنمائی کو اولیت دی اور پاکستان دوستی کا سبق دیا جس کا صلہ انہیں اب موت کے بعد یقیناً جنت میں مل رہا ہوگا، ہاکھی والے، پڑھ کر کئی پرانی یادیں تازہ ہوگئی ہیں۔ جہاں یہ واقعہ ہوا، مکہ سے تقریباً 5 کلومیٹر دور ہے اور مزدلفہ سے منیٰ جاتے ہوئے چھوٹا سا خطہ اراضی ہے جس کا نام ''وادی محسر'' ہے کیونکہ یہاں اللہ کا عذاب نازل ہوا تھا اس لیے دوڑ کر گزرنے کا حکم ہے۔ فلمی الف لیلہٰ، اپنے مخصوص رنگ ڈھنگ سے جاری ہے۔ ریاض شاہد کا بڑا چرچا سنتے آرہے ہیں لیکن ان کی کوئی فلم نہیں دیکھ سکے البتہ ان کے بیٹے شان کی کئی فلمیں کیبل پر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ناصر خان تو دلیپ کمار سے کم خوبصورت نظر نہیں آرہے۔ یہ سب یادداشت ہمارا دل جلانے کا موجب ہیں کیسے یہ نگری آنا فانا اجڑ گئی بس اک آہ نکل جاتی ہے اور اپنوں کی بے حسی پر شرمندگی ہوتی ہے۔ سراب، لکھنے اور واقعات کی ترتیب میں کافی محنت سے کام لے رہے ہیں' سلطانہ بیگم، سرورق کی کہانی اور اولین سچ بیانی ہے جسے ایک روایتی گھر کی عکاس ضرور کہا جاسکتا ہے۔ سلطانہ بیگم ایک ساس ضرور ہیں لیکن واقعات میں ایسا پن نہیں کہ غیر معمولی تحریر کے زمرے میں شمار کیا جاسکے۔ روشنی، میں اکرام کو ایسی دل کی لگی کہ علاج ممکن نہیں رہا، وہ منزل ہی کھو بیٹھے ہیں۔ مریم ایک مجبور اور بے بس لڑکی ہے اس کی سلامتی کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ اچانک، احساس کمتری میں مبتلا صنف نازک کو اس خول سے باہر لانے کی اچھی کوشش ہے۔ لاحاصل، پڑھنے کے بعد یہ یقین پختہ ہوگیا کہ عشق دماغ کا خلل ہے، کیسے؟ ڈاکٹر عدنان اور شاہد ایک دوسرے کو جھوٹی سچی باتیں سنا کر دل بہلاتے رہے اور آخر ڈاکٹر عدنان سیجا سے بے رحم قاتل بن گئے لیکن ثانیہ کا معما حل نہ ہوسکا کہ اس نے آخر کس گھر کو رونق بخشی، سچ کہتے ہیں کبھی کانوں سنا اور آنکھوں دیکھا بھی دھوکا ہوتا ہے۔ اگر صبر سے کام لے کر حالات کا جائزہ لے لیا جائے اور دوسروں کی باتوں کا اعتبار نہ کیا جائے تو سانحہ سے بچا جاسکتا ہے۔ بیتے دن، کے انجم خطرناک مثلث سے بخیریت نکل گئے وگرنہ رقابت اور غیرت میں وہ انتقام کا نشانہ بن سکتے تھے۔ رخسانہ بڑھاپے میں خاوند کو رجھاتے اور جوانی کے حسن کا رعب جھاڑتے ہوئے بے وقوفی میں حد سے گزر گئی، خاوند کتنا نرم مزاج اور مصلحت پسند ہو تو بھی خون جوش مار سکتا ہے پھر یہاں تو بیٹا بھی سارے حالات سے واقف ہوگیا تھا، وہ ایسی صورتِ حال کب برداشت کرتا، کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ سب اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ گئے یہ سب کے حق میں بہتر ہوا وگرنہ کسی بری خبر کا سننا نئی بات نہ ہوتی۔ محبت زندہ ہے، میں ڈاکٹر شاہینہ نے آذر کو شہریار کے طور پر جانا اور اس کے متعلق سوچا، اسی لمحہ سے اس نے شوہر سے خیانت شروع کر دی تھی۔ بچوں کی محبت اپنی جگہ ہے آخر خاوند کی معاشرے میں کوئی عزت اور کاروباری ساکھ ہوتی ہے۔ وہ کیسے دنیاوی اور کاروباری معاملات نمٹاتا اور ہم عصروں کا کس طرح سامنا کرتا۔ اس کا سب کچھ تباہ ہو جاتا۔ جس خوش اسلوبی سے معاملات سمٹ گئے ہیں اللہ کا جتنا شکر ادا کریں، کم ہے۔ ''انتہا'' جیسی کہانیاں کم ہی پڑھنے سننے میں آتی ہیں۔ غزالہ کے مزاج کی درندگی کم از کم لڑکیوں میں دکھائی نہیں دیتی لیکن یہ ان چند گنی چنی عورتوں میں ہے جو سفاکی میں اس انتہا تک چلی گئی پھر سوچنے کی بات ہے کہ اکرم کو بہکانے والی بھی عورت ذات تھی، انہیں کیوں سزا نہ ملی؟ عشق عشق ہے، میں غزالہ نے فطری بزدلی دکھائی اگر وہ بروقت شجاعت کو حالات سے آگاہ کرتی تو وہ موقع کی مناسبت سے حالات کو سنبھال لیتا اور ابرار کو لگام دیتا، نشہ کرنے کی وجہ سے اس سے جان چھڑانا آسان ہوتا اور قانون بھی مدد فراہم کرتا لیکن معمولی سستی سے سارا کام بگڑ گیا اور غزالہ جان کی بازی ہار گئی۔ بس اب یوں کہہ سکتے ہیں کہ قسمت میں یہ ملاپ نہ لکھا تھا جس کی وجہ سے منزہ کی ریاضتوں کا صلہ مل گیا اور خلوصِ نیت اور اپنا معاملہ اللہ کی رضا پر چھوڑ دینے کی وجہ سے سرخرو ٹھہری ہیں۔ یارِ عیار، میں ذیشان کی چالاکیاں بلکہ گھناؤنا کردار پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوگئے یہاں آکر انسان اور درندے کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ میں دوسرے لڑکوں کو کم قصوروار سمجھتا ہوں وہ انہیں تحریک دے کر اس اسٹیج تک لاتا تھا۔ جذبات بھڑکانے والی گفتگو سے ان کا ذہن بناتا تھا اور خود کو اسی گھٹیا کام کے لیے مخصوص کر لیا وہ اپنے انجام کو پہنچ گیا لیکن جو بے وقت موت کی آغوش میں چلے گئے ان کے افسوس سے دل مرجھا گیا ہے۔ معاشرے کے ایسے ناپسندیدہ کردار سڑکوں پر مچل دیئے جائیں، بوٹی بوٹی ہو جائیں، انسانیت تبھی سکون کا سانس لے سکے گی۔''

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے ''نئے سال کے پہلے دن سرگزشت کا دیدار ہوا۔ گزرا سال وطنِ عزیز کے باسیوں کے لیے تلخیوں سے بھرپور رہا۔ شہر کراچی کا ہر باسی شکوہ کناں رہا۔ بقول شاعر خوف وہراس، بارود اور موت کا خوف محسن، نہ پوچھ کتنی اذیتوں میں یہ سال گزرا ہے۔ دوستوں کی محفل میں خالد کبیر، وحید ریاست بھٹی اور ناصر حسین رند نے سالانہ تجزیے کی رپورٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بڑے اچھے انداز میں پیش کی اور میرے خطوط کو پسند کر کے اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔ میرے لیے اعزاز یہی ہے کہ مجھے سال 2013ء کی بہترین لکھنے والی قرار دیا۔ بشریٰ افضل رب تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ جلد از جلد صحتیاب ہوں اور اللہ پاک روبینہ نفیس صاحبہ کی مشکلات کو دور کرے۔ ابن کبیر نے اپنے قلم کے جادو سے جاپان کے ہنری فورڈ، کا قصہ لکھ کر ہمیں سحر زدہ کر دیا۔ غربت کو شکست دینے والے سویشیر وکی کامیابی کا سب سے قیمتی راز یہی ہے کہ اس نے ناکامی کو شکست دے کر آگے بڑھنے کا ہنر سیکھا اور اتنا مقبول ہوا کہ مایوسی اور ناامیدی میں گھرے لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ کے لیے گھر کر گیا، منظر امام کی تحریر جنوری بے حد پسند آئی۔ معلومات اتنی دلچسپ اور بھرپور ہیں کہ ہم نے فوراً پڑھ کر انہیں اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا، فلمی الف لیلہٰ میں آفاقی انکل کی زبانی پرانی فلموں کی داستان پڑھ کر محظوظ ہوئے۔ آفاقی انکل آپ کا دور واقعی سنہری دور تھا جب اچھے اور عمدہ موضوعات پر شاندار فلمیں بنا کرتی تھیں اور دیکھنے والے دنگ رہ جایا کرتے تھے اور ایک دور یہ ہے کہ بے حیائی اور بے ہودہ ناچ گانوں پر مشتمل فلمیں دکھا کر ہماری نوجوان نسلوں کو مفلوج کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک حساس موضوع ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ فلمی الف لیلہ میں کبھی اس موضوع کو بھی زیرِ بحث لائیں۔ پہلی سچ بیانی سلطانہ بیگم، جیسے کردار تو ہمارے معاشرے میں بھرے پڑے ہیں جو اپنی انا اور ضد میں آ کر ہنستے مسکراتے لوگوں کی زندگیوں میں زہر گھول دیتے ہیں، اچانک، بھی اچھی تحریر ہے۔ فیصل نے اپنی محبوبہ کو پانے کے لیے واقعی عمدہ منصوبہ بنایا اور شازیہ کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی حیران کر دیا آخری سچ بیانی میں مہک کی خودکشی نے افسردہ کر دیا آخر میں سرگزشت کی ٹیم اور انکل آنٹی کے لیے ڈھیر ساری دعائیں، خدا پاک سرگزشت کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے (آمین)"

☆ شاہد احمد خان، گلستان جوہر کراچی سے لکھتے ہیں "سرگزشت کے ماہ نومبر اور دسمبر 2013ء کے شماروں میں جنگ عظیم دوم سے متعلق آشوٹز (Auschwitz) موجودہ پولینڈ میں قائم نازی عقوبتی مرکز میں ہونے والے مظالم کے بارے میں دلخراش واقعات پر مبنی دو اقساط میں ڈاکٹر مکلوس میزلی کی آپ بیتی شائع ہوئی ہے۔ ان اقساط میں ڈاکٹر جوزف مینگلے کے ایما پر انسانی لاشوں پر کی جانے والی بھیانک طبی تحقیق کے مراحل بیان کیے گئے ہیں۔ اگرچہ خالص انسانی جذباتی نقطۂ نگاہ سے یہ واقعات از حد شرمناک ہیں، تاہم اس قسم کے واقعات کی صداقت کے بارے میں بے شمار تحقیقی مضامین اخبارات، کتب اور اب انٹرنیٹ پر موجود ہیں جن میں اس قسم کے واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر تحفظات اور شبہات کا منطقی اظہار کیا گیا ہے۔ ماہنامہ سرگزشت سے مزید گزارش ہے کہ تاریخی مضامین میں بہتر ہوگا کہ کرداروں اور مقامات کے نام انگریزی میں بھی ضرور تحریر کیے جائیں تاکہ باذوق قارئین، خصوصاً نوجوان طبقہ، اول تو ان مقامات اور کرداروں کو بہتر تلفظ سے پڑھ سکیں اور مزید حوالوں کے لیے انٹرنیٹ سے مدد لے سکیں۔ مندرجہ بالا مضامین کے سلسلے میں انٹرنیٹ پر Institute for historical Review کی سائٹ پر موجود تحقیقی مواد کا مطالعہ سودمند ہو سکتا ہے۔ میرے پسندیدہ مضامین میں جناب علی سفیان آفاقی صاحب کی فلمی الف لیلہٰ اور سفرنامے سرفہرست ہیں، آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ کچھ سینئر اداکاروں مثلاً مسعود اختر، غزالہ اور حنیف وغیرہ کے حالات بھی تحریر فرمائیں۔ مجموعی طور پر رسالہ قابلِ ستائش ہے۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے لاہور سے لکھا ہے "اس ماہ 2013 کے الوداعی شمارے پر تبصرہ کرنے کا ہمارا کوئی پروگرام نہیں تھا بلکہ اس ماہ ہم آپ سے سرگوشیاں کرنے کے موڈ میں تھے لیکن جہانِ حیرت اور عقوبت خانہ پڑھ کر ان کی شان میں قصیدہ گوئی نہ کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہوتا اور ڈاکٹر ساجد امجد اور افسر آذر کو مبارک باد کے ساتھ شکریہ بھی ادا کرنا ضروری تھا۔ آپ اس مرتبہ بھی اشرافیہ کی بے حسی پر کفِ افسوس مل رہے ہیں۔ چیف صاحب جب اربوں کی فالتو کرنسی روز چھاپی جائے گی تو ہمارے نوٹ کی وقعت تو کم ہوگی ہی۔ بحیثیت قوم اور مسلمان ہم اس وقت بدترین دور سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرح کے استحصال کے باوجود ہماری غفلت سے یاری ہے۔ بحیثیت مسلمان بھی ہماری غیرت نہیں جاگ رہی۔ کون سی ایسی اخلاقی برائی ہے جو ہم میں موجود نہیں ہے۔ ناجائز منافع خوری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، رشوت خوری اور اقربا پروری تو پرانی باتیں ہیں ہماری حالیہ بے حسی یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی چینلز پر اکثریت پر انڈین اور ترکی کے حیا باختہ ڈرامے اور اشتہارات بڑی دیدہ دلیری سے جاری ہیں اور کوئی پوچھنے اور باز پرس کرنے والا نہیں ہے اور ہم سب بھی خاموش ہیں۔ گزشتہ چند ماہ سے شہرِ خیال کے ساتھی ایسی ایسی فرمائشیں کر رہے ہیں جو پورا کرنے سے آپ اس لیے قاصر ہیں کہ وہ سب کچھ چھپ چکا ہے اور کب چھپا ہے اکثر ساتھیوں کو یہ علم اس لیے نہیں ہے کہ وہ نئے نئے قاری بنے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری آفر یہ ہے کہ ہم سرگزشت کا مکمل ریکارڈ رکھتے ہیں اس لیے اگر ہم ہر ماہ ایک سال کے چھپے ہوئے مواد کی فہرست لکھ کر بھیج دیں تو پڑھ کر نئے ساتھی پرانے شمارے تلاش کر کے اپنی تشنگی دور کر سکتے ہیں اور اگر اس میں بھی انہیں مکمل سیراب ہونے کا موقع نہ ملے تو پرانے مواد سے ہر ماہ ایک اعلیٰ ترین انتخاب دوبارہ چھاپ دینے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے دیوتا، کے خالق جناب محی الدین نواب کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شہرِ خیال ہی نہیں سسپنس اور جاسوسی کے اکثر قاری بھی نواب بیتی ضرور پڑھنا چاہیں گے جو بائیس سال گزرنے کے باوجود آج بھی تروتازہ ہے۔ ان بائیس سالوں میں نواب صاحب کی زندگی میں اور

کیا کچھ ہوا ہے اگر نواب محی الدین صاحب وہ بھی ہم سب سے شیئر کر لیں تو سونے پہ سہاگا ورنہ صرف نواب بیتی بھی کافی ہے۔ دنیا کی سب سے طویل کہانی لکھنے والے نواب صاحب کی سرگزشت ان کی تحریروں کی طرح اچھوتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری تجویز ساتھیوں کو پسند آئے گی۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا مکتوب پشاور سے "قارئین سرگزشت کو نیا سال مبارک ہو۔ اداریہ میں درج معراج رسول صاحب کے خدشات آخر رنگ لے ہی آئے۔ نوید ہو کہ وطنِ عزیز کسی ایک شعبہ زندگی میں تو اول نمبر پر آیا۔ چاہے کرپشن ہی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر ساجد ہمیشہ کی طرح بہترین رہے "اصحاب الفیل" کے عبرتناک انجام پر مبنی قرآن پاک کی "سورۃ الفیل" کے تاریخی پس منظر کو عائشہ جونیجو صاحبہ نے خوب بیان کیا ہے جو کہ اس ماہ کے شمارہ کا تبرکِ خاص ہے۔ ماہ ربیع الاول کے حوالے سے بھی اگر کوئی خوبصورت تحریر شاملِ اشاعت ہوتی تو شمارہ کو مزید چار چاند لگ جاتے۔ منظر امام صاحب بہت اچھے لکھاری ہیں اس بار تو ماہ جنوری سے متعلق چیدہ چیدہ واقعات کو ایک ہی مضمون میں اکٹھا کر دیا۔ ہماری گزارش ہے کہ باقی کے گیارہ مہینوں کے بھی اہم واقعات ماہ بہ ماہ لکھتے اور ہمارے علم میں اضافہ کرتے رہیں۔ محترم آفاقی صاحب نے پاکستان فلم انڈسٹری کی دو اہم شخصیات کے بارے میں لکھ کر ماضی کی یادیں تازہ کی ہیں۔ کیا وقت تھا کہ خلیل قیصر اور ریاض شاہد کا نام پڑھ کر فلم بین سنیما گھروں کا رخ کرتے تھے۔ ان دونوں کا جب جب ساتھ ہوا کلاسک فلمیں وجود میں آئیں۔ خلیل قیصر جیسا ذہین ہدایت کار پاکستان فلم انڈسٹری میں نہ پہلے پیدا ہوا اور نہ ان کے بعد اور ریاض شاہد جیسے پُرشکوہ اور کاٹ دار مکالمے پاکستان تو کیا بھارت کا بھی بڑے سے بڑا کہانی نویس اور مکالمہ نگار نہیں لکھ سکتا۔ میں نے پاکستان یا بھارت کے مکالمہ نگاروں میں ریاض شاہد کے علاوہ کوئی مصنف نہیں دیکھا جس کے مکالموں پر فلم بین خوش ہو کر بے اختیار تالیاں بجانے لگتے تھے۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں، شوکت رحمان خٹک صاحب نے بیماری کے باوجود بہت خوبصورت خط اداکار ناصر خان کے بارے میں لکھا۔ دعا ہے کہ اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے (آمین) اب آتے ہیں شہرِ خیال کی طرف۔ خالد کبیر صاحب اور وحید ریاست بھٹی صاحب نے سال بھر سرگزشت میں چھپنے والی تحریروں کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ میرے مضمون سپر اسٹار، کے بارے میں وحید ریاست بھٹی صاحب نے جس فراخ دلی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے میں ان کا ممنون ہوں۔ لیکن وحید بھائی دوسرے بہت سے دوستوں نے مجھ سے کہیں بہتر لکھا ہے ان کی دل آزاری تو نہیں ہونا چاہئے بہرحال بہت بہت شکریہ حوصلہ افزائی کے لیے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ، ڈاکٹر روبینہ انصاری صاحبہ، رانا شاہد صاحب بہت مختصر تبصروں کے ساتھ آئے یوں کہ تشنگی باقی رہ گئی۔ اعجاز حسین ستھار صاحب کا تبصرہ بھی مختصر لیکن جامع تھا۔ پارچے اب زیادہ بہتر اور معلوماتی ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں میں بیت بازی کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں کہ اس ماہ بہت بہتر اشعار دیکھنے کو ملے۔ مزید بہتری کی گنجائش ہے۔ پرچہ چونکہ دیر سے ملا اور پھر اپنا بیدل پر لکھا مضمون بھی مکمل کرنا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ دیر تو ہوئی مگر دونوں کام مکمل ہو گئے۔ تبصرہ کے ساتھ مضمون بھی بھجوا رہا ہوں۔ سرگزشت کے معیار پر پورا اترے تو کسی قریبی شمارے میں شائع کر دیجئے۔"

☆ عبدالقیوم خان ساغری خٹک، میاں ڈھکی اٹک سے لکھتے ہیں "سب سے پہلے سراب پڑھی، کافی سسپنس تھا لیکن پھر شہباز کو انڈیا واپس کر دیا اب سویرا اور شہباز کو بھی ملا دیں۔ اس کے بعد سچ بیانیاں پڑھی، سلطانہ بیگم ایک انا پرست عورت کی کہانی تھی۔ کہانیوں میں روشنی، لاحاصل، عشق عشق ہے اچھی کہانیاں تھیں لیکن یار عیار میں ذیشان جیسے دوست کا پڑھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ دوستی کے نام پر یہ لوگ دھبا ہیں۔ شہرِ خیال میں خالد کبیر (لاہور) صدارت فرما رہے تھے۔ محمد عزیز مئے لڈن اینڈ رانا محمد شاہد بھائی، یہ بیٹیاں ہی والدین کے بڑھاپے میں کام آتی ہیں۔ بیٹے تو چھوڑ جاتے ہیں۔ بیٹیاں بیٹوں سے کم نہیں ہوتی ہیں۔ بہنا ڈاکٹر روبینہ نفیس خدا سے ناامید نہ ہوں۔ ذکر زیادہ کیا کریں خاص کر درود شریف کا پھر دعا مانگا کریں اور میرے پاس ایک لیڈی کرنل ڈاکٹر صاحب کا ایڈریس اور فون نمبر ہے۔ ہمارے گاؤں کا آدمی تھا اس نے علاج کرایا تو اولاد ہوگئی۔ خدا سے دعا کریں۔ میں نمبر اور ایڈریس لکھ دیتا ہوں۔"

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے "معراج انکل نے 100 فیصد حقیقت پر مبنی گفتگو کی، اچھا لگا، نامور اشتراکی سرگزشت پڑھ کر کافی معلومات ملیں۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے شہرِ خیال ایک فیملی کی طرح ہے۔ خالد کبیر لاہور سے سالانہ رپورٹ لے کر حاضر ہوئے تو وحید ریاست بھٹی اور ناصر حسین بھی سالانہ رپورٹ کے ساتھ موجود تھے۔ بہرحال وحید ریاست بھٹی ان دونوں پر سبقت لے گئے۔ عبدالرؤف عدم بیٹی کی سالگرہ مبارک ہو۔ سدرہ بانو ناگوری میں آپ کی باتوں سے متفق ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ نیا سال ہمارے لیے اور حکومت کے لیے ڈھیروں خوشیاں لائے اور امن وامان قائم ہو۔ اب کہانیوں کی طرف چلتے ہیں اکرام کو (روشنی) سے منور ہوتے دیکھا اور سیدھی راہ روشنی ہی نے دکھائی۔ بہترین تحریر، موبائل چوروں کے لیے نصیحت کا پہلو تھا۔ شازیہ کی (اچانک)

WWW.PAKSOCIETY.COM

شادی نے تو حیران ہی کر دیا کتنا انوکھا انداز اپنایا فیصل نے، حزہ ہی آ گیا۔ فیصل کی عقل کی داد دینی چاہیے۔ شجاعت اور غزالہ نے عشق عشق ہے، میں ایک دوسرے کو اتنا پسند کیا کہ دونوں ہی قربانی دے رہے تھے۔ غزالہ نے شجاعت کی عزت پر آنچ نہ آنے دی اور جان کی قربانی دے دی جس کی مثال نہیں ملتی۔ عدنان اور شاہد دونوں ہی لاحاصل، رہے۔ تانیہ نے دونوں کو بیوقوف بنایا۔ عدنان اگر پہلے ہی شاہد کے باپ سے بات کر لیتا تو انتقامی کارروائی پر نہ اترتا۔ بہت غلط کیا غلط فہمی میں ہی دوست کی جان لے لی۔ سلطانہ بیگم میں اگر سلطانہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان فرق نہ کرتی تو خاندان کا شیرازہ نہ بکھرتا، مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں، آخر میں وہ ان کے پاس ہی گئی۔ غزالہ نے تو اپنے پیار کی انتہا ہی کر دی، شوہر کو انوکھے انداز میں اپنا بنا لیا۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری یہ مثال اسی لیے بنی ہے۔ یارِ عیار میں ذیشان جیسے فراڈیے کی واقعی یارِ عیاری تھی۔ نعمان شریف انسان تھا ذیشان کے گروپ میں رہ کر بھی غلط کام نہیں کیا اور ماہم بھی ذیشان کی وجہ سے خودکشی پر مجبور ہوئی۔ خدا کی قدرت جوش میں آئی اور ذیشان کو دنیا میں عبرت کا نشان بنا دیا، لوگوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔"

☆ طاہر الدین بیگ کا خلوص نامہ میرپور خاص سے "نامور اشتراکی اچھا لکھا گیا۔ خواجہ عباس اس لیے فلمی دنیا میں مشہور ہوئے کہ یہ دلیپ کمار کے سب سے بڑے حریف راجکپور کے کیمپ سے تعلق رکھتے تھے اور دلیپ کمار سے..... چلیں چھوڑیں اشتراکیت کیا ہے کافی لوگ اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی عباس صاحب تھے جو آوارہ کی کہانی لے کر محبوب صاحب کے پاس آئے۔ محبوب صاحب دلیپ صاحب کو کاسٹ کرنا چاہتے تھے اور عباس صاحب راجکپور کے لیے بضد تھے نتیجہ یہ کہ کہانی لے کر واپس آ گئے تھے۔ خالد کبیر صاحب اور ریاست بھٹی کے تبصرے شاندار رہے۔ بھٹی صاحب کا شکریہ انہوں نے ہمیں یاد رکھا۔ سدرہ بانو ناگوری کا تبصرہ بھی اچھا رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدیقی صاحب پر لکھا اور خوب ہی لکھا، کافی معلوماتی تحریر تھی۔ معلومات میں حیرت انگیز اضافہ جاپان کا ہنری فورڈ نے کیا۔ سسپنس سے بھرپور عزم و حوصلہ کی کہانی ابن کبیر صاحب نے زبردست تحریر پیش کی۔ ترکی کی سیر آفاقی صاحب کرا رہے ہیں۔ بٹ صاحب اور خان صاحب دونوں کردار خوبصورت انداز لیے ہوئے ہیں پھر آفاقی صاحب کا لکھنے کا اندازِ سفر مزہ دیتا ہے۔ تذکرہ چین اور ہاتھی والے بھی معلومات میں اضافہ کر گئے۔ اس دفعہ معلوماتی مضامین بڑے زبردست رہے۔ فلمی الف لیلہٰ ناصر خان کے ذکر سے شاندار ہو گئی پھر نوشاد صاحب کی زبردست جدوجہد کی کہانی بہت خوب۔ برفانی ریگستان بھی ہمت اور حوصلہ کی کہانی ہے جسے امجد رئیس نے غالباً انگلش سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ آپ بیتیاں ہوں یا جگ بیتیاں ان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے۔ کہیں کہیں قاری پڑھ کر عجب صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے کہ ایسا ہمارے ساتھ ہوتا تو۔ سلطانہ بیگم خوب کہانی تھی۔ سلطانہ بیگم کا دوہرا معیار تھا۔ روشنی بھی اچھی کہانی تھی۔ اچانک بھی بس اچانک شروع ہوئی اور اچانک ہی بند ہو گئی۔ سب سے زبردست یارِ عیار تھی۔ سبق آموز اور اپنے اندر ایک سبق لیے ہوئے تھی۔ اس لیے سبق حاصل کر لیا جائے کہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے انجام بڑا اثر انگیز۔"

☆ چوہدری مدثر حسین کی کھاریاں سے شگفتہ بیانی "شمارے پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ایک معاشرتی مسئلہ بیان کرنا چاہوں گا۔ ہمارے معاشرے میں لوگوں کی اکثریت ایک عجیب طرح کی سوچ میں مبتلا ہے۔ لوگ اپنا کام ایمانداری سے کرنے کی بجائے دوسروں سے اونچا دکھائی دینے کی دھن میں مبتلا ہیں۔ اکثر لوگ ایسے ہیں کہ جن کی زندگی کا مقصد دوسروں پر رعب جمانا اور انہیں دبا کر رکھنا ہے۔ اور وہ کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جس سے انہیں اپنی چودھراہٹ دکھانے کی شہ ملے۔ اس وجہ سے ہر آدمی دوسرے کو اپنا حریف سمجھنے لگتا ہے اور دوریاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ صرف اور صرف اپنی ذمے داریاں اچھی طرح نبھائیں۔ اب میگزین پر کچھ تبصرہ ہو جائے "سرگزشت" آہستہ آہستہ میرے روٹین سے پڑھنے والے میگزینوں میں شامل ہو رہا ہے۔ آپ کا میگزین واقعی ادب کا شاہکار ہے۔ ادب کے وہ ستارے جنہیں ہم ایک ادیب سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے، سرگزشت نے ان کے مقام سے روشناس کرایا۔ اندازِ تحریر پُرکشش ہے۔ سچ بیانیاں، دلچسپ ہوتی ہیں۔ اس شمارے میں روشنی، محبت زندہ ہے، دلچسپ لگیں لیکن انتہا من گھڑت کہانی لگی۔ مجھے ایسی کہانی سے بالکل اتفاق نہیں۔ ترکی کا سفرنامہ کافی زبردست جا رہا ہے۔ صفحہ 223 پر ایک مرسلہ پڑھا جس میں بتایا گیا کہ: تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب، یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔ یہ شعر جو کہ علامہ اقبال سے منسوب ہے دراصل علامہ صاحب کا نہیں بلکہ سید صادق حسین کاظمی کا ہے۔ اس بارے میں پڑھ کر اعتراف ہوا کہ سرگزشت واقعی تحقیق سے بھرپور ہے۔ شہر خیال بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ خطوط پڑھنے کا بھی اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بہترین... تبصرہ کرنے والے کو ہر ماہ کوئی نہ کوئی انعام دینے کا سلسلہ ہونا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ سلسلہ ہے اور لوگوں کی دلچسپی میگزین میں اور بڑھے گی۔"

☆ احمد خان توحیدی کراچی سے لکھتے ہیں "سب ساتھیوں کو سال نو مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ پاک وطن کے لیے خصوصی رحمت نازل کرے۔ لاٹھی گولی و دہشت گردی کی بجائے پیار و سکون سے وطنِ عزیز کو پُرامن ترقی پر گامزن کرے (آمین) برادر معراج رسول

آپ سمندر کو کوزے میں بند کر دیتے ہیں۔ اللہ کی نعمتوں سے مالا مال زرعی ملکیں درست حکمتِ عملی نہ ہونے پر آلو پیاز ٹماٹر جیسی عام سبزی کا بھی قحط پڑھ گیا۔ ایٹمی قوت ہو کر بھی عام مسائل میں الجھی ہے نیک نیتی بروقت درست اقدام سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں بلاوجہ ریلیاں وقت کا ضیاع ہے، دھرنے، مظاہرے، قومی املاک کی توڑ پھوڑ میں نمبر لینے کے ساتھ مہنگائی میں بھی نمبر ون ہو چکے ہیں، ہمیں دیکھ کر واقعی شرمائیں یہود۔ نامور اشتراکی میں خواجہ احمد عباس، تفصیلی حالات پڑھے اس سے قبل نظروں سے گزرا ہو تو بھی یاد نہیں ہے۔ (حیرت ہے آپ نے خواجہ احمد عباس کو نہیں پڑھا؟) شہر خیال میں خالد کبیر 2013 کی تفصیل کے ساتھ کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے ڈبل مبارک باد۔ ریاست بھٹی کلر سیداں راولپنڈی، پورے سال کی کہانیوں پر اتنا تفصیلی تبصرہ۔ آپ نے کمال کا لکھا قلمی مبارک باد۔ میرا تبصرہ دسمبر پسند کرنے کا شکریہ۔ سابقہ برس 2013 سب سے اچھا شمارہ بینا و نابینا نمبر تھا۔ انور عباس بھٹر، بلبل صحرا ریشماں کی جدائی کے ساتھ دسمبر میں جون ایلیا، منیر نیازی، پروین شاکر، معین اختر اور اب قاضی حسین احمد جیسے عظیم لوگوں کی برسیاں گزری ہیں۔ کاش ہم ان کے وصف اپنا سکیں۔ عامر ساحل ڈیرہ اسماعیل خان، واقعی سرگزشت تاخیر سے ملنے لگا ہے۔ اور مصروفیت زندگی کے ساتھ محکمہ ڈاک کا بابا آدم بھی نرالا ہے۔ بشریٰ افضل بہاولپور، اچھا تبصرہ مبارک ہو، آپ کے دو خط شائع ہوئے مضمون ایک جیسا ہی ہے۔ قیصر عباس، فساد، دہشت گردی، مذہبی طالب الدنیا ملاؤں کی ہی ایجاد ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، آپ ماشاءاللہ اپنے نام کی طرح نفیس ہیں۔ سسٹرز اپنا فون نمبر بالکل نہ لکھیں غلیظ لوگ دوسروں کو بھی اپنی ماں بہن جیسا بدمعاش سمجھتے ہیں۔ احمد چوہان اینڈ رانا حبیب، وطن کو کھوکھلا کرنے والی دیمک کرپشن ہی تو ہے۔ اعجاز سٹھار، سلیم رشید، شاہد جہانگیر، محسن علی اچھے تبصرے لکھے ہیں۔ سچ بیانیاں کی طرف آتے ہیں۔ سلطانہ بیگم، مکان بنیادی ضرورت ہے سلطانہ کو اپنے فتوے پر عمل کرتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو مکان بنا کر دینا چاہیے تھا۔ روشنی میں مریم معصوم خود پامال ہو کر اکرام کو صراطِ مستقیم دکھا گئی۔ اچانک، فیصل کو دیکھ کر جہاں شازیہ کا دل دھڑکا وہاں فیصل کی لاجواب اداکاری نے شازیہ کو خوبصورت زندگی شادی کا موڑ دیا۔ لاحاصل عدنان نے اپنے مقدس پیشے سے بے وفائی کی، تانیہ نے دونوں کو بے وقوف بنایا۔ اپنے خاوند و بچوں کے ساتھ زندگی کے ازدواجی مزے لوٹ رہی ہو گی۔ محبت زندہ ہے، شادی سے قبل ہر مرد عورت کی زندگی میں مختلف لوگ آتے ہیں، شادی کے بعد میاں بیوی خصوصاً عورت بچوں کو چھوڑ کر پرانے یار سے رابطہ، غلط اقدام ہے۔ ڈاکٹر جواد اور فیاض کی چال اچھی رہی۔ شاہینہ ٹھوکر سے بروقت سنبھل گئی۔ انتہا، شادی شدہ مرد کی خوبصورتی پر مرمٹنا لڑکیوں کی حماقت ہوتی ہے۔ تیزاب سے چہرہ جلا دینا غزالہ مکافاتِ عمل سے نہیں بچے گی۔ یارِ عیار، ذیشان جیسے شیطان کا یہی انجام ہونا تھا۔ ہم بھی مخلوط کالج میں پڑھتے رہے، فی الوقت امیرزادے تعلیم کی آڑ میں عشق لڑانے کے لیے داخلہ لیتے ہیں۔ مہک کی خودکشی کا قلبی دکھ ہے۔"

☆ عبدالخالق بھٹی صدر پریس کلب اسلام آباد سے لکھتے ہیں "شمارہ کئی مضمون میں منفرد ثابت ہوا۔ ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی رات میں رضائی میں دبک کر نئے سال کا پہلا پرچہ پڑھنے کا مزہ خوب رہا۔ ابن کبیر کی تحریر جاپانی ہنری فورڈ نے ذہن و دل پر جادو سا کر دیا۔ اگر انسان حوصلہ دکھائے تو اسی طرح کامیابی قدم چومتی ہے۔ ایک معمولی سے گھرانے میں پیدا ہونے والے، عسرت و تنگدستی میں پلنے والے نے کس طرح دنیا کے امیر ترین شخص ہونے کا مقام حاصل کیا یہ قابلِ تقلید بات ہے۔ کاش ہمارے ہم وطن بھی اس کی تقلید کر لیں۔ نامور اشتراکی میں خواجہ احمد عباس کے بارے میں پڑھا۔ مروہ کا مجنوں نے بھی نئی معلومات فراہم کیں۔ عشق حشر ساماں میں محمد ایاز راہی نے معلومات کا سمندر کوزے میں بند کر دیا۔ جنوری اور تذکرہ چین نے بھی مزہ دیا۔ ہاتھی والے کی تعریف کیا کروں، قرآن میں جس واقعہ کا تذکرہ ہوا سے تو ہر مسلمان پسند کرے گا۔ مارلن برانڈو کا انداز خشک تھا۔ برفانی ریگستان ایسا لگ رہا تھا جیسے اسکول کی کسی کتاب کا خشک مضمون پڑھ رہے ہیں۔ سلطانہ بیگم ہمارے معاشرے کا ایسا کردار ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی یارِ عیار لگی۔ اچانک اور لاحاصل بھی پسند آئی۔

☆ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا اظہاریہ بھٹر سے "ان تمام مہربانوں کا شکریہ جنہوں نے میرے دکھ پر ہمدردی کی۔ شہر خیال میں آ کر یہی تو اچھا لگتا ہے کہ لوگ دکھ درد کو شیئر کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر میں عزیز مئے لڈن کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے یاد رکھا۔ بشریٰ افضل بہاولپور اور میرے پسندیدہ مصنف محمد ایاز راہی کا بھی شکریہ، اب آتے ہیں اس ماہ کے شمارے کی طرف، جاپانی ہنری فورڈ نے دل موہ لیا۔ مروہ کا مجنوں بھی پسند آیا۔ عشق حشر ساماں کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، مختصر پیرائے میں بہت کچھ کہہ گئے راہی صاحب۔ تذکرہ چین اور ہاتھی والے بھی پسند آئی۔ برفانی ریگستان کو پڑھتے ہوئے سپاٹ پن کا احساس ہوا۔ مزہ بالکل نہیں آیا۔"

تاخیر سے موصول خطوط:

ارشد نیاز، چیچہ وطنی۔ نغمہ یاسین، دینہ جہلم۔ فروہ حسن، لاہور۔ ابرار علی سید، مہوش ممتاز، فہد حسن صدیقی، اسلام آباد۔ کلیم اللہ، پشاور۔ نعمان بشیر ٹیکسلا۔ کاظم علی کاظمی کوئٹہ۔ نیاز احمد، ڈی آئی خان۔ انیس حیدر، پیواڑ پارہ چنار۔ زاہد فاروقی، حیدر آباد۔ نگار محسن، ایبٹ آباد۔ سلیم نیازی، شیخوپورہ۔ انیس نیاز وٹو، میرپور آزاد کشمیر۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

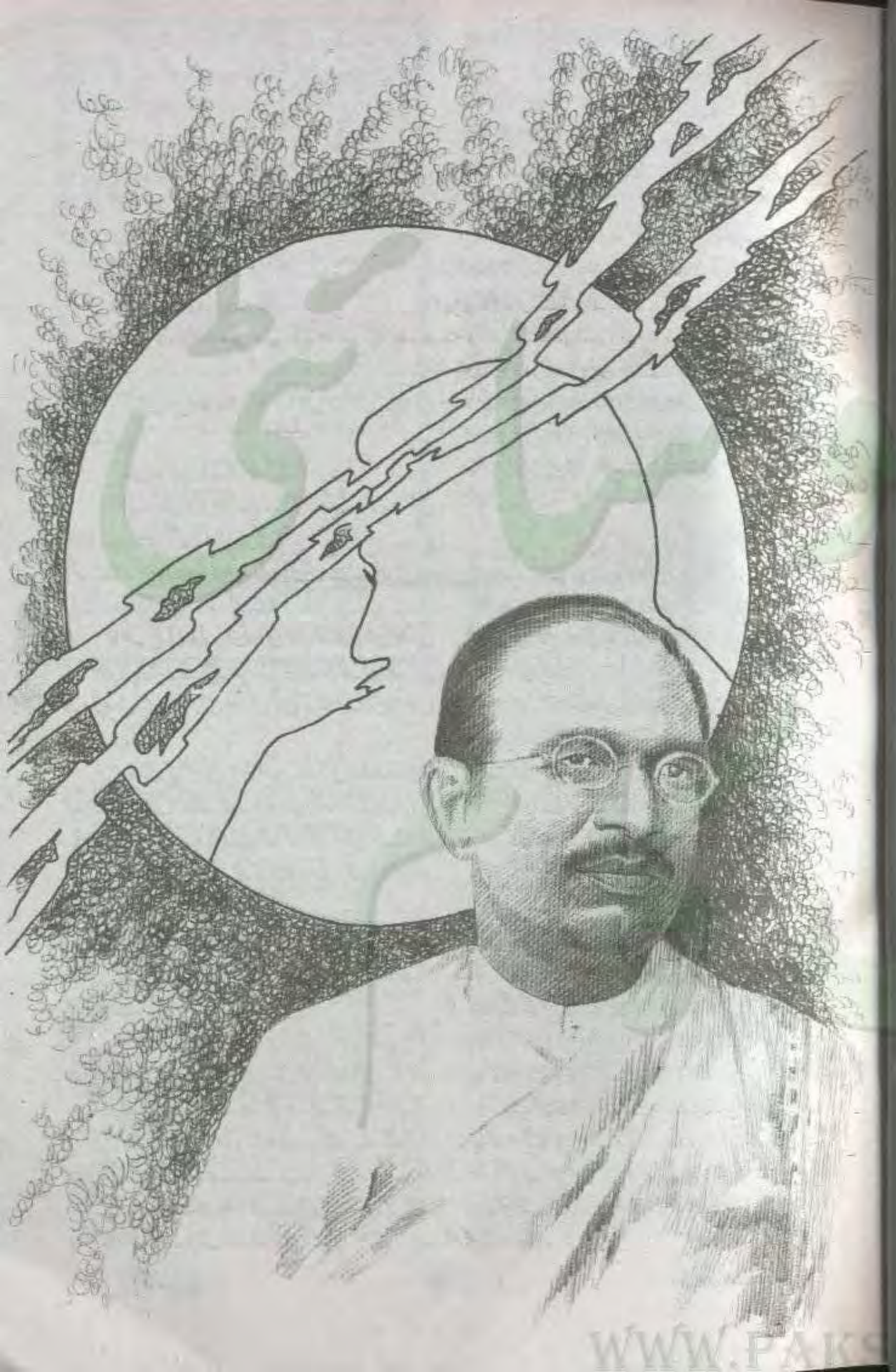

طلوعِ مہر

ڈاکٹر ساجد امجد

پژمردہ چہرے، سسکتی آہیں اور اکھڑی اکھڑی سانسیں۔ اسے اپنے اطراف میں یہی کچھ نظر آتا تھا جبکہ وہ ہر لمحہ جشن ریز، ہرکرن تنویر ریز اور ہر چہرہ تبسم ریز کا خوابشمند تھا، اسی لیے زندگی کی بے راہ روی، بے ضابطگی اور دلخراش تلخیوں کو وہ الفاظ میں سمونے لگا۔ تخیلی اور تصوراتی روپ دینے لگا۔ لوگ اسے دل جلا، آتش صفت کہنے پر مجبور ہوگئے لیکن پھر ایک دور وہ بھی آگیا جب وہ ناصح کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ اقبالیات کا ماہر کہلانے لگا کیونکہ اس کا ذہن رسا، دماغ تیز اور بالغ نظری وافر تھی۔

اردو کے ایک معروف قلم کار کا احوالِ زیست

چوہدری محمد علی خاں کو آج پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ ان کے گاؤں پھول پور میں ابتدائی تعلیم کے لیے بھی کوئی اسکول نہیں۔ یہ احساس بھی اس لیے ہوگیا کہ ان کا بیٹا غلام رسول پڑھنے کی عمر کو پہنچ گیا تھا۔ انہیں یہ احساس بھی پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ پھول پور میں کوئی اسکول نہیں اس لیے وہ بھی ان پڑھ رہ گئے۔ اپنی اس کمی کو وہ اپنے بیٹے کے ذریعے پورا کرنا چاہتے تھے لیکن پھول پور میں کوئی اسکول نہیں تھا۔

وہ اس روز گھر آئے اور حقہ سامنے رکھ کر بیٹھے تو حقے کی گڑگڑاہٹ بدلی ہوئی تھی۔ وہ جب غصے میں ہوتے یا کچھ سوچ رہے ہوتے تو ان کے حقے کی آواز بدل جاتی تھی۔ اتنے لمبے کش لیتے کہ چلم سے شعلے نکلنے لگتے تھے جیسے اپنا غصہ حقے پر اتار رہے ہوں۔ اس وقت ضروری ہوتا تھا کہ فاطمہ بی بی جو اُن کی زوجہ تھیں کام کاج چھوڑ کر ان کی دلداری کے لیے ان کے پاس آکر بیٹھ جائیں اور ان کا غصہ کم کرنے کی کوشش کریں۔ اس وقت بھی جب ان کے حقے کی آواز گونجی تو فاطمہ بی بی پر لازم ہوگیا کہ وہ ان سے حقے کی جان چھڑائیں۔ وہ دوڑی ہوئی آئیں اور دیکھا کہ چوہدری صاحب حقے سے دست و گریباں ہیں۔

"خیر تو ہے، غصہ کیوں اتار رہے ہیں؟"

"غصے کی تو بات ہی ہے۔ جالندھر یہاں سے کتنی دور ہے۔ وہاں علم کے دریا بہہ رہے ہیں۔ اس کی تحصیل نکودر تک میں مدرسہ ہے۔ پھول پور اس تحصیل کا موضع ہی تو ہے۔ یہاں ایک بھی اسکول نہیں۔"

"اس میں غصہ ہونے کی کیا بات ہے۔ تمہیں کون سا وہاں ہیڈ ماسٹر ہونا تھا۔ اپنا کھیت ہے اپنی زمینیں ہیں۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔"

"مجھے تو ہیڈ ماسٹر نہیں بننا لیکن غلام رسول اب بڑا ہو رہا ہے۔ میں اسے اسکول بھیجوں گا۔ و لایت تک پڑھاؤں گا اسے۔ مجھے تو انگریزی راج پر غصہ آرہا ہے۔ اسے چھوٹے چھوٹے دیہات کا خیال ہی نہیں۔ سرسید نے بھی مدرسہ کھولا تو علی گڑھ میں۔ یہ نہیں کہ پھول پور میں کھول دیتے۔"

"تم غلام رسول کو پڑھاؤ گے؟"

"وہ جتنا پڑھ سکے گا اسے پڑھاؤں گا۔ سوچا تو یہی تھا لیکن یہاں کوئی اسکول ہی نہیں۔ اب کچھ اور سوچنا پڑے گا۔"

"سوچو مگر حقے پر تو غصہ مت اتارو۔ لاؤ میں دوسری چلم بھر کے لادوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

جتنی دیر میں وہ چلم بھر کر لاتیں چوہدری صاحب کسی نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے نئی چلم کا ایک گہرا کش لیا اور حقے کو ایک طرف رکھتے ہوئے بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''میری سسرال اس اعتبار سے خوش قسمت ہے کہ وہاں پرائمری اسکول ہے۔ ابھی غلام رسول چھوٹا ہے کہیں اور بھیج نہیں سکتا۔ اگر اسے کھانبرا بھیج دوں تو پرائمری وہاں سے کرلے گا۔''

''تو اب اسے آپ کھانبرا بھیجیں گے؟''

''کیا کروں مجبوری ہے۔''

''کیا اس گاؤں کے سب بچے کھانبرا چلے جاتے ہیں؟''

''جنہیں پڑھنا ہوتا ہے وہ کہیں نہ کہیں چلے ہی جاتے ہیں۔''

''میں غلام رسول کے بغیر کیسے رہوں گی۔''

''ایک میل کا فاصلہ ہے۔ ابھی وہ کوئی ولایت نہیں جارہا ہے۔ کوئی بھی نوکر اسے چھوڑ آیا کرے گا اور لے آیا کرے گا۔ تمہارے خاندان کے وہاں بہت سے گھر ہیں۔ ایک آدھ دن وہاں رہ بھی جائے گا تو کوئی حرج نہیں ہے۔''

فاطمہ بی بی نے یہ دیکھا ہی نہیں تھا کہ گاؤں کا کوئی بچہ اسکول جارہا ہے۔ انہیں یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا لیکن دل ہی دل میں خوش بھی ہورہی تھیں کہ غلام رسول اسکول جایا کرے گا۔

چوہدری محمد علی اَن پڑھ ضرور تھے لیکن اردو، فارسی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ہزاروں اشعار انہیں زبانی یاد تھے جو وہ غلام رسول کو پہلو میں بٹھا کر اکثر گنگنایا کرتے تھے اور یہ دیکھ کر خوش ہوتے تھے کہ غلام رسول انہیں بڑی توجہ سے سنتا ہے۔

انہیں نظر آرہا تھا کہ اگر غلام رسول کی تعلیم صحیح خطوط پر کی گئی تو اس میں ایک اچھا ادیب بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔

غلام رسول کھانبرا کے پرائمری اسکول میں داخل ہوگیا۔ وہ ابھی ابتدائی کلاسوں میں تھا لیکن اس کے کان اردو اور فارسی کے اشعار سے آشنا ہوچکے تھے۔ اسکول میں داخل ہونے کے بعد تو اس کے والد یہ سمجھنے لگے تھے کہ وہ یونیورسٹی میں پہنچ گیا ہے۔ اسے اپنے پاس لٹا کر غالب کے مشکل اشعار سناتے اور پھر اس سے ان کا مطلب پوچھتے۔ وہ ابھی اس کا اہل نہیں ہوا تھا لیکن اس کی شعری تربیت ہورہی تھی جو کسی وقت کام آنے والی تھی۔

چوہدری محمد علی خاں کے دل میں بڑا ارمان تھا کہ وہ غلام رسول کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں۔ جس دن سے وہ اسکول میں داخل ہوا تھا چوہدری صاحب کی گفتگو کا ایک ہی موضوع تھا۔ جب دوستوں میں بیٹھتے اس کی تعلیم کا ذکر چھیڑ دیتے۔ ان کے پروگرام میں شامل تھا کہ وہ اسے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے ولایت بھیجیں گے۔ وہ علامہ اقبال سے بہت متاثر تھے۔ وہ غلام رسول کو بھی ان کی طرح لندن بھیجنے کے خواہاں تھے لیکن قدرت کے فیصلے کچھ اور ہی تھے۔

غلام رسول نے ابھی پرائمری تعلیم مکمل بھی نہیں کی تھی کہ چوہدری محمد علی بیمار پڑے۔ بیماری اتنی بڑھی کہ انہیں اپنے بچنے کی امید نہ رہی۔ جب وقت قریب آگیا اور انہیں احساس ہوگیا تو ان کی زبان پر بے اختیار غلام رسول کا نام آگیا۔ ان کے تمام اقربا اور زوجہ موجود تھیں کہ انہوں نے نصیحت کی۔

''میں اس دنیا میں موجود نہیں رہوں گا لیکن میں وصیت کرکے جارہا ہوں کہ غلام رسول کی تعلیم کی طرف سے غفلت نہ برتنا۔ خواہ کوئی صورت پیش آئے میرے بچے کو ضرور اعلیٰ تعلیم دلوائی جائے۔ جتنا بھی خرچ کرنا پڑے بے دریغ خرچ کرنا۔''

مرتے وقت ان کی زبان پر کسی اور بچے کا نام نہیں تھا۔ یہ واحد وصیت تھی جو انہوں نے کی اور آنکھیں بند کرلیں۔

ان کے مرنے کے بعد غلام رسول کے ماموں اور والدہ نے عہد کیا کہ وہ مرحوم کی وصیت ضرور پوری کریں گے اور اسے تعلیم دلوائیں گے۔

والد کے انتقال کے وقت غلام رسول کی عمر دس گیارہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

اس کی پرائمری تعلیم ختم ہوئی تو گھر میں سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اب اسے کس اسکول میں داخل کروایا جائے۔ کھانبرا میں کوئی سیکنڈری اسکول نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے جالندھر جانا پڑتا۔ ایک مرتبہ پھر فاطمہ بی بی کے سامنے سوال آیا کہ غلام رسول کو خود سے جدا کیا جائے یا نہیں۔ جالندھر بھیجنے کا مطلب یہ تھا کہ اسے بورڈنگ میں رہنا پڑتا اور چھٹیوں میں گھر آتا۔ فاطمہ بی بی یہ دوری برداشت نہیں کرسکتی تھیں لیکن شوہر کی وصیت کا خیال تھا۔ انہوں نے دل پر پتھر رکھ لیا۔

اسے مشن ہائی اسکول جالندھر میں داخل کروادیا گیا۔ اسے اب اسکول کے بورڈنگ ہاؤس میں قیام کرنا تھا۔

وہ پھول پور اور کھانبرا جیسے نواحی علاقوں سے ہوکر آیا تھا۔ اس کے مقابلے میں جالندھر بڑا شہر تھا۔ یہاں کی مستقل ادبی روایات تھیں۔ کئی نامور ادبی شخصیات یہاں موجود تھیں۔ روزنامے بھی نکلتے تھے۔ وہ ابھی شعور کی اس منزل میں تو نہیں تھا کہ اس ادبی فضا سے براہِ راست متاثر ہوتا۔ ابھی تو وہ اس شہر کے بڑے ہونے کے مزے لوٹ رہا تھا لیکن جب وہ نویں جماعت تک پہنچا تو ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں کے ناموں سے آشنا ہوا۔ ابوالکلام آزاد کا ''الہلال'' اس کے مطالعے میں آنے لگا۔ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار زمیندار اس کے ہاتھ لگا تو ایک نئی دنیا اس کے سامنے تھی۔ مولانا ظفر علی خاں اس وقت تک فرنگیوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کا سمبل بن چکے تھے۔ ان کی انقلاب آفریں نظمیں ''زمیندار'' میں شائع ہوتی تھیں۔ ان نظموں نے ایسا اثر دکھایا کہ غلام رسول نے بھی وادیِ سخن میں قدم رکھ دیا۔ اس کے والد اسے لوری کی جگہ غالب و اقبال کے اشعار سناتے تھے۔ اس تربیت نے اس کی طبیعت میں ذوقِ سخن پیدا کردیا تھا۔ اب جو وہ مطالعہ کرنے کے قابل ہوا تو اس ذوق نے عملی شکل اختیار کرلی۔ علامہ اقبال کی نظموں نے نوجوانوں کے قلوب و اذہان کو دینی غیرت و حمیت، قومی خدمت اور آزادی کے بے پناہ جذبے سے سرشار کردیا تھا۔ غلام رسول نے بھی اپنے لیے ''مہر'' تخلص اختیار کیا اور نظمیں لکھنے لگا۔ ان نظموں پر اقبال کے اثرات واضح دیکھے جاسکتے تھے۔

اے حسن جوہرِ دل کون و مکاں ہے تو
جسمِ جہاں میں صورتِ روح رواں ہے تو
شاداب ہے سرشک وفا سے چمن ترا
پردوں سے سازِ کن کے بنا پیرہن ترا
قائم ترے وجود سے ہے بزم سوز و ساز
پوشیدہ نظم کون و مکاں کا ہے تجھ میں راز
قائم جہاں میں زینتِ ہستی تجھی سے ہے
گل میں ہے بو شراب میں مستی تجھی سے ہے

☆☆☆

عشق ہے شیرِ خدا عشق ہے سرِ علا
عشق ہے خیبر شکن عشق ہے اقصیٰ خرام
عقل ہے بے کیف و ذوق، عشق ہمہ جذب و شوق
عقل ہے بے مقتدیٔ عشق جہاں کا امام
اس کا نتیجہ بقا اس کا نتیجہ فنا
عشق کی مستی حلال عقل کی مستی حرام
عقل ہے عرفاں سے دور منزلِ جاناں سے دور
عشق ہے یثرب خرام عشق ہے یثرب مقام

☆☆☆

شاعری کا شوق اتنا بڑھا کہ نصاب سے توجہ ہٹ گئی۔ وہ نصاب سے زیادہ ہم نصابی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا۔ نتیجہ یہی ہونا تھا کہ میٹرک میں اس کی کارکردگی خاطر خواہ نہ رہی۔ وہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔

اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ لاہور جاکر گورنمنٹ کالج یا فارمین کرسچین کالج میں داخلہ لے گا لیکن میٹرک میں نمبر اتنے کم آئے تھے کہ اسے ان کالجوں میں داخلے کی امید نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے کوشش کی لیکن ظاہر ہے کہ داخلہ نہ ہوسکا۔ اب ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لے۔ اس نے یہی کیا۔ کالج میں داخلہ لے لیا اور ہاسٹل میں قیام کیا۔

سوانحی خاکہ

نام: غلام رسول مہر
والد: چوہدری محمد علی خاں
والدہ: فاطمہ بی بی
پیدائش: موضع پھول پور، تحصیل نکودر، ضلع جالندھر
میٹرک: مشن ہائی اسکول، جالندھر
بی اے: اسلامیہ کالج، لاہور
پیشہ: صحافت
ملازمت: زمیندار، انقلاب (روزنامے)
ازواج: امیر فاطمہ، امتہ الحفیظ
سن پیدائش: 1893ء
وفات: 1971ء لاہور

مولانا کی اولادیں

عبدالسلام اسلم، امتہ السلام (پہلی بیوی سے)
بلقیس کشور، رضیہ سلطانہ، خالدہ نسیم، تیرہ پروین، ناصرہ پروین،
فاروق ارشد، جاوید سلطان، سعید اکرم، مسعود طارق، امجد سلیم (دوسری بیوی سے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

لاہور کے قیام نے اس کے ذہن پر زبردست اثرات مرتب کیے۔ اب وہ اس شہر میں تھا جہاں سے زمیندار نکلتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں اس اخبار کے ذریعے نوجوانوں کے سینوں میں بیداری کا صور پھونک رہے تھے۔ دوسری جانب مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار الہلال یہی کام کررہا تھا۔ مولانا آزاد نے ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی جس کا مقصد نوجوانوں کی دینی تربیت، سیاسی بیداری اور قوم کو انگریزی سامراج کے خلاف متحد کرنا تھا۔ غلام رسول بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اس تنظیم میں شمولیت اختیار کرلی۔ اقبال کی نظمیں سننے کے لیے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں میں شریک ہونے لگا۔ یہاں اس کی سیاسی تربیت بھی ہوئی اور شاعری کا ذوق بھی پروان چڑھتا رہا۔

اے کوزۂ سفال غریب الوطن ہے تو
سرگرم نالہ پاشی رنج و محن ہے تو
تاراج کاوش غم ہجراں ہے گھر ترا
یادِ وطن میں چاک ہوا ہے جگر ترا
اس سرزمیں میں آہ ترے غم میں روئے کون
ذرہائے اشک تار نظر میں پروئے کون
تو کربلائے یاد عزیزاں کا ہے شہید
یا مجھ سیاہ بخت کی ٹوٹی ہوئی امید

☆☆☆

ان صحبتوں اور ان جلسوں کا اثر یہ ہوا کہ انگریزوں کی نفرت دل میں جاگزیں ہوگئی۔ یہ فیصلہ کرلیا کہ دورِ طالب علمی گزرنے کے بعد وہ انگریزی حکومت کی ملازمت اختیار نہیں کرے گا بلکہ ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کی طرح صحافت کو ذریعۂ معاش بنائے گا۔ روزی کا ذریعہ بھی اور خدمتِ وطن بھی۔

ان دلچسپیوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ جب ایف اے کا رزلٹ آیا تو وہ ریاضی میں فیل ہوگیا۔ فیل ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اسی کلاس میں ایک سال اور لگانا پڑا۔ یہ نصیحت بھی ہوگئی کہ ریاضی اس کے بس کی نہیں لہٰذا جب بی اے میں آیا تو ریاضی اور تاریخ کو چھوڑ کر انگریزی، فارسی اور فلسفے کے مضامین اختیار کرلیے۔

فلسفہ ذہن کو عقلی و مادی خطوط پر سوچنے، سوالات اٹھانے اور انسان میں ہر امر کو شک کی نظروں سے دیکھنے کا رجحان پیدا کرتا ہے اور اس کا تو عالم ہی دوسرا تھا۔ اس کا مطالعہ نصابی کتب تک محدود نہ رہا۔ وہ اپنی عمر سے بڑی فلسفیانہ کتب کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ان انگریزی کتابوں نے اس کے دل میں دین کی طرف سے شک کے بیج بودیے۔ اس کی ابتدائی تربیت دینی خطوط پر ہوئی تھی۔ گھر کا ماحول بھی دینی تھا۔

برِاعظم ہندوپاک میں یہ نری کھری عقل پرستی کا زمانہ تھا اور شبلی و اکبر کی کاوشوں کے باوجود عقل کا آزاد دھارا اپنی رو میں بہتا چلا جارہا تھا۔ نظام اور نصابِ تعلیم فرنگی کے ہاتھوں میں تھا۔ اس ماحول میں سوچنے والے ذہین طلبہ تشکیک کا شکار ہورہے تھے۔ غلام رسول کی عمر بھی ایسی تھی کہ اس عمر میں نئی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں۔ غلام رسول بھی فلسفے کی رو میں بہہ گیا۔ مذہب و اخلاق اس کی زندگی سے الگ جاکر کھڑے ہوگئے۔ اب تک وہ جن چیزوں کو جزوِ ایمان سمجھ رہا تھا عقل پرستی نے ان اقدار کو کمزور بنادیا۔ اس زمانے میں نفسیات، فلسفے ہی کا حصہ تھی۔ اس کا رخ ایمان کی طرف سے پھیرنے میں کتابیں نہایت موثر ثابت ہوئیں جو نفسیات کے موضوع پر اہلِ فن کے قلم سے نکلی تھیں۔

ان تصنیفات کے سامنے ایمان و یقین کی عمارت ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ نماز کی ہمیشہ سے عادت تھی لیکن اب ایمان سے اس حد تک برگشتہ ہوا کہ نماز بھی ترک کردی۔

یہ کیفیت نہ جانے کب تک رہتی لیکن سرشت میں نورِ ایمانی تھا۔ دین کی محبت گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔

ایک دن ہاسٹل کے کمرے سے نیچے اترا۔ ہاسٹل کے صحن میں طلبہ نماز کے لیے صف آرا تھے۔ اس وقت کوئی نیک گھڑی تھی۔ کچھ دیر اس خوب صورت منظر کو دیکھتا رہا پھر اچانک ذہن میں خیال آیا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں اپنے فلسفہ زدگی کے باعث اس خوب صورت عمل سے محروم ہوگیا ہوں۔ یہ لمحہ ہدایت کا لمحہ تھا۔ اس نے فوراً وضو کیا اور جماعت میں شامل ہوگیا اور پھر یہ سلسلہ اسی طرح جاری ہوگیا جس طرح پھول پور میں آغاز ہوا تھا۔ اگر وہ اس لمحے کو نظرانداز کردیتا اور تشکیک کی جڑیں گہری ہوجاتیں تو نہ جانے کب تک وہ گمراہی کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ یہ اس کی زندگی کا ایک نہایت اہم موڑ تھا جس سے وہ اپنی سلامتیِ طبع کے ساتھ بہ آسانی گزر گیا۔

اس کا بڑا ارمان تھا کہ اسے علامہ اقبال سے ملاقات اور صحبت کا موقع ملے۔ کتنی عجیب بات ہوگی کہ وہ لاہور میں

رہے اور اقبال کے ارشادات سے محروم رہے۔ اسے معلوم تھا کہ اقبال اپنے ملاقاتیوں کو مایوس نہیں کرتے۔ جو جس وقت چاہے ان سے مل سکتا ہے خصوصاً طلبہ کے لیے ان کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ وہ ایک دن ہمت کرکے ان کے مکان پر پہنچ گیا۔ اس نے دور سے دیکھ لیا کہ اقبال لنگی پر بنیان پہنے بیٹھے ہیں۔ سامنے حقہ رکھا ہے۔ وہ فلسفے کا ایک طالب علم تھا اور فلسفی اقبال سے ملنے آیا تھا۔ اتنی دیر میں اقبال کا ملازم علی بخش نظر آیا۔

''میں علامہ اقبال سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اس وقت مجھ سے مل سکتے ہیں؟''

''کیوں نہیں مل سکتے۔ میں ان سے پوچھ کر آتا ہوں۔''

''میرا نام غلام رسول مہر ہے اور میں اسلامیہ کالج کا طالب علم ہوں۔''

''پھر تو وہ ضرور بلالیں گے۔ طالب علموں کو کبھی واپس نہیں لوٹاتے۔''

علی بخش گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آگیا۔ ''جایئے، آپ کو بلا رہے ہیں۔''

اس نے دیکھا دو آدمی علامہ کے پاس پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ کسی فلسفیانہ موضوع پر گفتگو ہورہی تھی۔ وہ فلسفے کا طالب علم تھا کچھ نہ کچھ باتیں سمجھ میں آہی رہی تھیں لیکن اسے یہ دیکھ کر مایوسی ضرور ہوئی کہ علامہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ان دو اشخاص نے اس کی طرف دیکھا ضرور لیکن کچھ بولنا انہوں نے بھی ضروری نہیں سمجھا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اٹھ کر چلا جاتا لیکن گفتگو کا موضوع تھا خدا اور کائنات۔ ہلکا پھلکا موضوع تھا اور تمام باتیں اس کی سمجھ میں آرہی تھیں۔ عام سا موضوع تھا لیکن علامہ اس میں ایسے نکتے پیدا کررہے تھے کہ غلام رسول کی عقل دنگ تھی۔

گفتگو اپنے انجام تک پہنچے بغیر ختم ہوئی اور علامہ کے مہمان اٹھ کر گئے تو علامہ نے غلام رسول کی طرف رخ کیا۔ یہ سن کر خوش ہوئے کہ وہ فلسفے کا طالب علم ہے۔ کچھ دیر فلسفے کی مبادیات پر گفتگو کرتے رہے۔ اس کے بعد غالباً غلام رسول کی ذہانت جانچنے کے بعد ارشاد ہوا کہ وہ جس وقت چاہے ان کے پاس آسکتا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ غلام رسول تو دل سے چاہتا تھا کہ اقبال کی حضوری نصیب

خراجِ عقیدت

''آہ کہ فضل و کمال کا یہ پیکر، حسن و اخلاق اور شرافت کا یہ پتلا، پرہیزگاری کا یہ مرقع، تواضع اور خاکساری کا یہ سراپا، دنیا کی نیرنگی کا تماشا دیکھ کر دنیائے رنگ و بو سے رخصت ہوگیا۔ آپ کا جسدِ خاکی دفن ہوچکا ہے مگر موت کو تو بس اتنا ہی خراج ملا۔ مورخ، محقق، ادیب، نقاد، صحافی اور جہدِ آزادی کا ثابت قدم سپاہی موت کی دسترس سے باہر ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک علم و ادب کے چشمے رواں رہیں گے۔''

(قاضی افضل حق)

''ان (مولانا مہر) کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ کوئی ایک علمی و ادبی شخصیت پُر نہیں کرسکتی۔ وہ ایک جامع شخصیت تھے۔ وہ اپنی ایک ذات میں پوری انجمن کی شان رکھتے تھے۔ مہر صاحب جیسی جامع شخصیت ہر عہد کے نصیب میں نہیں ہوتی۔''

(ابوسلمان شاہجہاں پوری)

''مولانا غلام رسول مہر کی ہمہ جہت شخصیت کا تنوع حیرت انگیز تھا۔ وہ جتنے بڑے اخبار نویس تھے اتنے ہی بڑے ادیب، اتنے ہی بڑے محقق، اتنے ہی بڑے مورخ اور اتنے ہی بڑے نقاد۔''

(احمد ندیم قاسمی)

ہوجائے۔

اس اجازت کے بعد تو یہ عالم ہوا کہ اقبال کی خلوت و جلوت کا کوئی پہلو اس کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اس نے یہ قاعدہ بنالیا تھا کہ وہاں جو باتیں ہوتیں وہ ہاسٹل آکر انہیں قلم بند کرلیتا۔ ہوتے ہوتے اس کے پاس اتنا سوانحی مواد جمع ہوگیا جو اقبال کے کسی شیدائی کے پاس نہ ہوگا۔

وہ ابھی لاہور میں طالب علمی کے دور سے گزر رہا تھا کہ ایک مرتبہ جو پھول پور گیا تو ماں کی ممتا نے جوش مارا۔ انہوں نے لڑکی پہلے ہی دیکھ رکھی تھی۔ اسے شادی کے بندھن میں باندھ دیا۔ قسمت نے ایک چال چلی تھی لیکن اس نے تقدیر بدل دی۔ سب کا خیال تھا کہ شادی کے بعد وہ پڑھائی چھوڑ دے گا لیکن اس نے سب کے خیال کو غلط ثابت کردیا۔ چھٹیاں ختم ہوئیں تو وہ لاہور چلا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پنجاب میں لاہور شہر انیسویں اور بیسویں صدی میں بہت سی ادبی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ انجمن پنجاب، بزمِ اردو، انجمن اربابِ علم، مجلسِ اردو، بزمِ ادب پنجاب، حلقہ اربابِ ذوق۔

ان باقاعدہ تشکیل شدہ ادبی انجمنوں اور حلقوں کے علاوہ بھی لاہور شہر کے بھاٹی دروازے اور اس طرح دوسرے مقامات پر شعرا اکٹھے ہوکر شعروسخن کی محفلیں برپا کرتے رہے ہیں۔

ادبی حلقوں کے علاوہ مختلف ادبی رسائل اور اخبارات بھی ادبی فضا کو پُررونق بنائے ہوئے تھے۔ ادبی رسائل میں مخزنِ شباب، ہمایوں، نیرنگِ خیال، کارواں، عالمگیر وغیرہ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ زمیندار یہیں سے نکلتا تھا۔ چائے خانے ادیبوں اور شاعروں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے۔ ہفتہ وار طرحی مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ انجمن حمایت اسلام کے جلسے دلوں کو گرماتے تھے۔

ادبی معرکے شعرا کی ذہنی تربیت کا سامان تھے۔

اس فضا میں غلام رسول مہر بھی اپنے مستقبل کے لیے نئے نئے نقشے مرتب کرتا رہا۔ ان جھمیلوں کی موجودگی میں وہ لاہور کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ پھول پور میں اب اس کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا مگر ایک وفاشعار بیوی جو اس کے نام سے منسوب ہوگئی تھی، بعد میں بچے بھی ہوئے۔ مہربان ماں وہاں تھی۔ ان سے ملنے وہ پھول پور جاتا رہا۔

مولانا تاجور، حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، پطرس بخاری وغیرہ اس ادبی ماحول کے نمائندہ نام تھے۔ وہ ان سے متاثر ہوتا رہا۔ اس نے بی اے کرلیا تو ذریعۂ معاش کی فکر دامن گیر ہوگئی۔ کسی دوست کی معرفت اسے آپریشن ڈپارٹمنٹ میں سو روپے ماہوار تنخواہ پر نوکری کی پیشکش ہوئی لیکن اپنے نظریات وخیالات اور حکومت برطانیہ کی ملازمت سے گریز ونفرت کے باعث اس نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا۔

"میں اجتماعی طور پر غلام ہوں لیکن انفرادی طور پر تو آزاد ہوں۔ انگریز کی ملازمت کے بعد انفرادی آزادی بھی جاتی رہے گی۔" یہ تھے اس کے خیالات جن کی حفاظت کے لیے اس نے سو روپے کی تنخواہ ٹھکرا دی۔

اس زمانے میں جو لوگ انگریزی ملازمت کرنا پسند نہیں کرتے تھے ان کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ صحافت کا پیشہ اختیار کرتے تھے یا کوئی مسلمان ریاست ان کا سہارا بنتی تھی۔

ریاست رام پور اور ریاست حیدرآباد دکن دو ریاستیں تھیں جو ادب وشعر کا گہوارہ بنی ہوئی تھیں اور جہاں اس وقت تک انگریزوں کی عمل داری بالکل نہیں تھی۔ حکمران داد و دہش کا نمونہ تھے۔ جو بھی ان ریاستوں سے وابستہ ہوا چین کی بنسری بجاتا رہا۔ کتنے ہی لوگوں کی مثالیں غلام رسول مہر کے سامنے تھیں۔

حیدرآباد دکن بڑی اور مالدار ریاست تھی لہٰذا بیشتر ادیب وشاعر اور دوسرے لوگ اس ریاست کا رخ کررہے تھے۔ اس نے بھی اس ریاست میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

یہ ریاست لاہور سے دور ضرور تھی لیکن مالی کشش اسے حیدرآباد لے گئی۔ یہاں اسے انسپکٹر تعلیمات کی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ بھی پُرکشش تھی اور ماحول بھی اس کے مطلب کا۔

اس نے دورِ طالب علمی ہی میں صحافت کا پیشہ اختیار کرنے کا عزم کرلیا تھا لیکن اس وقت اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں تھا کہ اپنا اخبار نکال سکتا۔ قیام حیدرآباد میں اسے معقول تنخواہ مل رہی تھی۔ اپنی جزرسی کی بدولت اتنا سرمایہ اس کے پاس جمع ہوگیا تھا کہ اخبار نکال سکتا تھا۔

جب وہ اس ریاست میں آیا تھا تو یہ سوچ کر خوش تھا کہ انگریزی کی ملازمت سے نجات ملی لیکن ریاستوں کا اپنا ایک ماحول تھا۔ یہاں نواب مطلق العنان ہوتا تھا۔ اس کے حکم اور منشا کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا۔ نواب تو نواب امراء اور درباری بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ نچلے ملازمین کو ان کی بھی غلامی کرنی ہوتی تھی۔ خوشامدیوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملتا رہتا تھا۔ آزاد طبع لوگ یہاں خوش نہیں رہ سکتے تھے۔ قدم قدم پر خودداری کا خون ہوتا تھا۔ وہ اس ماحول میں خوش نہیں تھا۔

"امراء کے درباروں سے مجھے پہلے بھی نفرت تھی۔ اب جانا، اجازت لینا، پھر کچھ سنانا یہ میری طبیعت کے مطابق نہ تھا۔"

اس دربارداری سے بچنے کے لیے اس نے بعض دوستوں کے مشورے سے "سلطنت" کے نام سے ایک اخبار جاری کرنے کا منصوبہ بنایا اور سرکار سے اجازت لینے کے لیے درخواست دے دی۔

اس نے طالب علمی کے دور میں مولانا عبدالکلام

آزادی کی تنظیم حزب اللہ میں رکنیت اختیار کی تھی۔ اس تنظیم کا مقصد قوم کی شیرازہ بندی کرنا اور اس کے اندر آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔

جب اس نے اخبار کے اجراء کے لیے درخواست دی اور اس سلسلے میں ریاستی اداروں نے چھان بین کی تو یہ انکشاف ہوا کہ درخواست گزار حزب اللہ کا رکن ہے اور اس کے سیاسی مقاصد ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے وہ اخبار نکالنا چاہتا ہے۔

کارپردازانِ ریاست نے مناسب طور پر یہ سوچا کہ اگر یہ اخبار جاری ہوا تو حزب اللہ کی ترجمانی کرے گا۔ اس اخبار میں انگریزوں کے خلاف مضامین شائع ہوں گے جس کا جواب دہ ریاست کو ہونا پڑے گا۔ اس وقت اس اخبار پر پابندی لگانی پڑے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ اسے جاری نہ ہونے دیا جائے۔

اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی سوچا گیا کہ ایسے آدمی کا ریاست میں رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ اس کے مخالفین نے بھی امراء کو بھڑکا دیا۔

یہ معمولی سی سیاسی وابستگی اس کے لیے بڑا الزام بن گئی۔ نہ اخبار کے اجراء کی اجازت ملی اور نہ ملازمت قائم رہ سکی۔ ملازمت چھوٹنے کے بعد وہ پھول پور واپس آگیا۔

☆☆☆

عبدالمجید سالک جو ان دنوں زمیندار اخبار کے ایڈیٹر تھے اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ بیدل شاہ جہاں پوری آگئے۔

"خدا کے بندے، اب تک دفتر میں بیٹھے ہو شام ہونے کو آئی گھر نہیں چلنا۔"

"بس چلتے ہیں۔ آپ دس منٹ بیٹھیں۔ کچھ کام رہ گیا ہے اسے نمٹالوں۔" عبدالمجید سالک نے کہا اور اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے سر اٹھایا۔ ایک بھرپور انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ بیدل بھی ان کے ساتھ ہی اٹھ گئے۔

گھر پہنچ کر بیدل صاحب کو مردانے میں بٹھایا اور سالک صاحب زنانے میں گئے اور چائے کا کہہ کر آگئے۔ ابھی چائے تیار نہیں ہوئی تھی کہ کسی نے سالک صاحب کو پکارا۔ یہ آواز منشی نذیر احمد کی تھی۔ یہ صاحب زمیندار کے پبلشر تھے۔ سالک صاحب اٹھ ہی رہے تھے کہ آواز پھر آئی۔

چند تصانیفِ مہر

سیرت امام ابن تیمیہ، غالب، 1857ء، سید احمد شہید، جماعت مجاہدین، آزادی کی جنگ، تاریخ سندھ، اقبالیات، مولانا ابوالکلام آزاد، ایک نادر روزگار شخصیت، رسولِ رحمت، انبیائے کرام، خطوط غالب، سرود رفتہ، نقش آزاد، تبرکات آزاد، تاریخ ارادت خاں، نوائے سروش، آزادیِ ہند کی کہانی۔

☆☆☆

چند تراجم مہر

طبقات ناصری، انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم، مطالعہ تاریخ، سکندر اعظم، پاکستانی معاشرہ اور ثقافت، تاریخ شام، تاریخ لبنان، تاریخ تہذیب، جزیہ اور اسلام، اسلام صراطِ مستقیم، اسلامی مملکت کے بنیادی اصول، سائنس اور عقلِ سلیم، وہ لوگ جنہوں نے دنیا بدل ڈالی، فکرِ سلیم کی تربیت، ذہن انسانی کا ارتقا، سائنس داں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی۔

☆☆☆

نوائے سروش سے ایک اقتباس

دیوان غالب کی شرح کا اصل مدعا یہی نہیں کہ ایک جلیل القدر شاعر کا کلام بخوبی سمجھ میں آجائے۔ غالب دراصل اردو شاعری کو جدید اسلوب پر لانے کا ذمے دار تھا۔ اسے قدیم وجدید کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ندرت افروز فکرو بیان سے اردو زبان کو ایسی پرواز دے دی جس سے اس میں حسنِ اسالیب کے علاوہ دقیق حکیمانہ، فلسفیانہ اور دوسرے نکات ومطالب بے تکلف پیش کرنے کی صلاحیت نمایاں ہوگئی۔ اس کا مطالعہ ہماری قومی زبان کے ممکنات ارتقا سے استفادے کا ایک اہم جزو ہے۔ جسے میں بہترین ذریعہ سمجھتا ہوں۔

"ذرا سیڑھیوں میں آکر میری بات سنیے۔" سالک نیچے اترے تو منشی نذیر کو پریشان صورت دیکھا۔

"منشی جی خیریت تو ہے؟"

اس کے ساتھ ہی پریشانی کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ مرزا غلام حسین انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کے ساتھ کھڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔

"مرزا غلام حسین میرے مکان پر آئے تھے۔ انہوں نے مجھے گرفتار کرلیا ہے اور آپ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔"

سالک اوپر آئے، اچکن پہنی۔ گھر والوں کو اپنی گرفتاری کی خبر سنائی۔ بیوی واویلا کرتی رہیں اور وہ نیچے اتر آئے۔ انسپکٹر نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ تانگا تیار کھڑا تھا۔ انہیں تانگے میں بٹھا کر تھانہ نولکھا لے جایا گیا۔ وہ تھانے پہنچے تھے کہ شہر میں ان کی گرفتاری کی خبر اُڑ گئی۔

بیدل شاہ جہاں پوری جو گھر میں بیٹھے رہ گئے تھے فوراً بھاگے۔ احمد شاہ بخاری، امتیاز علی تاج اور دوسرے دوستوں کو خبر دی۔ ادارے کے منیجر شفاعت اللہ خاں کو بھی خبر ہوگئی۔ وہ ان کا بستر، چند کتابیں، پان اور سگریٹ لے کر تھانے پہنچ گئے۔

تھانے کی ڈیوڑھی میں حوالات کی کوٹھری بنی ہوئی تھی۔ جب احباب رخصت ہوگئے تو ان کا بستر وہاں بچھا دیا گیا۔

صبح نو بجے انہیں حوالات سے نکالا گیا۔ ہتھکڑی لگائی اور عدالت پہنچا دیا گیا۔ مجسٹریٹ نے ساعت مقدمہ کی آئندہ تاریخ مقرر کردی اور سالک کو سینٹرل جیل بھیج دیا گیا۔ جیل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی ایک بزرگ نظر آئے۔ گندمی رنگ خشخشی سی داڑھی، چہرے سے سنگ دلی کے آثار ظاہر تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ مرزا نواب بیگ جیلر ہیں۔ انہوں نے سالک کو دیکھتے ہی عجیب ہمت افزا جملہ کہا۔

"اچھا آپ بھی آگئے۔ کمال ہے جن لوگوں کی باہر ضرورت ہے وہ اندر چلے آرہے ہیں۔"

سینٹرل جیل کے ایک کونے میں وسیع احاطہ حوالات تھا جس میں ایک بہت بڑی کھلی بارک اور عمارت تھی جس میں دونوں طرف کوٹھریوں کی قطاریں تھیں۔ انہیں بھی ایک کوٹھری میں داخل کر کے مقفل کردیا گیا۔

وہ ابھی حوالاتی تھے یعنی ان کا مقدمہ زیر ساعت تھا اس لیے ان کی خوراک کے لیے جیل میں ایک رقم جمع کروادی گئی، دونوں وقت کا کھانا مل جاتا تھا۔

ان پر الزام یہ تھا کہ ملزم نے زمیندار اخبار میں ایک ایسا مضمون لکھا جس سے ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں یعنی ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان نفرت و حقارت پیدا ہوتی ہے۔

"جرح کرو گے؟" عدالت نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"صفائی پیش کرو گے؟"

"نہیں، صرف ایک تحریری بیان دوں گا جسے تحریر کرنے کے لیے جیل میں تحریری سہولتوں کا طالب ہوں۔"

"سالک صاحب کو جیل میں لکھنے کا سامان مہیا کرو۔" مجسٹریٹ نے حکم دیا۔

انہوں نے تحریری بیان داخل کردیا۔ اس تحریر کے باوجود انہیں ایک سال قید کی سزا سنا دی گئی۔

مولانا ظفر علی خاں پہلے ہی پانچ سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے تھے۔ سالک بھی ایک سال کے لیے چلے گئے۔ مدیر کی اسامی خالی پڑی تھی۔ زمیندار کے منیجر شفاعت اللہ خاں غلام رسول مہر سے واقف تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ حیدر آباد دکن کی ملازمت چھوڑ کر آچکا ہے اور ان دنوں پھول پور میں بے کاری کے دن کاٹ رہا ہے۔ اس کے خیالات زمیندار کی پالیسی سے مطابقت رکھتے تھے اس لیے وہ اسامی کے لیے موزوں تھا۔

وہ فوراً پھول پور گئے اور غلام رسول مہر سے ملاقات کر کے زمیندار کی ایڈیٹر شپ کے لیے پیش کش کی۔ صحافت اس کا خواب تھا اور اب زمیندار کی ادارت مل رہی تھی۔ اس نے فوراً قبول کرلی۔

ایک زمانہ وہ تھا جب وہ زمیندار پڑھ پڑھ کر اپنی رگوں میں خون دوڑتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اب وہ اس کا مدیر بن رہا تھا۔ اسے یہ موقع مل رہا تھا کہ اپنے خیالات کو لفظوں کی شکل دے سکے۔

وہ بہ حیثیت مدیر زمیندار سے وابستہ ہوگیا۔

اس نے اخبار میں آتے ہی ایک مضمون طلوع صبح امید کے عنوان سے لکھا جو چار اقساط میں شائع ہوا۔

وہ اخبار سے منسلک ہونے کے چند روز بعد ضروری سامان لینے کے لیے پھول پور گیا تو والدہ اس پر برس پڑیں۔

"کیا میں نے تجھے اسی لیے پیدا کیا تھا کہ بڑا ہو کر جیل کی چکی پیستا رہے اور ہم تیرے بیوی بچوں کو پالتے رہیں۔"

"اماں، میں کچھ بھی نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں تو لاہور نوکری کرنے گیا ہوں۔ یہ جیل بیچ میں کہاں سے آگئی؟"

"اخبار میں نوکری کی ہے ناں؟"

"ہاں، ہاں بہت بڑا اخبار ہے۔"

"اس اخبار کا مالک بھی جیل میں ہے اور تجھ سے پہلے جو ایڈیٹر تھا وہ بھی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ اب تیری باری ہے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ میں بھی جیل جانے والا ہوں؟"

"یہاں سب کہہ رہے ہیں کہ اخبار کی نوکری خطرناک کام ہے۔ بس میں کہتی ہوں تو نوکری چھوڑ۔ اللہ رزق دینے والا ہے کوئی اور بندوبست ہوجائے گا۔ ہم کوئی بھوکے نہیں مر رہے ہیں۔"

"اماں، میں نے یہ نوکری پیسوں کے لیے نہیں کی ہے۔ یہ میرا شوق ہے۔"

"میں کوئی بحث کرنا نہیں چاہتی۔ میرا حکم ہے تو یہ نوکری فوراً چھوڑ دے۔"

غلام رسول ماں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی زمیندار کی ادارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ان کی والدہ کو دیگر رشتے داروں نے ڈرا دیا تھا کہ صحافت بہت خطرناک کام ہے۔ یہ مثالیں بھی دی تھیں کہ مولانا ظفر علی خاں اور سالک گرفتار ہو چکے ہیں۔ انگریزی حکومت اس اخبار کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جو بھی اس اخبار سے منسلک ہوگا اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔

اس اثنا میں زمیندار کی ضمانت ضبط ہوگئی اور اخبار کچھ عرصے کے لیے بند ہوگیا۔

جب نئی ضمانت داخل کر کے اس کا اجراء ہوا تو شفاعت اللہ خاں پھر پھول پور گئے اور اس کی والدہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"خطرے کی کوئی بات نہیں۔ غلام رسول کا اخبار سے بظاہر کوئی تعلق نہ ہوگا۔ یہ صرف مضمون لکھا کرے گا۔ مضمون پر اس کا نام بھی نہیں ہوگا جو یہ پکڑا جائے۔ انگریز حکومت اب کمزور پڑ گئی ہے۔ نئی گرفتاریاں نہیں ہو رہی ہیں۔"

غرض اپنی باتوں سے اس کی والدہ کو رام کرلیا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ غلام رسول تو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا فوراً راضی ہوگیا۔ وہ لاہور آگیا اور زمیندار کی ادارت سنبھال لی۔

اس دوران سالک کی رہائی کا وقت قریب آگیا۔ انہیں ایک سال کی قید ہوئی تھی۔ ایک سال پورا ہوگیا۔ وہ میانوالی جیل میں تھے۔ وہ میانوالی سے اپنے وطن بٹالہ گئے۔ اہل بٹالہ کو معلوم ہوگیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ دوسرے دن والد اور والدہ سے ملنے پٹھان کوٹ پہنچے۔

ان ملاقاتوں کے بعد وہ لاہور آئے اور سب سے پہلے زمیندار کے دفتر پہنچے۔ یہاں انہوں نے ایک اجنبی شخص کو بیٹھے دیکھا۔ یہ زمیندار قسم کا آدمی کھدر کا کرتہ پاجامہ اور صدری پہنے ایک کھردرا سا چارخانہ کمبل اوڑھے بینچ پر بیٹھا ہے۔ شفاعت اللہ خاں نے اس کا تعارف سالک سے کروایا۔

"یہ غلام رسول مہر بی اے ہیں۔ آپ کی اور مولانا ظفر علی خاں کی غیر موجودگی میں انہی کا دم تھا کہ زمیندار کو زندہ رکھا۔ آپ کی جگہ مدیر کے فرائض انہوں نے ہی سنبھالے۔ اب یہ اور آپ دونوں مدیر ہوں گے۔ آپ افتتاحیہ لکھیں گے اور مہر صاحب نوٹ لکھیں گے۔ ویسے آپ آزاد ہیں اپنا اپنا کام خود بانٹ لیں۔"

مہر اور سالک دونوں کی یہ پہلی ملاقات تھی لیکن چند ہی ملاقاتوں میں دونوں بے تکلف ہوگئے اور معلوم ہوگیا کہ یہ زمیندار قسم کا آدمی فارسی اور عربی سے بدرجہ اتم واقف ہے۔ فلسفہ، تاریخ اور دینیات کے مطالعے میں بے حد شغف

مولانا کی اپنی کہانی اپنی زبانی

"اخبار نویسی کے لیے لاہور آگیا تو حضرت علامہ اقبال مرحوم کی بارگاہ عالی میں باریابی کا شرف حاصل ہوا اور ان کے لطف و نوازش سے ایسی صورت پیدا ہوگئی کہ دوسرے اوقات کے علاوہ شام کو تقریباً روزانہ مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ حسنِ اتفاق سے میرا مکان ان کے نشیمن عالی سے بہت قریب تھا۔ صرف پانچ سات منٹ میں ان کے پاس پہنچ جاتا اور بعض اوقات گیارہ بجے کے قریب لوٹتا۔ کوئی ضروری حکم ہوتا تو وہ خود بھی علی بخش کو بھیج کر بلا لیتے۔ ان بابرکت صحبتوں میں جو کچھ اپنی ناچیز استعداد کے پیشِ نظر حاصل ہوا ان کے بیان کے لیے الفاظ مساعدت نہیں کرتے بس یہ سمجھ لیجیے کہ مولانا روم کے اس ارشاد کی یاد تازہ ہوجاتی کہ اہلِ حق کے پاس تھوڑا سا بھی وقت گزار لینا سو سال کی بے ریا بندگی سے بہتر ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

رکھتا ہے اور ادب و شعر میں بھی مذاق سلیم کا سرمایہ دار ہے۔

جب مہر کی قابلیت سالک پر آشکار ہوگئی تو سالک نے افتتاحیہ لکھنے کی ذمے داری مہر کے سپرد کردی۔

ایک دو سال اسی طرح گزر گئے تھے کہ ایک افواہ نے پوری ملتِ اسلامیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ افواہ یہ اڑی تھی کہ وہابیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اطہر پر گولہ باری کی ہے۔ ابن سعود کی طرف سے اس کی تردید ہوئی لیکن افواہ اڑ جائے تو اسے واپس لانا مشکل ہوتا ہے۔ آخر اس کی تصدیق کے لیے مجلس خلافت ہندوستان نے ایک وفد ترتیب دیا جو مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، مولانا سید سلیمان ندوی اور شعیب قریشی پر مشتمل تھا۔ غلام رسول مہر بھی اس وفد کے ساتھ گئے۔

اس وفد نے مدینہ منورہ جا کر نہایت احتیاط سے مسجد نبویؐ اور گنبد خضریٰ کا معائنہ کیا اور اس نامبارک خبر کی تردید کی۔ اس تمام عرصے میں جو چار مہینے پر محیط تھا غلام رسول مہر لاہور سے باہر رہے اور زمیندار کا تمام کام سالک پر آن پڑا۔

جب مہر واپس آئے تو سالک رخصت پر جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ انہوں نے ظفر علی خاں سے چھ ماہ کی رخصت طلب کی۔

''میرے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ برادرم غلام رسول مہر کی غیر حاضری میں تمام کام میں اکیلے کرتا رہا ہوں اب وہ آگئے ہیں لہٰذا مجھے چھ ماہ کی چھٹی عنایت فرمائیں۔''

مہر نے سنا کہ سالک نے رخصت کی درخواست دی ہے تو وہ پریشان ہوگئے کیونکہ اب تمام کام انہیں اکیلے کرنا پڑتا۔

''میں اکیلا کام کیسے کروں گا؟''

''تم ظفر علی خاں سے کہو وہ میری جگہ کوئی عارضی انتظام کردیں ورنہ تم بھی چھٹی پر چلے جاؤ۔''

ادھر مولانا ظفر علی خاں سالک کو کسی طرح رخصت دینے پر تیار نہیں تھے۔ ہر طرح سے منانے کی کوشش کی ناچار رخصت منظور کرنی پڑی۔

سالک صاحب ''زمیندار'' سے جان چھڑا کر گھر جا بیٹھے۔

اس وقت ملکی سیاست کا حال نہایت عجیب تھا۔ بعض مقامات پر ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے۔ حجاز کے مستقبل پر بھی مسلمانوں کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ ابن سعود وہاں بادشاہت رائج کرنا چاہتے تھے۔ مولانا محمد علی حجاز گئے اور ابن سعود کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

''حجاز میں ملوکیت اور شہنشاہیت نہیں ہونی چاہیے۔ یہ اسلام میں جائز نہیں بلکہ جمہور اہلِ اسلام کی ایک نمائندہ کمیٹی مقرر کردیجیے جو حرمین شریفین میں نظمِ امور کا کام سرانجام دے۔''

ابن سعود نے ان سے اتفاق نہیں کیا اور ٹالنے کے لیے کہہ دیا۔ ''آپ درست فرماتے ہیں ہوں گے لیکن فی الحال تو مجھے یہاں قانون و انتظام کی حکومت قائم کرنے دیجیے تاکہ یہ مقدس خطہ مسلمانوں کے لیے محفوظ بن جائے۔ اس کے بعد جو عالم اسلام کی رائے ہوگی اس پر عمل کرلیا جائے گا۔''

اس پر مولانا محمد علی بگڑ گئے اور ابن سعود سے جھگڑا کر کے کراچی آگئے۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ ابن سعود کے خلاف تحریک چلائیں گے۔

ملکی حالات ایسے ہوگئے تھے کہ ان حالات میں زمیندار کو اپنا کردار ادا کرنا تھا جبکہ زمیندار کا حال یہ تھا کہ سالک چھ مہینے کی رخصت پر تھے اور غلام رسول مہر بھی چھٹی پر چلے گئے تھے۔

سالک گھر پر بیٹھے تھے کہ مولانا ظفر علی خاں کا رقعہ ملا۔

''مہر صاحب چلے گئے ہیں۔ میں آپ کی تنخواہ دوگنی کردوں گا آپ واپس آجائیں۔'' پیشکش سنہری تھی لیکن سالک نے قبول نہیں کی اور جواب لکھ دیا۔

''میری رخصت کے چھ مہینے پورے ہوجانے دیجیے اس کے بعد میں آپ کی تجویز پر غور کروں گا۔'' مولانا ظفر علی خاں نے اپنی پیشکش کا یہ حال دیکھ کر سفارش کے لیے علامہ اقبال سے رجوع کیا۔

پندرہ بیس روز گزرے تھے کہ علامہ نے سالک اور مہر کو بطور خاص طلب کیا۔ یہ دونوں وہاں پہنچے تو پوری بات سمجھ میں آگئی کیونکہ وہاں مولانا ظفر علی خاں پہلے سے موجود تھے۔ ان کے ساتھ مولانا عبدالقادر قصوری بھی بیٹھے تھے۔ عبدالقادر قصوری نے آغاز کیا۔

''مولانا محمد علی حجاز سے واپس کراچی پہنچ گئے ہیں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابن سعود کے خلاف ہنگامہ آرائی کریں گے اور مولانا ظفر علی خاں کو مختلف مقامات پر جلسے

منعقد کرنے کے لیے جانا پڑے گا۔ آپ لوگ اپنی رخصت کو ختم کیجیے اور زمیندار میں بدستور کام شروع کردیجیے۔''

دونوں نے ایک مرتبہ پھر معذرت کی لیکن علامہ اقبال نے بھی عبدالقادر قصوری کی تائید کی اور ان دونوں سے کہا۔ ''آپ دونوں کے قلم ابن سعود کی حمایت کا حق ادا کرسکتے ہیں لہٰذا اس نازک وقت میں اپنی ضد کو چھوڑ دیں۔''

اقبال کے آگے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ دم مارتے۔ دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ ازسرِنو کام شروع کردیں گے۔

دونوں نے کام سنبھالتے ہی سلطان ابن سعود کی حمایت اور مولانا محمد علی کی مخالفانہ مہم کی مزاحمت بڑے زور شور سے کی اور اس میں مولانا محمد علی سے قلمی جنگ کا سلسلہ بھی جاری ہوگیا۔

یہ مہم تو کامیاب رہی لیکن سلطان ابن سعود کی حمایت کا مطلب تھا جذباتِ عوام کی مخالفت۔ اس سے زمیندار کی اشاعت پر برا اثر پڑا۔ اخبار مالی دشواریوں کا شکار ہوگیا۔ عملے کی تنخواہوں تک کی ادائی کے لیے پیسے نہ تھے۔ مہر اور سالک کو تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح قسطوں میں تنخواہ مل جاتی تھی لیکن باقی عملہ سخت پریشان تھا۔ آخر تنگ آکر عملے نے ہڑتال کا فیصلہ کرلیا۔ عملے کے لوگ مہر اور سالک کے پاس بھی آئے اور انہیں ہڑتال میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ ان دونوں کو تنخواہ مل رہی تھی لیکن انہوں نے اس خیال سے ہڑتال میں شریک ہونے کا فیصلہ کرلیا کہ شاید ان کے ہڑتال کردینے سے ظفر علی خاں پر دباؤ پڑے اور وہ عملے کی تنخواہوں کا بندوبست کردیں۔ الٹی میٹم دے دیا گیا۔

''اگر بیس مارچ (27ء) تک عملے کو دو دو ماہ کی تنخواہیں نہ ملیں تو اکیس مارچ سے کام ترک کردیا جائے گا۔'' مولانا ظفر علی خاں لاہور سے باہر تھے۔ انہیں تار دے کر واپس بلا لیا گیا۔

اس دن مہر گھر پر بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔ کچھ ہی دیر میں انہیں دفتر کے لیے نکلنا تھا کہ عملے کا ایک آدمی ان کے پاس پہنچا اور دفتر میں کیا ہو رہا ہے اس سے آگاہ کیا۔

''ظفر علی خاں ایک ایک کارکن کو اپنے کمرے میں طلب کر کے اس سے پوچھ رہے ہیں کہ تم سالک اور مہر کے ساتھ ہو یا زمیندار کے ساتھ۔''

''کچھ معلوم ہوا کارکن کیا کہہ رہے ہیں؟''

''سب کا ایک ہی جواب ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں بلکہ سب اکٹھے ہیں۔''

مہر اس خبر کو سن کر مبہوت رہ گئے۔ ہماری خدمات کا یہ صلہ کہ ظفر علی خاں نے مجھے اور سالک کو زمیندار کا مدِ مقابل سمجھ لیا اور یہ سمجھ لیا کہ ہم نے عملے کو زمیندار کے خلاف بھڑکایا ہے یا ہڑتال میں ہمارا ہاتھ ہے۔

''سالک صاحب کو اس کی خبر پہنچائی گئی ہے؟''

''ایک آدمی ان کے پاس بھی گیا تھا۔ وہ دفتر جانے کے لیے نکل رہے ہیں۔ انہوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ بھی دفتر پہنچیں۔''

وہ دونوں دفتر گئے اور ایک رقعہ لکھ کر مولانا ظفر علی خاں کے کمرے میں بھیج دیا۔

''اب چونکہ ہمیں زمیندار کا مخالف اور حریف سمجھ لیا گیا ہے اس لیے ہم مستعفی ہوتے ہیں اور آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر آپ ہمارے سوا دوسرے ارکانِ عملہ کو کام کرنے پر رضامند کرلیں تو ہمیں ہرگز تعرض نہ ہوگا۔ ہم صرف اپنے لیے رخصت کی اجازت چاہتے ہیں۔''

اس رقعے کے جواب میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مولانا انہیں شرفِ ملاقات بخشتے اور غلط فہمی دور کرتے۔ اس کے بجائے انہوں نے بھی ایک رقعہ لکھ کر بھیج دیا۔

''ارکانِ عملہ سے ہڑتال کے متعلق میرے جواب طلب کرنے پر آپ حضرات کا مستعفی ہوجانا دور حاضر کے عجائبات میں سے ہے۔ اگر آپ کو زمیندار سے قطع تعلق ہی کرنا تھا تو بوجہ احسن رخصت ہوتے اور زمیندار آپ کو اسی عزت سے رخصت کرتا جو آپ کے شایانِ شان ہوتی۔''

مہر نے سالک کو متوجہ کیا۔

''سالک صاحب، مولانا نے ہمیں ملاقات تک کے لائق نہ سمجھا۔ ایک رقعہ لکھ کر بھیج دیا۔ اب ہمارے یہاں رہنے کا کیا جواز ہے۔''

وہ دونوں دفتر سے نکل گئے۔ ابھی کچھ دور گئے تھے کہ ظفر علی خاں کا ملازم یٰسین بھاگتا ہوا آیا۔

''مولانا عبدالقادر قصوری، مولانا ظفر علی خاں کے کمرے میں بیٹھے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔''

مہر اتنے غصے میں تھے کہ پوری بات سنے بغیر ہی جانے سے انکار کردیا لیکن سالک نے انہیں سمجھایا۔

''مولانا عبدالقادر کا حکم ہے۔ اس کی تعمیل واجب ہے، چلو چلیں۔''

''میں تمہارے کہنے سے چلتا تو ہوں لیکن میں گونگا بن کر بیٹھا رہوں گا۔ جو کچھ کہنا ہو آپ ہی کہیے گا۔ ہماری

WWW.PAKSOCIETY.COM

جتنی بے عزتی ہوئی ہے اس کے بعد بولنے کا کوئی جواز نہیں۔"

وہ دونوں واپس ہوئے۔ کمرے میں پہنچے تو مولانا عبدالقادر قصوری اور ظفر علی خاں براجمان تھے۔ وہ دونوں یہی سمجھے ہوں گے کہ ان کا استعفیٰ واپس کر دیا جائے گا اور انہیں زمیندار نہ چھوڑنے کا کہا جائے گا لیکن معاملہ کچھ اور ہی نکلا۔ ظفر علی خاں انہیں رخصت کرنے پر تیار بیٹھے تھے۔

"اب چونکہ آپ دونوں صاحبان تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اعزاز میں ایک دعوتِ طعام دی جائے۔"

مہر تو خاموش تھے سالک ہی کو جواب دینا پڑا۔

"مولانا صاحب! جہاں تک زمیندار کی خیر خواہی کا سوال ہے ہم اللہ اور اس کے بندوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہیں۔ ہم نے انتہائی ایثار کے ساتھ اس اخبار کی خدمت کی ہے۔ یہ خدا کی قدرت ہے کہ آج ہمیں اس اخبار کا دشمن کا قرار دیا جا رہا ہے۔ باقی رہی دعوتِ طعام تو بے حد تعجب ہے کہ چند مزدور اپنی مزدوری مانگ رہے ہیں اور آپ ان کو پلاؤ کے چند لقمے کھلا کر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔"

"بہتر ہے، اگر آپ کو یہ منظور نہیں تو نہ سہی۔"

اس موقع پر عبدالقادر قصوری نے بھی معاملے کو رفع دفع کرنے کی کوشش کی۔ سالک نے انہیں بھی صاف جواب دے دیا۔

"حضرت روپے کا معاملہ تو روپے سے ہی فیصل ہوگا۔ محض باتوں سے تو کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ عملے کو تنخواہیں دلوائیے اور کام لیجیے۔ رہے ہم تو ہماری واپسی کی توقع نہ رکھیے۔"

وہ باہر نکلنے لگے تو مولانا عبدالقادر نے چپکے سے کہا۔ "دوپہر کے بعد جمعیۃ دعوت و تبلیغ کے دفتر میں مجھ سے ضرور ملنا۔"

وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا "اب کیا کرنے کا ارادہ ہے۔"

دونوں نے کچھ نہیں سوچا تھا لیکن جب مولانا عبدالقادر نے پوچھا تو دونوں کی زبان سے نکلا۔

"اخبار نکالیں گے کیونکہ اگر ہم دونوں کا معاملہ ہوتا تو کوئی بات نہیں تھی لیکن عملے کے سولہ سترہ انسانوں کی روزی کا بندوبست تو اخبار نکالے بغیر نہیں ہو سکتا۔"

"پھر ایسا کرو کوئی ہفتہ وار پرچہ نکال لو۔ دو تین کاتب، ایک آدھ کلرک اور چپراسی اس میں کھپ جائیں گے۔ باقی آدمیوں کے لیے میں خود شہر میں گھوم پھر کر روزگار تلاش کروں گا۔"

"حضور ہفتہ وار نہیں، نکلے گا تو روزانہ اخبار نکلے گا۔"

"اس کے لیے روپیا کہاں سے لاؤ گے؟"

"آپ جو بیٹھے ہیں، کہیں نہ کہیں سے روپے کا انتظام کر ہی دیں گے۔"

"نہ صاحب میرے پاس روپیا کہاں، میں تو سب کچھ اپنے لڑکوں کے حوالے کر چکا ہوں۔"

"مولانا اگر آپ بندوبست نہ کر سکے تو کوئی بات نہیں اللہ تعالیٰ اتنے مظلوم انسانوں کو بھوکوں نہیں مرنے دے گا۔"

مولانا عبدالقادر مجلس خلافت پنجاب کے صدر نہایت متقی اور پرہیز گار انسان تھے۔ نہایت مخیّر اور صاحب ایثار تھے۔ ہزار ہا روپیا کسی نمود و نمائش کے بغیر تبلیغِ اسلام اور تحریکِ خلافت پر صرف کر چکے تھے۔

سالک اور مہر دونوں اخبار نکالنے کا عندیہ دے چکے تھے لیکن سرمایہ کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ ادھر زمیندار میں ہڑتال ہو چکی تھی اور تمام عملہ یہ سن کر کہ وہ اخبار نکالیں گے سالک کے گھر جمع تھا۔

"ہم میں سے کوئی بھی شخص آپ سے الگ ہو کر زمیندار میں کام کرنے پر آمادہ نہیں۔ اب تنخواہ مل بھی جائے تو بھی ہم زمیندار میں واپس نہیں جائیں گے۔"

اب اخبار نکالنا اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔

مہر اور سالک نے آپس کے مشورے سے یہ طے کیا کہ جو چند مہربان دوست ہیں ان سے روپیا بطور قرض لیا جائے اس طرح کسی ایک شخص پر بوجھ نہیں پڑے گا۔

انہوں نے ایک اشتہار شائع کیا جس میں صرف یہ لکھا کہ زمیندار کے تمام ملازمین کام چھوڑ چکے ہیں اور سالک و مہر بھی ان سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ دوسرے اشتہار کا انتظار کیا جائے۔

صرف دو دن میں چار ہزار فراہم ہو گئے۔ یہ وصولی نہایت حوصلہ افزا تھی۔

علامہ اقبال نے ایک نظم "انقلاب اے انقلاب"

لکھی تھی۔ اس نظم سے متاثر ہو کر اخبار کا نام انقلاب تجویز ہوا۔

دوسرے دن دوسرا اشتہار شائع کیا گیا۔ یہ اجرائے انقلاب کا اشتہار تھا۔ اس اشتہار میں اطلاع دی گئی تھی کہ سالک اور مہر کی ادارت میں زمیندار کے پورے سابقہ عملے کے زیر اہتمام ایک روزنامہ 2 اپریل کو عید کے دن نکلے گا۔

دونوں نے بھاگ دوڑ کی۔ جوانی کا جوش تھا۔ کچھ کر گزرنے کا حوصلہ تھا۔ دفتر کرائے پر حاصل کیا گیا، فرنیچر خریدا گیا۔ مضامین ترتیب دیے۔ پریس اور کاغذ کا بندوبست کیا گیا۔

"انقلاب" جاری ہو گیا۔ پہلا پرچہ دس ہزار چھاپا گیا جو چند گھنٹے کے اندر لاہور کی گلی گلی اور صوبے کے ہر قصبے میں پہنچ گیا۔

یہ اخبار جہاں ایک قومی خدمت تھی وہاں ایک اچھا کاروبار بھی ثابت ہوا چنانچہ چند ہی برس میں مہر و سالک نے کرائے کے گھروں کو خیر باد کہا اور لاہور کے علاقے مسلم ٹاؤن میں اپنے گھر تعمیر کیے۔

حکومت برطانیہ نے سر جان سائمن کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا تھا جس کا نام سائمن کمیشن تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی آئندہ دستوری اصلاحات کے لیے سفارشات مرتب کی جائیں۔ کانگریس نے اس کمیشن کی مخالفت کی جبکہ مسلم لیگ اس موقع پر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ جناح لیگ اور شفیع لیگ۔ جناح لیگ نے کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا جبکہ شفیع لیگ کے صدر محمد شفیع کا موقف یہ تھا۔

"کمیشن ہندو اکثریت کے سیاسی مفادات نظر انداز نہیں کر سکتا اس لیے ان کے مقاطعہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اگر مسلمانوں نے بائیکاٹ کیا تو وہ سیاسی رعایتوں سے محروم رہ جائیں گے۔"

غلام رسول مہر بھی اس خیال سے متفق تھے اور بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے انقلاب کے اداریے میں لکھا۔

"اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی سمجھوتا طے پا جائے اور کانگریس اخلاص کے ساتھ اس بات کا عہد کرے اور مسلمانوں کو اعتماد میں لے کہ وہ انہیں کسی بھی وقت مشکل میں تنہا نہ چھوڑے گی تو سائمن کمیشن کا ان دونوں کی طرف سے مشترکہ بائیکاٹ سود مند ثابت ہو سکتا ہے مگر اندریں حالات ہندوؤں کا مسلمانوں کی طرف سے بے اعتنائی کا رویہ اس قابل نہیں کہ مسلمان ہندوؤں کی تقلید میں کمیشن کا بائیکاٹ کریں اور اپنے آئینی حقوق کے تحفظ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں۔"

انہوں نے انقلاب کے اداریے میں لکھا۔

"سمجھوتا اصل شے ہے۔ اگر یہ جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے تو ملک دنوں میں ایک مرکز پر جمع ہو سکتا ہے۔ ہم مسلمانوں کو حکومت کی طرف لے جانا نہیں چاہتے لیکن ان کے حقوق کی طرف سے غافل بھی نہیں ہو سکتے۔ ہم حکومت سے نہیں بلکہ ہندوؤں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ سمجھوتے کی اہمیت کو محسوس کریں۔ جب تک یہ نظر تغافل ہوتا رہے گا ہمارے یا کسی دوسرے شور مقاطعہ سے کمیشن کی کامیابی کا راستہ بند نہ ہو سکے گا۔"

ان دنوں مہر کے اداریوں کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ وہ بڑی خاموشی سے مسلمانوں کے ذہن بدل رہے تھے۔ جو لوگ ان کے موقف سے متفق نہیں تھے ان کے بھی چودہ طبق اس وقت روشن ہو گئے جب نہرو رپورٹ منظرِ عام پر آئی۔ اس رپورٹ نے ہندو ذہنیت کو آشکارا کر دیا۔

اس رپورٹ کا شائع ہونا تھا کہ ملک کے گوشے گوشے میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ مسلمانوں کے نزدیک اس رپورٹ کی سفارشیں ناقابلِ قبول تھیں۔ روزنامہ انقلاب اس جہاد میں پیش پیش تھا۔ مہر نے تابڑ توڑ اداریے لکھے۔ ان اداریوں نے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی کہ ان کا مستقبل ایک علیحدہ سیاسی تنظیم سے وابستہ ہے جو مسلمانوں کی ہو اور مسلمانوں کے ملی مفاد کے لیے کام کرے۔

ان اداریوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے برگشتہ کر دیا۔ مہر نے اپنے قلم سے یہ فضا ایسی قائم کر دی کہ جو لوگ پنجاب سے لکھنو جا کر نہرو رپورٹ کو قبول کر آئے تھے، ان حضرات کو واپس آتے ہی معلوم ہو گیا کہ قوم ان کے ساتھ نہیں۔ ان حضرات میں ظفر علی خاں بھی شامل تھے۔

انقلاب نے بارہا چیلنج شائع کیا کہ یہ حضرات مسلمانوں کے کسی جلسہ عام میں آ کر نہرو رپورٹ کی حمایت کریں۔ ان حضرات نے ہمت کر کے دہلی دروازے کے باہر جلسہ منعقد کیا اور مسلمانوں کے سامنے نہرو رپورٹ کی تائید کرنی چاہی، نتیجہ بہت برا ہوا۔ مسلمانوں نے ایک نہ سنی اور اسٹیج پر پتھراؤ کر دیا۔ اس پتھراؤ سے مولانا عبدالقادر

WWW.PAKSOCIETY.COM

قصوری، مولانا ظفر علی خاں اور مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری زخمی بھی ہو گئے۔

یہ مہر کے اداریوں ہی کا نتیجہ تھا کہ نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں کے قہر و غضب کا جذبہ بے حد مشتعل ہو گیا اور مسلم لیگ کے نقطہ نگاہ کی پیہم تائید ہونے لگی۔

جب قوم اس معاملے میں تقسیم ہو گئی تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک آل پارٹیز کانفرنس منعقد کی جائے۔ اس میں تمام مسلم جماعتیں ایک مرکز پر جمع ہو کر کوئی فیصلہ کریں۔ یہ کانفرنس دہلی میں منعقد ہونی تھی۔

اس قسم کی سیاسی مجالس میں اخبار کی نمائندگی مہر کے حصے میں آتی تھی۔ سالک ان محفلوں سے گریز کرتے تھے لیکن دو دن کی چھٹی پڑ رہی تھی اس لیے مہر نے سالک کو مجبور کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلیں۔

"دو دن کے لیے اخبار بند ہے اور آپ نے دہلی دیکھا بھی نہیں ہے لہٰذا اس مرتبہ آپ بھی چلیں۔ اچھا شغل رہے گا۔"

دہلی پہنچے تو سوال پیدا ہوا کہ قیام کہاں ہو۔ دو تین ہوٹل دیکھے تو وہ جچے نہیں۔ دوبارہ اسٹیشن گئے اوپر کی منزل پر کچھ صاف کمرے تھے جو دو تین روز کے لیے مل سکتے تھے۔ ان کمروں کو دیکھ کر جی خوش ہوا۔ ایک کمرے میں اپنا سامان رکھوا دیا۔ دوسرے کمروں کا جائزہ لینے نکلے تو معلوم ہوا کہ ساتھ کے کمرے میں ڈاکٹر اقبال اور ملک فیروز خان نون ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہاں جا کے بیٹھے اور گپ شپ ہوتی رہی۔

مہر کئی مرتبہ دہلی آ چکے تھے۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ سالک نے اب تک دہلی کا ایک بھی پھیرا نہیں لگایا تھا لہٰذا مہر انہیں دہلی گھمانے لے گئے۔

دوسرے دن کانفرنس منعقد ہوئی۔ جامع مسجد دہلی کے سامنے کھلے میدان میں پنڈال بنایا گیا تھا۔ اسٹیج پر سر آغا کے لیے سنہری کرسی رکھی گئی تھی۔ پشت پر اور دائیں بائیں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے نمائندے، علمائے کرام، مجالس قانون ساز کے منتخب شدہ ممبران بیٹھے تھے۔

مسلمانوں کی جس قدر نمائندگی اس کانفرنس میں تھی اتنی کسی اور اجتماع میں کبھی دکھائی نہیں دی۔ سر آغا خان آئے تو گارڈ آف آنر کی تلواروں کے سائے میں کرسی صدارت تک پہنچے۔ خطبہ صدارت دیا۔ اس کے بعد دوسرے مقررین نے مسلمانوں کے مطالبات کی قراردادیں پیش کیں۔

کامل اتفاق رائے سے قرارداد منظور ہو گئی۔ یہ قرارداد جداگانہ انتخاب سے متعلق تھی۔ اس قرارداد میں اتنی نرمی کر دی گئی تھی کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات کو ہندو قبول کر لیں تو مسلمان مخلوط انتخاب پر بھی رضامند ہو جائیں گے۔

غلام رسول مہر نے اس کانفرنس کا احوال لکھتے ہوئے اداریے میں لکھا۔ "خدا کا شکر ہے کہ کانفرنس حسب توقع کامیاب ہوئی۔ اس کے فیصلوں نے مسلمانوں کی رائے واضح کر دی۔ نہرو رپورٹ کے متعلق مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ حتمی طور پر ظاہر ہو گیا اور انقلاب نے جو کام شروع کیا تھا اسے خدائے برتر و توانا نے کامیاب نتائج سے مشرف فرمایا۔"

یہ کانفرنس کامیاب ہوئی تھی لیکن مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک دھڑے نے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی ایک نے نہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ دونوں دھڑے ایک ہو جائیں۔ مہر کو مسلم لیگ کے دو حصوں میں تقسیم ہونے کا انتہائی دکھ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ کے دونوں دھڑے پھر سے یکجا ہو جائیں تاکہ مسلمان متحد و منظم صورت میں اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کر سکیں۔

"ضروری چیز یہ ہے کہ اسمبلی میں ایک متحدہ مسلم پارٹی بنائی جائے اور ہر مسلمان ممبر اسمبلی میں شریک ہو۔ مسلمانوں کا متحدہ مطالبہ سب کا محور ہو اور سب اس کے لیے متحدہ کوشش فرمائیں۔"

مہر اور سالک نے طے کیا کہ دونوں لیگیوں کے سیکریٹریوں کو آپس میں ملا کر گلے شکوے دور کروا دیے جائیں۔ مہر نے اس سلسلے میں بڑی تگ و دو کی۔ آخر جناح لیگ کے سیکریٹری سیف الدین کچلو اور شفیع لیگ کے سیکریٹری علامہ اقبال کے درمیان ملاقات ہوئی۔ پہلے تو طعن و تشنیع اور طنز و استہزا کی باتیں ہوتی رہیں اس کے بعد قرار پایا کہ دونوں مسلم لیگیوں کی کونسلوں کے اجلاس ایک ہی تاریخ پر دہلی میں منعقد ہوں اور پھر ایک مشترک اجلاس کر کے دونوں لیگیوں کو ایک دوسرے میں مدغم کر دیا جائے چنانچہ کچھ مدت کے بعد یہ ادغام عمل میں آ گیا۔

جب مسلم لیگ متحد ہو گئی تو انقلاب نے اس اتحاد کو قابل تحسین اقدام قرار دیا۔ مہر نے اس موقع پر "دونوں مسلم لیگیں متحد ہو گئیں" کے عنوان سے اداریہ رقم کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

قائد اعظم نے غیر ممالک میں لیگ کے موقف کی نشر واشاعت کے لیے ایک فارن سب کمیٹی نامزد کی جس کے صدر سیٹھ عبداللہ ہارون تھے۔ اس کمیٹی کی فرمائش پر مہر نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور لیگ کے موقف پر ایک کتابچہ لکھا جس کا عربی ترجمہ عرب ممالک میں تقسیم کیا گیا۔

☆☆☆

1857ء کے بعد مسلم معاشرے کے سامنے دو بڑے مسائل تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے مرعوب کیا تھا لیکن طاقت کا اصول روبہ عمل ہوا۔ فاتح کے اثرات معاشرت پر ضرور پڑتے ہیں۔ اس غلبے نے مسلم معاشرت کی مذہبی ساخت کو بھی متاثر کیا تھا۔ دین اور وطن سے محبت رکھنے والے ہر حساس دل کو اس تبدیلی کا احساس تھا۔ اس کے خلاف شدید ردِعمل ہو رہا تھا۔ غلام رسول مہر نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی تھی لہٰذا سیاست اور مذہب کا انہوں نے خاص طور پر مطالعہ کیا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے دورِ طالب علمی ہی میں انہیں حزب اللہ میں شمولیت پر ابھارا تھا۔ تحریکِ خلافت میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ اس کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما تھا۔ وہ جب حیدرآباد کی ملازمت ترک کر کے پنجاب آ گئے تھے اور یہ زمانہ کانگریس اور خلافت کی تحریکوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ انہوں نے بھی خلافت کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور جالندھر خلافت کمیٹی کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ زمیندار سے وابستگی کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما رہا تھا۔ یہ اسے ایک ایسے پلیٹ فارم کی حیثیت سے استعمال کر رہے تھے جس سے وابستہ رہ کر دین و ملت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔

اس کے بعد حالات ایسے ہوتے چلے گئے کہ انہیں عملی سیاست میں آنا پڑا کیونکہ سیاسی برتری ہی میں دین کی حفاظت مضمر تھی۔ دین اور سیاست کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ کام انہوں نے اپنے اداریوں سے لیا۔ وہ تاریخ کا گہرا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ عصرِ رواں کے مسائل سے بھی بخوبی واقف تھے۔ ان کے ذوقِ انتقاد اور محققانہ ذہن نے انہیں یہ صلاحیت عطا کر رکھی تھی کہ وہ ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر روحِ عصر کا جائزہ لیں۔

مولانا مہر کے سیاسی شعور کی آبیاری میں علامہ اقبال کی فکر و نظر کا ایک اہم کردار ہے۔ جب اقبال نے الٰہ آباد کے مقام پر خطبہ دیا تو مسلمانوں پر ان کی منزل واضح ہو گئی۔ مہر نے اس خطبے کا اردو ترجمہ کیا اور اس ترجمے کو انقلاب میں شائع کیا۔ اس کے علاوہ بھی اس کے حق میں کئی اداریے اور مضامین تحریر کیے۔

"اگر مسلمانوں کے تمام مطالبات منظور کر لیے جائیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ میں وہ اپنی اکثریت کی وجہ سے غالب رہیں گے اور ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت ان کے اس غلبہ و اقتدار میں دست اندازی نہ کر سکے گی۔ علامہ اقبال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔ انہوں نے صرف اتنا اضافہ فرمایا ہے کہ یہ اسلامی صوبے متحد ہو کر ایک اسلامی سلطنت کے قیام کا نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور اکثریت کی صورت میں یہ نصب العین کسی طرح بھی غیر حق بہ جانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔"

خطبہ الٰہ آباد کے بعد مہر کی تحریریں دو خطوط کا احاطہ کرنے لگیں۔ ایک طرف علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کی جانب اور دوسری طرف عبوری دور میں قائد اعظم کے چودہ نکات کی جانب۔

☆☆☆

پہلی بیوی کے انتقال کے بعد پچھلے چھ سالوں سے وہ مجرد زندگی گزار رہے تھے۔ پہلی بیوی سے انہیں بے حد محبت تھی یہاں تک کہ ان کو پا لینے کی تڑپ انہیں ہر لمحہ موت کو گلے لگانے کو تیار رکھتی تھی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے مرنے کو بھی تیار تھے۔

"اگر مشیتِ ایزدی سے آج بھی بلاوا آ جائے تو اس کے خیر مقدم میں کوئی تامل نہ ہوگا۔"

اسی محبت کا تقاضا تھا کہ انہوں نے عرصے تک شادی نہیں کی۔ اس بیوی سے دو بچے بھی تھے۔ ان کی دیکھ بھال کا خیال تھا پھر وہ لکھنے پڑھنے والے آدمی تھے۔ گھر میں ایک ایسی سگھڑ عورت کی ضرورت تھی جو گھر کو سنبھال کر انہیں لکھنے کی فرصت دے۔ انہیں 1929ء میں دوسری شادی کرنی پڑی۔

شادی کے بعد وہ حج کو چلے گئے۔ یہ ان کا سرزمینِ حجاز کی جانب دوسرا سفر تھا۔ پہلی مرتبہ وفد خلافت کے ساتھ گئے تھے۔

ایک ماہ بعد واپس آئے تو حجاز کا سفرنامہ لکھا جو انقلاب میں قسط وار شائع ہوا اور بقول عبدالمجید سالک اپنی تفصیلات میں اس قدر مکمل تھا کہ میرے نزدیک محض اس کو

پڑھ کر انسان حاجی ہو جاتا ہے۔

اب تک کرائے کے مکان میں رہتے چلے آئے تھے۔ شادی کے بعد سوچا کہ جب لاہور میں ہی رہنا ہے تو اپنا مکان ہونا چاہیے۔ مہر اور سالک تو گویا ایک قالب دو جان تھے۔ مہر نے ان سے تذکرہ کیا۔

"یار تم نے سوچا تو ٹھیک ہی ہے۔ اب ہمیں لاہور میں ہی رہنا ہے۔ کب تک کرائے کے مکانوں میں ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ کوئی قطعہ زمین دیکھ کر اپنی اپنی کوٹھیاں بنواتے ہیں۔"

دونوں نے ایک ساتھ مل کر زمین کی تلاش شروع کر دی۔ کبھی دن دن پورہ کی جانب جا نکلے۔ کبھی مصری شاہ کا چکر لگایا۔ کبھی راوی روڈ دیکھا لیکن کوئی پسند نہ آیا۔

دونوں ادیب، دونوں محقق، دونوں شاعر، زمین کی تلاش اور وہ بھی اپنی جیب کے مطابق۔ ایک مشکل مرحلہ تھا جسے وہ دونوں طے کر رہے تھے۔

جب اس راستے پر چل پڑے تو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑنے لگا جو اس کاروبار سے تعلق رکھتے تھے۔ ان دنوں زمینوں کے کاروبار میں آج کل کی طرح دھوکے بازی کا تصور نہیں تھا بس مسئلہ زمین کے پسند آنے نہ آنے کا تھا۔ اس تگ و دو میں ایک روز ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ (احمدیہ بلڈنگ) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اچھرہ سے ایک میل آگے نہر کے کنارے بہت سی زمیں خرید رکھی تھی جس میں وہ مسلمانوں کی ایک بستی بسانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب سنا کہ مہر اور سالک مکان بنوانے کے لیے زمین خریدنے کے خواہاں ہیں تو انہوں نے اپنی خریدی ہوئی زمین کے لیے ترغیب دی جس کا نام انہوں نے مسلم ٹاؤن رکھا تھا۔

"مہر صاحب، یہ تو ٹھیک ہے کہ ہر آدمی کسی آباد بستی میں رہنا چاہتا ہے۔ آپ بھی یہی چاہتے ہوں گے کہ شہر میں رہیں لیکن شہر کی زمین آپ کی قوتِ خرید سے زیادہ ہوگی۔ آپ تو شہر سے دور زمین خریدیں۔ زمین نہایت سستی مل جائے گی۔ تھوڑے دن میں آبادی ہو جائے گی تو وہ شہر بن جائے گا۔ تھوڑے دن ویرانے میں رہیے۔ نہ رہیے زمین لے کر ڈال دیجیے جب آباد ہو جائے تو اس وقت مکان بنوا لیجیے۔"

بات اس وقت بھی آئی گئی ہوگئی۔ انہی دنوں ان کی ملاقات شیخ محمد نصیر ہمایوں، مالک قومی کتب خانہ سے ہوئی۔ شیخ صاحب کچھ مدت تک مسلم ٹاؤن کے لیے قطعات فروخت کرنے میں ڈاکٹر صاحب کی مدد کرتے رہے تھے۔ اس بستی کے بارے میں ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ خرید لو۔

"قطعات میرے ہاتھوں فروخت ہوئے ہیں۔ بہت اچھے اور پڑھے لکھے لوگوں نے قطعات خریدے ہیں۔ جب بھی آبادی ہوگی تو بہت اچھی آبادی ہوگی۔ انتظار مت کیجیے۔ ابھی تعمیر بھی کروا لیجیے کیونکہ آج کل سامانِ عمارت بھی کچھ زیادہ گراں نہیں۔ آس پاس اینٹوں کے بھٹے وغیرہ بھی ہیں۔"

خوب اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد دونوں نے پانچ پانچ کنال زمین خرید لی۔

ابھی اس زمین کی رجسٹری نہیں ہوئی تھی کہ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ علامہ کو مہر کی سیاسی بصیرت اور گرانقدر معلومات پر اتنا بھروسا تھا کہ اس سفر میں علامہ انہیں بھی پرائیوٹ طور پر اپنے ساتھ انگلستان لے گئے۔ مقصد یہی تھا کہ وہ مسلمان مندوبین کی سہولت کے لیے ضروری معلومات فراہم کریں گے۔

ان کے جانے کے بعد سالک نے انقلاب کے اداریے میں لکھا۔

"مولانا غلام رسول مہر کو سیاساتِ ہند اور مسائلِ اسلامی بالخصوص شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی زندگی اور ان کے مستقبل کے متعلق جو بصیرت حاصل ہے وہ قارئین انقلاب سے پوشیدہ نہیں۔ اس کے علاوہ اس سفر میں اعداد و شمار اور حقائق و واقعات کا جو دفتر اپنے ساتھ لے گئے ہیں وہ گول میز کانفرنس کے مسلمان مندوبین کے لیے بے حد گراں بہا اور مفید ثابت ہوگا اور انشاءاللہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں پیش آئے گا جس کے متعلق مہر صاحب بہترین اور صحیح ترین معلومات مسلمان مندوبین کی خدمت میں پیش نہ کر سکیں۔ اس لیے یقین رکھنا چاہیے کہ لندن میں مہر صاحب کی موجودگی اسلامی مطالبات کی تقویت کا باعث ہوگی اور مسلمانوں کے پرائیوٹ مشیروں میں ان کی معلومات بے حد کارآمد ثابت ہوں گی۔"

یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ صوبہ جاتی آئین کے متعلق بحثیں اور فیصلے ہو چکے تھے اور کانفرنس آئین کے وفاقی حصے پر بحث کرنے کے لیے آمادہ ہو رہی تھی۔ مسلمان نمائندوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کہا جب تک وفاقی اداروں میں مسلمانوں کا حصہ مقرر نہ ہو جائے ہم وفاق کی بحث میں حصہ نہ لیں گے لیکن چونکہ بعض نمائندے مثلاً چوہدری ظفر اللہ خاں وغیرہ وفاق کی بحث کے لیے تیار ہو گئے اس لیے ڈاکٹر اقبال اور مولانا شفیع داؤدی نے کانفرنس سے استعفیٰ دے دیا اور انگلستان سے روانہ ہو گئے۔

واپس آتے ہوئے انہوں نے اقبال کے ہمراہ اٹلی اور فلسطین کی سیر بھی کی۔ سرزمین انبیاء کی سیر کرتے ہوئے واپس لاہور آ گئے۔ مہر نے واپس آ کر انقلاب میں اس سفر کے نہایت مفصل حالات شائع کیے۔ بعد میں یہ سفرنامہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔

وہ جب دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے تھے مسلم ٹاؤن میں زمین خریدی جا چکی تھی۔ 1932ء کے آخر تک مہر اور سالک دونوں کی کوٹھیاں تیار ہو گئیں۔ دونوں اپنے اپنے کرائے کے مکانوں سے یہاں منتقل ہو گئے۔

اس انتقال مکانی میں دقتیں تو ضرور تھیں لیکن یہاں سکون بہت میسر آیا۔ جب ایک دفعہ گھر پہنچ جاتے تھے تو کامل خلوت اور تنہائی میسر آ جاتی تھی۔ ملاقاتی اتنی دور آتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ اس تنہائی میں لکھنے پڑھنے کا موقع خوب مل جاتا تھا۔

مسلم ٹاؤن میں رہتے ہوئے انہیں غالب کی وہ غزل اکثر یاد آ جاتی تھی جس کا مصرع تھا "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔"

یہ مصرع بار بار یاد آیا تو یہ خیال آیا کہ غالب کی سوانح مرتب کی جائے۔ اس سے پہلے وہ سیرت امام ابن تیمیہ تصنیف کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی دوسری کتاب "غالب" کے لیے مواد اکٹھا کیا اور اس ویرانے میں پھول کھلانے بیٹھ گئے۔ غالب کا نام ونسب، خاندانی حالات، دہلی میں سکونت، شادی، سفر کلکتہ، پنشن، اسیری، عوارض و وفات اور اخلاق و عادات تک کی تمام تفصیلات نہایت شرح و بسط کے ساتھ رقم کیں۔

اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ مولانا نے خطوط غالب کو ماخذات کے طور پر استعمال کیا جس سے غالب کی زندگی کی حقیقی جھلکیاں نمایاں ہو گئیں۔

ایک اور علمی کارنامہ ان کی تصنیف "1857ء" ہے۔ اس کتاب میں جنگِ آزادی کے حالات و واقعات کو انہوں نے نہایت صراحت سے بیان کیا۔

مصنف نے کتاب کے پہلے حصے میں جنگِ آزادی کا پس منظر بیان کرنے کے بعد دوسرے حصے میں میرٹھ میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بیان کی ہے۔ تیسرے سے ساتویں حصے تک ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جنگِ آزادی کے دوران پیش آنے والے واقعات کی تفصیل پیش کی ہے۔ آخری حصے میں جنگ آزادی کے الم ناک نتائج بیان کرتے ہوئے انگریزوں کی بربریت کو بے نقاب کیا ہے۔

اسی تصنیف کا ایک حصہ "1857ء کے مجاہد" کے عنوان سے لکھا۔ یہ ان صاحبان کے حالاتِ زندگی ہیں جن بہادر جانبازوں نے جنگِ آزادی کو کامیاب بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور وطن کو آزاد کروانے میں جان کی بازی لگائی۔

"آزادی کی جنگ" غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کی مشترکہ تصنیف ہے۔ اس کتاب میں جنگ عظیم اول کے بعد یورپ کے حالات اور جنگ عظیم دوم کے اسباب تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب 1940ء میں شائع ہوئی۔

وہ ان تصنیفات میں گھرے ہوئے تھے کہ دفعتاً سیرِ افغانستان کی سوجھی۔ پاسپورٹ تیار ہی رہتا تھا۔ کئی سفر اس سے پہلے بھی کر چکے تھے۔ رختِ سفر باندھا اور روانہ ہو گئے۔

وہ دیگر اسلامی ممالک کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ حکام افغانستان نے ان کی خوب آؤ بھگت کی۔ کابل میں سردار ہاشم خاں اور دوسرے اکابر سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ نے بھی شرف باریابی عطا فرمایا۔ مہر صاحب ایک قصیدہ بزبان فارسی لکھ کر لے گئے تھے اس پر بھی اظہارِ خوشنودی فرمایا۔

اس سفر میں انہوں نے سید احمد شہید کے ایک قریبی ساتھی مولانا محمد بشیر شہید سے عہد کیا تھا کہ وہ سید احمد شہید کے حالاتِ زندگی اور کارناموں پر ایک مفصل کتاب تحریر کریں گے لہٰذا واپس آتے ہی انہوں نے اس عظیم شہید کے حالاتِ زندگی جمع کرنے شروع کر دیے۔ ان دنوں ان کا عجیب حال تھا۔ لگتا تھا دنیا کا ہر موضوع ختم ہو گیا ہے۔ سید احمد شہید کے بارے میں مواد اکٹھا کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہے لیکن انسان کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ کام پر کام نکل ہی آتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کام پھر نکل آیا۔

سر عبداللہ ہارون کے ایما پر سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا تاکہ سندھ کی صوبائی اسمبلی میں کانگریس کے مقابلے میں مسلم لیگ کی پارلیمانی جماعت کے قیام کے حوالے سے مشاورت کی جا سکے۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے بہت سے سرکردہ مسلمان رہنما کراچی پہنچے۔ سر عبداللہ ہارون نے مہر کو بھی دعوت دی۔ وہ کراچی گئے اور سر عبداللہ ہارون کے مکان پر قیام کیا۔ پیر علی محمد راشدی ملنے آئے تو سر عبداللہ ہارون نے غلام رسول مہر کا تعارف ان الفاظ میں کروایا۔

"یہ ہیں مولانا غلام رسول مہر ایڈیٹر انقلاب، لاہور۔ انہوں نے اور ان کے ساتھ مولانا عبدالمجید سالک نے مل کر موجودہ دور کے مسلمانوں کی تاریخ بنائی ہے۔ ان کو میں نے یہاں آنے کی تکلیف اس مقصد سے دی ہے کہ ہماری کانفرنس کے پیشِ نظر ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان سے مشورہ کیا جائے۔"

کانفرنس ختم ہونے کے بعد سر عبداللہ ہارون نے باہمی مشاورت کے لیے مہر صاحب کو اپنے پاس روک لیا اور یہ طے ہوا کہ اب تک ایک الگ مسلم ریاست کے قیام کے حق میں جتنی تجاویز آ چکی ہیں ان سب کا تفصیلی جائزہ لیا جائے اور ان تجاویز کی روشنی میں نظریۂ پاکستان کے جواز اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ وطن کے قیام کے حق میں ایسی جامع اسکیم مرتب کی جائے جس کی افادیت اور معقولیت سے کسی کو انکار نہ ہو۔

یہ کام تفصیل طلب تھا لہٰذا مہر کو تقریباً سات ماہ تک کراچی میں رکنا پڑا۔ اس دوران انہوں نے مسلمان زعما سے ملاقاتیں بھی کیں اور ہندوستان کی تاریخ، سیاست اور جغرافیہ کے بارے میں شدید مطالعہ بھی کیا۔ ان تمام تقاریر کا جائزہ لیا جو مسلمان زعما نے مختلف اوقات میں کی تھیں۔ چوہدری رحمت علی کے شائع کردہ پمفلٹ بھی ان کے مطالعے میں آئے۔ سرکاری ذرائع سے بھی مواد اکٹھا کیا۔ آخر کار سخت محنت کے بعد فروری 1940ء میں آزادی کی یہ اسکیم جسے پاکستان اسکیم کا نام دیا گیا تیار کر لی۔

پاکستان اسکیم کی تیاری کے تقریباً ایک ماہ بعد لاہور میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا۔ ہندوستان بھر کے نمائندہ مسلمان جمع ہوئے۔ اجلاس نہایت کامیابی سے منعقد ہوا اور وہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی جسے قرارداد پاکستان کہتے ہیں۔ اس قرارداد میں لفظ پاکستان تو استعمال نہیں ہوا البتہ مطالبے کی شکل وہی رکھی گئی جس سے پاکستان کے سوا کچھ اور مقصود نہ تھا۔

قرارداد لاہور کا مسودہ تقریباً علامہ مہر کی پاکستان اسکیم کو سامنے رکھ کر تیار کیا گیا تھا۔

قرارداد کی منظوری کے بعد ان کا سفر ختم نہیں ہو گیا تھا۔ اب ضروری تھا کہ اس قرارداد سے لوگوں کے کان آشنا کیے جائیں اور اس کے جواز کو دلائل سے ثابت کیا جائے لہٰذا انہوں نے اس قرارداد کی حمایت میں کئی اداریے تحریر کیے۔ انہیں کامل یقین تھا کہ پاکستان کے نام سے ایک الگ وطن ہی مسلمانوں کی آزادی کی ضمانت ہے۔

"پاکستان ہماری آزادی کا دوسرا نام ہے۔ ہم آزادی کے لیے وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو ہمارے امکان میں ہے اور کسی ایسے دستورِ آزادی کو ایک لمحے کے لیے بھی قبول نہیں کریں گے جس کی بنیاد دو اساسِ پاکستان نہ ہو۔"

ان ہنگامہ خیزیوں سے نمٹنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر سید احمد شہید کی سوانح عمری اور ان کی تحریک کی مفصل تاریخ لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ کام کچھ مدت سے شروع کر رکھا تھا۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ضلع ہزارہ اور وادیٔ کاغان کا سفر کیا اور سید صاحب کے آخری میدانِ جہاد بالا کوٹ کی زیارت کی۔ واپس آئے تو اس علاقے اور آخری جہاد کے متعلق نہایت بیش بہا معلومات ساتھ لائے۔

1946ء کا سال پنجاب کی سیاست میں نہایت مصروف سال تھا۔ آزادی کی منزل قریب آنے لگی تھی۔ حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اس سال ہولناک فسادات پھوٹ پڑے۔ کلکتہ میں فساد ہوا پھر بمبئی، الہ آباد، نواکھلی اور صوبہ بہار میں خون ریزیاں ہوئیں۔

حالات اس مقام پر پہنچ گئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ زندگی بسر کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا اور پاکستان کا قیام اس برصغیر کی سب سے بڑی شرط قرار پایا۔

جون اور جولائی 1947ء کے مہینے "انقلاب" کے لیے بہت سخت تھے۔ پچھلے کئی مہینے فسادات میں گزرے تھے لہٰذا وصولیاں رک گئیں۔ کچھ حالات کی وجہ سے وقفے وقفے سے انقلاب اور دوسرے اخبار اپنی اشاعت ملتوی رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس پر غضب یہ ہوا کہ اس علاقے میں کرفیو نافذ ہو گیا جس میں انقلاب کا دفتر اور مطبع تھا۔

انقلاب بند ہونے کے قریب پہنچ گیا بلکہ بند ہو گیا۔ علامہ مہر مسلم ٹاؤن میں بند بیٹھے تھے کیونکہ لاہور شہر میں آگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

لگی ہوئی تھی۔ ہندو امرتسر کی طرف بھاگ رہے تھے اور مسلمان آبادی امرتسر سے لاہور کی طرف آرہی تھی۔

پاکستان قائم ہوگیا۔

ان کی روزی کا ذریعہ ان کا عشق یعنی ''انقلاب'' قیامِ پاکستان کے بعد لڑکھڑاتا ہوا چلتا رہا لیکن اب دورِ سیاست کے تقاضے کچھ اور تھے۔ انقلاب ان کا ساتھ نہ دے سکا اور 1949ء میں بند ہوگیا۔

اردگرد کی فضا کچھ ایسی تھی کہ حساس دل بجھنے لگے تھے۔ انہوں نے بھی صحافت کو خیر باد کہا اور اپنے آپ کو تصنیف وتالیف کے لیے وقف کردیا۔

انہیں وہ عہد یاد تھا جو وہ افغانستان میں کر کے آئے تھے کہ سید احمد شہید کی مفصل تاریخ لکھیں گے۔ اسی سلسلے میں وہ قیام پاکستان سے قبل بالاکوٹ بھی گئے تھے۔ اس سلسلے کے کئی مضامین مختلف رسالوں میں شائع بھی کروا چکے تھے۔ اب وقت تھا کہ اس عہد کو پورا کیا جائے۔ اس عہد کو نبھانے میں پورے بیس برس صرف ہوگئے اور بالآخر ایک مفصل کتاب وجود میں آگئی۔ پہلا حصہ سید احمد شہید اور ان کے خاندانی کوائف پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے کا آغاز ہزارے کے محاذِ جنگ سے ہوکر اختتامِ ازواج و اولاد اور اخلاق وعادات پر ہوتا ہے۔

کتاب بھرپور تھی لیکن مہر کی پیاس نہیں بجھی۔ بہت سے بڑے نام وہ بھی تھے جنہوں نے سید صاحب کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا۔ سید احمد شہید پر مواد جمع کرتے ہوئے ان ناموں کی تفصیلات بھی ان کے سامنے آئی تھیں۔ ان مجاہدین کے حالات بیان کرنے کے لیے انہوں نے ایک کتاب ''جماعت مجاہدین'' لکھی۔

''جماعت مجاہدین'' سید احمد شہید کی جماعت کے ان مجاہدوں کی سرگزشت پر مشتمل ہے جنہوں نے راہِ آزادی میں سید صاحب کے ساتھ جامِ شہادت نوش کیا یا پھر بعدازاں اپنی ساری زندگی دعوت وتبلیغ کے مشاغل میں صرف کردی۔

''سرگزشت مجاہدین'' مولانا مہر کی ایک اور معرکتہ الآراء کتاب ہے۔ سید احمد شہید کے سلسلے کی یہ تیسری اور آخری کتاب تھی۔ اس پر بالاکوٹ کا سفر اپنے اختتام کو پہنچا۔

سید احمد شہید کے بارے میں انہوں نے اتنی معلومات فراہم کردی تھیں کہ کسی اور کے لیے کچھ نہیں چھوڑا۔ اس موضوع پر اب جو بھی قلم اٹھائے گا ان کی ان تین کتابوں سے باہر نہیں جاسکتا۔

جب وہ 1940ء میں کراچی آئے تھے اور سر عبداللہ ہارون کے مہمان بنے تھے اور پاکستان اسکیم کو مرتب کرنے کے لیے سات ماہ قیام کرنا پڑا تھا اسی وقت ان کے ذہن میں خیال آیا تھا کہ وہ سندھ کی تاریخ لکھیں گے۔ جو ضروری کتابیں مل سکی تھیں وہ بھی ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے یادداشتوں، کتابوں اور تصاویر کی مدد سے تاریخ سندھ کے نام سے کتاب لکھی۔ وہ غالباً سندھ کی مکمل تاریخ لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ کتاب محض کلہوڑا خاندان کے عہدِ حکومت کی تاریخی دستاویز ہے، سندھ کی مکمل تاریخ نہیں۔ وہ اس کام کو مزید آگے نہ بڑھا سکے اور دوسری مصروفیات نے ان کا دامن کھینچ لیا۔

وہ اگرچہ صحافی تھے لیکن اردو ادب ان کی نظروں سے پوشیدہ نہ تھا۔ خاص طور پر غالب شناسی ان کی زندگی کا عظیم سرمایہ تھا۔ وہ حیاتِ غالب پر مشتمل کتاب ''غالب'' تحریر کرچکے تھے۔ یہ کتاب ان کا ایک بڑا سوانحی کارنامہ تھا کیونکہ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ غالب کی حیات خود غالب کی تحریروں کی مدد سے قلم بند کی گئی تھی۔ اس کتاب کو تحریر کرتے وقت خطوط غالب کا ایک بڑا ذخیرہ مولانا کی نظر سے گزرا تھا۔ ان بکھرے ہوئے خطوط کو دیکھ کر انہیں خیال آیا کہ ان کو یکجا کیا جائے اور خطوط غالب کا عنوان دے کر ان خطوط کو جمع کردیا۔

یہ کوئی نیا کارنامہ نہیں تھا۔ ان سے پہلے مکاتیب غالب کے کئی مجموعے شائع ہوچکے تھے۔ مہر کا کارنامہ اسی وقت قابلِ قبول ہوسکتا تھا جب وہ اس میں کوئی انفرادیت پیدا کرتے۔

غلام رسول مہر کا تعلق اس اسکول سے تھا جس کے نمائندہ حالی، شبلی اور ابوالکلام آزاد تھے لیکن وہ جدت کے بھی قائل تھے جو اُن کی انفرادیت کا سبب بنتی تھی۔ انہوں نے خطوط غالب کو جمع کرتے ہوئے یہ جدت پیدا کی کہ یہ خطوط جن لوگوں کے نام لکھے گئے تھے ان کا اجمالاً یا تفصیلاً تعارف پیش کیا۔ تمام خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا علاوہ ازیں حسبِ ضرورت حواشی کا اہتمام بھی کیا۔ اس کے علاوہ مقدمہ بھی تحریر کیا جس میں غالب کے اسلوبِ تحریر پر گراں قدر تبصرہ کیا گیا تھا۔

غالبیات کے حوالے سے مولانا مہر کے اہم کارناموں میں دیوانِ غالب کی تدوین بھی ہے۔ یہ بھی کوئی

پہلی مرتبہ نہیں ہورہا تھا۔ دیوان غالب کئی لوگوں نے مرتب کیا اور کئی نسخے منظرِ عام پر آئے۔ مولانا نے اس میں جدت پیدا کرنے کے لیے کلام غالب کی صحیح تاریخیں مستند ماخذ کی مدد سے رقم کردیں اور حواشی میں تصریحات بھی درج کیں۔ اشعار کے معانی ومطالب کو واضح کرنے کے لیے ضرورت کے مطابق اشعار کے اندر رموز اوقاف کا استعمال کیا اور تلفظ کی اغلاط سے بچنے کے لیے اشعار پر اعراب لگائے۔

اس دیوان کو مرتب کرتے وقت انہیں یہ بھی احساس ہوا کہ غالب کے اشعار کی درست تشریح ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ شرح غالب کے عنوان سے جو کتابیں شائع ہوچکی تھیں مہر ان سے بھی مطمئن نہیں تھے لہٰذا انہوں نے کلامِ غالب کی شرح رقم کی اور نوائے سروش نام دیا۔

اس کا مقدمہ تحریر کرتے وقت انہوں نے نوائے سروش کی تحریر کا جواز یوں پیش کیا۔

''میں نے ذہن میں شرح کا جو پیمانہ تجویز کیا تھا وہ نہ زیادہ مختصر تھا اور نہ زیادہ مفصل۔ آرزو یہ تھی کہ مرزا کے شعر ایسے انداز میں پیش کیے جائیں جس سے ان کی معنوی اہمیت وعظمت بخوبی واضح ہوجائے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ ہر شعر کی شرح خواہش واطمینان کے مطابق کرسکا ہوں لیکن اسے ملاحظہ فرمالینے کے بعد یہ یقین ضرور ہوجائے گا کہ میں نے شارحین کی قابلِ قدر نکتہ نوازیوں سے استفادے کے ساتھ جابجا فکر ونظر کے نئے پہلو بھی پیش کیے ہیں اور کوشش برابر یہ رہی کہ مرزا کی شعر گوئی میں بیان و تخیل کے جن کمالات کی جلوہ آرائیاں بہ کثرت نمایاں ہیں ان تک رسائی زیادہ سے زیادہ سہل ہوجائے۔ میں نے محض الفاظ وتراکیب ہی کی تشریح پر معاملہ نہیں چھوڑا بلکہ افکار کے مختلف پہلو بھی واضح کیے اور حتی الامکان کوئی ضروری نکتہ نظر انداز نہ کیا۔''

پاکستانی سیاست ان کے خوابوں کے برعکس چالیں چل رہی تھی۔ جو شریکِ سفر نہ تھے وہ مختار بنے بیٹھے تھے۔ ایسے میں سیاست پر لب کشائی مصلحت کے خلاف تھی۔ احباب میں سے بہت سے اٹھ چکے تھے۔ وہ وقت بھی آیا جب اپنے یارِ عزیز سالک کو مرحوم لکھنا پڑا۔

بڑھاپے کا سہارا دوسری بیوی بھی 57ء میں رخصت ہوگئی تھی۔ کوئی اور ہوتا تو کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا لیکن وہ ان لوگوں میں سے تھے جو مشکلات کو خاطر میں نہیں لاتے۔ رفتار دھیمی ضرور ہوجاتی ہے لیکن منزل تک پہنچنے کی لگن میں چلنا نہیں چھوڑتے۔ بیماریوں نے الگ گھیر رکھا تھا۔ اب تحقیق کی فرصت نہیں تھی لیکن لکھتے رہنے کا چسکا پڑا ہوا تھا وہ کیسے چھوٹتا۔

بعض شخصیات سے محبت کا حق بھی ادا کرنا تھا۔ تصنیف نہ سہی تالیف سہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے عقیدت ہمیشہ کی تھی۔ دورِ طالب علمی سے وہ ان کے عاشق تھے۔ الہلال اور البلاغ ہمیشہ مطالعے میں رہتے تھے۔ ان پرچوں میں ابوالکلام آزاد کے مقالات شائع ہوتے رہے تھے۔ مہر کے پاس وہ سب پرچے محفوظ تھے۔ ایک بڑی تعداد سیرت طیبہ کے موضوع پر تھی۔ مہر نے ان مقالات کو جمع کیا اور ترتیب دیا۔

بکھرے ہوئے یہ مقالات سیرت طیبہ کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتے تھے۔ بہت سے حصوں کے درمیان خلا پیدا ہوگیا تھا جسے پُر کرنا ضروری تھا۔ اس خلا کو مہر نے اپنے قلم سے پُر کرنے کا فیصلہ کیا۔

''مولانا آزاد کے افادات میں اپنی کوئی چیز شامل کرنا ریشم میں ٹاٹ کے پیوند کی حیثیت رکھتا ہے لیکن مجبور تھا۔ دل نہیں چاہتا تھا کہ سیرت طیبہ کا کوئی ضروری حصہ تفصیل سے نہ آئے لہٰذا بہت سے باب لکھ رہا ہوں۔''

یہ مقالات ''رسولِ رحمت'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔ البلاغ اور الہلال میں ایسے مقالات بھی ان کی نظر سے گزرے جن کا موضوع انبیائے کرام کی سیرت طیبہ تھی۔ عام اصحاب کو ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا۔ عام لوگوں تک ان پرچوں کی رسائی بھی نہیں تھی۔

غلام رسول مہر نے انہیں انبیائے کرام کے نام سے کتابی شکل میں منتقل کردیا۔ ان کے پاس ان خطوط کی نقول موجود نہیں تھیں جو انہوں نے مختلف اوقات میں ابوالکلام آزاد کے نام تحریر کیے تھے۔ مختلف پرچوں میں انہیں وہ خطوط بھی مل گئے جو آزاد نے خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور نیاز فتح پوری کے نام تحریر کیے تھے۔

ان تمام مکاتیب میں متعدد مقامات تشریح کے متقاضی تھے۔ انہوں نے حواشی میں ان کی تشریح کی اور ان تمام مکاتیب کو نقش آزاد کے نام سے شائع کروایا۔

انہوں نے مولانا آزاد کے وہ مضامین جو ایک ہی موضوع سے تعلق رکھتے تھے۔ رسولِ رحمت، انبیائے کرام اور باقیات ترجمان القرآن کے نام سے شائع کردیا تھا۔ وہ مضامین جو مختلف موضوعات پر اب بھی بکھرے ہوئے تھے ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی افادیت کے پیشِ نظر انہیں یکجا کیا اور ''تبرکاتِ آزاد'' کے نام سے مرتب کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔

یہ بڑی خدمت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد برصغیر کی تاریخ ادب میں ایسے منتخب روزگار افراد میں شامل تھے جنہیں سیاسی اور ادبی تاریخ سے الگ کر دیا جائے تو تہی دامنی پر کوئی شک نہ رہے۔ ان کی تحریروں کا وہ سرمایہ جو منتشر ہو کر بکھر جاتا یا کسی کو انہیں ترتیب دینے کا خیال اس وقت آتا جب وقت گزر چکا ہوتا اور بہت سا سرمایہ ضائع ہو جاتا مولانا مہر نے اسے بروقت تاریخ کا حصہ بننے کے لیے محفوظ کر دیا۔

یہی وہ دن تھے جب ان کے قلم سے تراجم کا سیلِ رواں جاری ہوا۔ اگر ''زبان'' الفاظ کے مجموعے اور تہذیب وثقافت کا نام ہے اور اسی کے ذریعے افکار وخیالات کو قید کیا جاتا ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تراجم کے ذریعے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ ہوتا ہے۔ تہذیب وثقافت میں نئے دھارے شامل ہوتے ہیں۔ افکار وخیالات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ ایک ترقی یافتہ زبان کے جوہر کم ترقی یافتہ زبان میں منتقل ہوتے ہیں۔ نئے اسالیب متعارف ہوتے ہیں۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ نئی تراکیب، نئے محاورات، ضرب المثال، تشبیہات واستعارات کا ذخیرہ نصیب ہوتا ہے۔

ترجمہ کرنا صرف دو زبانوں کے جاننے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک فن ہے جس پر کسی کسی کو دسترس ہوتی ہے۔ مولانا مہر کے تراجم جب شائع ہوئے تو دنیا نے تسلیم کیا کہ اس فن پر قدرتی طور پر انہیں عبور حاصل ہے۔ وہ صرف لغات سے واقف نہیں بلکہ دونوں زبانوں کی روح سے واقف ہیں۔

ان کے بیشتر تراجم انگریزی سے اردو میں کیے گئے ہیں۔ ان تراجم کے ذریعے انگریزی تصانیف کا علمی سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہوا جس سے اردو زبان کے قاری کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ ان کی اس کاوش سے بہت سے نئے الفاظ اردو کا حصہ بنے۔ مختلف موضوعات پر مستند کتابوں کا اضافہ ہوا۔

ان کے تراجم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کسی ایک موضوع تک محدود نہیں بلکہ تاریخ، فلسفہ، سائنس، نفسیات، شخصیات، اسلامیات تمام موضوعات شامل ہیں۔

یہ تراجم ان کی سہل نگاری کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ انہیں دل سے یہ احساس تھا کہ اردو زبان میں فن کے متعلق نہ صرف طبع زاد مضامین اور کتابوں کی افسوس ناک حد تک کمی ہے بلکہ تراجم بھی کم یاب ہیں۔ اسی لیے انہوں نے معلوماتی کتب کے تراجم پر زیادہ زور دیا۔

انہوں نے چالیس سے زیادہ انگریزی کتب کا اردو میں ترجمہ کیا جن میں ضخیم کتب بھی شامل ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی آخری زندگی کا بہت بڑا وقت ان تراجم پر صرف کیا۔

ولیم، ایل، شائرر کی کتاب کا ترجمہ ''ہٹلر کا عروج و زوال'' کے نام سے تین جلدوں میں کیا۔ اس میں کئی جدتیں کیں جو عموماً تراجم میں نہیں ہوتیں۔ تمام اسمائے معرفہ انگریزی میں بھی لکھ دیے۔ کم معروف علاقوں کی مختصر تفصیل بھی لکھ دی۔ کتاب میں جو تلمیحات آئیں ان کی اجمالی تفصیل لکھ دی۔

انگریزی انسائیکلوپیڈیا تاریخ عالم کا ترجمہ تین جلدوں میں کیا۔ اس میں بھی قاری کی سہولت کے لیے حواشی درج کیے اور جابجا نقشوں کا اضافہ کر کے کتاب کی جامعیت میں اضافہ کیا۔

سیر لڈیم کی مشہور زمانہ کتاب ''سکندر اعظم'' کو اردو میں ڈھالا۔ اس میں بھی صرف ترجمہ نہیں کیا بلکہ حواشی میں ضروری تصریحات وتوضیحات بھی تحریر کیں۔

آرنلڈ جے، ٹائن، بی نے دس جلدوں میں ایک کتاب ''اے اسٹڈی آف ہسٹری'' تحریر کی تھی۔ اس کی تلخیص ڈی، سی، سمرویل نے دو جلدوں میں کی تھی۔ مولانا مہر نے اس تلخیص کو ''مطالعہ تاریخ'' کے عنوان سے دو جلدوں میں ترجمہ کیا۔

''طبقات ناصری'' منہاج سراج کی فارسی تصنیف تھی۔ یہ تاریخ پاک وہند کی ابتدائی تاریخ کا مستند مرقع ہے لیکن فارسی میں ہونے کی وجہ سے عام دسترس سے دور تھی۔ مولانا کو احساس تھا کہ فی زمانہ انگریزی جاننے والے تو پھر بھی موجود ہیں لیکن تعلیم یافتہ طبقہ بھی فارسی سے دور ہے لہٰذا وہ اس کا ترجمہ کرنے بیٹھ گئے۔ ترجمے کی دقتوں سے قطع نظر ایک مشکل مگر مفید کام یہ کیا کہ تمام ہجری سنین کے ساتھ عیسوی سنین درج کر دیے کیونکہ دورِ حاضر کے لوگوں کو عیسوی سنین پیشِ نظر رکھ کر حالات کو سمجھنے میں اور یاد رکھنے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ اور ثقافت Stanley Maron کی مرتب کردہ کتاب تھی۔ مہر نے اس کتاب

کی افادیت کے پیشِ نظر اس کا ترجمہ کیا تاکہ اردو داں طبقہ یہ جان سکے کہ مغرب کی آنکھ پاکستانی معاشرے کو کس طرح دیکھتی ہے۔

ترکی ایک اسلامی ملک ہے۔ وہاں کے بارے میں ہر مسلمان کچھ نہ کچھ جاننا چاہتا ہے لیکن ترکی کے بارے میں کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں تھی۔ مہر نے اس کمی کو محسوس کیا اور انگریز مصنف ولیم سپنسر کی کتاب کا ترجمہ ''ترکی معاشرہ اور باشندے'' کے عنوان سے کیا۔

اس کتاب میں ترکی کے تمدنی، مجلسی، صنعتی اور تاریخی حالات کا ایسا مرقع پیش کر دیا گیا تھا جو ترکی کو متعارف کرواتا تھا۔ اس ترجمے میں بھی مولانا نے حواشی رقم کر کے کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی تاریخ لبنان کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کے مقدمے میں مولانا نے وہ مقصد بھی بیان کر دیا جو اسلامی علاقوں کی تاریخ کو اردو میں منتقل کرنے کا سبب بن رہا تھا۔

''عرب کے مختلف حصوں کی سرگزشتیں قرآن پاک اور اسلامی تاریخ کی تفہیم کے حوالے سے پس منظری مطالعہ کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ اگر عرب کے مختلف حصوں کی تاریخ پر مشتمل کتابوں کو اردو میں منتقل کر دیا جائے تو یہ ایک اہم علمی خدمت ہوگی۔''

انہوں نے اگلی ہی سانس میں تاریخ شام اور قسطنطنیہ جیسی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتابیں وہاں کے بازاروں اور شاہی محلات سے لے کر کتب خانوں تک کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہیں۔

رچرڈ، ایچ، سنگر کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ''عرب اور اہلِ عرب'' کے نام سے کیا۔

کچھ ایسی انگریزی کتابیں تھیں جو معلومات عامہ کے لیے مفید تھیں مثلاً ''خلا میں سفر کی پہلی کتاب، طیاروں کی پہلی کتاب، خود اعتمادی بڑھایئے، ذہن انسانی کا ارتقا، وہ لوگ جنہوں نے دنیا بدل ڈالی، اڑن کھٹولے سے جٹ طیارے تک، کتابیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی، سائنس داں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی۔'' مہر نے ان کتابوں کے تراجم کر کے عام لوگوں کے لیے معلومات کی دنیا فراہم کر دی۔

کچھ ایسی کتابیں ان کے ہاتھ آئیں جو اسلام کے بارے میں تھیں لیکن غیر مسلموں کی تصانیف تھیں۔ یہ دیکھنا اور عام لوگوں کو دکھانا ضروری تھا کہ ان غیر مسلموں نے اسلام کو کتنا سمجھا ہے۔

مولانا نے ڈیلیل، سی، ڈینٹ کی کتاب کا اردو ترجمہ ''جزیہ اور اسلام'' کے نام سے کیا اور حواشی میں مصنف کی غلطیوں کی اصلاح بھی کی۔

کچھ ایسی کتابیں تھیں جو علمائے اسلام کی تحریر کردہ تھیں لیکن انگریزی میں تھیں۔ ان کی افادیت کے پیشِ نظر ان کا اردو میں ترجمہ ضروری تھا۔ عراق کے مشہور عالم مجید خدوری نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ مولانا نے اس کا اردو ترجمہ ''اسلام اور قانون جنگ وصلح'' کے نام سے کیا۔

علامہ محمد اسد کی انگریزی تصنیف کا ترجمہ ''اسلامی مملکت وحکومت کے بنیادی اصول'' کے عنوان سے کیا۔

رونالڈ کمپنی نیویارک نے ایسی کتابیں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا جن کی مدد سے مختلف مذاہب کی ایک سچی تصور سامنے آ سکے۔ اس ضمن میں ایک کتاب شائع ہوئی۔ اس میں اسلامی دنیا کے جید علما کے اسلام کے مختلف پہلوؤں سے متعلق مقالات شامل تھے۔

یہ کتاب اصلاً اہلِ مغرب کے لیے لکھی گئی تھی لیکن مولانا مہر کے مطابق اگر اسے اردو میں منتقل کیا جاتا تو یہ دو وجہ سے مفید ہوتی۔ ایک اس لیے کہ ہمارے نوجوان طبقے کو اس کے مطالعے سے اطمینان ہوگا اس لیے کہ مقالہ نگاروں کا اسلوب نگارش پرانا نہیں نیا ہے۔ دوسرے ہمارے علما اندازہ فرما سکیں گے کہ جن اہلِ علم کو مغرب سے ذہنی قرب حاصل ہے اور وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں وہ اسلام کے بنیادی حقائق کس رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

ان خیالات کے پیشِ نظر مہر نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا نام ''اسلام، صراطِ مستقیم'' رکھا۔

مولانا مہر علامہ اقبال کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک گوشہ ان پر عیاں تھا۔ کون سا کلام کس وقت اور کن حالات میں لکھا گیا اس کے وہ چشم دید گواہ تھے۔ تقریباً روزانہ ... گھنٹوں ان کی محفل میں بیٹھتے تھے۔ فکر وفلسفہ، شعر وادب اور سیاست پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان طویل ملاقاتوں کے سبب وہ علامہ کی طبع اور عادات و خصائل سے گہرے واقف ہو چکے تھے۔ اقبال کے متعلق جس قدر بیش بہا سوانحی مواد ان کے پاس تھا شاید کسی کے پاس نہ ہو۔ مولانا سے بار بار تقاضے ہوتے تھے کہ آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

اقبال کی سوانح ترتیب دیں لیکن دیگر مصروفیات آڑے آتی رہیں۔ آخری دنوں میں اس طرف توجہ بھی دی تو بیماریوں نے فرصت نہ دی اور پھر اچانک موت نے تو کھیل ہی ختم کردیا۔

اقبال کے سوانح اور فکر وفن کے حوالے سے انہوں نے بے شمار مضامین تحریر کیے تھے جنہیں یکجا کرنے کی ضرورت تھی۔ یہ کام بھی ان کی موت سے قبل ممکن نہ ہوسکا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے امجد سلیم نے ان تحریروں کو اکٹھا کر کے ایک کتاب مرتب کردی اور اس کا نام ''اقبالیات'' رکھا۔

غالب کے دیوان کی شرح کے بعد یہ بھی ان پر فرض ہوگیا تھا کہ وہ اقبال کے کلام کی بھی اسی طرح تشریح کریں لہٰذا اقبال کی چار تصانیف کی شرح ''مطالب'' کے نام سے کی یعنی مطالب بانگ درا، مطالب بال جبریل، مطالب ضرب کلیم اور مطالب اسرار ورموز۔

ان تشریحات کی اہمیت اس لیے بہت بڑھ گئی ہے کہ مہر، اقبال کے قریبی ساتھیوں میں تھے۔ وہ بہت سی نظموں کی شانِ نزول اور تاریخی وسیاسی پس منظر سے واقف تھے۔ شرح کرتے وقت وہ اس پس منظر سے بھی قاری کو آگاہ کرتے ہیں جس سے اشعار کی تفہیم میں مدد ملتی ہے۔

وہ مختلف اوقات میں مغربی پاکستان اور پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ سے بھی وابستہ رہے اور انہوں نے دیگر مشاہیر کے ساتھ کئی نصابی کتب مرتب کیں۔

☆☆☆

ان کی عمر 78 سال ہوچکی تھی۔ بہت سال پہلے آشوبِ چشم کی بیماری نے بہت تنگ کیا تھا۔ حکیم فقیر محمد چشتی کے علاج سے افاقہ ہوگیا تھا لیکن بینائی پر اثر پڑنے لگا تھا۔ ایک عرصہ پیٹ کی بیماری میں بھی مبتلا رہے تھے۔ اچانک درد شروع ہوجاتا تھا۔ یہ درد اتنا شدید ہوتا تھا کہ ہوش وحواس بجا نہ رہتے تھے۔ کثرتِ سگریٹ نوشی نے قلب کو متاثر کردیا تھا۔ شوگر بھی ہوگئی تھی اور پھیپھڑے بھی متاثر ہونے لگے۔ آخری دو تین سالوں میں سردیوں کے موسم میں انفلوئنزا ہوجاتا تھا۔ انہیں اب یقین ہوگیا تھا کہ یہ بیماریاں پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ جو کام ادھورے رہ گئے ہیں انہیں جلد سے جلد نمٹالیا جائے۔ پہلا خیال یہ آیا کہ مولانا آزاد کے سوانح اور سیاسی نظریات پر دو الگ الگ کتابیں تحریر کرنا چاہئیں۔ ایک کتاب کا عنوان ''مولانا آزاد الہلال کے آئینے'' میں تجویز بھی کرلیا لیکن جب کام شروع کیا تو معلوم ہوا اس کے لیے ہندوستان کا سفر ممکن نہ تھا۔ تھک ہار کر کام روک دیا کہ صحت بحال ہونے کے بعد دیکھا جائے گا۔

اس کے بعد ان علمی منصوبوں کی فہرست مرتب کر کے رکھ لی جن پر انہیں کام کرنا تھا تاکہ جب فرصت ملے تو ایک ایک کر کے کام شروع کیا جائے۔

سوانح اقبال، سوانح ابوالکلام آزاد، مولانا آزاد الہلال کے آئینے میں، سوانح سلطان فتح علی ٹیپو، خودنوشت، زمیندار وانقلاب کے اداریوں کی ترتیب، اردو صحافت کا آغاز وارتقا، تاریخ تحریک پاکستان۔

یہ فہرست ایسی تھی کہ اگر ان پر کام ہوجاتا تو نہایت مستند کتابیں وجود میں آتیں لیکن اچانک موت نے یہ کام مکمل نہیں ہونے دیا۔

وہ ان دنوں سراج الدین علی خاں آرزو کے تذکرے ''مجمع النفائس'' کو مرتب کررہے تھے۔ رات کو دیر تک کام کرتے رہے تھے۔ 16 نومبر 1971ء کی تاریخ تھی۔ علی الصباح حسبِ معمول بیدار ہوئے اور نماز کی تیاری کرنے لگے۔ آزارِ قلب میں مبتلا تو تھے ہی۔ غالباً دل کا دورہ پڑا تھا۔ ان کی چھوٹی صاحب زادی ناصرہ پروین نے ان کی آواز سنی۔ وہ اسے پکار رہے تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی ان کے قریب پہنچی۔ وہ ابھی پوچھنے بھی نہیں پائی تھی کہ اسے دیکھتے ہی مولانا نے بے اختیار کہا۔

''اچھا بیٹی خدا حافظ۔''

یہ آخری الفاظ تھے جو اُن کی زبان سے ادا ہوئے اور اس کے ساتھ ہی روح جسدِ خاکی سے پرواز کرگئی۔ اردو کا مایہ ناز ادیب، صحافی، سوانح نگار، مترجم، غالب واقبال شناس، محقق، ناقد، سیکڑوں مقالوں کا اور کتابوں کے خالق مولانا غلام رسول مہر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اس قابلِ رشک وفات کے ساتھ علم کے ایک دور، تہذیب کے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ماخذات

مولانا غلام رسول مہر، حیات و آثار، ڈاکٹر محمد آصف اعوان۔ سرگزشت، عبدالمجید سالک۔ مہر اور ان کا عہد، حمزہ فاروقی

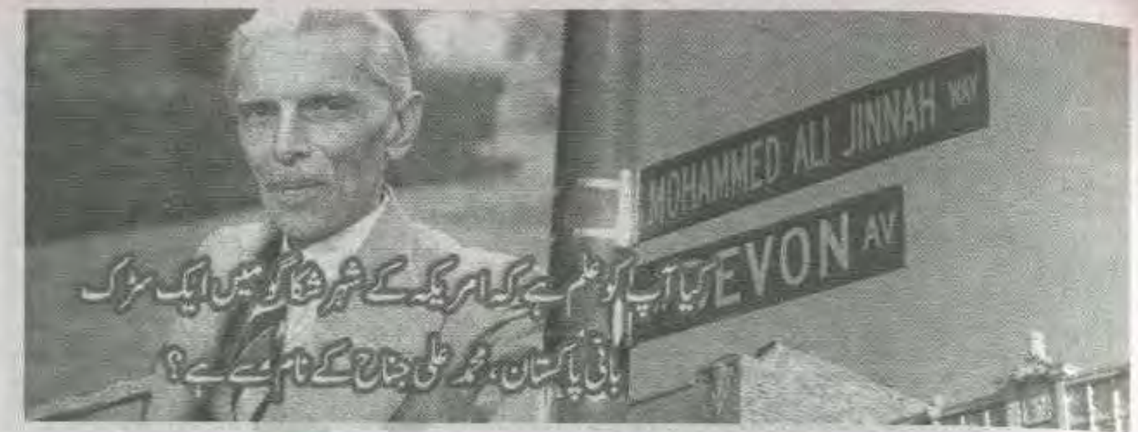

کیا آپ کو علم ہے کہ امریکہ کے شہر شکاگو میں ایک سڑک بانیِ پاکستان، محمد علی جناح کے نام سے ہے؟

جناح وے

امین بھایانی

قائداعظم نے ہمیں سر اٹھا کر جینے کے لیے انگریزوں اور ہندو بنیوں کی غلامی سے آزاد کروا کر ایک خطۂ سرزمین دیا۔ ہر قسم کی سازش کا مقابلہ کیا اور یہ ثابت کیا کہ اخوت، عزم اور جذبے سے ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ اسی مرد آہن کے نام پر امریکا میں ایک سڑک موسوم ہے۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک تحفہ خاص

ہوائی جہاز بڑے ہی نپے تلے اور مکمل ہموار انداز میں محوِ پرواز تھا۔ میں حفاظتی پیٹی باندھ کر اپنی نشست سے ٹیک لگائے، جہاز کی اندرونی فضا کا مشاہدہ کررہا تھا۔ جہاز مسافروں سے مکمل طور پر بھرا ہوا تھا اور اردگرد بیٹھے لوگوں کی آپسی گفتگو کے ملے جلے شور سے مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے میں کسی جہاز میں سفر نہیں کررہا ہوں بلکہ کراچی کے کیپری سنیما میں لگی انگریزی فلم کے کسی منظر کو دیکھ رہا ہوں، فرق صرف اتنا تھا کہ میں بجائے سنیما کی بالکنی میں بیٹھنے کے خود ہی اس منظر میں شامل ہوکر اس کا ایک حصہ بن چکا تھا۔

اچانک جہاز کے پبلک ایڈریس سسٹم پر ایک ہلکی سی گھنٹی نما آواز سنائی دی اور پھر ایک خاتون کی آواز ابھری۔

''اس وقت رات کے 9 بج رہے ہیں اور اب ہم کچھ ہی دیر میں شکاگو کے اوہیئر انٹرپورٹ پر اترنے والے ہیں، مطلع مکمل طور پر ابر آلود ہے اور کسی وقت بھی برفباری کا آغاز ہوسکتا ہے۔ میں اپنے جہاز کے کپتان اور عملے کی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ کا کارپس کرسٹی، براستہ جارج بش انٹرنیشنل انٹرپورٹ، ہیوسٹن، ٹیکساس سے یہاں تک کا 1106 میل کا سفر

WWW.PAKSOCIETY.COM

خوشگوار گزرا ہوگا۔ تمام مسافروں سے التماس ہے کہ وہ اپنے حفاظتی بند اگلے اعلان تک باندھے رکھیں، شکریہ!"

اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں اپنا سوٹ کیس سنبھالے ائرپورٹ کے خودکار دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور دروازے کے کھلتے ہی وسط نومبر کی ہڈیوں تک کو منجمد کردینے والی سرد ہوا نے میرا استقبال کیا۔ میں نے اپنے چرمی ... کوٹ کی چین کو کالروں سے اوپر چڑھاتے ہوئے کالروں کو اس طرح سے کھڑا کرلیا کہ گردن اور کان سرد ہواؤں کی دسترس سے محفوظ رہیں۔ ابھی میں کچھ ہی قدم... آگے بڑھا تھا کہ ہلکی ہلکی برفباری کا آغاز ہوگیا۔

ائرپورٹ کی عمارت کے باہر گاڑیوں کا ایک ازدحام تھا، اس تاحدِ نظر گاڑیوں کے میلے میں میں اپنے کراچی والے بچپن کے دوست ریاض کی گاڑی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑانے لگا کہ اچانک ایک گاڑی نے زوردار ہارن بجایا۔ میں نے چونک کر اُدھر دیکھا تو گاڑی کے بند شیشوں میں سے ریاض ہاتھ ہلا رہا تھا۔ پردیس میں کسی اپنے اور وہ بھی اپنے بچپن کے یار کی صورت نظر آجانا کیسا ہوتا ہے، اس کیفیت کا اندازہ تو کوئی غریب الوطن ہی لگا سکتا ہے۔ بہرحال کچھ ہی دیر بعد میں ریاض کی گاڑی میں بیٹھا شکاگو کی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔ ایک سڑک جو کہ اس وقت قدرے تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی اس پر پہنچ کر ریاض بولا "یہ شکاگو کا مشہور ڈایون ایونیو ہے اور یہاں ایک حصہ قائداعظم کے نام سے موسوم ہے۔ انشاء اللہ کل کسی وقت تمہیں یہاں لے کر آؤں گا، یہاں بہت سے پاکستانی ریسٹورنٹس اور دکانیں ہیں اور تمہیں ایسا محسوس ہوگا کہ جیسے تم کراچی میں گھوم رہے ہو۔"

واقعی اگلے روز جب ریاض مجھے ڈایون ایونیو پر واقع قائداعظم وے پر لے گیا تو سب سے پہلے جس سائن بورڈ پر میری نظر پڑی وہ تھا "تہاری کی دکان کا بورڈ" جی ہاں وہی کراچی والی تہاری کی ایک معروف دکان کا بورڈ۔"

تو یہ تھا میرا اس سڑک سے اولین تعارف جو میرے دوست ریاض نے میرے نومبر 2000ء کے شکاگو کے اولین اور اب تک کے آخری دورے میں کروایا جو کہ بطور خاص اس سے ملاقات کے سلسلے میں تھا۔

22 اگست کو ہمارے کرم فرما عقیل عباس جعفری نے ہمیں اسی ڈیوان ایونیو پر 14 اگست کے سلسلے میں 17 اگست کو مڈویسٹ اسماعیلی پائپ بینڈ کی ویڈیو بسلسلہ یوم آزادی پریڈ اور اس سڑک پر آویزاں "محمد علی جناح وے" کی تختی کی تصاویر لیگ کیں اور ساتھ میں یہ حکم بھی صادر فرمایا۔ "بھایانی صاحب ذرا معلوم کریں یہ بورڈ کب نصب ہوا تھا..... تاریخ پتا چل جائے تو کیا کہنے۔"

میں نے سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواباً عرض کیا: "جی میں کوشش کرتا ہوں۔"

اسی وقت ذہن میں ایک آواز گونجی "حالانکہ 11 سال پہلے بنفسِ نفیس، خراماں خراماں اسی سڑک پر ٹہلا کیے، مگر مجال ہے کہ کوئی اس قسم کی جوں بھی رینگی ہو۔"

بس صاحب، پھر کیا تھا، میں نے یا پیر و مرشد، قبلہ و کعبہ حضرت علامہ گوگل امریکوی کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور "محمد علی جناح وے" لکھ کر گگلیانا شروع کیا۔

واضح ہو کہ جس وے کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ انگریزی کا وے ہے پنجابی کا وے نہیں۔ جی ہاں بالکل یہ "وے منڈیا" والا "وے" ہرگز نہیں۔

لیکن حیرت کی انتہا نہ رہی کہ مسلسل کئی گھنٹوں تک گگلیانے کے بعد بھی میں اس ضمن میں کوئی سراغ نہ لگا سکا۔ بالآخر تھک ہار کر شکاگو شہر کے سٹی کلرک کو ایک عدد ای میل ارسال کردیا اور اگلی ہی صبح سٹی کلرک دفتر سے جوابی ای میل موصول ہوا جس میں فراہم کردہ فون نمبر پر رجوع کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، فوراً ہی میں نے وہ نمبر گھمایا اور پھر ایک خاتون سے ہماری گفتگو ہوئی جس کا لب لباب یہ تھا کہ میں "فریڈم آف انفارمیشن" کے قانون کے تحت یہ معلومات حاصل کرسکتا ہوں اور پھر محترمہ نے کچھ دیر تک مجھے ہولڈ کروا کر نہ صرف مجھے متعلقہ محکمے کا فون نمبر فراہم کیا بلکہ میرا سلسلہ اس سے جوڑ دیا اور پھر وہاں سے مجھے ایک عدد ویب سائیٹ کا پتا حاصل ہوا جہاں مجھے اس ضمن میں باقاعدہ درخواست دائر کرنا تھی۔ اگلے ہی روز 24 اگست کو میں نے بذریعہ ای میل وہ درخواست دائر کردی جس کے جواب میں 31 اگست کی شام کو دو مختلف سرکاری عہدیداران کی جانب سے معذرتی خطوط موصول ہوئے کہ مطلوبہ معلومات ان کے محکمہ کی جانب سے فراہم نہیں کی جاسکتی ہے۔ البتہ ہمراہ سٹی کلرک کے دفتر کے نائب افسر برائے فریڈم آف انفارمیشن کا ای میل ایڈریس اس سلسلے میں رابطے کے لیے بھی فراہم کیا گیا اور میں نے اسی روز ان کے رُوبرو اپنی درخواست دائر کردی۔ اگلی شام ان کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی معذرتی خط بذریعہ ای میل موصول ہوا کہ ان کے پاس ہماری مطلوبہ معلومات میسر نہیں ہے۔ معاملہ پھر وہیں آن پہنچا جہاں سے چلا تھا کہ اچانک اس شام یعنی 8 ستمبر 5 بج کر 18 منٹ پر ہمیں سٹی کلرک کے دفتر کے نائب افسر برائے فریڈم آف انفارمیشن، محترمہ امینڈا پرینٹس صاحبہ کا ایک عدد مزید معذرتی خط موصول ہوا لیکن اب یہ معذرت مطلوبہ معلومات کی عدم دستیابی کی نہیں، بلکہ دائر کردہ درخواست کو درست طور پر نا سمجھ پانے سے متعلق تھی اور ساتھ ہی میری مطلوبہ معلومات بھی فراہم کردی گئی تھیں۔ میں نے فوراً سے پیشتر انہیں شکریہ کا ای میل ارسال کیا۔ موصول شدہ دستاویز جو کہ شکاگو کی سٹی کونسل کی کارروائی کی رپورٹ شائع شدہ مورخہ 22 مئی 1991ء کے صفحہ نمبر 1007,1006 اور 1008 کے عکس ہیں جس کا ترجمہ ذیل میں پیشِ خدمت ہے۔

''اعزازی نامزدگی برائے جزوی ویسٹ ڈیوان ایونیو بطور ''محمد علی جناح وے'' کمیٹی برائے ٹرانسپورٹ اینڈ پبلک وے نے مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کی۔ شکاگو، 3 مئی، 1991ء۔

بخدمت صدر و ممبران سٹی کونسل۔

آپ کی اسٹریٹ اینڈ ایلیز کمیٹی یہ مودبانہ سفارش کرتی ہے کہ آپ کی معزز باڈی اس مجوزہ آرڈیننس جسے 15 مارچ 1991ء آپ کے پاس پیش کیا گیا ہے، پاس کرے جس کے تحت سٹی کونسل کے 3 دسمبر 1984ء کو پاس کردہ آرڈیننس جو کہ کونسل کی عمومی کارروائی کے صفحے نمبر 11460 پر شائع ہوا، جس کے تحت اس بات کی منظوری دی گئی تھی کہ کمشنر پبلک ورکس ویسٹ ڈیوان ایونیو کے درمیان واقع ڈیمین ایونیو اور ویسٹرن ایونیو کو محمد علی جناح وے بنانے کے لیے تمام تر ضروری اقدامات اٹھائیں گے۔ مذکورہ سفارش پر بنا کسی اختلافی ووٹ کے کمیٹی کے اراکین کے زبانی ووٹ کے ذریعے متفقہ طور پر .... اتفاق کیا گیا تھا۔ دستخط پیٹرک جے لیوار چیئرمین۔

ایلڈرمین ہولز کی تحریک پر کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ ارسال کردہ مجوزہ آرڈیننس، 45 اراکین کی مندرجہ ذیل ''ہاں یا نا'' سے منظور کرلیا گیا۔

ہاں: 45

نا: کوئی نہیں

ایلڈرمین ناٹارس نے ووٹ پر نظر ثانی کا کہا۔ تحریک نظر انداز کردی گئی اور مندرجہ ذیل آرڈیننس پاس کرلیا گیا:

''شکاگو شہر کی شہر کے سٹی کونسل کی طرف سے حکم جاری کیا جاتا ہے۔

سیکشن 1: سٹی کونسل کی طرف سے 3 دسمبر، 1984ء کے منظور کردہ ایک آرڈیننس کے مطابق جو کہ مذکورہ تاریخ ہی کی عمومی کارروائی کے صفحہ نمبر 11460 پر شائع ہو چکا ہے جس میں اس بات کی منظوری دی گئی تھی کہ کمشنر پبلک ورکس ویسٹ ڈیوان ایونیو کے درمیان واقع ڈیمین ایونیو اور ویسٹرن ایونیو کو ''محمد علی جناح وے'' بنانے کے لیے تمام تر ضروری اقدامات اٹھائیں گے۔

سیکشن 2۔ یہ آرڈیننس اپنی منظوری اور اشاعت کے ساتھ اور اس کے بعد سے نافذ العمل ہو جائے گا۔

عومی راستوں میں فراہمی استحقاق کا اختیار کمیٹی برائے ٹرانسپورٹ اینڈ پبلک وے نے مندرجہ ذیل رپورٹ پیش کی۔

شکاگو، 20 مئی، 1991ء بخدمت صدر و ممبران سٹی کونسل، کمیٹی برائے ٹرانسپورٹ اینڈ پبلک سے یہ مودبانہ سفارش کرتی ہے کہ آپ کی معزز باڈی کے پاس پیش کردہ مجوزہ آرڈیننس کو پاس کرے (بحوالہ 9 دسمبر، 15,1990 مارچ، 12 اپریل اور 20 مئی 1991ء) اور اس کا استحقاق منظور کرے۔ مذکورہ سفارش پر بنا کسی اختلافی ووٹ کے کمیٹی کے اراکین کے زبانی ووٹ کے ذریعے متفقہ طور پر اتفاق کیا گیا تھا۔ دستخط چیئرمین۔

تو صاحب، اس طرح سے شکاگو، سٹی کونسل میں 3 دسمبر، 1984 کو پاس کردہ مجوزہ آرڈیننس بالآخر 3 مئی اور 20 مئی، 1991 کو یکے بعد دیگرے شکاگو سٹی کونسل کے ممبران کے زبانی ہاں یا نا کے بلا اختلاف 45 ووٹوں سے متفقہ طور پر باقاعدہ منظوری پا کر نافذ العمل ہو گیا اور اسے سٹی کونسل کی 22 مئی 1991ء کو شائع شدہ عمومی کارروائی کی رپورٹ کے صفحات نمبر 1007,1006 اور 1008 میں شامل کرلیا گیا۔

کہرے کا قہر

صائمہ اقبال

کسے خبر تھی کہ ٹھنڈ کی لہر، کہرے کی دبیز چادر لندن والوں پر قہر بن کر ٹوٹے گی۔ ایک دو نہیں بارہ ہزار سے زیادہ افراد لقمہ اجل بن جائیں گے۔ ایک ترقی یافتہ شہر، ہر قسم کے وسائل کا حامل شہر، قدرت کے ستم پر کراہ اٹھے گا۔

قدرتی آفات نے اس شہر کو موت گھر بنا دیا تھا

پُراسرار دسمبر لندن پر اتر چکا تھا۔

سورج کملا گیا۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ خاموش گلیوں میں گشت کرنے لگی۔ زندگی ٹھٹھر گئی۔ گرمائش کی طلب بڑھی تو شہریوں نے آتش دانوں میں کوئلے اور لکڑیاں جھونک دیں۔ چمنیاں کسیلا دھواں اگلنے لگیں۔

محکمۂ موسمیات کی پیشگوئی غلط ثابت ہوئی تھی۔ 1952 کا موسم سرما معمول سے زیادہ سرد اور قہرناک تھا۔ یکم دسمبر کو تند ہوائیں شہر میں داخل ہوئیں۔۔ اور جوں جوں دن

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزرتے گئے، سردی کی شدت بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ 5 دسمبر کا قاتل دن طلوع ہوگیا۔

بوڑھا نورمن بھاری کمبل اوڑھے بستر پر دراز تھا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ فقط آتش دان میں جلتی لکڑیوں کی چٹخ سنائی دے رہی تھی۔

بوڑھے نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ چمنیوں سے بلند ہوتے دھویں سے منظر دھندلا گیا تھا۔ یہ لندن کا مضافاتی علاقہ تھا۔ مکانات کے پیچھے فیکٹریاں تھیں جن کی بڑی بڑی چمنیوں سے سیاہ اژدہے بلند ہوکر آسمان میں گم ہو رہے تھے۔

کسی زمانے میں نورمن ایک فائر فائٹر تھا۔ ایک پھرتیلا اور چاق چوبند انسان۔ مصیبت زدہ کی مدد کرنا اس کا شیوہ تھا۔ آگ میں بلاخوف وخطر کود جاتا۔ مگر وقت ظالم تھا۔ صحت ہمیشہ نہیں رہتی۔ ادھیڑ عمری میں اسے دمے کے مرض نے آلیا۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینی پڑی۔ اب یہ صورتِ حال تھی کہ سرما کا آغاز ہوتے ہی طبیعت بگڑنے لگتی۔ کمر بستر سے لگ جاتی۔ بوڑھے کا بیٹا جارج اس کی دیکھ ریکھ کیا کرتا تھا۔ بہت فرماں بردار تھا۔ باپ کا اشارہ ملتے ہی اس کا ہر حکم بجالاتا۔

جارج ایک دراز قد، وجیہہ نوجوان تھا۔ اپنے ہم عمروں کے برعکس انتہائی متین اور حلیم۔ وہ ایک اسپتال میں کمپاؤنڈر تھا۔

کبھی کبھی نورمن کو شرمندگی ہوتی کہ وہ اپنے بیٹے پر بوجھ بن گیا ہے۔ وہ اکثر اُسے سمجھاتا: "میری زیادہ پروا مت کرو جوان۔ میں بالکل فٹ ہوں۔"

کبھی کہتا۔ "ایک اداس بوڑھے آدمی کے ساتھ شامیں گزارنا اچھا آئیڈیا نہیں۔ جاؤ، دوستوں کے ساتھ فلمیں دیکھو۔ ذرا گھومو پھرو بھئی۔ ہر وقت یہیں پڑے رہتے ہو۔"

جارج کا دل تو نہیں مانتا تھا مگر باپ کے اصرار کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑتے۔

آج شام اُس نے ڈیوٹی کے بعد فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔

نورمن نے دیوار پر لگی گھڑی کی سمت دیکھا۔ کانٹے بارہ کے ہندسے کو چھونے کی جستجو میں تھے۔

"جارج ابھی لنچ کر رہا ہوگا۔" بوڑھے نے سوچا۔ "مجھے بھی تھوڑی کافی لے لینی چاہیے۔"

وہ بستر سے نکلا اور کچن میں داخل ہوگیا۔ کافی بناتے ہوئے نظر شمال کی سمت پڑی۔ آسمان کی جانب۔ وہاں ایک سیاہی مائل بادل چھا رہا تھا۔

"تو کہرا بھی حملہ آور ہوگیا۔" نورمن نے گہری سانس لی۔ "یہ دسمبر ظالم ہے۔"

کچن سے نکلتے وقت اس نے ایک بار پھر آسمان کی سمت دیکھا۔ شمالی افق پر ظاہر ہونے والا بادل دبیز دھند کی صورت میں شہر پر اتر رہا تھا۔ وہ انتہائی گھنا تھا۔

لندن کے باسیوں کے لیے کہرا کوئی نئی بات نہیں، سال کے اس حصے میں اکثر دھند شہر کو گھیر لیتی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ اثر سڑکوں پر پڑتا ہے ڈرائیوروں کو شدید مشکلات پیش آتی ہیں۔ ٹریفک حادثے بھی ہوتے ہیں مگر یہ سب معمول کی باتیں ہیں۔ البتہ آج... کچھ انوکھا ہونے جا رہا تھا۔

وہ 5 دسمبر کا قاتل دن تھا۔ ایک وحشت ناک گرد باد شہر پر اتر چکا تھا۔

☆☆☆

روشنی دھیمی پڑنے لگیں۔ اسٹریٹ لائٹ قبل از وقت روشن ہوگئیں۔

اسپتال سے نکلتے ہی ہوا کا جھکڑ جارج سے ٹکرایا۔ اس نے ہاتھ بغلوں میں دیے اور مفلر اچھی طرح گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ اس کی جیب میں بیٹی ہمفن کی مشہور فلم The Greatest Show on Earth کا ٹکٹ تھا اور منزل واٹرلو کا علاقہ تھا۔

سڑک پر آتے ہی اس کا سامنا گھنی دھند سے ہوا۔ ٹریفک کی رفتار سست پڑ رہی تھی۔ تمام گاڑیوں نے ہیڈ لائٹس جلا دیں۔

سنیما زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔ ایک بے نام سی سراسیمگی ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ ہر تھوڑی دیر بعد اسے اپنے بوڑھے باپ کا خیال آتا۔

سنیما میں زیادہ رش نہیں تھا۔ اندرونی حصہ نسبتاً گرم تھا۔ اسے درمیانی قطار میں سیٹ ملی تھی۔

فلم تفریح سے بھرپور تھی۔ پہلے ہی منظر نے گرفت میں لے لیا۔ وہ ٹھنڈ کو بھلا بیٹھا۔ انٹرویل میں جب کافی لینے باہر نکلا تو فلم کی کہانی اور کردار اس حد تک ذہن پر طاری تھے کہ وہ اُس پُراسرار تاریکی کی جانب دھیان ہی نہیں دے سکا جو دھیرے دھیرے عمارت کی کھلی کھڑکیوں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

"غضب کی دھند پڑ رہی ہے۔" کینٹین بوائے نے کہا۔

"دسمبر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس نے پیسے ادا کیے۔ "ویسے بھی اس بار سردی زیادہ ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ پھر پردے کے سامنے تھا جہاں سرکس سے جُڑی دلچسپ کہانی پیش کی جا رہی تھی۔

کلائمکس میں ناظرین کی دلچسپی عروج پر پہنچ گئی۔ جارج کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی تھی۔ کمال کا سسپنس تھا۔ مگر ٹھیک تب... تھیٹر میں کچھ بہت ہی عجیب رونما ہوا۔

وہ ایک بے چینی تھی جو اندھیرے میں حرکت کر رہی تھی۔ پچھلی نشستوں پر بیٹھے چند افراد شکایت کرنے لگے کہ انہیں پردہ صاف دکھائی نہیں دے رہا۔

پہلے تو اُنہیں ضعفِ نگاہ ٹھہراتے ہوئے نظر انداز کر دیا گیا مگر دھیرے دھیرے شور بڑھنے لگا۔ کچھ لوگ اٹھ کر آگے آگئے جن کی وجہ سے بدمزگی پیدا ہوگئی۔ کچھ دیر بعد جارج کی آنکھوں کے سامنے بھی دھندلاہٹ چھا گئی اور اس لمحے لوگوں کو اندازہ ہوا کہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے۔

ہاں، وہ دھند تھی... آسمان سے اترنے والی پُراسرار دھند۔ حیران کن دھند جو سڑکوں سے ہوتی ہوئی اب تھیٹر میں داخل ہو چکی تھی۔

☆☆☆

پولیس اسٹیشن میں ٹیلی فون کالز کا تانتا بندھ گیا۔ ہر طرف سے بری خبریں موصول ہو رہی تھیں۔

حدِ نگاہ اتنی تیزی سے کم ہوگئی کہ لندن کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ٹریفک سگنلز دھند میں گم ہوکر بے کار ہوگئے۔ کئی گاڑیاں حادثات کا شکار ہوگئیں۔ ریلوے ٹریک پر بھی حادثہ پیش آیا تھا۔ چند بوگیاں پٹری سے اتر گئیں۔

آفیسر اینڈی تیزی سے سارجنٹ مائیکل کلارک کے آفس میں داخل ہوا۔ ہاتھ میں ایک کاغذ تھا چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"سر، حالات تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔" آفیسر نے کہا۔ "میئر نے ایمرجنسی نافذ کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے۔"

"محکمۂ موسمیات والے کیا کہتے ہیں؟" سارجنٹ نے سوال کیا۔

"وہ حیرت کے زیرِ اثر ہیں۔" آفیسر نے کہا۔ "اطلاعات کے مطابق شمالی سمندر سے آنے والا گرد باد شہر پر حملہ آور ہوگیا ہے۔"

"یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔" سارجنٹ نے فوراً کہا۔ "سائیکلون تو سال کے اس حصے میں عام ہیں۔"

"یہ ایک اینٹی سائیکلون ہے سر۔" آفیسر نے تھوک نگلا۔ "یہ کہرے کی بھاری اور انتہائی دبیز لہر ہے جو شاید اگلے چند روز تک لندن پر تنی رہے۔ یہ اتنی گھنی ہے کہ ہلکی ہواؤں کی آمد مکمل طور پر بند ہوسکتی ہے۔ شہری اس میں محبوس ہو جائیں گے۔"

سارجنٹ نے جھرجھری لی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ وہاں سفید آسیب تھا... جس کے پار کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔

☆☆☆

سنیما کے باہر سرد خوف جارج کا منتظر تھا۔ ہر سو دھند چھائی ہوئی تھی۔ اسٹریٹ لائٹس دھیمی پڑ گئی تھیں۔ گاڑیوں کی بتیاں بھی بمشکل دکھائی دیتیں۔ اس نے اپنے پیروں کی سمت دیکھا۔ جوتے دھویں میں گم تھے۔ سڑک غائب ہوگئی تھی۔

راستہ بھول جانے کا خوفناک احساس اس پر حملہ آور ہوا۔ سراسیمگی نے اسے گھیر لیا۔ منہ سے نکلا۔ "خدایا! یہ کیا ہوگیا۔"

پریشانی میں ڈوبی آواز جارج کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ مڑا۔ دھند کے درمیان ایک بوڑھا جوڑا دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

عورت نے اپنے شوہر کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ اس کی عینک پر اوس کے قطرے تھے۔ بوڑھا دھیرے دھیرے کھانس رہا تھا۔

جارج فوراً آگے بڑھا۔ "کیا میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"ہاں بیٹا، ہمیں گھر تک پہنچا دو۔ یہیں پاس ہی ہے۔" عورت نے اسے پتا سمجھایا۔

ان کا فلیٹ کچھ ہی دور تھا، مگر دھند کے باعث راستے اپنی شناخت کھو بیٹھے تھے۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کون سی سڑک کس سمت جاتی ہے۔

جارج متذبذب کھڑا تھا کہ اچانک بوڑھا کھانسنے لگا۔ وہ سینہ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" جارج نے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔

"اوہ ہاں۔" اس نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو دھواں بھرا ہوا ہے۔"

"میری تو آنکھیں جل رہی ہیں۔" عورت کی آواز میں کرب تھا۔

"مجھے ان کی مدد کرنی ہوگی۔" جارج نے خود سے کہا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ تھام لیا اور اندازے سے آگے بڑھنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گاڑیوں کی رفتار اتنی سست تھی کہ انتہائی کشادہ سڑک پر بھی قطاریں لگ گئی تھیں۔ کئی افراد حسرت اور یاس کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

وہ آگے بڑھتا رہا۔ مرکزی سڑک سے نکل کر جب وہ رہائشی علاقے میں آئے تو دھند کا زور کچھ ٹوٹ گیا۔ سائن بورڈ دکھائی دینے لگے۔ بالآخر وہ اس جوڑے کے مکان تک پہنچ گیا۔

"خدا تمہارا بھلا کرے نوجوان۔" بوڑھے کے لہجے میں احساسِ تشکر تھا۔ "تمہاری رگوں میں نیک ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے ورنہ آج کے دور میں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔"

"ماں باپ!" جارج کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ آنکھوں کے سامنے نور من کی تصویر گھوم گئی۔

جوڑے سے رخصت ہو کر وہ سفیدے کے آسیب کو چیرتا ہوا تیزی سے اپنے مکان کی سمت بڑھنے لگا۔ اندیشے ہم قدم تھے۔

اُسے ساتھ چلتے لوگوں کی پریشانی میں ڈوبی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ ڈرے ہوئے تھے۔ کوئی خارش کی شکایت کر رہا تھا۔ کوئی بے طرح کھانس رہا تھا۔ کوئی آنکھیں مل رہا تھا۔

اس نے خود کو دلاسا دینے کی کوشش۔ "ڈیڈی گھر میں ہیں۔ چار دیواری میں وہ بالکل محفوظ ہیں۔ میں خواہ مخواہ پریشان ہو رہا ہوں۔"

اچانک کوئی شدتِ درد سے کراہا۔ اس نے دائیں جانب دیکھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا جو سینہ تھامے زمین پر بیٹھا تھا۔ ہیبت ناک سفید دھند نے اسے چاروں جانب سے گھیر رکھا تھا۔

جارج اپنی پریشانی بھول کر اس کی سمت بڑھا۔ اس کا کندھا ہلایا۔ "جناب آپ ٹھیک تو ہیں؟"

آدمی خاموشی سے ایک طرح ڈھلک گیا۔ سڑک پر حرکت کرتی دھند اس کے وجود پر چھانے لگی۔

جارج زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے آدمی کی نبض ٹٹولی۔ وہاں خاموشی تھی۔ کامل خاموشی۔

"کیا یہ مر گیا؟" ایک لرزتی ہوئی آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔ آسیبی سفیدے کے درمیان ایک عورت کھڑی تھی۔ وہ کسی بدروح کی مانند دکھائی دیتی تھی۔

جارج نے غور سے دیکھا۔ عورت کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

قومی ترانہ ختم ہوتے ہی ریڈیو سے ایک بارعب آواز سنائی دی۔ "لندن کے باسیو۔ میں ناظمِ شہر رپیرٹ لیبیری آپ سے مخاطب ہوں۔ اس وقت ہمیں ایک مشکل کا سامنا ہے۔ ماضی کے برعکس اس سال نہ صرف درجہ حرارت حیران کن حد تک گر گیا ہے، بلکہ کہرا بھی شدید ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے معمولاتِ زندگی شدید متاثر ہوئے ہیں۔ حدِ نگاہ گرتے گرتے 300 میٹر ہو گئی ہے۔ ہمیں ٹریفک حادثات کی خبریں موصول ہو رہی ہیں۔ لوگوں کو گھر پہنچنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔ جلدی امراض کا بھی خدشہ ہے۔ صورتِ حال کے پیشِ نظر چند پروازیں کینسل کر دی گئی ہیں۔ فی الحال ریل سروس کو بھی روک دیا گیا ہے۔ مگر پریشان مت ہوں۔ میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ حکومت آپ کے ساتھ کھڑی ہے۔ ماہرین اس مسئلے پر کام کر رہے ہیں۔ جلد اس کا حل تلاش کر لیا جائے گا۔ اس وقت تمام شہریوں سے درخواست ہے کہ آپ پُرسکون رہیں۔ گھر سے نکلنے سے اجتناب برتیں۔ اگر گھروں سے باہر ہیں تو شہر کے جنوبی حصے کا رخ کریں۔ وہاں کہرے کے اثرات نسبتاً کم ہیں۔"

ایک لمحے کا وقفہ آیا۔

"میں ناظمِ شہر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ مسئلہ جلد حل کر لیا جائے گا۔ اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی ہے۔ عملے کی چھٹیاں منسوخ کی جا چکی ہیں۔ اسپتالوں میں آپ کو مکمل طبی سہولیات فراہم کی جائیں گی۔ اگر آپ کو کسی بھی قسم کی مدد درکار ہو تو فوراً پولیس اسٹیشن فون کریں۔ آپ کی ہر ممکن مدد کی جائے گی، شکریہ۔"

میئر کی تقریر ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار پھر قومی ترانہ نشر ہو رہا تھا۔

آفیسر اینڈی نے آگے بڑھ کر ریڈیو بند کر دیا۔ وہ سارجنٹ کی طرف مڑا۔ "پولیس اسٹیشن فون کیا جائے... یہ آدمی دیوانہ ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں۔ ہم تو خود مفلوج ہو گئے ہیں۔"

"خود پر قابو رکھو آفیسر۔" سارجنٹ نے دبی آواز میں کہا۔

"یہ شخص مذاق کر رہا ہے سر۔" آفیسر نے تاسف سے گردن ہلائی۔ "حدِ نگاہ بے حد کم ہو چکی ہے۔ باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا اور یہ کہہ رہا ہے کہ مسئلہ حل..."

اچانک فون بجا۔ سارجنٹ نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا۔ "ہیلو سارجنٹ کلارک۔"

"ڈیڈی..." ایک مانوس مگر ڈری ہوئی آواز سماعتوں میں اتری۔

"کیا ہوا ٹام۔ تم ٹھیک تو ہو؟" سارجنٹ اپنے سات سالہ بیٹے کی آواز سن کر گھبرا گیا۔

"یہاں بہت ٹھنڈ ہے اور گھر میں دھواں بھر گیا ہے۔"

"مما کہاں ہیں۔ انہیں فون دو۔"

کچھ دیر بعد اس کی بیوی لائن پر تھی۔ "مائیکل مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کہرا گھر میں گھس آیا ہے۔"

"ارے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟ دسمبر میں تو کہرا پڑتا ہے۔"

"نہیں یہ عام کہرا نہیں۔" عورت کی آواز میں خوف تھا۔ "باہر کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ پڑوس والے مسٹر بین سخت بیمار پڑ گئے ہیں۔ میری بہن کا بھی فون آیا تھا۔ وہ آنکھوں میں جلن کی شکایت کر رہی تھی۔ بتا رہی تھی کہ اُس کے علاقے میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے... میرا دل بیٹھ رہا ہے۔ اگر ٹام کو کچھ ہو گیا تو..."

چند ساعت سارجنٹ خاموش کھڑا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ "فکر مت کرو۔ میں آ رہا ہوں۔"

ریسیور رکھ کر وہ اینڈی کی طرف مڑا۔ "کچھ دیر کے لیے اسٹیشن سنبھالو۔ میں جلد لوٹ آؤں گا۔"

"مگر آپ جائیں گے کیسے؟ باہر تو کچھ دکھائی ہی نہیں دے رہا۔" اسے اپنے پیچھے آفیسر کی آواز سنائی دی۔

باہر نکلتے ہی وہ سفید دبیز دھویں میں گھر گیا۔ سلفر کی پُراسرار بو نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ اس نے کہرے پر نظر ٹکائی۔ منظر سے آنکھیں مانوس ہوئیں تو اندازے سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

گاڑی کا دروازہ کھولتے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔ وہ کہرے سے بھری تھی۔ چند لمحات وہ یونہی کھڑا رہا۔ پھر گاڑی میں سوار ہو گیا۔

سڑک پر آتے ہی اُسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک مشکل میں پھنس چکا ہے۔ آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راستہ غائب تھا۔ اسٹریٹ لائٹس دم توڑ چکی تھیں۔ اس نے رفتار دھیمی کر دی۔ اسٹیئرنگ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، مگر ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

بالکل اچانک دھند کے درمیان ایک جیپ ظاہر ہوئی۔ وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تھی۔ سارجنٹ نے بریک پورا دبا دیا۔ ٹائر بری طرح چرچرایا، مگر فاصلہ کم تھا۔ اس کی گاڑی کا اگلا حصہ جیپ کے بمپر سے بری طرح ٹکرایا۔ اسے شدید جھٹکا لگا۔ حواس معطل ہو گئے۔

وہ منحوس لمحہ تھا۔ حادثات کے لیے سازگار۔

بدقسمت جیپ کے ڈرائیور نے احتیاط کے پیشِ نظر اپنی گاڑی روک دی تھی۔ دھند کے باعث سارجنٹ اسے دیکھ نہیں سکا۔ جب اس سے سامنا ہوا، بہت دیر ہو چکی تھی۔ حادثہ جنم لے چکا تھا... مگر کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ مزید سانحات ہونے تھے۔

سارجنٹ کی کار کے پیچھے ایک اور کار آ رہی تھی۔ جتنی دیر میں اس کا ڈرائیور بریک دباتا، وہ گاڑی سارجنٹ کی کار سے ٹکرا چکی تھی۔ ایک اور تصادم۔ ایک اور جھٹکا۔

سارجنٹ جھنجلا کر باہر آیا۔ ابھی وہ پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو مغلظات بکنے کا پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ یکبارگی کہرے میں روشنی ظاہر ہوئی۔ ایک موٹر سائیکل تیزی سے آئی اور حادثات کی اس قطار میں شامل ہو گئی۔

موٹر سائیکل ایک جانب جا گری۔ اس کا سوار لڑھکتا ہوا جھاڑیوں میں چلا گیا۔

نہیں... حادثہ یہاں بھی نہیں تھما۔ وہ ایک زنجیری عمل کی طرح پھیلتا چلا گیا۔ سارجنٹ کو بھاری انجن کی آواز سنائی دی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی ظاہر ہوئی۔ وہ ایک ٹرک تھا، جس کے ڈرائیور کو بہت دیر میں ادراک ہوا کہ وہ ایک منحوس لمحے میں پھنس چکا ہے۔ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑی تین گاڑیوں کو دیکھ کر اس نے بریک پوری قوت سے دبا دیا۔

اس کوشش میں ٹرک اپنا توازن کھو بیٹھا۔ وہ الٹ گیا۔

سارجنٹ کے لیے وہ منظر ہیبت ناک تھا۔ ٹرک سڑک پر رگڑتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ رگڑ سے شعلے پیدا ہو رہے تھے۔ ٹرک اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا اور قاتل کہرے میں غائب ہو گیا۔

☆☆☆

ٹھنڈ تھی۔ تاریکی تھی... اور کہرا تھا۔ جارج نے ایک عورت کو تھام رکھا تھا اور دیواریں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

"ہمت سے کام لو ہم جلد اسپتال پہنچ جائیں گے۔" اس نے عورت کو دلاسا دیا۔ "بس اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔"

عورت نے گردن ہلائی۔ ناک سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ غشی کی حالت میں تھی اور بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

جارج اندازے پر چل رہا تھا۔ یہ علاقہ اس کا دیکھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھالا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں قریب ہی سٹی گورنمنٹ کا ایک کلینک ہے مگر دھند کے باعث اسے وہاں پہنچنے میں شدید مشکل پیش آرہی تھی۔

یکدم اس کے کانوں میں سائرن کی آواز پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ ایک ایمبولینس سڑک پر رینگ رہی تھی۔ دھند کے باعث اس کا ڈرائیور دکھائی نہیں دیتا تھا۔

ایمبولینس کچھ آگے بڑھی اور بائیں جانب مڑ کر غائب ہوگئی۔ جارج سمجھ گیا کہ وہ کلینک کے قریب پہنچ گیا ہے۔

چند منٹ بعد وہ عورت کو تھامے کلینک کے دروازے پر تھا۔ وہ دو منزلہ ایک چھوٹی سی عمارت تھی۔ احاطے میں ایمبولینس کھڑی تھی۔ وہ عورت کو سہارے سے اندر لے گیا۔ دھند بھی ان کے ساتھ ساتھ اندر داخل ہوئی۔ استقبالیہ خالی تھا۔ اس نے عورت کو ایک کرسی پر بٹھادیا۔

"کوئی ہے۔ ہمیں فوراً مدد چاہیے۔" جارج چلایا۔

دائیں جانب کچھ ہلچل ہوئی۔ دروازہ کھلا اور ایک نیلی آنکھوں والی لڑکی برآمد ہوئی۔ اس کے حسین چہرے کو پریشانی نے گہنا دیا تھا۔ اس نے زخمی عورت کو دیکھا۔

"اوہ، یہ تو بہت بری حالت میں ہیں۔" آواز میں دکھ تھا۔

"ہاں۔" جارج نے جواب دیا۔ "انہیں فوراً طبی مدد کی ضرورت ہے۔"

"دراصل..." لڑکی متذبذب دکھائی دی۔ "آج بے حد مشکل دن ہے۔ تواتر سے مریض آرہے ہیں۔ بستر بھر چکے ہیں۔ اس وقت ہمارے پاس فقط ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں ہیں، جو مریض دیکھنے میں مصروف ہیں۔ مجھے دکھ ہے کہ انہیں انتظار..."

"کیا آپ مجھے ادویہ کے کمرے تک لے جاسکتی ہیں؟" جارج نے بات کاٹ دی۔

"اوہ ہاں، بالکل۔ وہ دائیں جانب والا کمرا ہے۔"

جارج وہاں سے فرسٹ ایڈ باکس، چند گولیاں اور ایک انجکشن اٹھالایا۔

اس نے عورت کو بینچ ہی پر لٹا دیا۔ انجکشن سے اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ جارج نے روئی سے اس کا زخم صاف کیا۔

"اب یہ خاصی بہتر لگ رہی ہیں۔ یہ آپ کی..." لڑکی نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ میرے لیے اجنبی ہیں۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل سڑک پر ان سے سامنا ہوا۔" جارج نے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔ "یہ مشکل میں تھیں تو میں انہیں یہاں لے آیا۔"

"آپ ڈاکٹر ہیں؟"

"نہیں کمپاؤنڈر۔ معذرت چاہتا ہوں، میں نے تعارف نہیں کروایا۔ میرا نام جارج ونسٹ ہے۔ میں سینٹرل اسپتال میں ملازم ہوں۔"

"ہیلو جارج، میرا نام جولیا ہے۔ جولیا کروز... میں یہاں ریسپشنسٹ..."

بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ دو آدمی ایک بچے کو تھامے اندر داخل ہوئے۔ بچے کے ہونٹ نیلے پڑ چکے تھے۔

"جلدی ڈاکٹر کو بلائیں۔" ایک آدمی نے کہا۔ "اس کی نبض ڈوب رہی ہے۔"

"ڈاکٹر..." جولیا کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ جارج نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اسے یہاں لٹادیں۔"

کچھ دیر بعد وہ بچے کو طبی امداد فراہم کررہا تھا۔ جولیا اس کی معاونت کررہی تھی۔

"یہ ایک ہیبت ناک رات ہے۔" جولیا نے کہا۔

"کہرے نے شہر کے بڑے حصے کو گھیر لیا ہے۔ ابھی ریڈیو سے میئر کی تقریر نشر ہوئی۔ انہوں نے امید ظاہر کی ہے کہ حالات جلد ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"مجھے اپنے والد کی فکر ہے۔" جارج نے بچے کو انجکشن دیتے ہوئے کہا۔ "وہ ویسے بھی بیمار رہتے ہیں۔ بالکل تنہا ہیں۔ اور ان حالات میں تو... خدا سب پر اپنا کرم کرے۔"

"تم کہاں رہتے ہو؟" جولیا کے سوال پر اس نے اپنا ایڈریس بتایا۔ جولیا نے کہا کہ اس کا ایک کزن اسی علاقے میں مقیم ہے۔

"میں اسے فون کیے دیتی ہوں۔ اور ویسے بھی جنوبی حصہ کہرے سے محفوظ ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ خیریت سے ہوں گے۔" اس نے جارج کا کاندھا تھپکا۔

"ہاں۔ مجھے بھی امید ہے۔"

ابھی وہ یہی باتیں کررہے تھے کہ ایمبولینس کا سائرن سنائی دیا۔ اگلے ہی لمحے دو آدمی اسٹریچر اٹھائے داخل ہوئے۔ اس پر پڑا شخص شدید زخمی تھا اور درد سے کراہ رہا تھا۔ سر اور کاندھے سے خون بہہ رہا تھا۔

زخمی شخص وہی ڈرائیور تھا جس کے ٹرک کو سارجنٹ نے دھند میں غائب ہوتے دیکھا تھا۔

☆☆☆

جولیا نے اپنے کزن کا نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ نہیں ہوسکا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ نتائج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اس نے نظر اٹھا کر جارج کو دیکھا۔ وہ زخمی کی مرہم پٹی کررہا تھا۔ وہ جولیا کو دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ لڑکی نے سر ہلا کر جواب دیا۔

ایک بار پھر اس کی انگلیاں نمبر ڈائل کرنے لگیں۔ کلینک کی کھڑکیوں سے کہرے کے سفید بھوت اندر جھانک رہے تھے۔

دوسری طرف ناظمِ شہر کے دفتر میں نصب فون کی گھنٹی بجی۔ ریپرٹ نے فوراً ریسیور اٹھایا۔ محکمۂ موسمیات کا ڈائریکٹر لائن پر تھا۔

"کوئی کامیابی ملی؟" میئر نے سوال کیا۔

"اب تک کے جائزے سے ہم نے کچھ ابتدائی اندازے قائم کیے ہیں۔" ڈائریکٹر کی آواز دور سے آتی سنائی دی۔ "میں معروف ماہرِ ماحولیات جیمز کیری سے بھی رابطے میں ہوں۔ ہمیں لگتا ہے کہ..." اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "ماحول میں پُراسرار طور پر سلفر کی مقدار بڑھ رہی ہے۔"

"پُراسرار طور پر؟" میئر کی آواز میں چبھن تھی۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ اس کے پیچھے کوئی مافوق الفطرت قوت ہے۔ کیوں؟"

"میرا یہ مطلب نہیں سر۔" ڈائریکٹر نے فوراً کہا۔ "لیکن ابھی ہم اس کی وجہ نہیں سمجھ پارہے۔ البتہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صبح تک ہم مسئلے کی جڑ تک پہنچ جائیں گے۔ مسٹر کیری خرابیٔ صحت کے باوجود اس کام میں جٹے ہیں۔"

میئر نے فون رکھ دیا۔ وہ کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ اس کا دفتر ایک سرسبز ٹیلے پر تھا۔ یہاں کھڑے ہوکر وہ کل تک شہر کو دیکھا کرتا تھا، مگر اس وقت وہاں دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ بس ٹھنڈ تھی اور دھواں تھا۔

☆☆☆

گھڑیاں جیسے رک گئیں۔

وہ قیامت کی رات تھی۔ نورمن نے شمال سے آتے کہرے کو جنوب پر چھاتے دیکھا۔ کہرا، جس میں موت کی چاپ تھی۔

اس نے خود کو لحاف سے ڈھانپ لیا۔ ایک تولیا گیلا کر کے پاس رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد اس علاقے میں گھنی دھند قابض ہوگئی۔

وہ لمحے صدیوں کی مانند تھے۔ نہ جانے کب تک وہ یونہی بیٹھا رہا۔

اب اس کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ دھیرے دھیرے منظر دھندلا رہا تھا۔ نورمن نے آنکھیں ملیں مگر دھندلاہٹ قائم رہی۔ تب اسے اندازہ ہوا، کہرا کونوں کھدروں سے کیبن میں داخل ہورہا ہے۔

وہ گھبرا گیا۔ اپنی زندگی میں اس نے کئی بار لندن کو کہرے کی لپیٹ میں دیکھا تھا مگر یہ منظر... پریشان کن حد تک ناقابلِ یقین تھا۔

اچانک ٹھنڈ بڑھ گئی۔ اس نے آتش دان کی طرف دیکھا۔ وہ دھیما پڑ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد وہ پُراسرار طور پر بجھ گیا۔

اور تب... دروازے پر دستک ہوئی۔

"کون ہے؟" نورمن نے آواز لگائی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

دستک پھر ہوئی۔ نورمن کھڑا ہوگیا۔ وہ دروازے تک گیا۔ جھری سے دیکھا۔ باہر ایک ہیولا تھا جو دھند کے درمیان ایستادہ تھا۔

اس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ "کون ہیں آپ؟"

"نورمن ونسٹ؟" ایک دبی ہوئی آواز نے سوال کیا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اگلے ہی لمحے اس ہیولے نے اسے کہرے میں گھسیٹ لیا۔

☆☆☆

وہ سڑک نہیں تھی، گاڑیوں کا مردہ خانہ تھا۔

قطار سے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ڈرائیور انہیں چھوڑ کر جاچکے تھے۔ وہ ٹھنڈ اور دھند کے درمیان ہیبت ناک معلوم ہوتی تھیں۔

جارج تیزی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی منزل جنوبی علاقہ تھا جہاں اس کا بوڑھا باپ ایک کیبن میں اس کا منتظر تھا۔

وہ ایک گھنٹے قبل کلینک سے نکلا تھا۔ جولیا کوشش کے باوجود اپنے کزن سے رابطہ نہیں کرسکی تھی مگر اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھے گی۔ ساتھ ہی اس نے جارج کا شکریہ بھی ادا کیا۔

عام دنوں میں وہ ڈیڑھ گھنٹے میں گھر پہنچ جاتا مگر اس وقت وہ ٹٹول کر، بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا اور جوں جوں جنوبی حصے میں داخل ہورہا تھا، یہ احساس قوی ہوتا جارہا تھا کہ حکومتی اندازے غلط ہیں۔ فقط شمالی حصہ نہیں، پورا شہر کہرے کی لپیٹ میں ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شام کے برعکس اب سڑکیں خالی تھیں۔ کوئی انسان نہیں تھا۔ وہاں فقط سناٹا اور تاریکی تھی۔

اچانک اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے زیادہ دھیان نہیں دیا۔

کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ کوئی تیزی سے اس کے پیچھے آرہا ہے۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ ایک سایہ تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ جارج تک پہنچ گیا۔ اس آدمی کا چہرہ ہیٹ میں چھپا تھا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" آواز کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"بارہ بجنے والے ہیں۔" جارج نے اپنی گھڑی دیکھی۔

اچانک اسے اپنے پہلو میں حدت کا احساس ہوا۔ پھر چبھن نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ اس نے نیچے دیکھا۔ حیرت نے اسے آن لیا۔ پیٹ کے دائیں حصے سے خون نکل رہا تھا۔ چاقو سے حملہ ہوا تھا۔

کمزوری نے حملہ کیا۔ وہ غش کھا کر گر گیا۔ آدمی اس پر جھکا۔ جیبیں خالی کرنے کے بعد اٹھا۔ چاقو صاف کیا اور کہرے میں گم ہو گیا۔

نقاہت سے جارج کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ٹھنڈ کا کفن آسمان سے اترنے لگا۔ اچانک... ایک مانوس آواز سماعتوں میں گونجی۔ "بیٹا!"

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ آواز پھر سنائی دی۔ "جارج بیٹا۔"

اس نے ہمت باندھی۔ دیوار کے سہارے کھڑا ہو اور گرتا پڑتا اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ خون کی لکیر بھی آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ شدید زخمی تھا۔

ٹھنڈ سے مقابلہ کرتے کرتے بالآخر وہ اپنے گھر تک پہنچ گیا۔ اور یہ دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی کہ دروازے کا ایک پٹ کھلا ہے۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہاں ماسوائے بجھے ہوئے آتش دان اور دھند کے... کچھ نہیں تھا۔

اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کسی ہلچل کے نشان نہیں تھے۔

"ڈیڈی!" اس نے باپ کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ دل میں اندیشے ابھرنے لگے۔ آنکھوں میں نمی کا ظہور ہوا۔

"ڈیڈی!" اس بار آواز رندھ گئی۔ "آپ کہاں ہیں؟"

نقاہت کے بعد مایوسی کا آسیب جکڑ چکا تھا۔

وہ خود کو گھسیٹتا ہوا بستر تک گیا اور دھم سے گر گیا۔

"ڈیڈی..." آنکھیں بند ہونے لگیں۔

☆☆☆

سارجنٹ اپنے اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ وہاں سناٹے کا راج تھا۔

"ٹام!" اس نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ آواز میں اندیشے تھے۔ آواز بازگشت میں بدل کر گم ہو گئی۔ کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے گھر کا کونا کونا کھنگال مارا۔ مگر نہ وہاں ٹام تھا، نہ اس کی بیوی ماریہ۔ سارجنٹ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس نے فوراً اسٹیشن کا نمبر ڈائل کیا۔ کافی دیر تک بیل جاتی رہی پھر آفیسر اینڈی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو!" آواز میں غنودگی تھی۔

"کیا تم سو رہے تھے؟" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"نہیں سر۔ ہاں سر... میرا مطلب ہے۔" آفیسر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "سر آپ گھر پہنچ گئے؟ سب ٹھیک ہے وہاں؟"

سارجنٹ نے جی کڑا کیا۔ "ہاں سب ٹھیک ہے۔ میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔"

ریسیور رکھ کر وہ مڑا۔ سامنے آئینہ تھا، اس میں ایک شکستہ شخص کھڑا تھا۔ ایک باپ، ایک شوہر، تفکرات جس کے چہرے سے عیاں تھے۔

دفعتاً ایک کھٹکا ہوا۔ فرش پر ایک جھری بنی تھی جس سے روشنی آرہی تھی۔

"تہ خانہ۔" اس کے ذہن میں بجلی کوندی۔ کچھ دیر بعد وہ تہ خانہ کے دروازے پر تھا۔ اس نے لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا۔

"ٹام؟" اس نے آواز لگائی۔

"ڈیڈ آپ آگئے۔" ایک معصوم آواز اس تک پہنچی۔

سارجنٹ کو لگا جیسے منوں وزنی بوجھ اس کے سر سے اتر گیا ہو۔

☆☆☆

وہ ایک قاتل رات تھی، جس کے اختتام پر ایک وحشت ناک دن طلوع ہوا۔

6 دسمبر... بیت چکے دن سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ ٹھنڈ اور کہرے نے سورج کے آگے پردہ ڈال دیا تھا۔ کئی افراد تو گھروں سے نکلے ہی نہیں اس روز۔

جارج کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے جسم کو مفلوج پایا۔ وہ ایک سرد قبرستان میں تھا۔

چند ساعت وہ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اس نے خود کو ہلایا جلایا۔ تھوڑی دیر بعد جسم حرکت کے قابل ہو گیا۔ جب

بستر سے اٹھنے کی کوشش کی، پیٹ پر شدید کھنچاؤ محسوس ہوا۔

اسے رات کا واقعہ یاد آگیا۔ اس نے سب سے پہلے فرسٹ ایڈ بکس تک رسائی حاصل کی۔ اپنی مرہم پٹی کے بعد اس نے آتش دان روشن کیا۔ ٹھنڈا پانی حلق میں اتارا۔

حواس بحال ہوئے تو اپنے باپ کے بارے میں سوچنے لگا۔

"کہاں جاسکتے ہیں؟" اس نے خود سے سوال کیا۔

کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پھر ایک عزم کے ساتھ کھڑا ہوا۔ "مجھے انہیں تلاش کرنا ہوگا۔"

اب وہ سڑک پر تھا۔ وہی سڑک جس پر دبیز دھواں بھرا تھا۔ پہلے اس نے پاس پڑوس میں معلوم کیا۔ محلے داروں نے نفی میں گردن ہلائی۔ وہ بے حد اکتائے ہوئے اور خوفزدہ دکھائی دیتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک شخص نے اسے بتایا کہ جب سے کہرا نازل ہوا ہے، چور اچکے سرگرم ہو گئے ہیں۔ وہ سڑکوں پر لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ گھروں میں ڈکیتیاں ہو رہی ہیں۔

"کہیں تمہارا باپ بھی کسی حادثے کا شکار نہ ہو گیا ہو!" اس جملے نے جارج کو اندیشوں میں دھکیل دیا مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرے خیال میں ان کی طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔ دمے کے مریض ہیں۔ شاید کسی اسپتال چلے گئے ہوں۔ وہاں چیک کرتا ہوں۔"

اب اس کے قدم قریبی اسپتال کی سمت بڑھ رہے تھے۔ وہاں استقبالیہ کاؤنٹر پر رش لگا تھا۔ بمشکل اس کی باری آئی۔

کوشش بے ثمر گئی۔ وہاں پچھلے چوبیس گھنٹوں میں نورمن ونسٹ نام کا کوئی مریض نہیں لایا گیا تھا۔

اس اسپتال سے نکل کر وہ دوسرے اسپتال کی سمت بڑھا۔ وہاں سے بھی یہی جواب ملا۔ پھر تیسرے اسپتال کی جانب۔ یہ کوشش بھی ناکام گئی۔

اب اس پر مایوسی طاری ہونے لگی۔ زخمی ہونے کے باعث نقاہت بھی تھی۔ پھر ٹھنڈ اور کہرا۔ اگر وہ یونہی چلتا رہا تو شاید سڑک ہی پر موت کو گلے لگا لیتا۔

سوچ بچار کے بعد وہ سینٹرل اسپتال کی جانب چل پڑا۔ سینٹرل اسپتال... جہاں وہ ملازم تھا۔

"لوگ مشکل میں ہیں۔ اسپتال میں میری ضرورت ہوگی۔"

اسپتال پہنچتے ہی وہ اپنے زخم کو بھول گیا کہ وہاں زخمیوں کا، مریضوں کا جمِ غفیر تھا۔ ہر شخص مدد کا طلب گار تھا۔

اب جارج زخمیوں کی مرہم پٹی کر رہا تھا۔ بیماروں کو دوا دے رہا تھا۔ مسکراتے ہوئے مریضوں کا حوصلہ بڑھا رہا تھا۔ مگر اندر... آنسو رواں تھے۔ لبوں پر دعائیں تھیں۔ اپنے باپ کی سلامتی کی دعائیں۔

قدرت کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔

☆☆☆

دوپہر اتر آئی مگر سردی میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ کہرا جوں کا توں تھا۔

میئر کے دفتر میں اعلیٰ سطح کی میٹنگ جاری تھی۔ پولیس چیف، محکمۂ موسمیات کا ڈائریکٹر، ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ، شہری امور کے ماہر... سب ہی وہاں موجود تھے۔ ضعیف العمر ماہرِ ماحولیات جیمز کیری بھی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکرات کی گہری لکیریں تھیں۔

میئر نے بات شروع کی۔ "جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت ہم ایک مشکل سے دوچار ہیں۔ سب سے پہلے میں امن و امان کی صورتِ حال جاننا چاہوں گا۔"

پولیس چیف نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "حالات واقعی کٹھن ہیں جناب۔ جرائم کی شرح میں پریشان کن اضافہ دیکھا گیا ہے۔ ہمیں چوریوں، ڈکیتیوں کی درجنوں رپورٹس موصول ہوئی ہیں۔ وارداتوں کے دوران کئی افراد زخمی بھی ہوئے۔ کئی افراد کے لاپتا ہونے کی اطلاع ہے۔ بدقسمتی سے پولیس اس ضمن میں زیادہ کچھ نہیں کر سکی۔ ہمارے حالات بھی اوروں جیسے ہیں۔ کہرے کے باعث حدِ نگاہ فقط دو سو میٹر رہ گئی ہے۔ سڑکیں بلاک ہو چکی ہیں۔"

میئر خاموشی سے سنتا رہا۔ پھر وہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کی جانب متوجہ ہوا۔ "اسپتالوں میں کیا حالات ہیں؟"

"ابھی کچھ واضح نہیں۔" ڈائریکٹر نے سر ہلایا۔ "ابتدائی اطلاعات کے مطابق گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں اسپتالوں میں ریکارڈ تعداد میں مریض لائے گئے۔ بیش تر سانس لینے میں دشواری اور آنکھوں میں جلن کی شکایت کر رہے تھے۔ دم گھٹنے کے باعث چار افراد کی ہلاکتوں کی بھی اطلاع ہے۔ ہم ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں لیکن کہرے نے ہر کام ٹھپ کر دیا ہے۔ ایمبولینس سروس لگ بھگ معطل ہے۔ وہ پانچ کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے پر مجبور ہیں۔ کچھ علاقوں میں تو ایک شخص کو راہ نمائی کے لیے ایمبولینس کے آگے آگے چلنا پڑتا ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب شہری حکومت کے نمائندے کے باری تھی۔ ”مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے جناب میئر کہ لندن باقی دنیا سے کٹتا جارہا ہے۔ انٹرپورٹ بند کردیا گیا ہے۔ ٹرین سروس معطل ہے۔ بندرگاہ خاموش ہے۔ ہمارے لیے بسیں چلانا لگ بھگ ناممکن ہوگیا ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ حالات نہیں بدلے تو بجلی کا نظام بھی درہم برہم ہوجائے گا۔“

وہ ماہرِ ماحولیات کی جانب مڑا۔ ”حالات میں بہتری کا کوئی امکان ہے مسٹری کیری؟“

اس ضعیف آدمی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ آنکھیں ملیں۔ پھر گویا ہوا۔ ”یہ کہرا... دراصل نارتھ سی سے آنے والا گرم ہوا کا بادل ہے، جو لندن پر چھا گیا ہے۔ ماضی میں بھی ہم نے کہرے کا سامنا کیا لیکن یہ یکسر مختلف ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ یہ مہلک ہے۔“

”اور اس کی وجہ؟“ میئر نے سوال کیا۔

”دراصل ہوا بالکل ساکت ہے۔ عموماً لندن کی فضا کو شمالی سمندر اور انگلش چینل سے آنے والی ہوائیں صاف کرتی ہیں مگر فی الحال اس کا امکان دکھائی نہیں دیتا۔ کہرا میرے خیال میں ابھی مزید دو روز رہے گا۔ اس کے علاوہ ایک اور نکتہ ہے جس کی جانب میں آپ سب کی توجہ دلانا چاہوں گا...“ اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ ”میرے تجزیے کے مطابق کہرے کے معکوس گرد باد کی وجہ سے لندن اپنی تاریخ کے بدترین سانحے سے دوچار ہونے جارہا ہے۔ دھند نے جیسے شہر کو اپنے اندر قید کر لیا ہے۔ ایک جانب جہاں تازہ ہوا اندر نہیں داخل ہو پا رہی، وہیں شہر کی فضا میں گردش کرتی آلودگی کو بھی باہر کا راستہ نہیں مل رہا۔ اور یہی آلودگی ہلاکت خیز ثابت ہو رہی ہے۔“

وہ سانس لینے کے لیے رکا۔ سب کی نظریں اس پر ٹکی تھیں۔ ”سردی کی وجہ سے کوئلے کا استعمال اس برس بڑھ گیا ہے۔ صنعتوں کی چمنیوں نے بھی دھواں اگلنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ دھواں سم قاتل ہے۔ بدقسمتی سے ماضی کے برعکس اس بار یہ زہر ہواؤں میں ٹھہر گیا ہے کیونکہ کہرے کے باعث اسے اوپر جانے کی جگہ نہیں مل رہی۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہر سانس کے ساتھ تیزابی زہر اندر اتار رہے ہیں۔“

”کیا ہم لوگوں کو کوئلے کے استعمال سے روک نہیں سکتے؟“ میئر نے کہا۔ ”اس طرح یہ مسئلہ بڑی حد تک حل ہوجائے گا۔“

”بلاشبہ ہم روک سکتے...“ ضعیف العمر شخص نے جواب دیا۔ ”مگر خدشہ ہے کہ اس طرح عوام سردی سے ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ اور ویسے بھی... اب بہت دیر ہوچکی ہے۔ قدرت نے ہمیں قتل کرنے کے لیے مطلوبہ مقدار میں سلفر اکٹھا کرلیا ہے۔“

میٹنگ روم میں سناٹا چھایا تھا۔ کامل سناٹا۔

باہر تیزابی دھواں پھنکار رہا تھا۔ چمنیاں مکروہ قہقہے لگا رہی تھیں۔

☆☆☆

جارج رات گئے لوٹا۔ کیبن سُونا پڑا تھا۔ باپ کے بستر پر ایک اداس خالی پن براجمان تھا۔

اسپتال سے نکلنے کے بعد جارج نے اُسے خاصا تلاش کیا مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ لندن ایک بھرا پُرا شہر تھا۔ اوپر سے یہ کہرا۔ تمام راہیں جیسے مسدود ہوگئی تھیں۔

صدمے سے وہ بستر پر گر گیا۔ دکھ غنودگی کی صورت اترا۔ سانس اٹکنے لگی... آنکھیں بند ہونے لگیں۔

وہ بے خوابی سے بدتر نیند تھی۔ بدرنگ خوابوں میں وہ سایوں کا تعاقب کرتا رہا۔ کبھی وہ بے انت سرنگ میں ہوتا، کبھی سیلن زدہ تہ خانے میں۔ کبھی چیخوں سے اس کے کان پھٹ جاتے۔ کبھی ہیبت ناک سناٹا کانوں میں برچھی بن کر گھستا۔

اس دوران ایک دوبار اس کی آنکھ کھلی۔ احساس ہوا کہ کوئی دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ پھر وحشت ناک غنودگی نے حملہ کیا۔ بے رنگ خواب لوٹ آئے۔

نیا سورج طلوع ہوگیا تھا مگر ماحول تبدیل نہیں ہوا۔ سب جوں کا توں تھا۔ وقت ٹھہرا ہوا۔ شہر جہنم کی مثل۔ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ جارج کی آنکھ کھل گئی۔

کیبن میں سناٹا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے دستک اس کا واہمہ تھا۔

شاید وہ دوبارہ سو جاتا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ وہ بہ مشکل کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھا۔ دروازہ کھلا تو کہرا اندر داخل ہوا۔

سامنے ایک سایہ تھا۔ وہ ایک دراز قد آدمی تھا۔ چہرے پر اکتاہٹ۔ ہونٹ نیلے۔

جارج کو بے چینی محسوس ہوئی۔ ”جی کون؟“

”کیا گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے؟“ اجنبی کی آواز میں بے زاری تھی۔ ”میں کل رات بھی یہاں آیا تھا۔ آج صبح پھر آیا۔ دونوں بار اندر سے تمہارے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہے تھی۔ یہ میرا تیسرا چکر ہے۔“

”جی معذرت چاہتا ہوں۔ وہ میں...“

”جولیا کو جانتے ہو؟“ اجنبی نے بات کاٹ دی۔

”جولیا...“ اس کے ذہن میں برسوں کی وہ رات گھوم گئی جب کہرے کا نزول ہوا تھا۔ اور ایک طبی مرکز میں اس کی ملاقات ایک نیلی آنکھوں والی دوشیزہ سے ہوئی۔ ”اُس کے کہنے پر میں تمہارے باپ کو یہاں سے لے گیا تھا۔ ورنہ تو بوڑھا مر جاتا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا اور لاتعلقی سے چل دیا۔

”میرا باپ... کہاں ہے وہ؟“ وہ چلایا۔

”ایک طبی مرکز میں۔ امید ہے وہ ابھی زندہ ہوگا۔“ جاتے جاتے اس نے کہا۔ پھر وہ اچانک مڑا۔ ”کیا تم اُس لڑکی سے محبت کرتے ہو؟“

وہ بوکھلا گیا۔ ”محبت؟“

”نہیں کرتے۔“ اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ”میں جانتا تھا۔ میں جانتا تھا۔“

یہ کہہ کر وہ کہرے میں غائب ہوگیا۔

☆☆☆

چمنیوں کا کثیف دھواں کہرے سے مل کر زہر بن گیا۔

سلفر کے اُس عفریت نے شہر پر حملہ کردیا۔ کئی لوگوں کی بینائی چلی گئی۔ وہ گھروں میں بیٹھے بیٹھے اندھے ہوگئے۔ کئی افراد دم گھٹنے کے باعث مر گئے۔ لندن دنیا سے جدا ہوگیا۔ راستے مسدود ہوگئے۔ تہذیب کا سب سے بڑا مرکز کھنڈر کی تصویر پیش کررہا تھا۔

جارج دوڑ رہا تھا۔ مسلسل۔ رکاوٹیں پھلانگتے ہوئے، لوگوں سے ٹکراتے ہوئے، کہرا چیرتے ہوئے... وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بھٹک گیا ہے۔ وہ ٹھہر گیا۔ کہرے پر نظریں جمائیں۔

کہرا گھنا اور گھاتک تھا۔ تاریکی تھی۔ سورج چھپ چکا تھا۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ واقعی بھٹک گیا تھا۔ جارج نے توجہ مرکوز کی اور پھر وہ اندازے پر ایک سمت بڑھنے لگا۔

وہ تیز تیز چل رہا تھا۔ اضطراب بڑھا تو دوڑنے لگا۔ سڑکوں پر وحشت تھی اور اس پر بھی وحشت سوار تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر رفتار کم کی، اگر وہ رکا تو اپنے باپ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو دے گا۔

اچانک اسے کسی نے پکارا۔ جارج نے مڑ کر دیکھنا چاہا تو پیر رپٹ گیا۔ وہ زمین پر آرہا۔

ابھی وہ اٹھنے کی کوشش کررہا تھا کہ دھند میں دو خوفناک آنکھیں ظاہر ہوئیں۔ ان سے آگ نکل رہی تھی۔ شاید وہ موت کا اژدہا تھا جو اس کے قریب آرہا تھا۔

”جارج...!“ کسی نے پھر اسے پکارا۔

اژدہا قریب آگیا۔ زمین لرزنے لگی۔ وہ ایک جیپ تھی جو پوری رفتار سے اس کی سمت آرہی تھی۔

کسی نے اسے پکڑ کر گھسیٹ لیا۔ وہ بال بال بچا۔ جیپ فراٹے بھرتے ہوئے پاس سے گزر گئی۔

”تم ٹھیک تو ہو؟“ ایک مانوس آواز سماعتوں سے ٹکرائی۔

جارج کے سامنے ایک حسین چہرہ تھا۔ ایک لڑکی، جس کی نیلگوں آنکھوں میں محبت تھی۔ وہ جولیا تھی۔

”اوہ جولیا... تم... وہ میں... میرے ڈیڈی...“ وہ انتہائی خستہ حال معلوم ہوتا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ جولیا نے اسے تھام لیا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ چلو۔“

وہ جولیا کے سہارے کھڑا ہوا۔ پیر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ دونوں نے سڑک پار کی۔

وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کلینک کے سامنے تھے جہاں دونوں پہلی بار ملے تھے۔

جولیا اسے اندر لے گئی۔ کہرا پھلانگ کر وہ آخری کونے میں گئے۔ وہاں جنرل وارڈ تھا۔ جولیا نے دروازہ کھولا۔

اندر تاریکی تھی۔ اس سے قبل کہ جارج کی آنکھیں ماحول سے ہم آہنگ ہوتی وہاں کوئی چیخا۔ ”کہاں تھے بھئی۔ کب سے تمہارا انتظار کررہا ہوں۔“

وہ اس کا باپ تھا۔ نورمن ونسٹ۔ وہ بستر پر لیٹا مسکرا رہا تھا۔

”میرا کزن انہیں پرسوں رات ہی یہاں لے آیا تھا۔ تمہارے کلینک سے نکلتے ہی میرا اس سے رابطہ ہوگیا تھا۔“ جولیا نے بتایا۔ ”ان کی طبیعت ناساز تھی، مگر اب یہ ٹھیک ہیں۔“

جارج کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ احساسِ تشکر سے لبریز تھا۔

”میں تمہارا ممنون ہوں۔ میں بتا نہیں سکتا کہ...“ آواز رندھ گئی۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ جولیا نے بڑی محبت سے اس کے آنسو پونچھے۔ ”جاؤ، تمہارے والد انتظار کررہے ہیں۔“

وہ آگے بڑھا اور اپنے باپ کے سینے سے لگ گیا۔ وہ کسی بچے کی طرح رو رہا تھا۔

”چلو یار تم مجھے بھی رُلا دو گے۔“ بوڑھے نے اس کا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر جولیا سے مخاطب ہوا۔ ”پیاری لڑکی، دو کپ کافی ملے گی؟“

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ضرور۔" جولیا مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"اچھی لڑکی ہے۔" بوڑھے نے اپنے بیٹے سے کہا۔ "میرا بہت خیال رکھا۔"

"ہاں۔" جارج نے آنسو پونچھے۔ "اچھی لڑکی ہے۔ اوہ ڈیڈ، میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ آپ کو دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوئی۔"

"مجھے بھی ہوئی۔" بوڑھا مسکرایا۔

وہ ایک چھوٹا سا کلینک تھا جہاں خوشی دمک رہی تھی اور خوشی کی دمک سے تاریکی کمزور ہو رہی تھی۔ محبت کی حدت سے ٹھنڈ سکڑنے لگی۔

وہ دو آدمی تھے، جن کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے اور ایک لڑکی جو اس رات مسرت سے لبریز تھی۔

دور سمندر سے تبدیلی کی ہوا آ رہی تھی۔ زندگی لوٹ رہی تھی۔

☆☆☆

سکوت ٹوٹ گیا۔

8 دسمبر کی صبح لندن میں تازہ ہواؤں کی آمد ہوئی۔ وہ کہرے کے حصار میں داخل ہوئیں اور اسے ادھیڑ ڈالا۔ مہلک دھند اور سلفر ہواؤں کے ساتھ اڑتے ہوئے لندن سے چلے گئے۔

فضا صاف ہوگئی۔ راستے روشن تھے۔ درختوں نے انگڑائی لی۔ پرندے چہکے۔

لندن جاگ رہا تھا۔ وہ زندگی کی سمت لوٹ رہا تھا۔

جارج اپنے باپ کے سامنے بیٹھا تھا۔ پہلو میں جولیا تھی۔ وہ تینوں مسرور تھے۔

دھند چھٹ گئی۔ قاتل کہرا چلا گیا۔ سارجنٹ نے خدا کا شکر ادا کیا۔ محکمۂ موسمیات کے ڈائریکٹر نے سکون کا سانس لیا۔ میئر نے تقریر تیار کر لی۔

سب خوش تھے۔ مطمئن تھے۔ بس ایک شخص پریشان تھا۔ وہ بوڑھا جیمز کیری تھا۔ ماحولیاتی ماہر۔

وہ بری خبروں کا منتظر تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سلفر اپنے نشان چھوڑتا ہے۔ اور وہ غلط نہیں تھا۔ شام تک بری خبروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا... اور اگلے کئی روز تک یہ خبریں جاری رہیں۔

شہر کے کونوں کھدروں سے لاشیں ملنے لگیں۔ ایسے کئی گھر تھے، جہاں بسنے والے پورے پورے خاندان کو کہرے نے نگل لیا۔ کچھ سردی سے مر گئے۔ کئی افراد کی بینائی چلی گئی تھی۔ کئی پھیپھڑوں کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ اسپتال بھی اپنے کئی مریضوں کی زندگی نہیں بچا سکے۔

ابتدا میں انتظامیہ نے دو ہزار ہلاکتوں کی تصدیق کی۔ اگلی صبح تک تعداد چار ہزار ہو چکی تھی اور یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔ اور پھر اس سطح تک جا پہنچی کہ لوگ ہیبت سے کانپ اٹھے۔

دسمبر 1952 میں لندن پر اترنے والا کہرا بارہ ہزار لوگوں کی جان لے چکا تھا۔

اس واقعے نے سب کچھ بدل دیا۔ حکومت شدید تنقید کی زد میں آ گئی۔ عوام سڑکوں پر نکل آئے۔ اُن مظاہروں کی یاد تازہ ہوگئی جو لندن کے باسیوں نے تیس برس قبل ماحولیاتی آلودگی کے خلاف کیے تھے۔

عوامی دباؤ نے انتظامیہ کو اقدامات پر مجبور کر دیا۔ دنیا بھر کے ماہرین کو اکٹھا کیا گیا۔ لندن کے ماحول کے معیار اور آلودگی کے اسباب کا جائزہ لینے کے لیے ٹیمیں تشکیل دی گئیں۔

یہ ایک طویل اور تھکا دینے والا عمل تھا۔ منصوبے پر خاصی لاگت آئی مگر عوام کے مطالبے کے پیش نظر حکومت اسے جاری رکھنے پر مجبور تھی۔ بالآخر تین برس کی کوششوں کے بعد ماہرین کی ٹیم نے ایک جامع رپورٹ مرتب کی جس میں آلودگی کم کرنے اور اس نوع کے مسائل سے نمٹنے کے لیے تجاویز دی گئی تھیں۔

پارلیمنٹ میں زور شور سے اس رپورٹ پر بحث ہوئی۔ تجزیے کیے گئے۔ 1956 میں ان تجاویز کی روشنی میں "کلین ائر ایکٹ" برطانیہ میں نافذ کر دیا گیا۔ اس ایکٹ کے نفاذ میں عوام نے انتہائی مثبت کردار ادا کیا۔ شہریوں نے حکومت سے بھرپور تعاون کیا۔ آلودگی میں کمی واقع ہونے لگی۔ حکومت مطمئن ہوگئی، تاہم دسمبر 1962 میں لندن کا سکون ایک بار پھر غارت ہوگیا۔

ایک اور قاتل کہرا شہر کو گرفت میں لے چکا تھا۔

ماضی کا تجربہ اور حکومتی کوششیں لندن کے لیے ثمر آور ثابت ہوئیں۔ ماضی کے برعکس صرف سو افراد اس کہرے سے ہلاک ہوئے۔

دھند چھٹنے کے بعد لندن کی شہری انتظامیہ نے ایک بیان جاری کیا، جس میں آلودگی کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کے عزم کا اعادہ کیا گیا۔

جب جارج نے یہ بیان پڑھا تو اس نے اپنی بیوی جولیا کو مخاطب کیا۔ "بلاشبہ انہیں یہ جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ ورنہ تہذیب کا یہ مرکز ایک دن کھنڈر بن جائے گا۔"

پاپارازی

ابن کبیر

وہ اپنی طرز کا انوکھا فوٹو گرافر تھا۔ پوری دنیا اسے بھنبھناتے مچھر سے تشبیہ دیتی تھی۔ اس لیے کہ وہ کسی کو نقصان تو نہیں پہنچاتا تھا مگر اتنا زیادہ اور اس طرح تعاقب کرتا تھا کہ لوگ جھنجلا اٹھتے تھے۔ مارلن برانڈو جیسا اداکار اس کے دانت توڑنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

دنیا بھر میں سب سے زیادہ متنازع فوٹو گرافر کی داستان

وہ 1971 کی ایک خاموش سہ پہر تھی۔ دنیا کے متنازعہ ترین فوٹو گرافر کی کہانی۔ نیویارک میں آج ٹریفک معمول سے کم تھا۔ سڑکوں پر اڑتے خشک پتے موسمِ سرما کی آمد کا پتا دے رہے تھے۔

ایک عورت اپنی گاڑی سے اتری۔ اس نے چست لباس پہن رکھا تھا۔ کھلے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ دھوپ کی عینک ہاتھ میں تھی۔

سڑک سے گزرتے ہوئے دفعتاً ایک بے نام الجھن

نے اسے گھیر لیا۔ یہ احساس ستانے لگا کہ کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ کسی کی شاطر نظریں اس پر ٹکی ہیں۔

کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی تھی۔ ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھا شخص چہرے سے اطالوی لگتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ ایک گھاگ شکاری کی مانند تھا، جو اس لمحے خاموشی سے اپنے شکار کی حرکات وسکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔

عورت چند ساعت خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے گہری سانس لی اور اپنے راستے پر ہو لی۔

آدمی نے ٹیکسی ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی کچھ فاصلے سے عورت کا تعاقب کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد عورت ایک شاپنگ مال کے سامنے پہنچی۔ ٹھیک اسی لمحے اس آدمی کو شدت سے احساس ہوا... کہ اگر وہ ابھی حرکت میں نہیں آیا تو موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ساری محنت غارت جائے گی۔

"ہارن بجاؤ۔" اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔

"جلدی۔"

ڈرائیور نے ہاتھ ہارن پر رکھ دیا۔

چال کامیاب گئی۔ شور سن کر عورت مڑی۔ اس کا آدھا چہرہ لہراتے بالوں کے پیچھے چھپا تھا۔ بالوں میں سورج کی سنہری کرنیں حرکت کر رہی تھیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔

یہی موقع تھا۔ آدمی فوراً حرکت میں آیا۔ فلیش چمکا اور وہ لازوال لمحہ کیمرے میں قید ہو گیا۔

عورت نے آدمی کو نظر انداز کر دیا اور شاپنگ مال میں داخل ہو گئی۔

"چلو۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "کام ہو گیا۔"

"کیا یہ تمہاری گرل فرینڈ ہے؟" ڈرائیور کے لہجے میں تذبذب تھا۔

"گرل فرینڈ؟" آدمی نے قہقہہ لگایا۔ "ہاں، ایسا ہی سمجھ لو۔"

وہ خوبرو عورت جیکی تھی... جیکولن کینیڈی۔ امریکا کی سابق خاتونِ اول۔ کینیڈی کی بیوہ۔

اور ٹیکسی کی پچھلی نشست پر بیٹھا شخص دنیا کا متنازعہ ترین فوٹو گرافر رون گوگیلا تھا۔ ایک پاپارازی۔ حقیقی تاثرات کا متلاشی۔

وہ کیمرا تھامے معروف فلمی ہستیوں کا پیچھا کرنے اور اچانک اُن پر دھاوا بول دینے کے لیے بدنام تھا۔ اپنی اس دیوانگی کے باعث اسے کئی بار مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی اس کے خلاف مقدمہ دائر ہوا۔ کبھی کسی فنکار نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ مُکّا مار کر دانت توڑ دیا، مگر وہ حقیقی تاثرات کی تلاش سے باز نہیں آتا، کیونکہ یہ اس کا جنون تھا۔

یہی جنون اس خاموش سہ پہر کو جیکی کا تعاقب کروا رہا تھا۔ وہ ایک جادوئی تصویر کا خواہش مند تھا۔

البتہ اس نے ڈرائیور سے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ وہ واقعی جیکی سے محبت کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

نیویارک کے قصبے برونکس پر سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ ونسنزو گھر سے ملحقہ چھوٹے سے کارخانہ میں موجود تھا جو لکڑی کے چھوٹے بڑے تختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایک جانب اوزار رکھے تھے جن میں آریوں کی کثرت تھی۔ فرش پر لکڑی کا برادہ بکھرا تھا۔ سامنے والی دیوار کے سہارے قطار سے چار تابوت رکھے تھے۔

ونسنزو ایک اطالوی تارکینِ وطن تھا۔ کچھ ہی برس قبل وہ اپنی بیوی کے ساتھ روزگار کی تلاش میں امریکا چلا آیا تھا۔ وہ خاندانی بڑھئی تھا۔ جلد ہی اسے ایک کارخانے میں ملازمت مل گئی۔ ونسنزو خوش تھا اور مستقبل کے حسین سپنے بُن رہا تھا کہ اچانک نیویارک اسٹاک مارکیٹ کریش ہو گئی۔ امریکا تاریخ کے بدترین مالیاتی بحران کی لپیٹ میں آ گیا۔

اس کی ملازمت چھوٹ گئی۔ پس انداز کی ہوئی رقم ختم ہوئی تو بیوی کے زیورات فروخت کرنے پڑے۔ اُن سے حاصل ہونے والے پیسے بھی زیادہ ساتھ نہیں دے سکے۔ چند ہی روز میں نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔ ونسنزو اب امریکا آنے کے فیصلے پر پچھتانے لگا تھا۔

مشکلات کے ان ہی دنوں میں 10 جنوری 1930 کو اس کے گھر بیٹے کی پیدائش ہوئی۔ وہ بچہ اطالوی خاندان کے لیے خوش بخت ثابت ہوا۔

نام رکھنے کی رسم کی ادائیگی کے اگلے ہی روز اُسے ایک تابوت ساز کے ہاں نوکری مل گئی۔ کام نیا اور مشکل تھا مگر مہارت کے حصول میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

مالیاتی بحران کے بعد امریکا دھیرے دھیرے سنبھلنے لگا تھا۔ کچھ ہی عرصے بعد قرض لے کر اُس نے برونکس کے مضافات میں چھوٹا سا مکان خرید لیا۔ کچھ اور پیسے آئے تو ایک کارخانہ بھی کھول لیا۔

جلد اُس کی بیوی کی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ حالات ڈگر پر آ گئے تھے اور اس کا سبب وہ اپنے بیٹے کو قرار دیتا تھا جو خوش بختی اپنے ساتھ لایا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا۔ ونسنزو مسکرایا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔

ننھا رون دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر معصومیت تھی۔

"ممّا بلا رہی ہیں۔ کھانا لگ چکا ہے۔" اُس نے توتلی زبان میں کہا۔

"تو آج کیا پکا ہے جناب؟" بڑھئی نے کپڑوں سے برادہ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"وہ..." بچہ کچھ سوچ رہا تھا۔ "وہ... پاسا۔"

آدمی نے قہقہہ لگایا۔ "پاسا نہیں پاستا۔ چلو۔"

وہ دروازے سے گزر کر مکان میں داخل ہوئے۔ دھوئیں سے بھرے کچن میں ایک خوبرو اطالوی عورت کھڑی مسکرا رہی تھی۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

☆☆☆

رون کا بچپن جادو بھرا تھا۔

وہ جنوں پریوں کی کہانیاں سنتے ہوئے بڑا ہوا۔ مہمات کے قصے اسے تجسّس سے بھر دیتے۔ بہادر شہزادے کی ظالم دیو سے جنگ کی تفصیلات وہ بڑے انہماک سے سنتا۔ شہزادی کے حسن کا تذکرہ اسے مبہوت کر دیتا۔ اور جب وہ خواب دیکھتا تو خود بہادر شہزادے کا روپ دھار لیتا۔ اپنے معصوم خوابوں میں وہ جادوگروں کا مقابلہ کرتا۔ انہیں نیست و نابود کر دیتا۔

وہ جادو بھرا بچپن تھا۔ شرارتوں سے بھرپور۔ ماں باپ سے فرمائشیں کرنا۔ فرمائش پوری نہ ہو تو منہ پھلا کر بیٹھ جانا۔ درختوں پر چڑھنا۔ سڑک پر دیگر بچوں کے ساتھ رگبی کھیلنا۔ سال کے آخر میں کرسمس کے تہوار کا انتظار اور کرسمس کی رات جلدی جلدی گفٹ بکس کھولنا۔

شعور کی دہلیز عبور کرنے کے بعد جس پہلی شے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کی وہ ایک جادوئی ڈبا تھا جسے ٹیلی ویژن کہا جاتا ہے۔ متحرک تصویروں نے اسے گرویدہ بنا لیا تھا۔ جونہی پڑھائی سے فراغت ملتی، وہ ٹی وی کے سامنے جا بیٹھتا۔ ریڈیو سے نشر ہونے والی کہانیاں بھی وہ بڑی دلچسپی سے سنا کرتا تھا۔

زندگی اپنی ڈگر پر جا رہی تھی کہ ایک روز... کیمرے کا طلسماتی فلیش اس کے سامنے چمکا۔

اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب بینائی واپس آئی، وہ کیمرے کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔

اس نے کیمرا خریدنے کی ضد شروع کر دی۔ محنت کش بڑھئی کے لیے یہ خواہش پوری کرنا سہل نہیں تھا۔ جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جاپانی مصنوعات پر پابندی لگ گئی۔ الیکٹرانکس آئٹمز کی قیمتوں کو جیسے پر لگ گئے تھے۔

ونسنزو کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ننھا رون ضد پر قائم رہا۔ بالآخر بڑھئی کو اپنے لاڈلے کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ پس انداز کی ہوئی رقم ناکافی تھی، سو تھوڑا قرضہ لینا پڑا۔

اس برس جب رون نے کرسمس پر گفٹ بکس کھولا تو اپنی روح کو مسرت سے لرزتا محسوس کیا۔ اس میں سیاہ رنگ کا ایک چمک دار کیمرا تھا۔

اس رات ننھے رون نے اپنی زندگی کی پہلی تصویر کھینچی۔

ماڈلنگ کا فریضہ اس کے ماں باپ نے ادا کیا جو اپنے بیٹے کو دیکھ کر پھولے نہ سما رہے تھے۔

"ریڈی۔" رون چہکا۔ کیمرے کا فلیش چمکا۔ اطالوی جوڑا کیمرے میں محفوظ ہو گیا اور ساتھ ہی رون گوگیلا کی زندگی کا تعین ہو گیا۔

☆☆☆

زوردار دھماکا سنائی دیا۔

جنوب سے دھوئیں کا بادل بلند ہوا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں چیخیں گونجیں۔ پھر ہیبت ناک خاموشی چھا گئی۔

وہ پیٹ کے بل سرکتا ہوا خندق سے باہر آیا۔ کچھ فاصلے پر شعلے لپک رہے تھے۔ وہاں اسے کچھ سائے دکھائی دیے۔ وہ دشمن فوجی تھے جو زخموں سے چور زمین پر پڑے تھے۔

اچانک فضا میں طیاروں کی گھن گرج سنائی دی۔ ایک اور دھماکا ہوا۔ ٹھیک اسی لمحے اس نے اپنا ہتھیار بلند کیا اور... روشنی ہوئی۔ فلیش تین بار چمکا۔ کچھ بعد وہ سرکتا ہوا خندق میں لوٹ آیا۔

اس کے گرد سپاہیوں کا ٹولا تھا جنہوں نے اسلحہ تھام رکھا تھا۔ جنگی محاذ پر وہ اکلوتا شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں تھا، فقط کیمرا تھا۔

یہ 1951 کا ذکر ہے۔ رون کوریا جنگ کے دوران امریکی فوج میں بہ طور فوٹو گرافر بھرتی ہو گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے اس نوجوان کے لیے شاید فوج کی ملازمت مشکل فیصلہ ثابت ہوتا، مگر معاشی مسائل نے اسے سہل کردیا۔ جنگ کی وجہ سے ملازمتوں کا کال پڑ گیا تھا۔ پھر اس کے پاس تجربہ بھی نہیں تھا۔

اتفاق سے برونکس میں تعینات ایک سینئر افسر جانتا تھا کہ ونسنز و بڑھئی کے بیٹے کو فوٹو گرافی کا شوق ہے۔ جب جنگ کے لیے بھرتیاں شروع ہوئیں تو رون کو بھی پیشکش کی گئی جسے اس نے فوراً قبول کرلیا۔

اس نے سوچا تھا کہ خوب تفریح رہے گی، سمندر کا سفر ہوگا، نئی زمینیں دیکھنے کا موقع ملے گا۔ اس بات کا تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اسے اگلے محاذوں پر بھیج دیا جائے گا جہاں وہ ہر روز موت کا سامنا کرے گا۔ دھماکوں اور گولیوں کی بوچھاڑ کے درمیان اس کے شب و روز گزریں گے۔

کوریا جنگ میں اُس نے دو برس خدمات انجام دیں۔ اس عرصے میں جہاں وہ کئی تلخ تجربات سے گزرا، وہیں اسے اپنے اندر کے انسان کو پہچاننے کا بھی موقع ملا۔ وہ انسان جو امن کا متلاشی تھا جو زندگی سے محبت کرتا تھا۔

فوٹو گرافر کی حیثیت سے بھی اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اس نے جانا کہ حقیقی حالات کی عکس بندی، اسٹوڈیو میں پیشگی انتظامات اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ کی جانے والی عکس بندی سے یکسر مختلف ہے۔ باقاعدہ تیاری کے ساتھ بنائی جانے والی تصاویر دلکش تو ہوسکتی ہیں مگر حقیقی ماحول میں بنائی جانے والی تصاویر کے سامنے وہ بالکل مصنوعی لگتی ہیں۔

یہی وہ احساس تھا جو اس کے مستقبل کا تعین کرنے والا تھا۔ انسانوں کے حقیقی تاثرات کی عکس بندی کرنے کی تحریک کرنے والا تھا... مگر ابھی اس فیصلے میں تھوڑا وقت تھا۔ ابھی اسے کئی مراحل طے کرنے تھے۔

☆☆☆

لاس اینجلس کے آسمان پر پہلی کرن نمودار ہوئی۔ رون نے بستر چھوڑ دیا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور سائیکل لے کر گھر سے نکل گیا۔ سڑکیں ابھی سونی ہوئی تھیں۔ مکانات خراٹے لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اخبار کے ڈپو میں تھا۔ وہاں سے بنڈل اٹھا کر وہ مضافات کی سمت نکل گیا۔ اگلے ڈیڑھ گھنٹا اخبار بانٹتا رہا۔ جب وہ لوٹا، شہر جاگنے لگا تھا۔

اس نے ٹوسٹ کے ساتھ کڑوی کافی حلق میں اتاری اور ایئر سینٹر کالج کی سمت چل پڑا جہاں وہ فوٹو جرنلزم میں ڈگری کررہا تھا۔

وہ ایک غریب گھرانے سے تھا۔ ایسا گھرانا جس کے بچے کالج جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ یہ تو شوق کی شدت تھی جس نے اُسے باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کی راہ سجھائی۔ کالج فیس کے لیے بڑھئی کی آمدنی ناکافی تھی اس لیے رون نے ہاکر کے طور پر کام شروع کردیا تھا۔

فوٹو گرافی کا تو اسے تجربہ تھا۔ فیلڈ میں بھی کام کرچکا تھا مگر کالج جاکر اسے کئی تکنیکی باتیں سمجھنے کا موقع ملا۔ مثلاً روشنی کو کیسے برتا جائے۔ کیمرے کو کس زاویے پر رکھا جائے۔ برسات اور طوفان میں کیسے فوٹو گرافی کی جاتی ہے۔

وہ کالج کا قابل ترین طالب علم تھا۔ اساتذہ کا چہیتا۔ ساتھی طلبا بھی اسے پسند کرتے تھے۔ توقع کے عین مطابق اس اطالوی نژاد امریکی نے اس برس ٹاپ کیا۔

وہ انتہائی پُرمسرت دن تھا۔ باغوں میں پھول کھل رہے تھے۔ آسمان پر بادل تھے اور اس کی آنکھوں میں خواب۔ حسین خواب۔

"مستقبل میرا منتظر ہے۔" اُس نے خود سے کہا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ مستقبل اسے ناکوں چنے چبوادے گا۔

☆☆☆

پالا پڑ رہا تھا۔ قہبے کو دھند نے حصار میں لے لیا تھا۔ مکانات کی چھتیں برف سی ڈھک گئی تھیں۔ شہر جانے والے راستے بند ہوگئے تھے۔ برف باری کا سو سالہ ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ زندگی پر جیسے جمود طاری ہوگیا۔

رون کھڑکی میں کھڑا تھا۔ باورچی خانے میں اس کی ماں چولھے کے سامنے بیٹھی تھی۔ عورت کے چہرے پر پریشانی تھی۔ راشن ختم ہونے کو تھا اور مزید قرضہ ملنے کا امکان نہیں تھا۔ اس نے اپنے جواں سال بیٹے کی سمت دیکھا جو مایوسی کی تصویر بنا تھا۔ اس نے سرد آہ بھری اور ہانڈی میں کفگیر چلانے لگی۔ ساتھ والے کمرے سے کھانسنے کی کمزور آواز بلند ہوئی۔ وہ اس کا باپ تھا جو اب بیمار رہنے لگا تھا۔ وہ زیادہ کام نہیں کرسکتا تھا۔ پھر سردی کی وجہ سے کاروبار ٹھپ ہوگیا تھا۔

رون گہرے صدمے میں تھا۔ بے روزگاری نے اسے توڑ ڈالا۔ ڈگری کام نہیں آئی۔ کوشش کے باوجود وہ کہیں ملازمت حاصل نہیں کرسکا۔

اُس برس فوٹو اسٹوڈیوز میں کوئی اسامی نہیں تھی۔ ادارے بھی فوٹو گرافرز کو ملازمت پر رکھنے کے بجائے بہ وقت ضرورت کسی اسٹوڈیو سے رابطہ کرلیتے۔ اس نے کچھ عرصے چھوٹے موٹے اسائنمنٹس پر کام کیا مگر ان سے کچھ خاص

حاصل نہیں ہوا... پھر برف باری شروع ہوگئی۔

موسم سرما اُس کی جیب پر بھی بھاری ثابت ہوا۔ نیویارک کا مرکزی علاقہ خاصا مہنگا تھا۔ جب جمع پونجی ختم ہوگئی تو وہ قہبے لوٹ آیا۔ اور اب اپنے گھر میں یاس کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

"رون، سنتے ہو۔" اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ "اپنا کیمرا اٹھا لو۔ میز کے کونے پر رکھا ہے۔ کہیں گر نہ جائے۔"

وہ خاموشی سے میز تک گیا اور کیمرا اٹھالیا۔ وہ کیمرا اس نے ایک کباڑیے سے خریدا تھا، مگر وہ بہت اچھی حالت میں تھا۔

اچانک کھڑکی سے اس کی نظر پڑوسی کے صحن میں پڑی۔ مفلر لپیٹے، سوئیٹر چڑھائے ایک بچی اپنے کتے سے کھیل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ازلی معصومیت تھی۔ گھر کے اندرونی حصے سے آنے والی روشنی میں اُس کی پلکیں چمک رہی تھیں۔ گرتی برف کے درمیان وہ کسی فرشتے کی مانند تھی۔

وہ ایک مسحور کن منظر تھا۔ انتہائی حقیقی۔ فطرت کے بے حد قریب۔

"خوبصورت۔" رون نے دھیرے سے کہا۔ اس نے کیمرا سیدھا کیا۔ لینس کو بچی پر فوکس کیا۔ فلیش چمکا۔ اس نے زاویہ بدل کر پھر فوکس کیا۔ پھر فلیش چمکا۔

بچی کھیل میں اتنی مگن تھی کہ اسے کچھ اندازہ ہی نہیں ہوا۔ رون کافی دیر تک تصاویر بناتے رہا۔ کچھ دیر بعد بچی گھر کے اندر چلی گئی۔

جادوئی منظر اختتام کو پہنچا مگر اپنے پیچھے حسین اثرات چھوڑ گیا۔

رون کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اب وہ اداس نہیں تھا۔ اسے ایک راہ دکھائی دینے لگی تھی۔ وہ توانائی کو اپنی روح میں دوڑتا محسوس کرسکتا تھا۔

☆☆☆

وہ جادو نگری تھی۔ ہر سمت گیت۔ ہر سمت روشنی۔ نیویارک شوبز سرگرمیوں کا گڑھ تھا۔ ستارے سڑکوں پر گشت کرتے۔ اسٹوڈیو اور ہوٹلوں کے باہر فلمی ہستیاں باکثرت دکھائی دیتیں۔ کچھ شاہراؤں پر فنکاروں کی آمد و رفت روز کا معمول تھی۔

کبھی مارلن برانڈو کسی ریسٹورنٹ سے برآمد ہوتا۔ کبھی ایلزبتھ ٹیلر کسی شاپنگ مال سے باہر آرہی ہوتی۔ کبھی رچرڈ برٹن سے سامنا ہوجاتا۔ کبھی الپا چینو سے۔

مداح اپنے پسندیدہ ستاروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ان مقامات پر منڈلاتے رہتے۔ صحافی اور فوٹو گرافرز بھی چہل قدمی کے لیے ان ہی جگہوں کا انتخاب کرتے۔

رون بھی ایک فوٹو گرافر تھا۔ نامور ہستیوں کی تصاویر اتار کر فری لانسر کی حیثیت سے وہ گزر بسر کا امکان پیدا کرسکتا تھا۔ مگر وہ روایتی ڈگر سے ہٹ کر کچھ انوکھا کرنا چاہتا تھا۔

فوٹو گرافروں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تقریبات، فلموں کے پریمیر اور پارٹیوں میں پہنچ جاتے۔ وہاں فوٹو شوٹ ہوتا۔ فلم اسٹارز کیمرے کو باقاعدہ پوز دیتے۔ اچھی تصاویر بن جاتیں۔ فوٹو گرافر یہ تصاویر کسی اخبار یہ رسالے کو بیچ دیتے۔

رون کو یہ سیدھا سادہ طریقہ قبول نہیں تھا۔

موسم سرما میں وہ جس جادوئی تجربے سے گزرا تھا، اس نے لگے بندھے طریقوں اور اہتمام کے ساتھ بنائی جانے والے تصویروں کو اس کی نظر میں بے توقیر کردیا۔ اب وہ مصنوعی تصاویر میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ حقیقت کا تعاقب کرنا چاہتا تھا۔

اپنے ساتھی فوٹو گرافروں کے برعکس رون فلمی ہستیوں کی میک اپ میں تصاویر کھینچنے کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ میک اپ سے پاک، حقیقی اور قدرتی تاثرات سے بھرپور تصاویر کھینچنا چاہتا تھا۔ ان کا سچا روپ کیمرے میں محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس خواہش کا پورا ہونا آسان نہیں تھا۔

بھلا کون سی اداکارہ بنا میک اپ، عام سے لباس میں تصویر کھنچوانا چاہے گی۔ فلم اسٹار تو بن ٹھن کر کسی اچھے اسٹوڈیو جانا پسند کرتے ہیں جہاں بڑے اہتمام کے ساتھ ان کی تصویر اتاری جائے۔

حقیقی تاثرات سے بھرپور تصاویر کے حصول کا ایک ہی طریقہ تھا کہ رون ان کی حقیقی زندگی تک رسائی حاصل کرلے۔ وہ زندگی، جس میں وہ سپر اسٹار نہیں بلکہ عام انسان ہیں۔

آج کی طرح اس وقت بھی فلمی ہستیاں اپنی نجی زندگی اور سرگرمیوں کو خفیہ رکھا کرتی تھیں۔ کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنے دیتیں۔

رون کے پاس لے دے کر ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا کہ وہ جاسوسوں کی طرح فلمی ستاروں کا پیچھا کرنا شروع کردے۔

☆☆☆

وہ ایک چھتنار درخت تھا۔ درخت کے نیچے بینچ بچھی تھی۔ اس پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ بالکل چوکس۔ نظریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازے پر ٹکی تھیں۔ ہاتھ میں کیمرا تھا۔

صبح کے نو بج رہے تھے۔ رون مشہور اداکارہ ایلزبتھ ٹیلر کا تعاقب کرتے ہوئے سینٹرل جم خانے پہنچا تھا اور اب وہ اس کے باہر آنے کا منتظر تھا تاکہ اسے کیمرے میں قید کر سکے۔

"کیسے ہو رون؟" ایک مانوس آواز کانوں سے ٹکرائی۔ کالج کے زمانے کا ایک دوست سامنے کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ جیمز۔" اس نے مصافحہ کیا۔

"زبردست۔ تم صبح صبح یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے سوال کیا۔

"ایلزبتھ ٹیلر کا انتظار۔" وہ مسکرایا۔

"یہاں؟" جیمز کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں یہاں۔" اس نے جم خانے کے دروازے کی سمت دیکھا۔ "اُس کی حقیقی تصویر بنانے کے لیے۔"

"میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔" جیمز کے لہجے میں حیرت تھی۔ "آج شام ایوارڈز تقریب ہے۔ وہاں تم اس کی اچھی تصاویر بنا سکتے ہو، مگر یہاں اس وقت..."

"میرا فلسفہ کچھ اور ہے۔" رون نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میں ان نامور شخصیات کی ایسی تصاویر حاصل کرنا چاہتا ہوں جن میں وہ گلیمر اور میک اپ سے پاک ہوں۔ عام کپڑوں، عام انسانوں کی مانند دکھائی دیں۔ اسٹوڈیو میں بٹھا کر تصویر تو اچھی بن جاتی ہے، پس منظر بھی بڑا حسین دکھائی دیتا ہے لیکن اس میں وہ جادو اور بے ساختگی نہیں ہوتی جو بے خبری میں بنائی گئی تصاویر سے جھلکتی ہے۔"

"مگر..." اس کے لہجے میں تذبذب تھا۔ "بھلا کون سا فنکار عمدہ پوشاک اور میک کے بغیر تصاویر بنوانا پسند کرے گا۔ انہیں یہ قطعی اچھا نہیں لگے گا۔ وہ صاف انکار کر دیں گے۔"

"جانتا ہوں کہ وہ انکار کر دیں گے۔" رون نے اثبات میں سر ہلایا "اسی لیے تو اجازت لینے کا تردد نہیں کرتا۔ میں اُن کے مکان کے باہر جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہوں۔ ان کا منتظر رہتا ہوں۔ اس طرح مجھے ان کے معمولات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ میں اُن کی گاڑی کا پیچھا کرتا ہوں۔ فون بوتھ کی اوٹ میں چھپ کر ان کا انتظار کرتا ہوں۔ جوں ہی وہ قریب آتے ہیں۔ میں فوراً کیمرے کا بٹن دبا دیتا ہوں۔"

"یعنی میرا پیارا دوست رون گوگیلا مسٹر پاپارازو کی تقلید کر رہا ہے۔"

"پاپارازو..." وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ "شاید ہاں۔"

یہ لفظ اُس وقت نیا نیا تھا۔ دراصل 57ء میں ریلیز ہونے والی اطالوی فلم La Dolce Vita کے ایک تیز طرار اور باتونی کردار نے ناظرین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ ایک فوٹو گرافر تھا جو معروف ہستیوں کا پیچھا کیا کرتا۔ اس کردار کا نام پاپارازو تھا۔

"اطالوی میں پاپارازو سے مراد ایسے مچھر ہیں، جو ہر وقت لوگوں کے کانوں کے پاس بھنبھناتے رہتے ہیں۔" رون نے اپنے دوست کو بتایا۔ "شاید اسی وجہ سے اس کردار کو پاپارازو کا نام دیا گیا۔ وہ فلمی ہستیوں کے گرد منڈلاتا رہتا۔ انہیں تنگ کرتا۔ تو ہاں... اس نقطۂ نگاہ سے میں بھی پاپارازو ہوں۔ اِن تقریبات پر پہنچ جاتا ہوں، جہاں مجھے مدعو نہیں کیا جاتا۔"

اسی لمحے جم خانے کے دروازے پر کچھ ہلچل ہوئی۔ ایلزبتھ ٹیلر برآمد ہوئی۔ رون تیزی سے اٹھا۔ کیمرا سنبھالے دروازے کی سمت دوڑا۔ اس سے قبل ایلزبتھ کار میں بیٹھ پاتی کیمرے کا فلیش دو بار چمک چکا تھا۔

ایلزبتھ کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ گئی جو فراٹے بھرتے ہوئے روانہ ہو گئی۔

رون سڑک پر کھڑا گاڑی کو دور جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جیمز نے بینچ پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ "مسٹر پاپارازو کافی کے بارے میں کیا خیال ہے۔"

رون مسکراتے ہوئے اس کی سمت چل دیا۔

☆☆☆

"شان دار تصویر ہے۔ کیا دام لو گے؟" ایڈیٹر نے سوال کیا۔

اس وقت وہ "فین" میگزین کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ "فین" نیویارک کا ایک معروف فلمی رسالہ تھا۔

رون کا مطالبہ سن کر ایڈیٹر نے برا سا منہ بنایا۔ "اتنی رقم۔ خدا کی پناہ! کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔ صرف مشہور فوٹو گرافر اتنی رقم کا تقاضا کرتے ہیں۔ تمہیں تو آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔"

رون نے گہری سانس لی۔ "ان تصاویر کے لیے میں نے ایلزبتھ ٹیلر کا پورے دو ہفتے پیچھا کیا جناب۔ اور نیویارک کے مشہور فوٹو گرافر ایسا نہیں کرتے۔ وہ بلا کے سہل پسند ہیں۔ فقط اسٹوڈیوز میں مصنوعی تصاویر کھینچتے ہیں۔ اگر آپ کو قیمت زیادہ لگ رہی ہے تو اجازت دیجیے۔ میں کہیں اور قسمت

آزماتا ہوں۔"

اس نے تصویریں اٹھالیں اور جانے کے لیے مڑا۔

"رک جاؤ۔" ایڈیٹر نے کہا۔ "بڑے ضدی اور ہٹ دھرم واقع ہوئے ہو میاں۔ تصویریں یہیں رکھ دو۔ دائیں کیبن میں اکاؤنٹنٹ بیٹھا ہے۔ جاتے ہوئے اس سے مل لینا۔"

"فین" میگزین کے دفتر سے باہر آتے ہوئے وہ خوشی سے لبریز تھا۔ یہ خوشی اگلے ہفتے کا شمارہ دیکھ کو دوبالا ہو گئی۔ ایلزبتھ کی تصویر ٹائٹل پر چھپی تھی اور تصویر کے نیچے اس کا نام تھا: رون گوگیلا!

اس کے جادو بھرے سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔

اگلی تصویر رچرڈ برٹن کی تھی۔ اُس تصویر میں فلمی پردے پر سنجیدہ اور متین دکھائی دینے والا برٹن کیمرے کو بری طرح گھور رہا تھا۔ چہرے پر درشتی تھی۔

اس تصویر کا بھی اچھا معاوضہ ملا۔ اب اُس نے الپاچینو کا تعاقب شروع کیا۔ اس مہم میں اسے نوجوان اداکار کے درشت رویّے کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بار تو دھکم دھکا بھی ہوئی۔ گالیاں دی گئیں... مگر وہ تصویر بنانے میں کامیاب رہا۔

شام میں تصاویر ڈیولپ کیں۔ انہیں ایک لفافے میں ڈالا اور "فین" کے دفتر کی سمت چل پڑا۔ راستے میں اس کا سامنا "ماڈرن اسکرین" کے ایک رپورٹر سے ہو گیا۔

"ماڈرن اسکرین" بھی ایک مشہور فلمی پرچہ تھا۔ جب رپورٹر کو پتا چلا کہ اس کے پاس الپاچینو کی تصاویر ہیں، اس نے رون کا ہاتھ پکڑا اور سیدھا اپنے ایڈیٹر کے پاس لے گیا۔

تصویر دیکھ کر ایڈیٹر نے کہا۔ "دام بتاؤ لڑکے۔"

مگر..." وہ متذبذب تھا۔ "میرا فین میگزین سے معاہدہ ہے۔"

ایڈیٹر نے اسے گھورا۔ "ایک بات تو بتاؤ ذرا۔ فوٹو گرافی تمہارا پیشہ ہے یا تم رضا کارانہ طور پر یہ کام کر رہے ہو؟" سوال نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ "جی پیشہ۔"

"تو اسے سنجیدگی سے لو۔" ایڈیٹر نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "تمہارا کسی ادارے سے معاہدہ نہیں۔ میری اطلاعات کے مطابق تم ایک فری لانسر ہو۔ کیا یہ درست نہیں؟"

"درست ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا۔

"اور اگر میں تمہیں ملازمت کی پیشکش کروں تو کیا تم اسے قبول کرو گے؟"

کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر رون کی آواز سنائی دی۔ "نہیں۔"

"اور اس کی وجہ؟" ایڈیٹر نے کرسی پر جھولتے ہوئے کہا۔

"اخبارات اور میگزین سے وابستہ فوٹو گرافر اسائنمنٹ کے محتاج ہوتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ایڈیٹر کے احکامات کے بعد ہی وہ حرکت میں آتے ہیں۔ ان میں چاہ نہیں ہوتی۔ میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں کسی کے حکم کا محتاج نہیں۔ یہ میرا شوق ہے۔ میں تصویر کا بھوکا ہوں۔ اس کا تعاقب کرتا ہوں۔ خود تصاویر تخلیق کرتا ہوں۔"

"درست کہا۔" ایڈیٹر مسکرایا۔ "اور میں بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ تم مختلف ہو۔ باصلاحیت ہو تو اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ لو۔ خود کو ارزاں مت فروخت کرو۔"

کچھ دیر رون نے غور کیا۔ پھر معاوضہ بتایا۔ وہ "فین" میگزین سے ملنے والے معاوضے سے دگنا تھا۔

ایڈیٹر چہکا۔ "یہ ہوئی ناں بات۔ جاؤ لڑکے اکاؤنٹنٹ سے مل لو۔"

☆☆☆

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ اگلی بار دکھائی دیے تو ایسی درگت بناؤں گا کہ ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

دھکا اتنا شدید تھا کہ رون توازن کھو بیٹھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے وہ کھڑا ہوا۔ اس پر حملہ کرنے والا دراز قد آدمی کچھ فاصلے پر کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس نے کیمرے کا جائزہ لیا۔ وہ محفوظ تھا۔ پھر اپنے لباس پر نگاہ کی۔ آستین کی سلائی کھل گئی تھی۔ ایک جیب کھینچا تانی میں پھٹ گئی مگر وہ مطمئن تھا۔ وہ رابرٹ ڈینیرو کی تصاویر بنا چکا تھا۔

اُس وقت رون مین ہٹن میں واقع "اسٹوڈیو 54" کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ ستّر اور اسّی کی دہائی میں وہ اسٹوڈیو فلمی ہستیوں کا من پسند مقام تھا۔ ان کے وقت کا بڑا حصہ وہیں گزرتا۔ وہاں کئی بڑی فلموں کی شوٹنگ ہوئی جنہوں نے اسٹوڈیو کی شہرت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ یہی شہرت رون کو یہاں کھینچ لائی۔

اس زمانے میں "فین" اور "ماڈرن اسکرین" میگزینز سے اسے ٹھیک ٹھاک معاوضہ مل رہا تھا۔ دیگر رسائل بھی رابطہ کرنے لگے، جن میں "ٹائم" جیسا معتبر پرچہ بھی شامل تھا۔ اس کی چند تصاویر ٹائم میگزین کا حصہ بن چکی تھیں اور یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ وہ اطالوی نژاد امریکی فوٹو گرافروں کے قبیلے کا اکلوتا فرد تھا جسے یہ اعزاز ملا۔

مگر یہ اعزاز مفت ہاتھ نہیں آیا۔ اُسے خاصی محنت کرنی پڑی۔ اب اِسی واقعے کو لیجیے۔ اس پر مُکّے برسائے گئے۔ کوٹ پھٹ گیا۔ آنکھ بھی سوج گئی، مگر وہ باز آنے والوں میں سے نہیں۔ چند روز بعد وہ پھر اِسی اسٹوڈیو کے گرد منڈلا رہا تھا۔

اُس زمانے میں رون جن اداکاروں کا تعاقب کر رہا تھا، اُن میں ایک ساحرہ بھی شامل تھی۔ ایک جادوگرنی۔

یہ بربیجت باردوتھ کا تذکرہ ہے، جس کے حسن نے دنیا کو گرویدہ بنا رکھا تھا۔ اس ساحرہ کا تعاقب اسے فرانس لے گیا۔ دراصل ان دنوں وہ مارسلی کے ایک قصبے میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ چھٹیاں منا رہی تھی۔ اسے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ رون وہاں چلا آئے گا۔

وہ سردیوں کے دن تھے۔ کچھ روز تک وہ اس کے مکان کے گرد منڈلاتا رہا۔ چند تصاویر بھی بنائیں مگر ان میں دم نہیں تھا۔ بہتر تصویر کے لیے اس نے مکان کے قریب جانے کی کوشش کی۔ کوشش سم قاتل ثابت ہوئی۔ وہ باردوتھ کے بوائے فرینڈ کی نظروں میں آگیا۔ اس ظالم نے لان میں لگا پائپ اٹھایا اور اس پر پانی کی بوچھاڑ کر دی۔ وہ پوری طرح شرابور ہوگیا۔ بہ مشکل وہاں سے نکلا۔

اس حملے کے بعد وہ دو روز بخار میں تپتا رہا۔ تیسرے دن اسے ایک گلدستہ موصول ہوا۔ بھیجنے والی بربیجت باردوتھ تھی۔ اس نے رون سے معذرت کی اور اس کی صحت کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا۔

گلدستے سے ننھی کارڈ پر سرخ ہونٹوں کا نشان بھی ثبت تھا۔

"لوگ غلط نہیں کہتے۔ تم واقعی ساحرہ ہو۔" وہ مسکرایا۔

ان برسوں میں پاپ موسیقی کا بے تاج بادشاہ ایلوس پریسلے بھی رون کے کیمرے سے خاصا پریشان رہا۔

"بدتہذیب فوٹو گرافر ہر وقت میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔" ایلوس اکثر بڑبڑاتا۔

وہ ایلوس کے لیے زیادہ اچھا دور نہیں تھا۔ اس کی شہرت گر رہی تھی۔ ایسے میں کیمرے کا ان چاہا فلیش اُسے مزید اذیت دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب رون، گوئنز کے علاقے میں ایلوس کی تصاویر اتار رہا تھا، اُس نے اپنے باڈی گارڈز کو اشارہ کیا جو رون پر پل پڑے۔

انہوں نے اسے مُکّوں پر رکھ لیا۔ پھر لاتیں رسید کیں۔ جب اس بے چارے نے بھاگنے کی کوشش کی تو وہ اس پر لپکے۔ اس کا کوٹ تار تار ہوگیا۔ ایلوس کھڑکی میں کھڑا اس منظر سے محظوظ ہوتا رہا۔

سب سے برا تجربہ اسے میکسیکو میں ہوا جہاں وہ مشہور فلمی جوڑے ایلزبتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن کا تعاقب کرتے ہوئے پہنچا تھا۔

رون کی قسمت واقعی خراب تھی۔ چند ہی روز بعد رچرڈ کو اندازہ ہوگیا کہ کوئی بدمعاش رنگ میں بھنگ ڈالنے آن پہنچا ہے۔ اس نے اپنے محافظوں کو الرٹ کر دیا۔

اگلی بار جب رون اس جوڑے کا تعاقب کر رہا تھا، اس پر اچانک حملہ ہوا۔ وہ زمین پر آرہا۔ اٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کمر پہ لات رسید ہوئی۔ بالوں سے پکڑ کر اسے گھسیٹا گیا۔ پھر جبڑے پر مکا پڑا۔

خاصی خاطر مدارت ہوئی اس روز۔ وہ لگ بھگ بے ہوش ہوگیا۔ رچرڈ نے اسی پر بس نہیں کیا۔ اس نے رون کو میکسیکو پولیس کے حوالے کر دیا۔ جب اسے ہوش آیا وہ تھانے میں تھا اور اس کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا۔

رہائی کے بعد چند روز مقامی اسپتال میں گزرے۔ بدبختی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ امریکا لوٹنے سے ایک روز قبل ایک میکسیکن بدمعاش اس کے اپارٹمنٹ میں گھس آیا۔ اس کے پاس چاقو تھا۔

رون نے بٹوا خالی کر دیا۔ مگر اسے پیسوں میں دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتایا کہ اُسے یہاں فلم رول کی تلاش میں بھیجا گیا ہے، جس میں ایلزبتھ ٹیلر کی تصاویر ہیں۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"کوئی رچرڈ نامی آدمی تھا۔ شکل سے فلمی ہیرو لگتا تھا۔" بدمعاش نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "خیر، تم فلم رول نکالو۔ وہ مجھے ڈالرز میں ادائیگی کرے گا۔"

"رچرڈ تم بے حد خبیث انسان ہو۔" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔

میکسیکو سے لوٹتے وقت وہ اداس ضرور تھا مگر مایوس نہیں۔ اس طرز کے حادثات پاپارازی فوٹو گرافروں کے لیے عام تھے۔ ہاں، غنڈے بھیجنے والے واقعے سے اسے تھوڑا دکھ پہنچا تھا۔ مگر جلد ہی وہ اس واقعے کو بھی بھول گیا۔ اسے اپنے زخم یاد نہیں رہے، کیونکہ ایک انوکھے احساس نے اسے گھیر لیا تھا۔ کوئی اس کے دل و دماغ پر چھانے لگا۔ یہ ایک عورت تھی، جس سے اسے محبت ہوگئی تھی۔

☆☆☆

پت جھڑ شروع ہوگیا۔ زرد خشک پتے سڑکوں پر اڑتے پھرتے۔ درختوں کی ٹہنیاں ویران ہونے لگیں۔

وہ ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ کیمرا گود میں۔ چہرے پر گہری سوچ کی لکیریں۔ ذہن میں ایک عورت کی شبیہہ۔ عورت... جسے وہ چاہنے لگا تھا۔ مگر یہ اس عورت کا حسن نہیں تھا، جس نے اسے گرویدہ بنا لیا بلکہ یہ وہ پُراسراریت تھی جو اس کی زندگی سے جڑی تھی۔

یہ عورت سابق صدر امریکا اور دنیا کے طاقتور ترین انسان جان ایف کینیڈی کی بیوہ جیکولن المعروف جیکی تھی۔

کینیڈی کا قتل ہنوز ایک معما تھا۔ وہ کبھی حل نہیں ہوسکا۔ واقعے والے روز جیکی اُس کے ساتھ گاڑی میں تھی۔

واضح رہے کہ موت سے قبل کینیڈی اور جیکولن کے درمیان کشیدگی کی خبریں گردش میں تھیں۔ اسی باعث جب سے کینیڈی کا قتل ہوا تھا جیکی توجہ کا مرکز بن ہوئی تھی۔

بعد میں اُس نے یونان کے ایک بے حد امیر تاجر اوناسس سے شادی کر لی۔ اوناسس کو یورپ میں ایک بااثر شخص کے روپ میں دیکھا جاتا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ اوناسس اور جیکی کا معاشقہ پرانا ہے۔ جیکی کینیڈی سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اُسے سابق امریکی صدر کی موت کا کوئی صدمہ نہیں۔ سازشی نظریوں پر یقین رکھنے والے یہ تک کہہ جاتے کہ جیکی کے یونانی عاشق نے اس کے شوہر کے قاتلوں کی معاونت کی تھی۔

شاید یہی پُراسراریت تھی، یہی بھید تھا جس نے اُسے جیکی سے باندھ دیا۔

1967 میں اس نے جیکی کا تعاقب شروع کیا تھا مگر اب تک کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئی تھیں۔ البتہ مئی کا مہینا خوش قسمت ثابت ہوا۔

جیکی اس روز نیویارک کے وائلڈ ڈسٹن آرٹ گیلری میں مدعو تھی۔ جب وہ واپسی کے لیے باہر نکلی، صحافیوں اور فوٹو گرافروں نے دھاوا بول دیا۔ رون ان میں شامل نہیں ہوا۔ اتنے رش میں اچھی تصویر بنانا ناممکن تھا۔

وہ خاموشی سے دور کھڑا رہا۔ جوں ہی جیکی گاڑی میں بیٹھی، اس نے ایک ٹیکسی لی اور اس کے تعاقب میں نکل گیا۔ جب جیکی اپنے اپارٹمنٹ کے پاس لیموزین سے اتری۔ ایک کھٹکا ہوا۔ فلیش چمکا اور رون کے کیمرے نے اس لمحہ کو قید کر لیا۔

یہ پہلا موقع تھا، جب اس نے پاپارازیوں کے انداز میں جیکی کی تصویر اتاری۔

جیکی نے برا سا منہ بنایا اور اپارٹمنٹ میں داخل ہوگئی۔ وہ اسے ایک عام فوٹو گرافر سمجھ کر بھول جاتی مگر جب اگلی صبح جم خانے جاتے ہوئے ایک بار پھر فلیش چمکا تو اس نے اپنی دھوپ کی عینک نیچے کی اور اس اطالوی نژاد امریکی کو غور سے دیکھا۔

اگلے چند روز یہ سلسلہ جاری رہا۔

جب گیلری سے لوٹتے وقت اتاری ہوئی تصویر ایک میگزین کے سرورق پر شائع ہوئی، تو جیکی کی برداشت جواب دے گئی۔ اس نے فوراً اپنے وکیل کو فون کیا۔

"یہ کون بدمعاش ہے؟" لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

وکیل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "رون گوئیلا۔ آج کل خبروں میں ہے وہ۔ اب اس شریر نے آپ کا تعاقب شروع کر دیا ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم اسے مجھ سے دور رکھو۔" اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"بے فکر رہیں۔" وکیل بولا۔ "بھونرا ہے، چند روز آپ کے گرد منڈلائے گا، پھر کسی اور کے پیچھے چل دے گا۔"

وکیل غلط تھا۔ وہ بھونرا کسی اور کے تعاقب کا خواہش مند نہیں تھا۔ وہ سابق خاتونِ اول کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔

اس برس جیکی کی متعدد تصاویر میگزین میں شائع ہوئیں۔ رون کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ معاوضہ بھی دُگنا ہوگیا۔

جب کبھی وہ کیمرا لیے جیکی کے سامنے آتا، اس کے چہرے پر ناگواری جھلکنے لگتی۔ ایک شام تو اس نے چیختے ہوئے اپنے سیکریٹری سے کہا۔ "اس بدمعاش کا کیمرا چھین کر توڑ دو۔"

مگر پھر... ایک رات عجیب واقعہ ہوا۔

کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ وہ جیکی کے اپارٹمنٹ کے سامنے جھاڑیوں میں دبکا بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

سڑک پر روشنیاں دکھائی دیں۔ گاڑی آکر رکی۔ جیکی باہر نکلی۔ اس نے فوراً کیمرا سنبھالا۔ ابھی وہ جھاڑیوں سے باہر آنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ٹھہر گیا۔

جیکی دھیمے قدموں سے چلتی ہوئی اسی کی سمت آرہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ رون کے لیے وہ جادوئی لمحہ تھا۔ وہ عورت جس کے لیے اس نے دن رات ایک کردیے، اپنی زندگی وقف کردی، ٹھیک اُس کے سامنے تھی۔

اس نے رون کو آستین سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گئی۔

"مسٹر گوگیلا! کیا آپ گزشتہ تین ماہ سے میرا پیچھا کر رہے ہیں؟" اُس کی آواز میں ٹھہراؤ تھا۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "تین نہیں، ساڑھے چار ماہ سے۔"

وہ مسکرائی۔ "تو آپ تھکے نہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں۔" اس نے کہا۔

اچانک جیکی کے تاثرات بدل گئے۔ "مسٹر گوگیلا، اب میں خاتونِ اول نہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اِس سلسلے کو ترک دیں۔ شکریہ۔"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ رون اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" وہ بڑبڑایا۔

جیکی کی نصیحت کا اس پر اثر نہیں ہوا۔ اس نے تعاقب جاری رکھا۔ بالآخر وہ جیکی کی اس کے بیٹے کینیڈی جونیئر کے ساتھ ایک یادگار تصویر بنانے میں کامیاب رہا۔

اسی تصویر نے گڑبڑ کردی۔

تصویر کی اشاعت نے جیکی کو آگ بگولا کردیا۔ دراصل وہ کینیڈی کی موت کے بعد اپنے بچوں سے متعلق بہت حساس ہوگئی تھی۔

"میں اس آدمی کا فوراً کچھ کرنا ہوگا۔" اس نے اپنے شوہر سے کہا، جو صوفے پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔

"میں اسے سنبھال لوں گا۔" اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا۔

اوناسس نے رون پر مقدمہ دائر کردیا۔ اس نے شہر کے بہترین وکلا کی خدمات حاصل کیں اور اعلان کردیا کہ جلد یہ بدمعاش جیل میں ہوگا۔

یہ کوشش بارآور ثابت نہیں ہوئی۔ قانونی پیچیدگیوں کے باعث مقدمہ طول پکڑ گیا۔ رون کی جانب سے جیکی کا تعاقب جاری رہا۔ تصاویر میگزینز میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔

تنگ آکر اوناسس نے باڈی گارڈ ساتھ رکھنے کا خیال پیش کردیا۔ "دو تین ہاتھ رسید کردیں گے، پھر بدمعاش پاس نہیں پھٹکے گا۔"

جیکی نے یہ تجویز رد کردی۔ "نہیں، اس سے صورتِ حال مزید بگڑ جائے گی۔"

نیویارک کے بہترین وکلا کی کوششیں بے کار گئیں۔ عدالت نے اوناسس کا مقدمہ کمزور شواہد کی بنا پر خارج کردیا۔

1972 میں جیکی کے شوہر نے دوسرا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس بار الزام عائد کیا گیا کہ وہ ایک عورت کی نجی زندگی میں دخل اندازی کررہا ہے۔

اِس الزام نے ملک گیر توجہ حاصل کی۔ امریکیوں کے لیے یہ امر بے حد دلچسپ تھا کہ جیکی نے خود کو عام عورت کے طور پیش کیا۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ عدالت کیا فیصلہ سناتی ہے۔

رون کے وکیل نے جیکی کی حیثیت کو اپنے دلائل کا موضوع بنایا۔ رون کا موقف تھا کہ جیکی کوئی عام امریکی عورت نہیں۔ وہ ایک سیلیبریٹی ہے۔ صحافیوں کو اُس کی اور اس کے اہلِ خانہ کی تصاویر اتارنے کا پورا پورا اختیار ہے۔

دوسری جانب جیکی نے عدالت کے سامنے موقف اختیار کیا کہ وہ اب کوئی سیلیبریٹی نہیں رہی۔ نہ تو وہ کوئی فن کار ہے، نہ ہی سیاست داں۔ وہ تو ایک عام گھریلو عورت ہے، جس کا ایک خاندان ہے، بچے ہیں۔ تو برائے مہربانی رون گوگیلا نامی فوٹو گرافر کو اس سے دُور رکھا جائے۔

رون کے وکیل نے جوابی دلیل دی کہ شہرت کوئی عہدہ نہیں، جو عطا کیا جائے یا واپس لیا جاسکے۔ اگر انسان ایک بار سیلیبریٹی بن جائے، تو وہ ہمیشہ سیلیبریٹی ہی رہتا تھا۔

مقدمہ لمبا چلا۔ رائے عامہ رون کے حق میں تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو جیکی کو سیلیبریٹی نہیں مانتا ہو۔ ماسوائے اس جج کے جس کے کورٹ میں یہ کیس لگا تھا۔ اس کی سخت گیری نے جیوری کو بھی فیصلہ بدلنے پر مجبور کردیا۔

عدالت نے جیکی کا موقف تسلیم کرتے ہوئے رون کو جیکی کے خاندان سے 45 میٹر اور اس کے اپارٹمنٹ سے 90 میٹر دور رہنے کا حکم صادر کردیا۔

رون کے لیے یہ حکم کسی صدمے سے کم نہیں تھا مگر عدالت کا حکم تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ وہ جیکی کی موت تک اس حکم کی پاسداری کرتا رہا۔

البتہ وہ اُس کے تعاقب سے باز نہیں آیا۔ پہلے عشق کو بھلانا آسان تو نہیں ہوتا ناں۔

اس نے جیکی کی ایک ملازمہ سے دوستی گانٹھ لی۔ وہ اسے جیکی کی مصروفیات سے باخبر رکھتی۔ اس کی معلومات کی روشنی میں رون لائحہ عمل طے کرتا۔ 45 میٹر دور سے سہی مگر اس کی تصاویر ضرور بناتا۔

1974 میں رون گوگیلا کی پہلی کتاب "Jacqueline" شائع ہوئی۔ یہ کتاب جیکولن کی تصاویر سے مزین تھی۔ جیکی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکس بندی کی گئی تھی۔ سابق خاتونِ اول ان تصویروں میں واک کرتی، بچوں کے ساتھ سائیکل چلاتی، شاپنگ کرتی نظر آئی۔ جان ایف کینیڈی کی وفات کے موقع پر سیاہ ماتمی لباس میں لی گئی تصاویر بھی اس میں شامل تھیں۔

کتاب کا بہت شہرہ ہوا۔ یہ بیسٹ سیلر ثابت ہوئی۔

وہ ملازمہ، جو رون کی اطلاعات فراہم کرتی تھی، اس نے ایک روز عجیب انکشاف کیا۔ اس نے رون کو بتایا کہ جیکی کو اپنی تصویروں والے اخبارات اور میگزین جمع کرنے کا ازحد شوق ہے۔ اکثر خود قریبی اسٹال سے جا کر میگزین خریدتی ہے۔ ان کی کٹنگ سنبھال سنبھال کر رکھتی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ جیکی کو اس کی کتاب بہت پسند آئی۔

"تمہاری کتاب کی اس نے پانچ کاپیاں خریدی ہیں۔" ملازمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ سن کر رون کو اچھا لگا۔

چند برس تو اس ملازمہ کے ذریعے وہ معلومات حاصل کرتا رہا مگر ایک دن بھانڈا پھوٹ گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ جیکی وقت سے پہلے اپارٹمنٹ لوٹ آئی۔ اس نے دیکھا کہ رون پارکنگ ایریا میں کھڑا اس کی ملازمہ سے بات کررہا ہے۔

اگلے دن اس عورت کو برخاست کردیا گیا۔ رون کو اس واقعے سے صدمہ پہنچا۔ اُس نے غریب عورت کے لیے ایک اور بنگلے میں ملازمت کا انتظام کرادیا۔

1994 میں جیکی کا انتقال ہوا۔ رون اس روز گہرے صدمے سے گزرا۔

اس واقعے کے بعد جیکی کے بیٹے کینیڈی جونیئر نے عدالت کی جانب سے عائد کردہ پابندی ختم کرادی۔

جیکی کی موت کے بعد کینیڈی خاندان میں رون کی دلچسپی ختم ہوچکی تھی، مگر اس نے پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے چند تقریبات میں اس کے خاندان کی تصاویر اتاریں اور کینیڈی جونیئر کے حوالے کردیں۔

☆☆☆

جیکی سے رون کے عشق کا کھٹا میٹھا قصہ تمام ہوا۔ اب ہم ماضی میں پلٹتے ہیں۔

یہ 73ء کے موسم گرما کا ذکر ہے، جب سال کی سب سے بڑی خبر نے جنم لیا۔

نیویارک سکتے میں تھا۔ رون خستہ حالی کی تصویر بنا اسپتال کے بستر پر پڑا تھا اور مارلن برانڈو کے ہاتھ میں انفیکشن ہوگیا تھا۔

اس صورتِ حال کا ماخذ 12 جون کا دن تھا، جب رون کیمرا تھامے مارلن کا تعاقب کررہا تھا۔

اس روز مارلن معروف ٹی وی میزبان ڈک کیویٹ کے پروگرام میں شریک تھا۔ پروگرام کے بعد وہ دونوں ڈنر کے لیے چائنا ٹاؤن کے ایک ریسٹورنٹ کی جانب چل دیے۔ رون بھی ان کا پیچھا کرتے ہوئے وہاں پہنچ گیا۔ جب وہ ڈنر کے بعد ریسٹورنٹ سے نکلے، رون اپنے ہتھیار سمیت سامنے موجود تھا۔

فلیش کئی بار چمکا جس کی روشنی نے مارلن کو آگ بگولا کر دیا۔

رون کی ڈک سے اچھی سلام دعا تھی۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جناب رات ہوگئی ہے۔ دھوپ کا چشمہ اتادیں۔ اچھی تصویر آئے گی۔"

اس سے قبل کہ ڈک کوئی جواب دیتا، اچانک مارلن کا بھاری مُکّا رون کے جبڑے پر پڑا۔

بے خبری میں ہونے والا حملہ اتنا شدید تھا کہ وہ زمین پر گر گیا۔ منہ خون سے بھر گیا۔ پانچ دانت ٹوٹ گئے۔ حواس جواب دینے لگے۔

ڈک اس صورتِ حال سے بھونچکا رہ گیا۔

"کیا تم پاگل ہوگئے ہو؟" وہ مارلن پر چلّایا جو اپنا ہاتھ سہلا رہا تھا۔

رون کو فوراً اسپتال پہنچادیا گیا جہاں وہ اگلے کئی روز زیرِ علاج رہا۔

مارلن کی صورتِ حال بھی کچھ مختلف نہیں تھی۔ مُکّے کی شدت کے باعث اس کے ہاتھ میں انفیکشن ہوگیا تھا۔

صحت یاب ہونے کے بعد رون نے قانونی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے مارلن پر مقدمہ دائر کردیا۔ رون کی جیت یقینی تھا۔ مارلن جیل بھی جاسکتا تھا۔ ڈک نے درمیان میں پڑ کر معاملہ عدالت کے باہر ہی چالیس ہزار ڈالر میں طے کروا

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ رون فائدے میں رہا۔ 70 کی دہائی میں چالیس ہزار ڈالر ایک بڑی رقم تھی مگر رون ہمیشہ یہ کہا کرتا کہ اس نے ڈک کی دوستی کی خاطر مارلن کو سستے میں چھوڑ دیا۔

وہ منہ بسورتا۔ ”تیس ہزار ڈالر تو جبڑے کے علاج اور وکیل کی فیس میں خرچ ہو گئے جناب۔ بھلا مجھے کیا فائدہ ہوا؟“

اس کرب ناک سانحے کے بعد کچھ عرصے تو وہ مارلن سے دُور رہا، مگر... ایک برس بعد اس کے اندر کا فوٹو گرافر پھر حرکت میں آ گیا۔

اس روز مارلن نیویارک آرٹ گیلری میں پریس کانفرنس کر رہا تھا۔ رون نے اس کا سامنا کرنے کا فیصلہ کیا مگر وہ حفاظتی انتظام کر کے نکلا۔

گیلری کی جانب بڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔

پریس کانفرنس جاری تھی۔ مارلن اپنے مخصوص انداز میں بات کر رہا تھا۔ اچانک حاضرین میں ہلچل ہوئی۔ اُن کی توجہ منتشر ہونے لگی۔ مارلن نے بھی محسوس کیا۔ اس نے لوگوں کی نظروں کا تعاقب کیا۔ دروازے کے پاس ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا اور چہرے پر ہیلمٹ۔

جب لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہیلمٹ کے پیچھے رون ہے، تو ان کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔

یہ صورتِ حال دیکھ کر مارلن کو بھی ہنسی آ گئی۔ اس نے بہ آواز بلند کہا۔ ”مجھ سے دور ہی رہنا۔“

رون نے فوراً جواب دیا۔ ”میں انتظام کر کے آیا ہو جناب۔“

اس نے مستقبل میں بھی مارلن کی کئی تصاویر کھینچیں مگر کبھی بغیر ہیلمٹ کے اُس کے سامنے نہیں آیا۔ عمر کے آخری حصے میں مارلن نے رون پر یوں تبصرہ کیا۔

”اس کی حرکتیں پریشان کن تھیں مگر وہ اپنے کام میں بہترین تھا۔“

کیا رون، مارلن سے نفرت کرتا تھا؟ نہیں۔ گو وہ اس کے مُکّے کا شکار بن چکا تھا مگر اس نے ہمیشہ مارلن کو بہترین اداکار قرار دیا۔ بدترین تو وہ رچرڈ برٹن کو قرار دیا کرتا، جس نے پرائے دیس میں اسے گرفتار کروایا اور پھر ہوٹل میں ایک بدمعاش بھیج دیا۔

”وہ واقعی بدترین ہی تھا۔ نالائق کہیں کا۔“ رون بڑبڑاتے ہوئے کہا کرتا۔

☆☆☆

جب رون نے پہلی بار اُس کی تصویر اتاری، وہ ایک عام سا سیاہ فام بچہ تھا اور وہ ایک عام سی تقریب تھی۔ رون یوں ہی مٹرگشت کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

کچھ برس بعد اس سیاہ فام بچے نے اپنا پہلا البم ریلیز کیا۔ البم کی بہت پزیرائی ہوئی۔ البم کی کامیابی کی پارٹی پر رون کی اس سے دوسری بار ملاقات ہوئی۔ اس دھان پان سے لڑکے کی آنکھوں میں رون کو صلاحیت کی چمک دکھائی دی۔ اسے وہ اچھا لگا۔ وہ دونوں دوست بن گئے۔

اس نے لڑکے کی چند تصاویر اتاریں جو ایک دوسرے درجے کے میگزین میں شائع ہوئیں۔

پھر نومبر 1982 میں دنیائے موسیقی میں ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ایک چوبیس سالہ پاپ آرٹسٹ کا Thriller نامی البم ریلیز ہوا۔ بعد کی کہانی تاریخ کا حصہ ہے۔

اس البم کی 65 ملین کاپیاں فروخت ہوئیں اور مائیکل جیکسن شہرت کے آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن گیا۔ ایک لیجنڈ۔

اس تاریخ ساز البم کی ریلیز کے بعد جب رون مائیکل جیکسن کی تصاویر بنانے کے ارادے سے اپنے اپارٹمنٹ سے نکلا، اس کے ذہن میں یہی خیال تھا کہ شاید نوجوان ابتدائی دو ملاقاتیں بھول چکا ہو۔ شاید اُسے پہچاننے ہی سے انکار کر دے۔

”شہرت جہاں انسان کو مغرور کرتی ہے، وہیں انسان کی یادداشت کمزور دیتی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”شاید اچانک تصویر کھینچنے پر وہ ناراض ہو جائے گا اور مغلظات بکنے لگا۔“

یہی سوچتے ہوئے اس کا ذہن شین پین کی جانب چلا گیا۔

رون کو وہ دن اچھی طرح یاد تھے جب شین نیا نیا تھا۔ تب وہ بڑی بے خوفی کے ساتھ خود کو نمایاں کیا کرتا۔ کبھی فوٹو گرافرز پر ناراض نہیں ہوتا۔ رون سے بھی بہت اخلاق سے پیش آیا کرتا۔ مگر مشہور ہونے کے بعد وہ فوٹو گرافرز سے کترانے لگا۔ اس کی کوشش ہوتی کہ صرف معروف میگزین ہی کے لیے تصاویر بنوائے۔ پاپارازیوں سے تو اسے چڑ ہو گئی تھی۔ رون کو بھی وہ سخت ناپسند کرنے لگا۔ ایک روز تو اس نے رون پر گرما گرم کافی انڈیل دی تھی۔

ماضی کی یادوں نے اس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ ”کوئی بات نہیں مسٹر شین پین۔ ابھی تم جوان ہو۔ مشہور ہو۔ جب بوڑھے ہو جاؤ گے، تو تمہاری خواہش ہو گی کہ کوئی تمہاری تصاویر بنائے۔ کوئی فوٹو گرافر تمہارا تعاقب کرے مگر تب تم خود کو تنہا پاؤ گے۔“

یہی سب سوچتے ہوئے وہ اس تقریب میں پہنچ گیا جہاں مائیکل جیکسن مدعو تھا۔

مائیکل اگلی صف میں بیٹھا تھا۔ جب اسٹیج سے اس کا نام پکارا گیا تو تالیوں کی گونج میں وہ اپنی نشست سے کھڑا ہوا۔

ٹھیک تب... رون حرکت میں آیا۔ اس نے لگاتار کئی تصاویر اتاریں۔ کیمرے کی فلیش سے مائیکل کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ جیسے سکتے میں آ گیا۔ رون کو یقین تھا کہ اب اس کے منہ سے گالیاں برآمد ہوں گی۔ مگر وہ اس وقت حیران رہ گیا، جب مائیکل نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اس کی خیریت پوچھی اور یہاں آنے پر شکریہ ادا کیا۔

رون کو اس کے رویّے سے خوشی ہوئی۔ وہ اب بھی دوست تھے۔

آنے والے برسوں میں رون نے اس کی کئی یادگار تصاویر کھینچیں۔ وہ ہمیشہ چھپ کر اس کی تصاویر بناتا، تاکہ وہ حقیقی تاثرات محفوظ کر سکے جن سے بطور فوٹو گرافر اسے عشق تھا۔

مائیکل جیکسن نے ایک بار کہا بھی اُسے یوں چھپ کر تصاویر بنانے کی ضرورت نہیں، وہ سیدھا اس کے پاس چلا آیا کرے مگر رون نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ مصنوعی تصاویر سے اسے نفرت جو تھی۔

رون نے مائیکل کو عروج پر جاتے دیکھا۔ اس لمحے کا گواہ بنا، جب پوری دنیا کے لبوں پر مائیکل کے گیت تھے۔ اس نے اسٹیج پر اُسے جادو جگاتے دیکھا۔ اُس نے مائیکل کی رنگت تبدیل ہوتے بھی دیکھی۔ ایک سیاہ فام بچہ ایک سفید فام شخص کے روپ میں ڈھل گیا۔

مائیکل دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ بن گیا اور رون اس کی کامیابی پر خوش تھا۔ اور پھر... رون، مائیکل جیکسن کی مشکلات کا شاہد بنا۔ اس نے اپنے دوست کو الزامات میں گھرا دیکھا۔ اُسے سماجی اور معاشی مصائب سے الجھتے دیکھا۔

اُس نے ہمیشہ خود کو یہی کہہ کر دلاسا دیا۔ ”خوشی اور غم زندگی کا حصہ ہیں۔ مائیکل کو آج مشکلات کا سامنا ہے مگر وہ جلد ان سے ابھر آئے گا۔“

رون نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کے کیمرے کی آنکھ کبھی مائیکل جیکسن کو تابوت میں لیٹا ہوا بھی دیکھے گی۔

وہ رون کی زندگی کا سب سے اداس دن تھا۔ اگرچہ کئی بڑے فن کاروں نے اس کے سامنے جہانِ فانی سے کوچ کیا مگر اسے مائیکل کی موت سے گہرا صدمہ پہنچا۔ مائیکل کی آخری رسومات کے موقع پر رون کی آنکھوں میں نمی تھی۔ مائیکل سے جڑی یادوں کو اس نے اپنی یادگار کتاب Man in the Mirror میں بڑے اچھوتے انداز میں پیش کیا۔

بیسٹ سیلر ٹھہرائی جانے والی اس کتاب میں شامل تصاویر میں مائیکل بروک شیلڈ، صوفیا لارین، سیلویسٹر اسٹالون، ایلزبتھ ٹیلر، میڈونا اور محمد علی کلے سمیت کئی معروف شخصیات کے ساتھ نظر آیا۔ اس کے ابتدائی زمانے کی تصاویر کے علاوہ اس کے اہلِ خانہ کے فوٹوز بھی اس کتاب میں شامل تھے۔

اس کتاب کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر اس نے کہا۔ ”یہ ایک عظیم فن کار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کی میری حقیری کوشش ہے۔ ایک فن کار جو مجھ سمیت کروڑوں افراد کے دلوں پر راج کرتا تھا۔“

یہ جملے ادا کرتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

☆☆☆

وہ ایک آواز تھی۔ ایک حسین آواز۔

پورے دو برس بیٹی برک، رون گوگیلا کے لیے فقط ایک آواز رہی۔ ”سنڈے سپلمنٹ“ سے منسلک بیٹی نیکی فون پر رون کو اسائنمنٹ سونپا کرتی۔ کبھی اُسے شین پین کی تصاویر بنانے کی ہدایت جاری کرتی، کبھی میڈونا کا تعاقب کرنے کا مشورہ دیتی۔ ان دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

ایک روز اسی آواز نے رون سے دریافت کیا۔ ”مسٹر رون گوگیلا تمہاری عمر کیا ہو گی؟“

یہ بڑا ہی غیر روایتی سوال تھا۔ آج تک لوگ فقط تصاویر اتارنے کی قابلیت یا کیمروں کی بابت گفتگو کیا کرتے تھے رون سے۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کوئی اس کی عمر میں دلچسپی لے رہا تھا۔

”یہی کوئی 47 برس۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو کب تک کنوارے رہنے کا پروگرام ہے؟ شادی کر لو۔“

”شادی!“ رون ماضی میں چلا گیا۔ اس زمانے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب وہ بے روزگاری کا کرب سہہ رہا تھا، ان دنوں اس کی ملاقات آئرلینڈ سے تعلق رکھنے والی صوفیا سے ہوئی تھی۔ صوفیا ایک ہوٹل میں ویٹرس تھی۔ جلد ہی وہ محبت کے بندھن میں بندھ گئے۔ ایک زمانے میں تو رون سنجیدگی سے شادی کرنے کی بابت سوچنے لگا تھا مگر صوفیا کی ترجیحات کچھ اور تھیں۔ موسم خزاں کی ایک اداس شام اس نے رون کو مطلع کیا کہ وہ آئرلینڈ جارہی ہے۔

"میں جلد لوٹ آؤں گی پیارے۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، جو مصنوعی معلوم ہوتی تھی۔

اس نے دکھی دل کے ساتھ اپنی محبوبہ کو رخصت کیا۔ توقع کے عین مطابق صوفیا کبھی لوٹ کر نہیں آئی۔

شروع شروع میں وہ خاصا اداس رہا۔ مگر آنے والے برسوں میں مصروفیات نے اسے گھیر لیا۔ اُسے کیمرے سے محبت ہوگئی اور اسے شادی ایک احمقانہ اور غیر ضروری بندھن لگنے لگا۔ اسی فکر کے سہارے وہ زندگی کے پانچویں عشرے میں داخل ہوگیا۔

"کبھی سوچا نہیں۔" وہ لمحہ حال میں لوٹ آیا۔ "میں بہت مصروف رہتا ہوں۔ آج یہاں تو کل وہاں۔ کوئی ٹھکانا نہیں۔ لوگوں کی گالیاں بھی سنتا ہوں، جوتے بھی کھاتا ہوں۔ مجھ سے بھلا کون شادی کرنا چاہے گا؟"

بیٹی نے قہقہہ لگایا۔ "ہاں، تم جیسے بدمعاش سے کون سی لڑکی شادی کرنا پسند کرے گی۔ چلو پھر بات کرتے ہیں۔ گڈ بائی۔"

فون رکھنے کے بعد ایک بے نام لطیف احساس نے رون کو گھیر لیا۔ اس نے کیمرا ایک جانب رکھ دیا اور اپنی زندگی کی بابت سوچنے لگا۔ جوں جوں وہ سوچتا گیا، یہ خیال راسخ ہوتا گیا کہ اُسے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔

تین روز بعد پھر بیٹی کی کال آئی۔ "پیارے پاپارازی ایک اسائنمنٹ ہے۔"

"بندہ حاضر ہے۔ حکم۔" اس نے خوش دلی کہا۔

بیٹی نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ "آج تو جناب بہت اچھے موڈ میں معلوم ہوتے ہیں۔ کیا کوئی لڑکی دیکھ لی؟"

"نہیں۔" اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں تلاش کررہا ہوں۔ اگر تمہاری نظر میں کوئی لڑکی ہو تو بتانا۔"

اسے ایک نقرئی قہقہہ سنائی دیا۔ "ایسی بات ہے تو میں تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہوں لیکن مجھے یہ تو بتاؤ کہ کس قسم کی لڑکی تمہیں پسند ہے۔"

"ٹیلی فون پر یہ باتیں مناسب نہیں لگتیں۔" اس نے کہا۔ "ملیں گے تو بتاؤں گا۔"

"تو کسی دن دفتر چلے آؤ۔"

"نہیں دفتر نہیں۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "کسی ریسٹورنٹ میں ملتے ہیں۔"

دو روز بعد وہ عمدہ لباس میں ملبوس ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔ نظریں دروازے پر ٹکی تھیں۔ اس نے کبھی بیٹی کو نہیں دیکھا تھا مگر ذہن میں ایک شبیہہ بنا رکھی تھی۔

ریسٹورنٹ میں داخل ہونے والی ہر لڑکی کو وہ غور سے دیکھتا، مگر کوئی لڑکی اس شبیہہ سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔

پھر ایک نقرئی آواز سماعتوں میں اتری۔ "دنیا کا متنازعہ ترین فوٹو گرافر آج کیمرے کے بغیر۔ خیر تو ہے۔"

وہ پلٹا۔ سامنے ایک حسین چہرہ تھا۔ آنکھیں سبز۔ چہرے پر شوخی۔ جسم متناسب۔

"مس بٹی۔ کیسی ہیں آپ؟" وہ کھڑا ہوگیا۔

"بہت دُکھی۔" اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ "سوچا تھا رون گوگیلا سے ملوں گی تو وہ فوراً حرکت میں آجائے گا، میری تصویر کھینچے گا۔ مگر آپ تو یہاں بنے ٹھنے بیٹھے ہیں جناب۔"

رون نے قہقہہ لگایا۔ گفتگو کا آغاز ہوا... اور پانچ منٹ بعد اس نے بیٹی کو شادی کی پیشکش کردی۔

وہ مسکرائی۔ شاید وہ اِس کی توقع کررہی تھی۔ "اتنی جلدی بھی کیا ہے؟"

"مجھے کوئی جلدی نہیں۔ میں انتظار کرنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

انتظار طویل ثابت نہیں ہوا۔ اگلی چند ملاقاتوں کے بعد معاملات طے پاگئے۔

رون اور بیٹی کی شادی کی خبر نے میڈیا کی خصوصی توجہ حاصل کی۔ نیویارک کے ایک پرچے نے 1978 میں رونما ہونے والے اہم ترین واقعات میں اسے شمار کیا۔

چند افراد کا خیال تھا کہ یہ شادی زیادہ عرصے نہیں چلے گی۔ بیٹی ابھی جوان ہے، شوہر سے سترہ برس چھوٹی۔ پھر رون گھر پر بھی کہاں ٹکتا ہے۔ اس لیے جلد ہی ان کے راستے جدا ہوجائیں گے مگر وہ غلط ثابت ہوئے۔ ان دونوں نے ایک خوشگوار اور بھرپور زندگی گزاری۔ دنیا بھر کی سیر کی۔ نیوجرسی کے علاقے ماؤنٹ ویلے میں ایک شان دار گھر تعمیر کیا۔

ان کی ہنستی کھیلتی زندگی میں بس ایک کمی تھی۔ خدا نے

انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا۔

اس کمی کو پورا کرنے کے لیے رون جانوروں سے محبت کرنے لگا۔ اس نے دو خرگوش پال لیے، جنہیں وہ بے حد چاہتا تھا۔ اولاد کی طرح ان کا خیال رکھتا۔ ان خرگوشوں کی اس نے کئی تصاویر بھی اتاریں جو مختلف میگزین کا حصہ بنیں۔ بدقسمتی سے ایک صبح صحن میں کھیلتے دونوں خرگوش ایک جانور کا شکار بن گئے۔

کتنا دل خراش واقعہ تھا وہ۔ رون اور بیٹی کو بہت صدمہ پہنچا۔ باغ میں دونوں خرگوشوں کو دفن کیا گیا۔ اِس واقعے نے میاں بیوی کو کئی ماہ اداس رکھا۔ زندگی میں لوٹنا تھوڑا دشوار ثابت ہوا تھا۔

☆☆☆

ایک پاپارازی کے لیے شاطر اور عیار ہونا ضروری ہے... اسے لوگوں کو اکسانے کا ہنر آنا چاہیے... خبر حاصل کرنے کے لیے فنکاروں کو اشتعال دلانا ایک اچھا حربہ ہے... ہاں، اسے ایک چور کی مانند دیوار پر چڑھنا ضرور آنا چاہیے، تاکہ وہ لوگوں کے گھروں میں کود کر تصویر بنا سکے..."

اگر آپ سوچتے ہیں کہ رون ان خیالات کا حامل تھا تو آپ غلط ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بہت مہذب اور با اخلاق آدمی تھا۔ اس نے اپنے لیے چند اصول وضع کر رکھے تھے جنھیں وہ "پاپارازیوں کا ضابطہ اخلاق" کہا کرتا۔

جب ایک پریس کانفرنس میں کسی صحافی نے اس ضابطے کی بابت پوچھا، تو اس نے کہا:

"ہر پیشے کی چند حدود ہوتی ہیں جن کی پاس داری ضروری ہے۔ پاپارازی کے لیے پہلی اور اہم ترین شرط یہ ہے کہ وہ تصویر حاصل کرنے کے لیے لوگوں کے گھروں میں داخل ہونے سے اجتناب برتے۔ ویسے بھی بلا اجازت کسی کے گھر میں جانا قطعی مناسب نہیں۔"

"واقعی، تو ہمارے پیارے مسٹر گوگیلا نے کبھی دیوار نہیں پھلانگی؟ حیرت ہے۔" ایک حسینہ نے شوخ لہجے میں سوال کیا۔

وہ مسکرایا۔ "قطعی نہیں محترمہ، مجھے یاد ہے کئی عشروں قبل موسم بہار کی ایک خوش گوار صبح میں ڈورس ڈے کی تصویر اتارنے کے لیے جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنے کتے سے کھیل رہی ہے۔ اتفاق سے اُس کے مالی کی نظر مجھ پر پڑگئی۔ اس نے دروازے کا ایک پٹ کھول دیا، تاکہ میں بہتر تصویر حاصل کرسکوں، لیکن..." اس نے ایک لمحہ کا توقف کیا۔ "لیکن آپ کے پیارے مسٹر گوگیلا نے صاف انکار کردیا۔ میں نے لانگ لینس کی مدد سے وہ تصویر کھینچی، جس کا مجھے اچھا معاوضہ ملا۔"

"سنا ہے کہ آپ ایک بار جہاز راں کا بھیس بدل کے جیکی کے تعاقب میں نکل گئے تھے؟" ایک اور شخص نے پوچھا۔

"اچھا واقعہ یاد دلایا آپ نے۔" رون نے ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں، جیکی ان دنوں یونان کے دورے پر تھی۔ وہ جزیروں کی سیر کررہی تھی۔ میں نے ایک جہاز راں کا روپ دھارا، کیمرا بیگ میں چھپایا اور جہاز میں سوار ہوگیا۔ میں کچھ بہت حسین تصویریں حاصل کرنے میں کامیاب رہا جن میں ایک ایسی تصویر بھی تھی جس میں جیکی کے جسم کا اوپری حصہ برہنہ تھا، مگر میں نے کبھی وہ تصویر شائع نہیں کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نوجوان فوٹو گرافروں کو بھی اس ضمن میں احتیاط برتنی چاہیے۔ ہمارا مقصد حقیقی تاثرات کا تعاقب ہے، کسی کی تضحیک نہیں۔"

"ایلزبتھ ٹیلر کی وجہ سے آپ کو جیل کی ہوا کھانی پڑی مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس نے اپنی آپ بیتی میں آپ کی بنائی ہوئی تصاویر شامل کیں؟"

"میکسیکو۔" رون نے گہرا سانس لیا۔ "ہاں یہ میکسیکو کا واقعہ ہے۔ وہ واقعی بہت مشکل دن تھا دوست۔ وہاں قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ یہی نہیں، مسٹر رچرڈ نے ایک بدمعاش بھی میرے پیچھے لگا دیا تھا لیکن مجھے ایلزبتھ ٹیلر سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ بے حد حسین اور باصلاحیت اداکارہ تھیں۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے میری تصاویر کو اس قابل جانا کہ اپنی کتاب میں شامل کیا۔"

شوخ لہجے والی حسینہ پھر کھڑی ہوگئی۔ "کچھ ہی روز پہلے لیڈی ڈیانا کی موت کا سانحہ پیش آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ڈیانا کے کار ڈرائیور نے اس وجہ سے رفتار کی حد کی خلاف ورزی کی کیونکہ ایک پاپارازی ان کا تعاقب کررہا تھا۔"

"میں نے بھی یہ افسوسناک خبر سنی۔" رون نے دھیرے سے کہا۔ "مجھے اس کا دکھ ہے۔ جو فوٹو گرافر ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں، درحقیقت وہ اس پیشے کو بدنام کررہے ہیں۔ میری درخواست ہے کہ وہ ایسا نہ کریں۔ اپنے پیشے سے پیار کریں، اس کا احترام کریں۔"

"ایک آخری سوال مسٹر گوگیلا۔ آپ کو دنیا کا متنازعہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ترین فوٹوگرافر کہا جاتا ہے۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں؟"

"متنازعہ؟" اس نے کچھ تامل کیا۔ "دیکھیں میں نے کبھی کسی کو اکسانے یا مشتعل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کبھی دو فنکاروں کو آپس میں لڑانے کی سازش نہیں کی۔ اگر ایسی تصاویر ہاتھ لگیں جن سے فنکاروں کی شہرت کو نقصان پہنچتا ہو تو انہیں چھاپنے سے اجتناب برتا۔ اگر اس کے باوجود آپ مجھے متنازعہ خیال کرتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

☆☆☆

دریا خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ غروب ہوتے سورج کی کرنیں پانی پر چمک رہی تھیں۔ دریا کے پاس ایک درخت تھا جس کے نیچے بچھی بینچ پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔

وہ بہت ہی پُرسکون اور تروتازہ تھا۔ چہرہ پُراطمینان۔ آنکھوں میں طمانیت۔ ایک اہم فیصلہ لیا جاچکا تھا۔

نئے ہزاریے کے آغاز سے قبل رون نے فوٹوگرافی کے پیشے سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔

اس فیصلے کا ایک سبب تو یہ تھا کہ وہ مزید بھاگ دوڑ نہیں کرسکتا تھا۔ پھر ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ اپنے کام کو محفوظ کرنا چاہتا تھا، اسے ایک ترتیب کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی آرزو دل میں پنپنے لگی تھی۔

اپنی تصاویر کو یکجا کرکے انہیں ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں اسے ڈیڑھ سال لگا۔ آنے والے برسوں میں امریکا، برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کی کئی مشہور گیلریز میں اس نے اپنی تصاویر کی نمائش کی۔ ساتھ ہی تصویری البمز کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا۔

2004 میں شائع ہونے والے البم کا نام Ron Galella: Exclusive Diary تھا۔ اس البم میں 150 تصاویر شامل تھیں جو تمام چھپ کر کھینچی گئیں۔ اس کتاب میں اُس نے پاپارازی کے فن کی تشریح بھی کی۔

2006 میں منظرِ عام پر آنے والی اس کی کتاب 70 کی دہائی کے گرد گھومتی تھی۔ بنیادی محور نیویارک کے نائٹ کلبس تھے جہاں معروف آرٹسٹ اپنی شامیں گزارتے۔

یہ ایک منفرد کتاب تھی جسے ایک نقاد نے معرکہ آرا قرار دیا۔ Disco Year نامی اس کتاب کو سال کی بہترین فوٹوگرافک بک کا ایوارڈ بھی ملا۔ اس کی اگلی کتاب معروف مصور، مجسمہ ساز اور فوٹوگرافر اینڈی وارہول کے گرد گھومتی تھی۔

2008 میں اس کی ایک اور یادگار کتاب منظرِ عام پر آئی جس کا نام No Pictures تھا۔ یہ کتاب ان افراد کی تصویروں پر مشتمل تھی جنہیں رون کے کیمرے کا فلیش انتہائی ناگوار گزرا۔ اسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر وہ چلّا اٹھے۔ "خبردار تصویر مت کھینچنا۔"

بعد کے برسوں میں بھی اس کے فوٹو البمز کا سلسلہ جاری رہا، جن میں سے ایک مائیکل جیکسن اور ایک کتاب محمد علی کلے سے متعلق تھی۔ 225 تصاویر پر مشتمل ایک کتاب میں اس نے اپنی آبائی جڑوں کو کھوجنے کی کوشش کی۔ Viv l' Italia! نامی کتاب میں اطالوی نژاد امریکی فن کاروں کی تصاویر شامل تھیں۔

یہ کتاب اسے سب سے زیادہ عزیز تھی۔

☆☆☆

رون گوگیلا اس وقت حیات ہے۔

کسی زمانے میں اسے گالیاں دی جاتی تھیں، جوتے مارے جاتے، محفلوں سے دھکے دے کر نکالا جاتا، مگر آج پوری دنیا میں اُسے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ناقدین متفق ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فوٹوگرافر اس مقام پر نہیں پہنچ سکا جو آج رون کو حاصل ہے۔

ماضی میں جو فنکار اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے بعد میں انہوں نے بھی اُس کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا۔

اس کے دانت توڑنے والے مارلن برانڈو اور اسے گرفتار کروانے والے رچرڈ برٹن نے شان دار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے ہم عصر اینڈی وارہول نے بھی اس کے کام کو انوکھا قرار دیا۔

2010 میں آسکر ایوارڈ یافتہ ہدایت کار لیون گاسٹ نے اس کی بھرپور زندگی کے متعلق ایک فلم بنائی، جسے Smash His Camera کا نام دیا گیا۔ یہ دراصل جیکی کا جملہ تھا جو گوگیلا کی حرکتوں سے تنگ آکر پکار اٹھی۔ "اس کا کیمرا توڑ دو۔"

اس فلم نے کئی فیسٹول میں ایوارڈز وصول کیے۔

اس کے منفرد کام پر سب سے اچھا تبصرہ ڈاسٹین ہافمین نے کیا جس کے بہ قول، "اگر آپ ستّر اور اسّی کی دہائی کی فلم نگری کا تذکرہ کریں گے، تو وہ رون گوگیلا کے کیمرے کے بغیر ادھورا ہوگا۔ کیونکہ اس کا کیمرا ہر طرف تھا۔"

واقعی، رون کے بغیر یہ تذکرہ ادھورا ہوگا۔ کیونکہ وہ ان عشروں کا سپر اسٹار تھا۔ ایک لیجنڈ۔

ڈزنی

شکیل صدیقی

اس نے غربت کے سائے میں پرورش پائی۔ دانے دانے کو ترستے ہوئے جوانی میں قدم رکھا مگر حوصلے کو مہمیز کیے رکھا اور تجربات کے کاندھے پر سوار ہوکر کچھ کردکھانے کی سعی میں مصروف رہا۔ بالآخر اس نے منزل پاہی لی اور آج اس کے نام پر اتنے اثاثے ہیں جس کا مقابلہ کوئی اور نہیں کرسکتا۔ اس نے ایک بڑے علاقے پر عجائبات کی دنیا تخلیق کردکھائی ہے۔

چھوٹے چھوٹے بچے تک اس کے نام سے واقف ہیں

آپ اس دنیا کا تصور کیجیے جس میں والٹ ڈزنی نہ ہو تو وہ پھیکی اور سُونی معلوم ہوگی۔ ایک ایسی دنیا جس میں اس کے کمالات، اس کی رجائیت پسندی اور دنیا کو بہتر سے بہترین دیکھنے کی خواہش موجود نہ ہو، کیسی لگے گی؟ والٹ ڈزنی دنیا میں خوشیاں بانٹنے کے لیے آیا تھا اور ہم اس کی قائم کردہ جنت (ڈزنی لینڈ) سے اب تک محظوظ ہو رہے ہیں۔ وہ خلاق ذہن کا مالک تھا اسی لیے اس نے دنیا کے باسیوں کو ہنسانے، رلانے اور انہیں تفریح مہیا کرنے کی نت نئی راہیں تلاش

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیں۔ لوگوں کو فرسودہ راستوں سے ہٹا کر نئی دنیا میں لے آیا۔ اس کی سوچ تازہ اور خیالات قابلِ تقلید تھے۔ اس نے جو راہیں متعین کیں لوگوں نے انہیں اپنا لیا۔ والٹ ڈزنی بلاشبہ ایک ایسا پل ہے جو ماضی سے مستقبل کو ملاتا ہے۔

ہالی ووڈ میں اپنے 43 سالہ کیریئر کے دوران اس نے موشن پکچرز کو جدید راہوں پر استوار کیا اور اپنے پاؤں استقامت سے جما کر ایسی اختراعات اور ایجادات کیں جنہیں آج تک کوئی فراموش نہیں کرسکا۔ اس کے تصورات منفرد اور یکتا تھے۔ اس میں جمالیاتی حس کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس نے ایک بچے امریکی کی طرح کچھ خواب دیکھے اور اپنی زندگی میں ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچا گیا۔ اس کی موت کے تیس برس گزرنے کے بعد بھی ہم اس کے فکر وخیال سے استفادہ کررہے ہیں۔

والٹ ڈزنی 5 دسمبر 1901ء میں شکاگو، ایلے نوائس میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ الیاس ڈزنی آئرش کینیڈین تھا جب کہ اس کی ماں فلورا جرمن نژاد امریکی تھی۔ شکاگو آج کے جیسا نہیں تھا۔ وہ جھونپڑیوں کا جنگل کہا جاسکتا تھا۔ والٹ ڈزنی کے تین بھائی اور ایک بہن تھی۔ اس کی ولادت کے بعد خاندان مارسلین، میسوری چلا گیا۔ ڈزنی کے بچپن کا بڑا حصہ وہاں گزرا۔ اسے ڈرائنگ اور آرٹ سے شغف تھا اور وہ ہاتھ میں پنسل لیے گھنٹوں رنگین تصاویر بناتا رہتا تھا۔ جب وہ سات برس کا تھا تو اپنے بنائے ہوئے اسکیچز آس پڑوس میں فروخت کردیا کرتا تھا۔ اس کا یہ جنون اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ اپنے اسکول کا کام کرنے کے بجائے سارا وقت قدرتی مناظر اور جانوروں کی تصاویر بنانے میں صرف کرتا تھا۔

جانوروں اور پرندوں سے اس کی محبت کی کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک بار اس نے اپنی اڑگن سے مذاق مذاق میں ایک اُلّو کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔ چھرّا نشانے پر لگا اور اُلّو چیختا ہوا زمین پر بوس ہوگیا۔ وہ مرتے وقت جاں کنی کے عالم میں تھا اور دیر تک تڑپتا رہا۔ ڈزنی اس منظر سے کافی متاثر ہوا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ اس نے توبہ کی اور تہیہ کرلیا کہ آیندہ وہ کسی پرندے یا جانور کو ہلاک نہیں کرے گا۔ اسے محسوس ہوا کہ جانور تو قدرت سے قریب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس نے ان کی تصویریں بنانا شروع کردیں۔

اس کی ڈرائنگ اور لکیروں میں اس وقت صفائی پیدا ہوئی جب اس کی بہن رُتھ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گھر کی چھپلی دیوار پر کوئلے کول سے تصویریں بنائے۔ مگر تصویر لکڑی کے تختوں پر کیسے بنتی؟ دونوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ اپنے صحن میں رکھا ہوا تارکول کا ڈبا کام میں لینے کا فیصلہ کیا۔ تارکول نرم تھا اس لیے اسے بالٹی میں بھرنے میں آسانی ہوئی۔ برش تلاش کیا گیا اور اس کے بعد دونوں نے مل کر لکڑی کے مکان کی پچھلی دیوار کو کالا کرڈالا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا باپ آیا تو اس نے دونوں کی اچھی درگت بنائی۔ وہ تارکول اس لیے لایا تھا کہ لکڑی پر لگا کر اسے دیمک پروف کرسکے۔ باپ غصیلا تھا اس لیے سب بچے اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔

اس کا باپ الیاس ڈزنی پیشے کے اعتبار سے بڑھئی تھا اور اس کا شمار ماہرین میں ہوتا تھا۔ وہ عقیدے کے لحاظ سے کٹر مذہبی شخص تھا۔ جب والٹ ڈزنی پیدا ہوا تھا تو وہ ٹھیکے داری کرتا تھا، لیکن بعد میں وہ بڑھئی بن گیا۔ اس نے شکاگو کی عالمی نمائش میں 1893ء میں کام کیا تھا۔ یہ نمائش اتنی کامیاب ہوئی کہ اس کے بعد دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی ایسی نمائشیں لگانے کا اہتمام کیا گیا۔ جب ڈزنی اور اس کا بھائی رائے چھوٹے تھے تو باپ انہیں اس نمائش کی حیرت ناک باتیں بتایا کرتا تھا۔

ڈزنی کے گھر کے قریب ہی سانتا ریلوے لائن تھی جو دیہات تک چلی گئی تھی۔ بعض اوقات ڈزنی اس ریلوے کی پٹری سے کان لگا کر آنے والی ٹرین کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنا کرتا تھا۔ اس کا چچا مائک مارٹن ریلوے انجینئر تھا اور فورٹ میڈیسن سے مرسلین تک کام کرتا تھا۔ ڈزنی اس کے ساتھ کئی بار ٹرین میں گھوما پھرا تھا۔ پھر اس نے ریل کے مسافروں کو اخبارات، پاپ کارن اور سوڈے کی بوتلیں فروخت کرنا شروع کردیں۔

ٹرین میں مسافروں کو چیزیں فروخت کرنے کے لیے اسے رات ساڑھے تین بجے اٹھنا پڑتا تھا۔ یہ کام وہ چھ بجے تک کیا کرتا تھا، اس کے بعد وہ گھر آتا اور ناشتا کرنے کے بعد اسکول چلا جاتا۔ پھر شام کو وہ آرٹ اسکول کی طرف دوڑ لگا دیتا۔ اس طرح سے وہ ایک سخت اور جاں گسل زندگی گزار رہا تھا۔ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا تھا کہ میں نے اپنے معمول میں کوئی فرق نہیں دیا البتہ جب میں ایک ماہ کے لیے بیمار پڑ گیا تھا تو وہ دن میں نے بستر پر لیٹ کر گزارے۔

ساڑھے تین بجے بستر چھوڑنا اور گھر سے باہر نکلنا کوئی آسان نہیں ہے۔ سردی میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی ہوتی تھیں۔ جن دنوں برف باری ہو رہی ہوتی تھی تو اس کے جوتے اور پاؤں سردی سے اکڑ جاتے تھے۔ جب ٹھنڈک

ناقابلِ برداشت ہوجاتی تھی تو وہ کسی مکان کی آڑ میں لیٹ جاتا تھا اور سورج نکلنے پر کام کا آغاز کرتا۔ وہ پہلے اخبارات خاص طور پر اتوار کے اخبارات کاندھے پر رکھ کر سپلائی کیا کرتا تھا۔ اس کے بعد جب ڈیلیوری بڑھ گئی تو اس کے باپ نے اسے لکڑی کے پہیوں والی گاڑی دلوادی جسے ہاتھوں سے دھکا دیا جاتا ہے۔ اخبارات کی ڈیلیوری میں مزید اضافہ ہوگیا تو ایک ہی وقت میں سارے اخبارات کو سپلائی کرنا ممکن نہ رہا۔ بے چارے ڈزنی کو گاڑی میں دو تین چکر کاٹنا پڑتے تھے۔ وہ ہر جگہ جاتا تھا، اسٹر کنڈیشنڈ مکانات میں، ریستورانوں میں اور فلیٹوں میں۔ جب وہ کسی گرم ریستوران سے نکل کر کھلی ہوا میں آتا تو جسم کا درجۂ حرارت اچانک تبدیل ہونے سے اسے چھینکیں آنے لگتیں اور زکام ہوجاتا۔ چنانچہ اس نے ریستورانوں میں جانا چھوڑ دیا۔ بلند و بالا فلیٹوں میں اخبارات پہنچانے میں کافی وقت صرف ہوجاتا تھا اس لیے وہ اسکول تاخیر سے پہنچتا تھا، لہٰذا اس نے بلند عمارتوں میں جانا بھی ترک کردیا۔

اتنے کام کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ایک دم سے بڑا ہوگیا تھا اور بچوں کے کھیلوں میں حصہ نہیں لیا کرتا تھا۔ بچوں کے ساتھ مل کر اس نے ایک چھوٹی سی تنظیم بنائی ہوئی تھی جو ویرانوں میں جا کر پرندے اکٹھا کیا کرتے تھے اور درختوں سے گوند اکٹھا کیا کرتے تھے۔ یہ گوند اچھی قیمت پر بازار میں فروخت ہوجاتا تھا تو سب لڑکے آپس میں رقم بانٹ لیا کرتے تھے۔ اس طرح سے ان کا جیب خرچ چل رہا تھا۔

وہ اور اس کا بھائی اتنی محنت و مشقت کررہے تھے، مگر انہیں اس کا معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اس کا باپ چونکہ اخباری ایجنسی چلا رہا تھا، اس لیے وہ سیاہ سفید کا مالک تھا۔ وہ ان کے ہاتھ پر معمولی سی رقم رکھ دیتا تھا۔ دونوں چیں بہ جبیں ہوتے لیکن کچھ کہہ نہ پاتے۔ باپ کہتا تھا کہ میں نے تمہیں رہنے کی جگہ دی ہوئی ہے اور میں تمہارا روٹی پانی کا خرچ بھی برداشت کرتا ہوں۔ یہ سب کہاں سے آئے گا؟ اگر تم محنت کررہے ہو تو اپنے لیے۔

باپ کے معاندانہ رویّے سے تنگ آکر ان کے دو بڑے بھائی گھر سے بھاگ گئے۔ وہ کہاں چلے گئے۔ آج تک پتا نہ چل سکا۔

رائے نے انیس برس کی عمر میں گریجویشن کرلیا۔ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس نے ڈزنی سے کہا کہ وہ بھی گھر سے بھاگ جائے گا۔ اس لیے کہ اس کا باپ اسے اب تک بچہ سمجھتا ہے اور بچوں جیسا سلوک کرتا ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ بڑھئی گیری کے کام میں جب چھوٹی سی غلطی بھی ہوجاتی ہے تو وہ ہمیں مارنا شروع کردیتا ہے۔ یہ سنتے ہی ڈزنی رونے لگا۔ رائے نے اسے تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے چچا کے فارم پر چلا جائے گا۔ جو یہاں سے چند میل کے فاصلے پر ہے پھر وہ اسے اپنے پاس بلالے گا۔ ان لفظوں سے ڈزنی کو قدرے ڈھارس ہوئی۔

ڈزنی کو کھیل تماشے کرنا بہت پسند تھے۔ وہ فلمیں دیکھا کرتا تھا تو کوشش کرتا کہ خود بھی کوئی کردار ادا کرے۔ ایک بار دروازے پر دستک ہوئی تو اس کی ماں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اسے ایک بڑھیا کھڑی نظر آئی۔ یہ سوچ کر کہ وہ بھکارن ہے، اس کی ماں نے دروازہ بند کرنا چاہا لیکن ہنسی سن کر ٹھٹک گئی۔ پلٹ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کپڑے اسی کے ہیں اور ان کپڑوں میں والٹ ڈزنی ہے۔ اس دل چسپ مذاق سے وہ کافی محظوظ ہوئی۔ آزادانہ زندگی میں جب ڈزنی بلا روک ٹوک گھومتا پھرتا تھا تو اسے قدرت کے نظاروں اور صناعی سے لگاؤ پیدا ہوگیا۔ خاندان کیا ہے (انسانوں اور جانوروں کا) اور اہلِ خاندان مل جل کر کیسے رہتے ہیں، اس کے مشاہدے میں شامل ہوگیا تھا۔ وہ زمین داروں کے رہنے سہنے کے طور طریقوں سے کماحقہٗ واقف ہوگیا تھا۔

ایک روز اس کے باپ نے گھر کے قریب مجمع دیکھا تو صورتِ حال معلوم کی۔ لوگوں نے بتایا کہ دو لڑکوں کی آپس میں لڑائی ہوئی ہے۔ وہ گتھم گتھا ہوئے اور اس کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو لہولہان کرڈالا۔ پولیس آئی اور اس نے دونوں کو گرفتار کرلیا۔ الیاس ڈزنی یہ سن کر گھر میں گیا اور اس نے اپنی بیوی کو سارا واقعہ سنایا۔ وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔

الیاس ڈزنی نے اس سے کہا کہ ہمارے دونوں بیٹے اتنے ہی بڑے ہیں۔ اگر ہم اس ماحول میں کچھ دن اور رہے تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی کہیں ایسے ہی نہ ہوجائیں، لہٰذا بہتر ہوگا کہ اب کسی اور شہر میں جا کر رہائش اختیار کریں۔ بیوی نے صلاح دی کہ اب ہمیں کنساس سٹی میں جانا چاہیے۔ وہ اچھا شہر ہے۔ اس کے شوہر نے اس سے اتفاق کیا۔

جب اس کا خاندان کینساس سٹی چلا گیا تو اس وقت بھی ڈزنی کے خیالات اور رجحانات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ڈرائنگ کرنے کے علاوہ ڈزنی اب اداکاری اور ڈراموں کی طرف بھی متوجہ ہوگیا۔ وہ اسکول میں خاموش فلموں کے ہیرو چارلی چپلن کی نقل اتارنے لگا۔ اپنے اساتذہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈزنی لینڈ

والٹ ڈزنی کے دماغ میں تفریحی زندگی کا بھی ایک معیاری خاکہ تھا۔اس کے بارے میں اس نے کہا تھا۔ ''میرے خیال میں دنیا میں اس بارے میں کہیں دو آرا نہیں پائی جائیں گی کہ ہمارے شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی یا گنجانیت کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے؟ میرا خیال ہے کہ ہمیں عوام کی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔اتنی بڑی آبادی کے لیے تفریح گاہ کیسی ہونی چاہیے؟

اپنے خوابوں کو عملی رنگ دینے کے لیے اس نے 43 مربع میل کا ایک خطۂ زمین خریدا جو مین ہٹن کے سائز سے دوگنا تھا۔یہ خطہ ریاست فلوریڈا کے وسط میں تھا۔اس کا نام اس نے 'ڈزنی لینڈ' رکھا۔اس کے گرد کا علاقہ ویران اور بے آباد تھا۔جائیداد خریدنے اور فروخت کرنے والوں نے پیش گوئی کر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ علاقہ زبردست رہائشی منصوبے میں تبدیل ہو جائے گا۔ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ڈزنی لینڈ کی تکمیل سے پیشتر ہی ریاست فلوریڈا کی ویرانی ختم ہو گئی۔

ڈزنی نے اسے خالص تفریحی مقام بنانے کا منصوبہ بنایا تھا، جہاں ہوٹل، موٹیل، آرام گاہیں اور بچوں کو حیرت زدہ کر دینے والی جھیلیں اور جادوئی مقامات بنتا تھے۔اس پارک کا خیال اس کے دماغ میں اس وقت آیا تھا جب وہ تفریح کی غرض سے ڈنمارک کے 'ٹیوولی' پارک کی سیر کر رہا تھا۔اس نے سوچا میں اپنے ملک کے لوگوں کے لیے ایسا پارک کیوں نہ بنواؤں؟

خیالات کی ایک رو تھی جو بہتی چلی جا رہی تھی۔اس نے ڈنمارک کے پارک کے بعد امریکا کے دوسرے بڑے اور چھوٹے پارکوں کی سیر کی اور اپنے نقشہ نویس کے کان کھاتا رہا ہے کہ وہ اس تفریح گاہ میں نت نئے انداز کی تخلیقی چیزیں جمع کر دے۔اسے ایسا خطہ بنا دے جس کی نظیر دنیا میں نہ ملتی ہو۔

کی اجازت سے وہ کلاس کے طالب علموں کو کہانیاں سنایا کرتا تھا اور اس دوران وہ چاک سے ان کی تصاویر بھی بلیک بورڈ پر بنا دیا کرتا تھا۔جب اس کا شوق فزوں تر ہو گیا تو اس نے راتوں کو مقامی تھیٹروں میں جانا اور اپنی اداکاری کے جوہر دکھانا شروع کر دیے۔باپ اس طرزِ عمل کے خلاف تھا لیکن ڈزنی نے اپنے شوق کے آگے اس کی پروا نہ کی۔ڈرائنگ بنانے کا شوق اسے ورثے میں نہیں ملا تھا۔یہ سب اس کی خداداد صلاحیت تھی۔اس معاملے میں اس کی خالہ اس کی مدد کیا کرتی تھی اور اسے رنگین پنسلیں خرید کر دیا کرتی تھی۔اس کے علاوہ اس کا پڑوسی ڈاکٹر اس کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھ کر انہیں خرید لیا کرتا تھا اور شاباشی کے دو چار جملے بھی اس پر نچھاور کر دیا کرتا تھا۔ڈزنی پھولا نہ سماتا۔

ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتا ہے۔''ایک روز ڈاکٹر صاحب نے اصطبل سے اپنا گھوڑا نکالا اور مجھ سے کہا کہ ڈزنی اس کی تصویر بناؤ۔'' میں نے ایزل پر کاغذ چڑھایا اور تصویر بنانے لگا۔کچھ دیر بعد جو کچھ مجھ سے بنا وہ گدھا یا گھوڑا تو نہ تھا کوئی ہیبت ناک سی چار ٹانگوں والا درندہ بن گیا تھا۔لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے مجھے خوب شاباش دی۔اس وقت میری عمر صرف سات برس تھی!

وہ ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے بتاتا تھا کہ میں نے بارہ برس کی عمر میں سیاسی کارٹون بنانا بھی شروع کر دیے تھے۔میں انہیں ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں لے گیا جہاں سے بال کٹوایا کرتا تھا۔وہ سیلون ہڈسن کا تھا۔ہڈسن کو میرے کارٹون بہت پسند آئے۔اس نے کہا میں ہر ہفتے اس کے لیے کارٹون بنایا کروں۔وہ انہیں سیلون میں لگائے گا۔جب میں نے معاوضے کی بات کی تو اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ وہ میرے بال مفت کاٹ دے گا۔میں نے یہ سودا منظور کر لیا۔

جب اس کی عمر پندرہ برس ہوئی تو اس کا ٹرین کی سپلائی والا کاروبار جاری رہا۔اس نے بتایا کہ اس میں زیادہ منافع نہیں ہوتا تھا۔یقین جانیے میں اپنے والدین کو اس رقم میں بہت کم دے پاتا تھا، اس لیے کہ زیادہ تر رقم میں اپنے ہی کھانوں پر خرچ کر دیا کرتا تھا یا پھر سگرٹ پیتا تھا۔کبھی کبھی سگار سے بھی شوق کر لیا کرتا تھا۔

اس کی کلاس میں ایک نیا جرمن لڑکا پفائفر داخل ہوا۔وہ ڈرائنگ جانتا تھا۔اس نے والٹ ڈزنی کو اس میں دل چسپی

اس تفریحی پارک کے لیے بڑی رقم درکار تھی، لہٰذا ڈزنی نے اس کا نقشہ بینک میں جمع کرایا تاکہ وہاں سے قرض حاصل کر سکے۔اس نے بینک کے منیجر سے کہا کہ یہ ایسا پارک ہوگا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہ مل سکے گی۔یہ اتنا بڑا ہوگا کہ لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ کر اس کی سیر کر سکیں گے۔اس کے علاوہ اس نے چھوٹی چھوٹی فلمیں بنائیں اور انہیں سینما گھروں میں چلا کر لوگوں کو اپنے منصوبوں سے آگاہ کیا اور ان سے اپیل کی کہ وہ اس کے عظیم منصوبے میں سرمایہ کاری کریں۔لوگوں نے اس کی اپیل پر عطیات فراہم کیے۔جس سے ڈزنی کو اپنا منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں آسانی ہوئی۔

اس پارک کی تعمیر 16 جولائی 1954ء کو شروع ہوئی تھی۔اس پر ایک کروڑ ستر لاکھ ڈالر کی لاگت آئی۔اس کی تزئین و آرائش کے بعد اسے ایک سال ایک دن کے بعد یعنی 17 جولائی 1955ء کو عام لوگوں کے لیے کھول دیا گیا۔جب لوگ اس میں داخل ہوتے ہیں تو والٹ ڈزنی کا مجسمہ ان کا استقبال کرتا ہے۔اس مجسمے کے نیچے ایک تختی لگی ہے، جس پر لکھا ہے:

وہ تمام افراد جو اس مسحور کن خطۂ زمین پر قدم رکھ رہے ہیں، میں ان سب کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتا ہوں۔یہاں آ کر آپ اپنی کلفتیں فراموش کر دیں گے اور نوجوان ماضی کے قصّے بھلا کر اپنا مستقبل نئے انداز سے تعمیر کرنا چاہیں گے، کیوں کہ یہ محض تفریح گاہ ہی نہیں، بلکہ سنہری خوابوں، فکر و ادراک اور تخلیق کی دنیا ہے۔میری آپ سے گزارش ہے کہ کوشش کیجیے اور اس سے بہتر ڈزنی لینڈ بنائیے۔اس لیے کہ ہمیں اپنے دیس امریکا کی بھی تو تعمیر کرنا ہے۔ہر وہ قدم جو آپ اٹھا رہے ہیں وہ دوسروں کی خوشی کا آئینہ دار بھی ہونا چاہیے۔

والٹ ڈزنی۔ 17 جولائی 1955ء

صرف امریکا ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے لوگ اس عجوبے کو دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑے۔پہلے دن اس پارک کی اٹھائیس ہزار افراد نے سیر کی۔جب کہ پچھلی صدی تک دو کروڑ افراد نے اس کی سیر کی تھی جن میں مختلف ممالک کے

لیتے دیکھا تو اسے اپنے مکان پر بلایا۔ڈزنی شام کو وقت نکال کر اس کے مکان پر گیا تو اس نے بتایا کہ تصویر کیسے بنائی جاتی ہے۔انسانی تصویر بناتے وقت آنکھ، ناک اور کان میں کیا توازن رکھنا چاہیے۔کارٹون میں مزاح کیسے پیدا کیا جاتا ہے اور خاکہ کیا ہے۔یہ سب معلومات اسے اپنے باپ سے ملی تھیں جو فنونِ لطیفہ کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور پیانو پر نغمے گانے کے علاوہ نہایت شوق سے فلمیں بھی دیکھا کرتے تھے۔ڈزنی ان کے ساتھ گانے لگا اور فلمیں دیکھنے لگا۔

ڈزنی کے باپ کو یہ سب باتیں پسند نہیں تھیں، لہٰذا وہ ناک بھوں سکیڑتا تھا۔اس کا حل ڈزنی نے یہ نکالا کہ وہ باپ کے علم میں لائے بغیر مسٹر پفائفر سینئر کے ساتھ فلم دیکھنے چلا جایا کرتا تھا۔وہ کہتا ہے کہ میری رگوں میں فلم سے جو دل چسپی اور عشق پیدا ہوا وہ مسٹر پفائفر کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔اس کی بنیاد انہوں نے ہی ڈالی تھی۔

وہ تعلیم کی طرف سے غافل نہیں تھا اور شکاگو کے میکنلے ہائی اسکول جایا کرتا تھا، لیکن اس کی تمام تر توجہ ڈرائنگ اور فوٹو گرافی کی طرف تھی۔ہفتے میں تین راتوں کو اس نے اکیڈمی آف آرٹس میں بھی داخلہ لے لیا تھا تاکہ اس کی ڈرائنگ اور آرٹ ورک میں نکھار پیدا ہوتا رہے۔اسی اثنا میں وہ انسٹی ٹیوٹ کے ایک استاد کیری کی نگاہ میں آ گیا۔جو شکاگو ٹریبون میں کام بھی کرتے تھے۔ان کی ایما پر اس نے 'دی وائس' نامی رسالے میں کارٹون بھیجے جو انہوں نے شائع کر دیے۔کیری نے اس کی بہتر رہنمائی کی اور اسے سیاہ روشنائی سے کارٹون بنانا سکھائے۔وہ اسے موضوع دے دیا کرتے کہ ان پر طبع آزمائی کرے۔پھر وہ اسے اپنے ساتھ شکاگو ٹریبون کے آفس بھی لے جانے لگے۔تاکہ وہ ماحول بھی اس کے دماغ میں بیٹھ سکے جہاں کارٹون سازی کی جاتی ہے۔ڈزنی نے وہاں شوقیہ بیٹھنا شروع کر دیا۔اس کے باپ کی سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا کہ کارٹون بنانے سے اسے کیا مل سکتا ہے۔بہر حال طوعاً و کرہاً اس نے اجازت دے دی۔مجموعی طور پر وہ اس سے مایوس تھا۔

ڈزنی خود بھی جانتا تھا کہ کارٹون سازی سے روزی روٹی نہیں چل سکتی، اس لیے وہ ایک جیلی بنانے والی فیکٹری میں ملازم ہو گیا اور جیلی کی خالی شیشیوں کو صاف کرنا، بھری ہوئی شیشیوں پر ڈھکن لگانا (اس وقت ڈھکن ہاتھ سے لگائے جاتے تھے) سیبوں کی قاشیں کاٹنا اور انہیں کچلنا تاکہ ان سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

صدور، بادشاہ، ملکائیں، شہزادے اور شہزادیاں شامل ہیں۔ یہی نہیں اس کی سیر کو دنیا کے گوشے گوشے سے لوگ آتے اور اس نابغہ روزگار ہستی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں، جس کا نام والٹ ڈزنی ہے! افتتاح کے موقع پر اے بی سی ٹیلی وژن نے ڈزنی لینڈ کے بارے میں لائیو پروگرام پیش کیا۔ والٹ ڈزنی نے اپنے قریبی دوستوں کو خاص طور پر افتتاح کے موقع پر بلایا تھا، جن میں رونالڈ ریگن بھی شامل تھا جو اس وقت اداکار بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ جب اس تقریب کو ٹیلی وژن پر براہِ راست دکھایا جانے لگا تو ریگن سے ابتدا ہوئی جو ایک ڈانسر لڑکی کے ہونٹوں کا بوسہ لے رہا تھا۔ جب گرد و پیش سے تالیاں بجنے لگیں تو اداکار رونالڈ ریگن کو ہوش آ گیا اور اس نے جیب سے رومال نکال کر ہونٹوں سے لپ اسٹک صاف کی۔

وہاں آئے ہوئے شائقین کو کوئی کوفت نہ اٹھانی پڑی سوائے اس کے کہ پانی ختم ہو گیا تو کوکا کولا کے اسٹال پر دھڑا دھڑ بوتلیں فروخت ہونے لگیں۔ کئی خواتین نے یہ شکایت بھی کی کہ اس تفریح گاہ کو اتنی جلد پبلک کے لیے کھولنے کی کیا ضرورت تھی، یہ تارکول جو سڑکوں پر بچھایا گیا ہے ابھی خشک بھی نہیں ہوا ہے' چلتے ہوئے ہمارے تو سینڈل اس میں دھنس گئے۔ کئی اسٹالوں پر کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو گئیں تو لوگوں نے اس کا بھی برا منایا۔ پارک کے ایک حصے میں گیس لیک ہونے لگی تو اس حصے کو بند کرنا پڑا۔ جب کہ وہی حصہ سب سے خوب صورت اور دیکھنے کے لائق تھا۔ آنے والے دنوں میں پارک میں درستی پیدا ہو گئی اور سب کمزوریوں پر قابو پا لیا گیا لیکن ڈزنی نے ان بدمزہ باتوں کو یاد رکھا اور اپنی ڈائری میں اس دن جب کہ پارک کا افتتاح ہوا تھا ''بلیک ڈے'' سے تعبیر کیا۔

جب ڈزنی لینڈ تیار ہو گیا تو پلمبروں نے ہڑتال کر دی۔ پانی کا مسئلہ پیدا ہو گیا کہ پانی ٹوائلٹس میں ہونا چاہیے یا اس سے فوارے چلنا چاہئیں اس لیے کہ اس روز گرمی بہت پڑ رہی تھی اور وہاں آنے والے پسینا بہا رہے تھے مگر ڈزنی نے ٹوائلٹس کے حق میں فیصلہ دیا۔ جب صحافیوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو ایک نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈزنی چاہتا ہے کہ

سیب کا خاص مادہ پیکٹن نکالا جا سکے۔ جب شیشیاں ڈبے میں بند کر دی جاتیں تو انہیں فولادی پٹی لگا کر ڈبوں کو پیک کرنا اس کے فرائض میں شامل تھا۔ ایک روز گارڈ نہیں آیا تو مالک نے اسے گارڈ کی وردی پہننے اور چوکیداری کرنے کی ہدایت کی۔ اس نے وردی پہنی اور فیکٹری کی سب روشنیاں گل کر کے ریوالور ہاتھ میں لیا اور فیکٹری کے چاروں طرف گھومنے لگا۔ تاکہ چوروں اور اٹھائی گیروں کو اندر داخل ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔ اس محنتِ شاقہ کے لیے اسے ہفتے وار 7 ڈالر ملا کرتے تھے۔ ممکن ہے وہ یہ ملازمت ترک نہ کرتا، لیکن فیکٹری والوں نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ گارڈ کی کمی بھی پوری کر سکتا ہے تو انہوں نے اس سے مستقل چوکیداری کرنے کو کہا جس پر والٹ ڈزنی نے ملازمت چھوڑ دی اور ریلوے میں چالیس سینٹ فی گھنٹے کی اجرت پر ملازمت کر لی۔ وہ مال گاڑیوں میں مال بھرنے پر ملازم ہوا تھا اور مال بھرنے کے بعد وہ گھنٹی بجا دیا کرتا تھا تاکہ سارے ملازمین اسٹیشن سے باہر نکل جائیں۔

گرمی کی چھٹیوں میں کام کرنے کے لیے اس نے اور اس کے ایک دوست نے پوسٹ آفس میں درخواست دی۔ اس کے دوست نے دروغ گوئی کی اور اپنی عمر اٹھارہ برس بتائی۔ اسے ملازم رکھ لیا گیا۔ جب کہ والٹ ڈزنی نے سچ گوئی سے کام لیا اور بتایا کہ وہ سولہ برس کا ہے تو اسے منع کر دیا گیا۔

ڈزنی کو بہت غصہ آیا۔ گھر آ کر اس نے رنگ کا ڈبا اٹھایا اور اپنی مونچھیں بنائیں اس کے بعد اپنے والد کا بوسیدہ سوٹ پہن کر دوبارہ بھرتی کے لیے گیا۔ اس بار پوچھنے پر اس نے اپنی عمر اٹھارہ برس بتائی۔ اسے ملازمت پر رکھ لیا گیا۔

اس کے ذمے ڈاک کی تقسیم تھی۔ وہ ڈاک کو علاقہ وار علیحدہ کرتا اور پھر تھیلے بنا کر تقسیم کرتا۔ بسوں میں سوار ہوتا اور شہر کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک جاتا۔ ایک بار سپر وائزر نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ٹرک چلا سکتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ہاں۔ اس لیے کہ وہ ایک بار ٹرک چلا چکا تھا۔

ٹرک میں ڈاک تقسیم کرنے میں اسے آسانی ہو گئی۔

اتوار کے دن ٹرک کے بجائے گھوڑا گاڑی ملتی تھی۔ وہ گھوڑے کو راستے پر چلانے کے لیے لگام تھامے رہتا اور شہر کا نقشہ لے کر ڈاک کو لیٹر بکسوں سے سمیٹتا پھرتا۔ اس کے سپر وائزر نے تیسرے اتوار کو اسے ٹوکا اور بتایا کہ وہ گھوڑے کی

ہم زیادہ سے زیادہ کوکا کولا پئیں اور اس کے ٹوائلٹ استعمال کریں۔

دوسرے دن ڈزنی لینڈ کو پچاس ہزار افراد دیکھنے آئے۔ جن میں سے پہلے دو آنے والوں کو دو یادگار ٹکٹ انعام میں دیے گئے کہ وہ ساری زندگی مفت اس پارک کی سیر کر سکتے ہیں۔

1960ء میں والٹ ڈزنی نے شہنشاہ ایران آریہ مہر اور ملکہ فرح دیبا کو اپنے پارک کی سیر کرنے کی دعوت دی جسے انہوں نے بخوشی قبول کیا۔

ڈزنی لینڈ کے افتتاح کے بعد نیگروز نے بھی ہنگامہ کیا کہ انہیں وہاں بہت کم تعداد میں ملازم رکھا گیا ہے۔ ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ بہرحال جب 1963ء میں شہری حقوق کے لیے تحریک چلائی گئی تو نیگروز کے بجائے ڈزنی نے ''ایشیائی کالوں'' کو ڈزنی لینڈ میں ملازم رکھ لیا، جن کا تعلق ملائیشیا اور سنگاپور سے تھا۔ 1990ء میں اس پارک میں بہت توسیع کی گئی۔ جگہ جگہ ہوٹل اور کشادہ پارکنگ لاٹ بنائے گئے تاکہ تفریح کے لیے آنے والے وہاں کئی روز تک قیام بھی کر سکیں۔ 2000ء ڈزنی لینڈ میں اتنے بڑے پارکنگ لاٹ بن چکے تھے کہ اتنے بڑے پارکنگ لاٹ سارے امریکا میں کہیں نہیں تھے۔

جب ڈزنی لینڈ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو پُراسرار فلموں کے شہرۂ آفاق ہدایت کار الفرڈ ہچکاک نے ڈزنی سے اجازت چاہی کہ وہ اپنی آیندہ فلم کی شوٹنگ ڈزنی لینڈ میں کرنا چاہتا ہے تو ڈزنی نے انکار کر دیا اس لیے کہ الفرڈ ہچکاک 'سائیکو' جیسی ہولناک اور ڈراؤنی فلم بنا چکا تھا جو مزاج پر منفی اثرات ڈالتی ہے۔ وہ صاف ستھرے مزاج کا مالک تھا اور تفریح کے اعتبار سے بھی ستھرے پن کا حامی تھا۔

بنیادی طور پر ڈزنی لینڈ کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، جن کے نام یہ ہیں:

مین اسٹریٹ یو ایس اے، ایڈونچر لینڈ، فرنٹیئر لینڈ، فنتاسی لینڈ، ٹومارو لینڈ، مکی ٹون ٹاؤن، ہالی ڈے لینڈ اور

لگام نہ تھامے اور اسے مرضی کے مطابق چلنے دے۔ وہ اسے مقررہ جگہوں پر خود لے جائے گا۔ بس اسے ڈاک کو لیٹر بکسوں سے نکال کر تھیلے میں ڈالنا ہوگا۔ ڈزنی نے ایسا ہی کیا اور یہ کام ٹرک چلانے کی نسبت آسان معلوم ہوا۔ اسے گھوڑے کی لگامیں چھوڑتے ہوئے اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں وہ کاروں یا ٹرکوں سے نہ ٹکرا جائے، لیکن اس کے اندیشے باطل ثابت ہوئے۔ اس لیے کہ جب اس نے گھوڑے کی لگامیں چھوڑ دیں تو وہ مزید سہولت سے چلنے لگا۔ وہ بڑی سڑکوں پر جاتے ہی ٹھٹک جاتا اور جب تک سڑک خالی نہ ہو جاتی قدم نہ اٹھاتا۔ اسی طرح سے جب وہ دریا پر پہنچتا تو ٹھہر جاتا۔ اس وقت کا انتظار کرتا جب تک کہ فیچی والا پل جڑ نہ جائے۔ جب پل جڑ جاتا تو وہ اس پر دلکی چال چلتا ہوا دوسری طرف پہنچ جاتا۔ والٹ ڈزنی اسے شاباش دیتا کہ گھوڑے کا مشاہدہ اور حس اتنی تیز ہے!

☆☆☆

ڈزنی نے 1918ء میں ملٹری کی ملازمت اختیار کرنے کے لیے درخواست دے دی۔ اس کی درخواست نامنظور کر دی گئی اس لیے کہ وہ بہ لحاظ عمر چھوٹا تھا۔ اس کی عمر صرف سولہ برس تھی جو عسکری قواعد اور ضوابط کے لحاظ سے کم تھی۔ چنانچہ ڈزنی نے ریڈ کراس میں درخواست دے دی جو منظور کر لی گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس کا پاسپورٹ بنے گا اور اس کے فارم پر باپ کے دستخط ہوں گے۔

باپ نے فارم پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کے موت کے وارنٹ پر دستخط نہیں کرنا چاہتا۔ ایک لحاظ سے وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس لیے کہ اس سے پہلے تین بیٹے گھر سے غائب ہو چکے تھے اور آج تک واپس نہیں آئے تھے۔ اس کی بیوی فلورا نے کہا کہ والٹ ڈزنی کا معاملہ علیحدہ ہے اس لیے کہ وہ بتا کر جا رہا ہے۔ اس کی واپسی یقینی ہے۔ اس کے بارے میں فکرمند نہ ہو۔ میں تمہاری جگہ اس فارم پر دستخط کیے دیتی ہوں۔ فارم مکمل ہو گیا تو اس کا پاسپورٹ بن گیا۔

یوں اسے فرانس بھیج دیا گیا۔ اس کے ساتھ اور بھی والنٹیئر تھے۔ مگر جہاز کوئی نہیں تھا اس لیے انہیں اس جہاز میں سوار کر دیا گیا جس میں مویشی پہلے سے سوار تھے۔ ان کے بول و براز سے ریڈ کراس کے خدمت گاروں کی ناکیں سڑ گئیں۔ کئی بیمار حیوانوں کی انہیں خدمت بھی کرنا پڑی۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سرکس لینڈ۔

مین اسٹریٹ یو ایس اے پر اس وقت کا نقشہ بنایا گیا ہے جب والٹ ڈزنی ہالی ووڈ آیا تھا اور اس نے وہاں جو چیزیں دیکھی تھیں۔ اس نقشے کو اس نے مختلف فلموں اور تصاویر دیکھ کر ترتیب دیا تھا۔ وہاں ایک تختی نصب ہے جس پر لکھا ہے کہ یہ سڑک ان یادوں کو لوٹا دے گی جو آپ کے ذہن کے نہاں خانوں میں سوئی ہوئی ہیں اور نوجوانوں کے لیے یہ ان کے دادا کے وقت کا امریکا ہے جسے دیکھنے کے لیے انہیں کلینڈر کے اوراق الٹنے کی ضرورت نہیں۔

اس حصے میں پرانے زمانے کی ٹرینیں چلتی ہیں جن میں لوگ بیٹھ سکتے ہیں اور اس کے علاوہ گھوڑا گاڑیاں بھی۔ اس کے علاوہ سٹی ہال، ڈبل ڈیکر بسیں، سینما ہال ہیں جہاں پرانے زمانے کی فلمیں چلتی ہیں۔ ایک دکان ایسی بھی ہے جہاں والٹ ڈزنی سے متعلق یادگاری چیزیں فروخت ہوتی ہیں۔

ایڈونچر لینڈ کو دیکھ کر آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ افریقا اور ایشیا کے جنگلات میں بیٹھے ہیں۔ وہاں کہانیوں میں بیان کیے گئے ٹارزن کا وہ مکان بھی بنایا گیا ہے جو اس نے درخت پر بنایا تھا۔ اس کے علاوہ انڈیانا جونز ایڈونچر بھی ہے۔

فرنٹیئر لینڈ میں امریکا کی تاریخ ہے اور ان پرانے لوگوں کے مجسمے اور معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے جنہوں نے امریکا کی بنیاد رکھی تھی۔

فنتاسی لینڈ ان کلاسیکی کہانیوں کو سامنے رکھ کر بنایا گیا ہے جو بچوں میں بے حد مقبول ہیں، مثلاً پیٹر پین کی رہائش گاہ اور اس کے ساتھ پرواز، ایلس کا حیرت کدہ اور قدیم لندن۔ اسے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہانیوں نے جیتی جاگتی شکل اختیار کر لی ہے۔

جب آپ مکی ماؤس کے قصبے میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو 1930ء کا وہ قصبہ نظر آئے گا جو آپ نے اس کی فلموں میں دیکھ ہوگا۔ اسے دیکھ کر آپ کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ یہ پارک لوگوں کے لیے 1993ء میں کھولا گیا تھا۔

ٹومارو لینڈ یعنی مستقبل کے خطے میں داخل ہونے پر آپ تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس کریں گے کہ گویا چاند کی سرزمین پر کھڑے ہیں۔ اس کے علاوہ وہاں کے دریا میں ایک آبدوز بھی کھڑی ہے جس میں بیٹھ کر آپ پانی کے نیچے کی سرزمین بھی دیکھ سکتے ہیں۔ وہاں خلا سے متعلق چیزیں بھی رکھی گئی ہیں اور دوسرے سیاروں کے ماڈل بھی۔ وہاں قدم رکھنے کے بعد آپ خود کو خلائی ماحول کی سیر کرتے محسوس کریں گے۔

والٹ ڈزنی کو بچپن ہی سے ریل گاڑیوں سے عشق تھا اس لیے اس نے پارک کے مختلف حصوں میں ریل گاڑیاں چلائی ہیں جن میں بیٹھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جایا جا سکتا ہے۔

ان سب دل چسپ مناظر اور تفریحات کے علاوہ ڈزنی لینڈ میں زندہ اور متحرک تماشے بھی ہیں جو ہفتہ وار ہوتے ہیں یعنی اسٹیج شو وغیرہ۔ والٹ ڈزنی کے سارے کردار آپ کو پارک میں چلتے پھرتے اور بچوں سے باتیں کرتے دکھائی دیں گے۔ وہ بچوں کے ساتھ فوٹو بھی کھنچواتے ہیں۔ رات کو فضا میں آگ کے کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ رنگین پھلجھڑیاں تاریکی میں اشکال بناتی دکھائی دیتی ہیں۔ آگ کا دل فریب تماشا خاص موقعوں پر بھی دکھایا جاتا ہے جس پر ایک محتاط اندازے کے مطابق انتظامیہ پچاس ہزار ڈالر خرچ کرتی ہے۔ ڈزنی لینڈ میں رات اور دن کو پریڈ بھی ہوتی ہے۔ جس میں ڈزنی کے کردار رنگ رنگ کے کپڑے پہن کر ڈھول تاشوں کے ساتھ پریڈ کرتے ہیں۔ گرمیوں میں امریکا کے بہت سے شعبدہ باز اپنے کرتب دکھانے وہاں آجاتے اور اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

ڈزنی لینڈ کے بعد اس کے ذہن میں مستقبل کا پارک گھومنے لگا، جس کا نام اس نے تھیم پارک رکھا۔ اس میں جادوئی کھیل تماشوں کے علاوہ اسکیٹنگ کا انتظام بھی تھا اور اس کا نقشہ اولمپک کھیل کے ایک بڑے منتظم نے بنایا تھا مگر اس سے پہلے کہ ڈزنی اسے مکمل کرا پاتا، وہ اپنے چاہنے والوں کو ملول و مضطرب چھوڑ کر دوسری دنیا کی طرف چلا گیا۔ اس کے منصوبے کو اس کے بھائی رائے نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔

بہرحال ریڈ کراس سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے انکار نہیں کر سکتے تھے۔

اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر پیرس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا دیا گیا۔ وہاں اور بھی ساتھی تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ ریستوران تک چلے اور اس کے ساتھ بیئر پیئے۔ والٹ اس کے ساتھ چلا گیا۔ ریستوران خالی معلوم ہوتا تھا۔ مگر جوں ہی اس نے مڑ کر دروازہ بند کیا اس کے ساتھی میزوں کے نیچے سے نکل آئے اور انہوں نے ہیپی برتھ ڈے کا شور مچا دیا۔ اب اسے یاد آیا کہ یہ تو اس کی پیدائش کا دن ہے۔ سب نے بیئر منگوائی، اسے پلائی اور خود بھی پی۔ اس کے بعد اس سے کہا کہ وہ بل ادا کرے۔ ناچار ڈزنی نے اپنا پرس نکال کر رقم ویٹر کی پلیٹ میں رکھ دی۔ وہ بہرحال کم تھی، لہٰذا اس نے اپنے جوتے 30 فرانک میں فروخت کر دیے۔

پیرس میں اس نے اپنے افسران کے ڈرائیور کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور ایمبولینس کی ڈرائیونگ بھی کی۔ جنگ کے دنوں میں گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو حکم تھا کہ وہ اسے درخت کے پتوں سے ڈھانک کر رکھیں مگر ڈزنی کی ایمبولینس اس کے بنائے ہوئے کارٹونوں سے ڈھکی رہتی تھی۔ افسران کو اِدھر سے اُدھر لے جانے میں اس کو ایک فائدہ ضرور ہوا کہ وہ پیرس کے جغرافیے سے بخوبی واقف ہو گیا۔ اسے ایک ایک گلی اور کوچے سے واقفیت ہو گئی۔

اسی زمانے میں اس کا ٹرک ایک جگہ خراب ہو گیا۔ اسے ہدایت تھی کہ اپنا ٹرک چھوڑ کر کہیں نہیں جایا جا سکتا۔ اس لیے اس نے اپنے اسسٹنٹ کو پیرس کے ہیڈ کوارٹر جانے اور پرزے لانے کی ہدایت کی اور خود وہاں ٹہلنے لگا۔ رات ہو گئی اور اسسٹنٹ واپس نہیں آیا تو اس نے سڑک پر متعین گارڈ سے التجا کی کہ اسے اپنے خیمے میں جگہ دے دے۔ گارڈ مہربان تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اس کی کہانی سن کر اسے خیمے میں جگہ دے دی بلکہ اسے رات کا کھانا بھی فراہم کر دیا۔ پھر ایک اسٹوو لے آیا تاکہ سردی سے بچاؤ ہو سکے۔

اس کا اسسٹنٹ دوسرے دن بھی نہیں آیا۔ ڈزنی نے مجبوراً ایک رات اس خیمے میں اور گزاری۔ گارڈ نے جو کھانے پینے کی اشیا دی تھیں وہ ختم ہو گئیں۔ پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے تو ڈزنی سڑک پار ریستوران میں چلا گیا۔ وہاں اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور واپس خیمے میں آ کر لیٹ گیا۔ پیٹ میں اناج کی گرمی پہنچی تو خوب نیند آئی۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر سوتا رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو گارڈ نے انکشاف کیا کہ وہ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ سویا ہے۔ یہ سن کر ڈزنی بدحواس ہو گیا۔ وہ دوڑ کر ٹرک کی طرف گیا تو معلوم ہوا کہ ٹرک غائب ہو چکا ہے۔ اس کا دماغ مختلف النوع خیالات کی آماجگاہ بن گیا۔ وہ فوراً ہی اسٹیشن گیا اور اس نے ہیڈ کوارٹر جانے کے لیے ٹرین پکڑی۔ جب وہ ہیڈ کوارٹر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اسسٹنٹ پرزے لے آیا تھا لیکن جب ڈزنی نہ ملا تو اس نے ایک مکینک کو بلا کر درستی کرائی اور ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ جب ڈزنی نے اسے بتایا کہ وہ تو چند قدم کے فاصلے پر خیمے میں سو رہا تھا تو اس کا اسسٹنٹ خوب ہنسا۔ اس نے کہا کہ جنگ کے دوران ایسے دل چسپ واقعات بہت پیش آتے ہیں۔

جرمنی فرانس سے نکل گیا اور اتحادی فوجیوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہو گئیں۔ والٹ ڈزنی کو ایک فوجی کینٹین میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اس نے کارٹون بنانے کا شغل جاری رکھا۔ وہ اپنے کارٹون کاؤنٹر کے پیچھے لگا دیتا تھا۔ جو سپاہی اپنے کارٹون بنوانا چاہتے تھے وہ اسے معمولی اجرت ادا کر کے کارٹون بنوا لیتے۔

اس کے علاوہ ڈزنی کارٹون بنا کر امریکی میگزین لائف اور جج کو بھی بھیجا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے فوجیوں کو اعلیٰ کارکردگی پر ملنے والا گولڈ میڈل اپنی وردی پر پینٹ سے بنا لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے سینے پر کسی افسر نے تمغا لگا دیا ہو۔ اس کے دوستوں کو یہ آئیڈیا بہت پسند آیا۔ انہوں نے اس کی مٹھی پر چند فرانک رکھ کر کہا کہ وہ بھی ان کے سینے پر تمغا بنا دے۔ ڈزنی نے ایسا کیا اور سیکڑوں فرانک کما لیے۔ وہ اس رقم کو اپنی ماں کو پابندی سے امریکا بھیجا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے ماں کو خط لکھا کہ رُتھ جس سنہری گھڑی کے لیے بہت دنوں سے فرمائش کر رہی تھی وہ اسے دلا دی جائے۔

روپیا کمانے کے نت نئے رنگ ڈھنگ اس کے دماغ میں خوب آتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں اس نے جرمن افواج کے جو فولادی ہیلمٹ جمع کیے تھے وہ ریلوے اسٹیشن پر کھڑا ہو کر انہیں فروخت کر دیا کرتا۔ ایک بار اس نے ہیلمٹ کو پینٹ کر دیا۔ ایک سپاہی نے اس سے ہیلمٹ خریدا اور اپنا ریوالور نکال کر تین چار فائر کر ڈالے۔ ہیلمٹ میں سوراخ ہو گئے۔ تب اس نے ہیلمٹ کے اندر چند بال چپکائے اور اسے لے کر وہاں سے جانے لگا تو ڈزنی نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے قصبے میں پہنچ کر بچوں کو بتائے

WWW.PAKSOCIETY.COM

گا کہ اس نے بہت سے جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور ان میں سے ایک کا یہ ہیلمٹ ہے۔ یہ سنتے ہی ارد گرد کھڑے سپاہیوں نے ڈزنی سے بچے کھچے ہیلمٹ خرید لیے۔

ڈزنی کو اس وقت ماہانہ 52 امریکی ڈالر بطور تنخواہ ملا کرتے تھے۔ اس نے اپنی نصف تنخواہ اور ہیلمٹ سے فروخت سے ملنے والی رقم اپنی ماں کو منی آرڈر سے روانہ کر دی۔ وہ ایک بار جوئے خانے میں داخل ہوا تو قسمت کی دیوی اس پر اچانک مہربان ہوگئی۔ ڈزنی نے اس روز جو بھی داؤ لگایا اس میں جیت گیا۔ شام ڈھلے اس کے پاس تین سو امریکی ڈالر جمع ہو گئے۔

اس نے دوسرے دن کا انتظار نہیں کیا اور فوراً پوسٹ آفس جا کر اس رقم کو منی آرڈر کے ذریعے سے اپنی ماں کو بھیج دیا۔ باپ کے لیے اس کے دل میں جگہ نہیں تھی، البتہ وہ اپنی ماں سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا۔

پیرس میں رہتے ہوئے اس کی دوستی روپرٹ سے ہوگئی جو اس کی طرح سے نوجوان اور متحرک تھا۔ اسے بھی کسی وقت چین نہیں آتا تھا اور وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے لیے بے چین رہا کرتا تھا۔ جب فرانس میں امن وسکون ہوگیا تو امریکی جنرل نے وہاں سے امریکا واپس جانا مناسب سمجھا۔ فوجیوں کو بھی حکم دیا گیا کہ وہ تھوڑی تھوڑی تعداد میں واپسی کی تدابیر کریں۔ اس کے دوست روپرٹ نے ایک لانچ کے ذریعے سے سفر کرنے کا پروگرام بنایا۔ ڈزنی کو جرمن کتا شیفرڈ بہت پسند تھا۔ اس نے شیفرڈ کا ایک جوڑا خرید کر روپرٹ کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ساتھ لے جائے۔ جب وہ واپس آئے گا تو اس سے لے لے گا۔

☆☆☆

ایک برس پیرس میں رہنے کے بعد ڈزنی قد آور لمبا تڑنگا اور طاقتور جسم کا مالک ہوگیا۔ وہ اٹھارہ برس میں ہی ایک مکمل نوجوان لگتا تھا۔ اس کے والدین نے اسے دیکھا تو حیران رہ گئے کہ ان کا سب سے چھوٹا بیٹا اتنی جلد بالغ اور ہنر مند ہوگیا۔ مگر کوئی والٹ ڈزنی کے دل سے پوچھتا کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ جس لڑکی سے محبت کرتا تھا اور جس سے اس نے شادی کا وعدہ کیا تھا، چھ ماہ پیشتر وہ کسی اور سے شادی کر چکی تھی۔ جب وہ روپرٹ سے شیفرڈ کا جوڑا لینے گیا تو اس نے بتایا کہ وہ جوڑا تو سفر کے دوران ہی مر گیا تھا۔ ڈزنی کو یہ سن کر بہت صدمہ ہوا۔ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی دنیا تاریک ہو چکی ہے اور اس کے خواب جل کر راکھ ہو چکے ہیں۔

زندہ رہنے کے لیے اس نے ایک بار پھر کارٹونوں کی طرف توجہ دی۔ اس کی ساری کوشش یہ تھی کہ وہ کمرشیل آرٹسٹ کی حیثیت سے کسی اخبار میں کام کرے۔ اس کے بھائی رائے نے اسے روبن آرٹ اسٹوڈیو میں ملازمت دلا دی۔ جہاں اس کی ملاقات اس وقت کے سب سے بڑے کارٹونسٹ 'اُبے اورک' سے ہوئی۔ یہاں سے نکل کر وہ کنساس سٹی فلم ایڈ کمپنی میں کام کرنے لگا۔

رائے خود ایک بینک میں ملازم تھا اور اسے ماہانہ 99 ڈالر ملا کرتے تھے جو ایک اچھی تنخواہ تھی۔ اس کی ایک گرل فرینڈ گریس بھی تھی، جو اس کے ساتھ گھومتی پھرتی تھی۔ دونوں آپس میں شادی کے لیے تیار تھے، لیکن شادی کے دوران اور بعد میں ہونے والے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اس لیے انہوں نے شادی کو التوا میں ڈالا ہوا تھا۔

سٹی ایڈ میں اشتہارات بنا کرتے تھے۔ وہ موقع محل کے لحاظ سے کارٹون بنایا کرتا تھا۔ اشتہارات میں لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ ڈزنی صحت مند، توانا اور قد آور تھا۔ جب وہ سوٹ پہن لیتا تھا تو لڑکیاں اس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں اور اسے ڈیٹ بھی دے دیا کرتی تھیں۔

ڈزنی کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کارٹون متحرک کیسے ہو سکتے ہیں۔ (وہ کارٹون فلمیں بنانا چاہتا تھا) جب اس کا طریقہ اس کی سمجھ میں آ گیا تو وہ کنساس سٹی کے کاروباری لوگوں کے لیے چھوٹی چھوٹی متحرک فلمیں بنانے لگا۔ تجربے کار آرٹسٹوں نے اسے بتایا تھا کہ ایک ہی منظر کے بہت سے کارٹون بنائے جائیں اور ان میں ہلکا سا فرق رکھا جائے اور پھر اس کی فلم بنائی جائے تو کارٹون حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ڈزنی نے ایسا ہی کیا اور متحرک کارٹون فلمیں بنانے لگا۔

اشتہاری کمپنی میں اس کی ملازمت کافی عرصے تک چلی۔ اس نے جب معقول رقم جمع کر لی تو بہت سا ساز و سامان خرید لیا اور اپنا اسٹوڈیو بنا لیا۔ بہت سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو ملازم رکھ لیا۔ اس نے صاف طور پر کہہ دیا کہ فی الوقت وہ کسی کو تنخواہ نہیں دے گا، البتہ جب اس کی اشتہاری فلمیں فروخت ہونے لگیں گی تو وہ باقاعدہ تنخواہ دے گا۔ سب نے شوق میں کام کرنا منظور کر لیا۔ اس اثنا میں ڈزنی نے کئی کارٹون فلمیں بنائیں اور اپنے دوست والٹر کو نیویارک بھیجا کہ وہ ان فلموں کے لیے مارکیٹ تلاش کرے۔ وہ نہ صرف نیویارک میں فلمیں فروخت کر آیا بلکہ ایک کمپنی سے نئے آرڈر بھی لے آیا۔ جب اسٹاف کو یہ بات معلوم ہوئی تو سب نے

مسرت کا اظہار کیا۔

ایلس نامی لڑکی اس کے آفس اسٹاف میں شامل تھی۔ اس کا روپ اور قد و قامت متاثر کن تھا اس لیے ڈزنی جو کارٹون فلمیں بنا رہا تھا اس میں ایلس کا کردار بھی سمو دیا۔ فلمی سیریز کی ایلس جیتی جاگتی لڑکی تھی لیکن افسانوی ماحول میں رہتی تھی۔ اس کی فلموں کا نام 'ایلس کامیڈیز' رکھا گیا تھا۔

☆☆☆

ایلس کامیڈیز سیریز کی فلمیں شومئی قسمت ناکام ہونا شروع ہوگئیں۔ ڈزنی کے پاس جمع شدہ سرمایہ ختم ہوگیا اور اس کی کمپنی بھی بینک دیوالیا ہوگئی۔ مگر ڈزنی نے حوصلہ نہیں ہارا، اس نے اپنا سامان سمیٹا اور اپنی ادھوری فلموں کے ساتھ ہالی ووڈ چلا گیا۔ اس کے اسٹاف میں جو لڑکے اور لڑکیاں اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے وہ بھی ہالی ووڈ آ گئے۔ والٹ ڈزنی کی عمر ابھی چوبیس برس سے کم تھی مگر سر میں بڑے بڑے سودے سمائے ہوئے تھے۔ وہ تقدیر سے ہار نہیں ماننا چاہتا تھا، بلکہ اسے اپنے آپ پر مہربان کرنا چاہتا تھا۔

بلاشبہ اس کے ارادے بلند و بالا تھے لیکن اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ جو کپڑے اس کے جسم پر تھے وہ کئی برس پرانے تھے اور اس پر اس نے ایک ملگجا سا سوئٹر پہن رکھا تھا۔ اس کے علاوہ کنساس سٹی میں اس نے جو تجربات کیے تھے اس کی بنا پر اس کی گردن پر ہزاروں ڈالر کا قرض تھا (جو اس نے طویل عرصہ کی مشقت کے بعد اتارا) ایسے میں ایلس کی حوصلہ مند باتیں اس کو سہارا دیے رہیں۔ جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے اسی طرح سے والٹ ڈزنی کو ایلس کا سہارا تھا۔ وہ شکستہ اور رنجور ہو کر ایک طرف نہیں بیٹھ گیا تو اس میں ایلس کی بلند حوصلگی اور استقامت شامل تھی، لیکن وہ اپنے حالات کی بنا پر ایلس کو اپنی زندگی کا ساتھی نہ بنا سکا۔

ہالی ووڈ میں اس نے نامساعد حالات میں ایک بار پھر 'ایلس کامیڈیز' بنائی جو پہلے کی طرح فلاپ ہوگئی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ہالی ووڈ سے روتا ہوا بھاگ آتا اور سیدھا اپنے گھر پہنچ کر دم لیتا مگر اس نے حوصلہ نہیں ہارا۔ اس موقع پر اس کا بھائی رائے کام آیا، جو ان دنوں کیلیفورنیا میں قیام پذیر تھا۔ اسے ڈزنی کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ اس نے اپنے بینک اکاؤنٹ سے ڈھائی سو ڈالر نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیے اور پانچ سو ڈالر کا مزید بندوبست کر دیا۔ ڈزنی کے لیے رقم سے زیادہ رائے کی حوصلہ افزائی اور توصیفی جملے قدر و قیمت رکھتے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسی لگن سے کام کرتا رہا تو ایک

والٹ ڈزنی قدیم داستانوں والا ہیرو تھا، جس نے بیسویں صدی میں اپنی شہرت اور مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے۔ وہ رجائیت پسند تھا اور ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنے کا عادی تھا۔ اس کے تصورات بہت بلند تھے۔ وہ اعلیٰ تخلیقی ذہن کا مالک تھا اور اس نے خود کو نچلی سطح سے اٹھا کر اوپر تک پہنچا دیا۔ اس لیے اسے سیلف میڈ کہنا چاہیے۔ گزشتہ صدیوں میں اس جیسا دانش ور اور نابغہ روزگار شخص پیدا نہیں ہوا۔ اس نے لوگوں کے دلوں میں بیٹھنے اور انہیں اعلیٰ تفریحی مقام مہیا کرنے کے ساتھ اپنی فلموں کے ذریعے سے ایک ستھرا ذوق بھی فراہم کیا۔ وہ یقیناً ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس جیسا نہ کوئی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ بلاشبہ وہ صلاحیتوں کی معراج پر تھا اسی لیے اس نے اپنے اسٹوڈیو سے 81 فلمیں ریلیز کیں اور اپنی خدمات کے عوض 32 اکیڈمی ایوارڈز حاصل کیے۔ اس نے امریکا کی مختلف تنظیموں سے 248 ایوارڈز حاصل کیے جب کہ ساری دنیا سے اسے جن اعزازات سے نوازا گیا ان کی تعداد 932 ہے، جن کا وہ بلاشبہ مستحق تھا۔

روز ضرور کامیاب ہو جائے گا۔ ان کے چچا نیویارک میں رہتے تھے۔ ان کی اجازت سے انہوں نے چچا کے گیراج میں چھوٹا سا اسٹوڈیو بنا ڈالا جہاں فلموں کی شوٹنگ کی جا سکتی تھی۔ اپنے ادارے کا نام انہوں نے والٹ ڈزنی پروڈکشنز رکھا۔

ڈزنی نے اپنی سوانح حیات میں انکشاف کیا کہ وہ دونوں بھائی سستے کرائے کے کمرے میں رہتے تھے۔ ان دنوں کھانے کے لیے رقم تک نہیں ہوا کرتی تھی۔ جیب میں جو ہوتا اسی سے دونوں بھائی کھا لیا کرتے تھے۔ ایک گوشت کا آرڈر دیتا تو دوسرا سبزی کا پھر جب وہ کسی میز پر بیٹھتے تو گوشت اور سبزی برابر تقسیم کر لیا کرتے۔ گھر پر وہ انڈوں کا آملیٹ بنا لیا کرتے تھے۔ رائے تو اپنے کام پر چلا جاتا تھا لیکن ڈزنی پھر ڈرائنگ بورڈ پر جھک جاتا۔ اسی ایک کمرے میں وہ کھانا پکاتے، کھاتے اور سوتے تھے۔ گویا ان کی ساری کائنات وہی ایک کمرا تھا۔

انہوں نے گیراج کا انتخاب تو کر لیا تھا لیکن اس میں کام کرنا آسان نہیں تھا۔ اس لیے کہ گیراج میں ہر وقت پٹرول اور گیس کی بو پریشان کرتی رہتی تھی۔ بہرحال ان نامساعد حالات میں اسے ایک ایسا خیال سوجھا جس نے اس کی زندگی کا دھارا تبدیل کر کے رکھ دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ اپنے گیراج والے اسٹوڈیو میں کام کررہا تھا کہ اسے ایک چوہیا نظر آئی جو لکڑی کے ایک تختے پر چڑھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر ناکام ہورہی تھی۔ وہ جھنجلا کر ناچنے لگی۔ ڈزنی کو وہ منظر پُرلطف لگا۔ اس نے کچن میں جا کر ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور اس ننھی چوہیا کو پیش کردیا۔

چوہیا نے اسے دوست بنالیا اور روز اس کے اسٹوڈیو میں آنے لگی۔ وہ اس سے اتنا مانوس ہوگئی کہ اس کے ڈرائنگ بورڈ پر چڑھ جاتی، جب کہ ڈزنی کام کرتا رہتا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ نیویارک کی ایک کمپنی کی طرف سے انہیں 'ایلس کامیڈیز' کی فلم کا آرڈر مل گیا۔ جب ان کی فلم فروخت ہوگئی اور کام یابی ہم سکنار ہوئی تو انہوں نے اپنا آفس ہالی ووڈ کے نزدیک بنا لیا۔ اس کے بعد اپنی خداداد صلاحیتوں اور ان تھک کاوشوں سے ہالی ووڈ کے اعلیٰ طبقے میں داخل ہونا ان کے لیے دشوار نہ رہا۔ اسے پارٹیوں اور دعوتوں میں جانا پسند نہیں تھا اور گہما گہمی سے وہ دور رہتا تھا۔ وہ حقائق پر مبنی گفتگو کرتا تھا اور سننے والے کو اپنے دلائل سے مسحور کرلیا کرتا تھا۔ ڈزنی انہی لوگوں سے نزدیک تھا جو اس کے خیالات ور جحانات میں مددگار و معاون ثابت ہوتے تھے۔

13 جولائی 1925ء کو اس نے اپنی فلم کمپنی کی ایک ملازمہ لیلین سے بوسٹن میں شادی کرلی۔ وہ سلولائڈ کو پینٹ کرنے کے لیے ملازمہ رکھی گئی تھی۔ دونوں کے درمیان عشق و محبت کی پینگیں بڑھیں اور پھر معاملہ شادی پر ختم ہوا۔ دو محبت کرنے والوں نے ایک دوسرے کو پالیا۔ اس شادی کے نتیجے میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا، بیٹیوں کے نام انہوں نے ڈیانا اور شیرون رکھے۔ وہ عموماً ڈزنی اپنے گھر پر اپنی بیوی لیلین اور اپنی بیٹیوں ڈیانا اور شیرون کے ساتھ کرنا پسند کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ دکھاوے اور تصنع کی زندگی ڈزنی کو پسند نہیں تھی۔ اس کا بیٹا کم عمری میں پولیو کا شکار ہوکر اسے داغ مفارقت دے گیا۔ ڈزنی اسے کافی عرصے تک یاد کرکے غمگین رہا کرتا تھا۔

اس نے شادی کے ایک سال بعد ایک کارٹون فلم 'چپلین کریزی' بنائی۔ اس کے بعد اپنی شادی کے تین سال بعد ڈزنی نے سوچا کہ اس نے اگر کارٹون فلم کے لیے کوئی کردار تخلیق نہ کیا تو بات نہیں بنے گی۔ اس نے بلی کتے اور لومڑی کے بارے میں سوچا پھر اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ چوہیا کو اپنا کردار بنا لے۔ چنانچہ اس نے ایک کارٹون کردار مکی ماؤس تخلیق کیا۔ یہ وہی چوہیا تھی جو اس کے اسٹوڈیو میں آتی جاتی تھی۔

سرمایہ بہت کم تھا، ساتھ کام کرنے والے تذبذب کا شکار تھے لیکن اس کے بھائی رائے کو یقین تھا کہ اس کے بھائی ڈزنی کی سوچ کامیابی سے ہمکنار ہوگی۔ فلم جیسے تیسے کرکے بن گئی مگر کوئی تقسیم کار اس کو خریدنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ان کا کہنا تھا کہ اتنا چھوٹا کردار لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ وہ اسے کوئی اہمیت ہی نہیں دیں گے۔ یہ کارٹون فلم خاموش تھی اس لیے کوئی اس پر توجہ نہیں دے رہا تھا۔

ہاتھ میں پیسا نہ ہونے کے باوجود ڈزنی نے دوسری مکی ماؤس فلم بنا ڈالی۔ اسے بھی کسی نے قبول نہیں کیا۔ اب ڈزنی ان فلموں میں آواز بھرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسٹوڈیوز کے چکر کاٹے لیکن سب نے لاگت اتنی بتائی کہ ڈزنی کو حوصلہ نہ ہوا۔ اس کی جیبیں خالی تھیں اور اسٹوڈیوز جہاں اس نے شوٹنگ کی تھی، اپنے واجبات کا مطالبہ کررہے تھے۔

قدرت کو اس کی زبوں حالی پر رحم آگیا۔ ایک کمپنی نے بہت کم معاوضے پر یہ کام کرنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ مگر فلم فروخت کرنا اب بھی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ کوئی تقسیم کار اس پر ہاتھ نہیں ڈال رہا تھا۔ ایک آدھ نے بہت کم قیمت لگائی جو ڈزنی کے لیے قابلِ قبول نہ تھی۔

تقسیم کاروں کے مایوسانہ رویّے سے تنگ آکر اس نے فلم کو خود ہی ریلیز کرنے کی ٹھان لی۔ اس موقع پر ایک بار رائے نے اس کی مدد کی۔ فلم ریلیز ہوئی۔ چلی اور خوب چلی۔ بچے تو گویا اس کے دیوانے ہوگئے۔

چوہیا مکی ماؤس پر بنائی جانے والی فلمیں بے حد کامیاب رہیں۔ مکی ماؤس ڈزنی کے دماغ سے نکل کر اس دنیائے رنگ و بو میں 18 نومبر 1928ء کو آیا۔ بڑے سے بڑا اداکار بھی شہرت و ناموری میں اس کارٹون کردار کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس کے بارے میں پسندیدگی کے خطوط لکھا کرتے تھے۔ مکی ماؤس ان کے دماغوں پر چھا گیا تھا۔

اسے امریکا ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ جاپان میں اسے 'مکی کوچی' کا نام دیا گیا۔ اٹلی میں اسے 'ٹوپولینو' کہہ کر پکارا گیا جب کہ لاطینی امریکا میں اس کا نام 'ریٹون میکولیٹو' رکھا گیا۔

اپنے مشہور کارٹونی کردار کا نام پہلے اس نے مورٹیمر رکھا تھا، لیکن اس کی بیوی لیلین نے اعتراض کیا کہ یہ نام لوگوں کی زبانوں پر نہیں چڑھ سکتا۔ اس نے تجویز پیش کی کہ کردار کا نام مکی ماؤس ہونا چاہیے۔ ڈزنی نے اس سے اتفاق کیا۔ جب

یہ کردار مقبولیت کی انتہا کو پہنچ گیا تو اس نے ڈونالڈ ڈک، گوفی اور پلوٹو جیسے کردار بھی تخلیق کیے جن کو بچوں اور بڑوں نے پسندیدگی کی سند عطا کی۔ ان فلموں میں مکی ماؤس کی آواز خود والٹ ڈزنی کی تھی۔ ڈونالڈ ڈک پر بنائی جانے والی پہلی فلم 'دی وائز لٹل ہن' تھی اور وہ 9 جون 1934ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کا کردار مکی ماؤس اتنا مشہور اور مقبول ہوا کہ 1950ء میں مکی ماؤس کلب قائم کیا گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ مکی ماؤس اسے کیسا لگتا ہے تو اس نے مسکرا کر جواب دیا کہ میں اس سے حسین سے حسین تر عورت سے بھی زیادہ محبت کرتا ہوں۔

دل چسپ بات یہ کہ جب اس برس آسکر ایوارڈ تقسیم ہونے لگے تو ڈزنی کو اعزازی طور پر ایک ایوارڈ مکی ماؤس تخلیق کرنے پر دیا گیا۔ یہ ایوارڈ آسکر ایوارڈ کی پانچویں تقریب میں دیا گیا تھا جو لاس اینجلیس کے بالٹی مور ہوٹل میں 10 نومبر 1932ء کو انجام پائی تھی۔ اس سے پیشتر صرف ایک اداکار چارلی چپلن کو اعزازی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ڈزنی کے کردار مکی ماؤس کی مقبولیت کم ہونے لگی۔ 1948ء میں اس نے سینڈریلا نامی فلم بنائی جس نے باکس آفس پر پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ بزنس کے اعتبار سے وہ اسنوو ھائٹ سے بھی بڑی فلم قرار پائی۔

'پونچیو' نامی فلم اس نے 1940ء میں بنائی جو ناقدین کے نزدیک اپنی میشن فلم کا نقطۂ عروج ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق اس فلم کو متحرک بنانے کے لیے اسٹوڈیو کے آرٹسٹوں کو تقریباً پندرہ لاکھ کارٹون بنانا پڑے۔ فلم کامیاب رہی اور باکس آفس پر اس نے کھڑکی توڑ بزنس کیا۔

اسی اثنا میں بولتی فلمیں بننے لگیں۔ موشن پکچرز میں گویا انقلاب آگیا۔ سینما ہالوں میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ ڈزنی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور مکی ماؤس کو میوزیکل کارٹون فلم بنا ڈالا۔ اس کی فلم 18 نومبر 1928ء کو کالونی تھیٹر نیویارک میں ریلیز ہوئی۔ بچوں نے اس فلم کو بہت پسند کیا اور فلم بزنس کے اعتبار سے کام یاب رہی۔

چارلی چپلن خاموش فلموں کے زمانے ہی سے مقبول و معروف تھا اور اس نے لازوال فیچر فلمیں بنائی تھیں۔ جب والٹ ڈزنی مشہور برطانوی فلم ادارے یونائیٹڈ آرٹس میں شامل ہوگیا تو چارلی چپلن سے اس کی دوستی ہوگئی۔ ڈزنی فیچر فلمیں بنانا چاہتا تھا، اس نے اس سلسلے میں چارلی سے

☆1964ء میں نیویارک میں عالمی نمائش لگائی گئی، جس کا نام نیویارک ورلڈز فیئر رکھا گیا۔ وہ نمائش کامیابی سے ہمکنار ہوئی، لیکن اس کی کامیابی میں بڑا ہاتھ والٹ ڈزنی کا تھا۔ اس نے لگائے جانے والے بڑے اسٹالوں کا ڈیزائن خود بنایا تھا اور جگہ جگہ اپنے قدِ آدم کارٹونوں کو نصب کیا تھا جس سے نمائش میں جاذبیت اور دل کشی پیدا ہوگئی تھی۔

☆1964ء میں صدر امریکا لندن بی جانسن نے جہاں دوسرے بہت سے شہریوں کو صدارتی میڈل آف فریڈم دیا وہاں ان میں ڈزنی بھی شامل تھا۔ یہ امریکا کا سب سے بڑا سویلین ایوارڈ ہے۔ ایوارڈ تقسیم کرنے کی یہ تقریب وھائٹ ہاؤس میں 14 ستمبر 1964ء کو منعقد ہوئی۔

☆11 ستمبر 1968ء کو اس کا ایک یادگاری ڈاک کا ٹکٹ امریکی حکومت نے جاری کیا جو چھ سینٹ کا تھا۔

☆ کھانے میں اسے لیمن پائی اور چاکلیٹ آئس کریم سوڈا بہت پسند تھا۔

☆ ہر چند کہ وہ گہری مونچھیں رکھتا تھا مگر اپنی فلم کمپنی کے ملازمین سے کہا کرتا تھا کہ وہ کلین شیو رہا کریں، نوجوان اس طرح سے زیادہ اسمارٹ دکھائی دیتے ہیں۔

☆ ایک تبصرہ نگار کے کہنے کے مطابق ڈزنی گرافک آرٹس میں لیونارڈو ڈاونسی کے بعد سب سے بڑا آرٹسٹ تھا۔

☆ وہ اپنے خلاق کارکنوں کو پسند کرتا تھا اور اس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہ جائیں۔ اس کے ساتھ کام کرنے والا اینی میٹر اور ڈائرکٹر ڈیوڈ سوئفٹ جو یہودی تھا اس نے ایک سوانح نگار کو بتایا کہ جب 1938ء میں اس نے ڈزنی کو یہ اطلاع دی کہ وہ اسے چھوڑ کر کولمبیا پکچرز کے ادارے میں جارہا ہے تو ڈزنی نے غصیلے لہجے میں کہا ٹھیک ہے ڈیوڈ بوائے، تم یہودیوں کے ساتھ جا کر کام کرو۔ کیوں کہ تم خود یہودی ہو۔

سوئفٹ کا کہنا ہے کہ وہ 1945ء میں اس کے پاس واپس آگیا۔ پھر جب وہ 1945ء میں ایک بار پھر ڈزنی اسٹوڈیوز سے جانے لگا تو ڈزنی نے کہا کہ تمہارے لیے اب بھی کھڑکی میں ایک شمع روشن ہے، تم جب چاہو واپس آسکتے ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشورے کیے۔اس نے جو مشورے دیے وہ ڈزنی کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔وہ اکثر چارلی کا تذکرہ کیا کرتا تھا اور اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

فلم کے کاروبار نے ترقی کی تو بلیک اینڈ وھائٹ فلموں کی جگہ ٹیکنی کلر نے لے لی۔والٹ ڈزنی نے بھی حکومت کی اجازت سے کلر کارٹون فلمیں بنانا شروع کر دیں۔1932ء میں اس نے دو فلمیں بنائیں 'فلاورز' اور 'ٹریز'۔اسے ان فلموں کی تخلیق پر اس کے اسٹوڈیو کو اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

1937ء میں اس کی صلاحیتوں کے جوہر کھلے اور اس کی چند اور فلمیں کام یاب ہوئیں تو لوگ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔والٹ ڈزنی کی فلموں کا انہیں انتظار رہنے لگا۔

ڈزنی کی ماں بچپن میں اسے ایک کہانی سنایا کرتی تھی جس کا نام 'تین چھوٹے سؤر اور ایک خبیث بھیڑیا' تھا۔ڈزنی نے سوچا کہ کیوں نہ اس کہانی پر فلم بنائی جائے۔اس نے یہ آئیڈیا اپنے معاونین کو سنایا تو انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا کہ اس پر بننے والی فلم ناکامی سے دوچار ہوگی۔ڈزنی نے ان سے اختلاف کیا۔اس کے معاونین خاموش رہے اور انہوں نے اس کی ہدایت کے مطابق کام کرنا شروع کر دیا۔وہ اب بھی پُر یقین تھے کہ فلم کی کہانی میں جان نہیں ہے اور ناکامی سے دوچار ہوگی۔

'تین چھوٹے سؤر اور ایک خبیث بھیڑیا' پر فلم بناتے ہوئے انہیں نوے دن لگے تھے۔اس فلم پر وہ اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے یہ فلم ساٹھ دن میں بنا ڈالی۔جب فلم ریلیز ہوئی تو اس نے امریکا میں تہلکہ مچا دیا۔اس فلم میں بچوں کے لیے ایک گیت بھی تھا۔تھوڑے عرصے کے بعد وہ گیت امریکا کے علاوہ یورپ کے ہر ملک کے بچوں کی زبان پر تھا۔بعض سنیما گھروں میں وہ فلم سات سات بار دکھائی گئی۔ڈزنی کو اس فلم سے جو شہرت اور ناموری ملی وہ کسی اور فلم سے نہیں ملی۔اس فلم کو بنانے پر پچیس ہزار ڈالر خرچ ہوئے جب کہ فلم کا منافع ساٹھ لاکھ ڈالر تھا!

اسے بتایا گیا کہ تبصرہ نگاروں نے فلم کو بہت پسند کیا ہے اور اخبارات میں اس پر مثبت اداریے لکھے گئے ہیں۔ڈزنی نے کہا کہ میں ان لوگوں کو خوش کرنے کے لیے فلمیں نہیں بناتا، میں تو چاہتا ہوں کہ میرے ناظرین فلم دیکھ کر خوش ہوں۔ان کے تبصرے میرے سر آنکھوں پر ہیں۔

وہ چاہتا تو اس رقم کو اپنی ذات پر خرچ کر دیتا، پُر آسائش مکان میں رہتا، ملازمین کی ایک فوج ظفر موج خدمت کے لیے رکھ لیتا اور رولس رائس جیسی کار خرید لیتا لیکن وہ اسی کار کو استعمال کرتا رہا جو اس نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی۔

دراصل وہ اپنی رقم سے لوگوں کو تفریح مہیا کرنا چاہتا تھا اس لیے فلموں سے ملنے والے منافع کو مزید کاروبار میں لگا دیتا تھا۔اس کا کہنا تھا کہ میں پیسا بنانے کے لیے فلمیں نہیں بناتا بلکہ فلمیں بنانے کے لیے پیسا بناتا ہوں۔

ایک دل چسپ بات یہ کہ فلم کے گیت کی دھن ڈزنی نے اپنے ملازم سے تیار کرنے کو کہی تھی، اس لیے اسے موسیقی کی سمجھ بوجھ تھی۔اسے بھی فلم سے کوئی دل چسپی نہیں تھی اور وہ سمجھتا تھا کہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔چنانچہ اس نے پندرہ منٹ میں اس کی دھن تیار کر ڈالی۔فلم کا گیت مشہور ہوا تو دوسرے ہدایت کار اس کی طرف دوڑ پڑے اور اسے پانچ فلموں کے معاہدے اور مل گئے۔بعد میں وہ بے حد کامیاب موسیقار ثابت ہوا۔

اس کی فلم 'اسنو وھائٹ اینڈ دی سیون ڈوارفس' مکمل کارٹون اور موسیقی سے بھرپور فلم تھی جس کا افتتاحی شو لاس اینجلیس کے کارتھی تھیٹر میں ہوا۔ایک اندازے کے مطابق اس فلم نے تقریباً پندرہ لاکھ ڈالر کا بزنس کیا، جب کہ امریکا اس وقت بحرانی کیفیت سے دوچار تھا۔یہ فلم اب بھی ناقابلِ فراموش فلموں میں شمار ہوتی ہے۔آیندہ پانچ برسوں میں والٹ ڈزنی کے اسٹوڈیو نے چار فلمیں مزید ریلیز کیں، جن میں فینٹاسیا، ڈمبو اور بامبی شامل ہیں۔

ڈزنی ایک تحمل مزاج شخص تھا جسے غصہ تو آتا تھا لیکن وہ اس پر قابو پا لیا کرتا تھا اور اپنے ملازمین کے ساتھ محبت اور یگانگت برتتا تھا۔اس کا رویّہ خلیقانہ تھا۔گھر پر بھی جب اس کی بیوی لڑتی جھگڑتی تھی تو ڈزنی اسے ملائمت سے سمجھا دیا کرتا تھا۔اس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے کبھی اونچی آواز میں بیوی سے گفتگو نہیں کی۔اس کی بیٹی کا کہنا ہے کہ میں اپنے ڈیڈی کو سمجھاتی تھی کہ میری الجھنوں سے اور پریشانیوں سے کوئی سروکار نہ رکھا کریں اور مجھے ان سے خود نمٹنے دیں مگر وہ میری ایک نہ سنتے اور میرے مسائل سے نبرد آزما ہوتے رہتے۔

فلم 'اسنو وھائٹ اینڈ دی سیون ڈوارفس' کی کام یابی کے بعد انہوں نے اسٹوڈیو کے قریب رہائش اختیار کر لی۔ڈزنی اور اس کے بھائی نے اپنے والدین کو اس مکان میں لا کر رکھا۔جب 1938ء میں ڈزنی کی ماں حادثاتی طور پر انتقال کر گئی تو اسے بہت صدمہ ہوا۔وہ اپنی بیوی اور بچوں سے چھپ کر کئی

بار روتا پایا گیا۔مکان میں چولہا کھلا رہ جانے سے گیس باورچی خانے میں بھر گئی تھی۔اس کی ماں کو اندازہ نہ ہو سکا۔اس نے جب چولہا جلایا تو وہیں بھسم ہو گئی۔ڈزنی نے اسے اپنا قصور جانا اور خود کو ساری زندگی معاف نہیں کیا۔

اس کا کام بڑھ چکا تھا۔اس لیے اس نے زمین خرید کر اپنا ذاتی اسٹوڈیو برینک کے نام سے قائم کیا اور اس میں اپنے اسٹاف سمیت منتقل ہو گیا۔جس میں ایک ہزار کے قریب اداکار، کہانی کار اور ٹیکنیشنز شامل تھے۔

دوسری عالمی جنگ کے شروع ہونے کے بعد والٹ ڈزنی کو اپنی مصروفیات کی طرف توجہ دینے کی مہلت ہی نہ ملی۔ایک اندازے کے مطابق وہ اس وقت 94 فی صد حکومت کے کاموں میں الجھا ہوا تھا، جس میں مسلح افواج کے لیے پروپیگنڈا فلمیں بنانے سے لے کر صحت و صفائی کی فلمیں شامل تھیں جن کی امریکا ساری دنیا میں نمائش کیا کرتا تھا۔جب اس سے وقت بچ جایا کرتا تھا تو اپنے لوگوں کے لیے تفریحی کارٹون یا مزاحیہ فلمیں بنایا کرتا تھا۔

والٹ ڈزنی تخلیق کار تھا اور اس نے فلم بنانے میں نت نئی جہتیں تلاش کی تھیں۔1945ء میں اس نے 'دی تھری کیبلرز' نامی فلم بنائی جس میں ایکشن فلم کے ساتھ کارٹون کو شامل کیا گیا تھا۔عام سی متحرک فیچر فلم میں کارٹون حرکت کرتا دکھائی دیتا تھا تو نہایت عجیب تاثر پیدا ہو جاتا تھا۔یہ تجربہ کامیاب رہا اور لوگوں نے اسے بھی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔چنانچہ ڈزنی نے اپنے اسٹوڈیو سے لگ بھگ سو فلمیں اسی انداز پر بنائیں۔

والٹ ڈزنی کو خیال آیا کہ وہ محض تفریح کے لیے فلمیں بنا رہا ہے، کیوں نہ اس میں تعلیم کا پہلو بھی مدِنظر رکھا جائے تو ایک پنتھ دو کاج کے مصداق تفریح کے ساتھ کام بھی ہو جائے گا اور اس کا شمار یقیناً قومی خدمت میں کیا جائے گا۔چنانچہ اس نے ایسی فلموں کی ایک سیریز تیار کر ڈالی۔جن میں 'لیونگ ڈیزرٹ، دی ویشنگ پریری، دی افریقن لوائن اینڈ وھائٹ وائلڈرنس شامل ہیں۔اس کی فلموں میں جانوروں سے محبت کا سبق دیا جاتا تھا اور ان کی اہمیت سے آگاہ کیا جاتا تھا۔

ڈزنی ایک عظیم تخلیق کار تھا، تفریحی فلمیں بناتے ہوئے اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ تعلیمی فلمیں بھی بنائے۔چنانچہ اس نے فضائی ادارے ناسا کے لیے راکٹ ڈیزائن کرنے والے سائنس داں وارنہر وان براں کے اشتراک سے 1955ء میں 'مین ان اسپیس' مین اینڈ دی مون اور 1957ء میں مریخ

☆1980ء میں جب ایک روسی ماہرِ فلکیات لڈمیلا نے ایک نیا سیارہ دریافت کیا تو اس کا نام 4017 ڈیزنیار رکھ دیا۔وہ ڈزنی سے بہت متاثر تھا اور کہا کرتا تھا کہ اگر دنیا میں چند افراد ایسے اور پیدا ہو جائیں تو دنیا جنت نظیر ہو جائے گی۔

☆لاس اینجلس میں ایک کنسرٹ ہال 2003ء میں ڈزنی کے نام پر کھولا گیا۔

☆ڈزنی لینڈ کی پچاسویں سالگرہ اٹھارہ ماہ تک 2005ء سے 2006ء تک منائی گئی، جس میں اس کے خالق کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔اس موقع پر ڈزنی لینڈ کو ''دنیا کا سب سے پُرمسرت خطہ'' قرار دیا گیا۔

☆سیونگ مسٹر بینک نامی فلم میں اداکار ٹام ہینکس، والٹ ڈزنی کی زندگی پر بننے والی فلم میں اس کا کردار ادا کرے گا اور یہ فلم 2013ء کے آخیر میں ریلیز ہوئی۔

☆اس کے بھائی رائے ڈزنی کا انتقال 20 دسمبر 1971ء میں ہوا۔

☆اس وقت والٹ ڈزنی کمپنی کے پاس پانچ ریزورٹ، گیارہ تھیم پارک، دو واٹر پارک، انتالیس ہوٹل، آٹھ موشن پکچرز اسٹوڈیوز، چھ ریکارڈنگ اسٹوڈیوز اور گیارہ کیبل ٹیلی ویژن نیٹ ورک ہیں۔2007ء میں اس کمپنی کی مجموعی آمدنی 35 بلین ڈالر تھی۔

اور اس سے آگے نامی فلمیں بنائیں۔

ڈزنی ایک عظیم ہدایت کار تھا۔اس نے اپنے اسٹوڈیو سے بچوں کے لیے کارٹون فلمیں بنانے سے ابتدا کی مگر بعد میں اسے فیچر فلموں کا خیال آیا، لہٰذا اس نے 1950ء میں ٹریژر آئی لینڈ، 1954ء میں پہلی سنیما اسکوپ فلم 20000 لیگ انڈر دی سی، 1959ء میں دی شیگی ڈاگ، 1960ء میں سوئز فیملی رابنسن اور 1961ء میں پیرنٹ ٹریپ بنائیں جن میں سے اکثر کامیاب ہوئیں۔

اتنا بڑا ہدایت کار اور فلم ساز ہونے کے باوجود اس نے اپنی زندگی میں صرف ایک فلم 'دی رلکٹنٹ ڈریگون' میں کام کیا اور اسکرین پر آنے کا شوق پورا کیا۔جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ باقاعدہ اداکار کیوں نہیں بنا تو اس نے جواب دیا کہ ہدایت کار کی حیثیت سے اسے اپنی اداکاری پسند نہیں آئی۔

والٹ ڈزنی ٹیلی ویژن پروگرامنگ کا بھی بانی کہا جاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ڈزنی نے اپنی ٹیلی ویژن پروڈکشن 1954ء میں شروع کی تھی اور دوسروں کے ساتھ مکمل رنگین پروگرامنگ کی جس کا نام 'ونڈرفل ورلڈ آف کلر' تھا۔اس کی ابتدا 1961ء میں ہوئی تھی۔

اس کی 35ویں سالگرہ پر اس کے بھائی نے فلم کمپنی کے ملازمین کے سامنے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ڈزنی کو سرپرائز دیا جائے اور بالکل آخری لمحوں میں بتایا جائے کہ آج اس کی سالگرہ ہے۔دو ملازمین نے جو فوٹو گرافر تھے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ مکی ماؤس کے کردار پر چھوٹی سی فلم بنانا چاہتے ہیں۔رائے نے اس کی اجازت دے دی۔شام کو جب سالگرہ کا کیک کاٹا گیا تو رائے نے اسے مکی ماؤس کی فلم کے بارے میں بتایا۔فلم اسکرین پر چلائی گئی۔والٹ اسے دیکھ کر ہنسا۔پھر جب فلم ختم ہوگئی تو اس پوچھا کہ فلم کس نے بنائی ہے۔دونوں فوٹو گرافر سامنے آئے۔ڈزنی نے دونوں فوٹو گرافروں کو ملازمت سے کھڑے کھڑے نکال دیا اور خود اسٹوڈیو چھوڑ کر چلا گیا۔

اپنی موت سے چند برس پیشتر 15 دسمبر 1966ء کو والٹ ڈزنی نے کیلیفورنیا میں انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس کھولا۔یہ پرفارمنگ آرٹس کے سارے شعبوں کی تعلیم دینے کے لیے قائم ہوا تھا۔

وہ بلا کا سگرٹ نوش تھا اور سگریٹ سے سگریٹ سلگانے کا عادی تھا۔اس قبیح عادت کی بنا پر اسے پھیپڑے کا سرطان ہوگیا۔وہ اپنی 65ویں سال گرہ نہ منا سکا اور دس دن قبل 15 دسمبر 1966ء کو اس دنیائے رنگ و بو سے رخصت ہوگیا۔موت کے وقت وہ 'جنگل بک' نامی فلم بنا رہا تھا جو اس کی موت کے ایک سال بعد ریلیز ہوئی۔

موت سے چند ماہ پیشتر وہ سخت بیمار پڑا تھا۔اس کی گردن میں درد تھا۔اس نے اسپتال میں داخلہ لیا۔وہ ہالی ووڈ میں پولو کھیلنے کا عادی تھا اس لیے گردن میں درد ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔اسے سینٹ جوزف اسپتال برباک، کیلیفورنیا میں 2 نومبر 1966ء کو داخل کرا دیا گیا۔اس نے ڈاکٹروں کو بتایا تھا کہ اس کی کمر اور گردن میں درد ہے۔اس کے ایکسرے لیے گئے تو معلوم ہوا کہ اس کے دائیں پھیپڑے میں سرطانی رسولی ہے۔ڈاکٹروں نے سرجری تجویز کی۔ڈزنی نے اس کی پروانہ کی اور ڈاکٹروں سے اجازت لے کر اسٹوڈیو گیا اور اپنی زیرِ تکمیل فلم کی شوٹنگ کی اور دوبارہ آ کر 9 نومبر کو اسپتال کے بستر پر لیٹ گیا۔ڈاکٹروں نے سرجری کی تو معلوم ہوا کہ دائیں پھیپڑے میں سرطان پوری طرح سے پھیل چکا ہے، لہٰذا انہوں نے اسے نکال دینا مناسب سمجھا۔ڈاکٹروں نے پیش گوئی کہ اس کی موت چھ ماہ سے دو سال کے دوران ہو سکتی ہے۔اس کی کئی بار تھراپی ہوئی۔وہ اپنی بیوی کے ساتھ پام اسپرنگ کے پُرفضا مقام پر رہائش پذیر ہونے کے لیے بھی گیا۔اس کی سرجری 11 نومبر کو ہوئی تھی، 30 نومبر کو اپنے گھر میں چلتے ہوئے وہ لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔اسے اسپتال لے جایا گیا۔وہاں سے اس کی خواہش پر اسٹوڈیو لے جایا گیا۔وہ جانبر نہ ہو سکا اور سرطان نے اس کی جان لے لی۔اس کی موت کے بعد یہ افواہ کافی دنوں تک پھیلی رہی کہ اس نے اپنے جسم کو منجمد کرا لیا ہے یا اس نے ڈزنی لینڈ میں کسی خفیہ جگہ پر اپنے آپ کو دفن کرایا ہے۔یہ افواہیں غلط ثابت ہوئیں۔ایک تحقیق کار نے انکشاف کیا ہے۔اس کی موت کے بعد اسے دفن نہیں کیا گیا بلکہ اس کی وصیت کے مطابق لاش کو جلا کر اس کی راکھ کیلیفورنیا میں واقع اس کے اسٹوڈیو کے اطراف میں بکھیر دی گئی۔

ڈزنی بخوبی واقف تھا کہ وہ ایک خراب عادت میں مبتلا ہے اس لیے جب وہ مجمع میں جاتا تھا تو سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔خاص طور پر وہ نہیں چاہتا تھا کہ بچوں میں اس کا امیج خراب ہو، لہٰذا وہ ان کے سامنے کبھی سگرٹ نہیں سلگاتا تھا۔

غالباً وہ اپنی موت سے باخبر تھا اسی لیے اس نے اپنی زندگی میں ایک فلم بنوائی تھی جس میں اس نے تقریر کی تھی اور اپنے ایگزیکٹیو بورڈ ممبران سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ان کی ذمے داریاں کیا ہیں۔اگر وہ اس دنیا میں نہ رہے تو اپنے عظیم منصوبوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔''میری آنکھیں بند ہو چکی ہوں گی، مگر میں آپ کو دیکھ رہا ہوں گا۔''

اس کا انتقال اپنے اسٹوڈیو میں ہوا تھا۔مرتے وقت اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ میرے اسٹوڈیو کا واٹر ٹینک کتنا بھدا اور خراب ہوگیا ہے۔اسے مسمار کرا دینا چاہیے۔اس کی موت کے بعد اس واٹر ٹینک کو مسمار تو نہیں کیا گیا، لیکن اس کی مرمت کر کے اسے خوشنما ضرور بنا دیا گیا۔

اس کی موت کے بعد اس کے بھائی رائے نے اسٹوڈیو کا چارج سنبھالا اور بہت سی معیاری فلمیں بنائیں جن میں 'ہو فریمڈ راجر ریبٹ (1988)' دی لٹل مارمیڈ (1989) بیوٹی اینڈ دی بیسٹ (1991) الہ دین (1992) اور کنگ لائن (1994) جیسی فلمیں شامل تھیں۔

جلاوطن

اے آر راجپوت

زندگی کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے۔ کس کس طرح مدّوجزر سے ہمکنار کرواتی ہے۔ وہ ایک سپاہ سالار تھا۔بادشاہ کا مقربِ خاص تھا مگر جب حالات نے کروٹ بدلی تو بھیک پر گزارہ کرنے لگا۔بچے مختلف گھروں میں بطور غلام کام کرنے پر مجبور ہوگئے مگر قسمت نے ساتھ دیا اور وہ بچے منصب اعلیٰ پر پہنچنے لگے۔تبھی قسمت نے ایک اور حیرت زدہ کردینے والا منظر سامنے لادیا۔

مغرب سے درآمد دلچسپ و سبق آموز کتھا

جب رومی سلطنت فرانسیسیوں کے قبضے میں چلی گئی تو دونوں اقوام میں کافی عرصے تک جنگ وجدال کا سلسلہ جاری رہا۔اپنے ملک کے تحفظ اور دشمن ملک پر حملہ کرنے کی غرض سے شاہ فرانس نے تمام حلیف بادشاہوں، بیٹوں اور رشتے داروں کو ایک جگہ جمع کیا۔متحدہ فوج ترتیب دی، جنگ پر جانے سے پہلے اس نے ضروری خیال کیا کہ زمامِ حکومت کسی ایسے شخص کو سونپی جائے جو اندرونِ ملک اس کی نمائندگی کرنے کے ساتھ ساتھ نہایت وفاداری اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

خلوص سے اس کی مدد کرتا رہے۔ اپنے اس مقصد کے لیے اس کی نظر انتورپ کے سردار پر پڑی جو ایک بہترین سپاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا منتظم بھی تھا حالانکہ اس کی صلاحیتوں کا تقاضا تو یہ تھا کہ بادشاہ اس کی خدمات سے میدانِ جنگ میں فائدہ اٹھاتا لیکن اس سے زیادہ اندرونِ ملک کے لیے ایک حاکم کی ضرورت زیادہ تھی۔ چنانچہ شاہ فرانس کے جانے کے بعد وہ سردار بادشاہ کے نائب کی حیثیت سے فرانس کا حکمران ہوگیا۔ لیکن جب اس نے یہ عہدہ سنبھالا تھا تو دل ہی دل میں اس بات کا عہد کرلیا تھا کہ وہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ملکہ اور بادشاہ کی بہو یعنی ولی عہد کی بیوی سے مشورہ ضرور کیا کرے گا۔ بادشاہ کو سردار پر اتنا اعتماد تھا کہ اس نے سارے افرادِ خاندان کی دیکھ بھال اور سرپرستی بھی اس کو سونپ دی تھی۔

الثر (ولی عہد) کی عمر تقریباً چالیس سال تھی لیکن وہ اپنی سرخ و سفید رنگت اور صحت مند جسم کی وجہ سے نوجوان لگتا تھا۔ اس کے بال قدرے سفید تھے، تمام فرانس میں اس کی جامہ زیبی، وجاہت اور خوبصورتی کا شہرہ تھا اور سونے پر سہاگا کہ وہ انتہائی زیرک اور سرد مزاج سیاستدان بھی تھا۔ انہی خصوصیات کی بنا پر دربار کے امراء وزرا اور خود بادشاہ اس کی بے حد عزت کرتے تھے۔

جن دنوں شاہ فرانس اپنے شہزادے کے ساتھ جرمنوں سے نبرد آزما تھا۔ سردار کی بیوی کا انتقال ہوگیا۔ اس نے اپنے بعد دو ننھے خوبصورت پھول چھوڑے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا تھا اور دوسری لڑکی، سردار کو اپنی بیوی کی موت کا بے حد غم ہوا اور وہ غم بھلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مصروف رہنے لگا۔ وہ اکثر ملکی معاملات میں ملکہ اور اس کی بہو سے مشورے کرتا رہتا تھا۔ اس دوران شاہ فرانس کی بہو سردار کی پُرکشش شخصیت کا اثر قبول کرتی رہی، یہاں تک کہ اب وہ اس فکر میں مبتلا رہنے لگی تھی کہ سردار کو کس طرح اپنی محبت کے دام میں لایا جائے۔ چنانچہ جیسے ہی سردار کی بیوی کے انتقال کی خبر اسے ملی وہ بہت خوش ہوئی، اس نے سوچا کہ اب اس کا معمولی اشارہ ہی سردار کو مائل کرلینے کے لیے کافی ہوگا۔ کیونکہ سردار تنہائی سے ضرور اداسی محسوس کرے گا۔

ایک دن جب وہ تنہا اپنے کمرے میں بیٹھی تھی اس نے سردار کو بلوا بھیجا۔

”فوراً آجائیے۔ ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنی ہے۔“

سردار جو شہزادی کی طرف سے کسی غلط حرکت کا تصور بھی نہ کرسکتا تھا فوراً ہی اس کے پاس پہنچ گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا، اس وقت شہزادی کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ گفتگو شروع ہوئی اور سردار نے کئی بار اپنی طلبی کا مقصد دریافت کیا لیکن اسے کوئی معقول جواب نہ ملا۔ شہزادی پر نفسانی خواہشات نے غلبہ پالیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا اور وہ روہانسی ہوکر کہنے لگی۔

”کیا تمہیں میرے انداز اور بات چیت سے میری اس محبت کا اندازہ نہیں ہوتا جس کی آگ میرا وجود بھسم کیے دے رہی ہے۔ میں خوب جانتی ہوں کہ مجھے سب کچھ میسر ہے اور میرا گناہ کی طرف مائل ہونا اس مفلوک الحال عورت کے گناہ سے زیادہ سنگین ہے جو ہر طرح سے مایوسی اور محرومیت کا شکار ہو۔ میں اپنے گناہ کی بدترین سزا کی مستحق ہوں۔ لیکن اگر تم اس طرح سوچو کہ محبت ایک غیر اختیاری جذبہ ہے اور میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں تو میرے جرم کی نوعیت مجھے تمہاری ہمدردی کا مستحق قرار دیتی ہے اور پھر ایسی حالت میں کہ میں ایک عرصے سے اپنے شوہر کی آغوش سے محروم ہوں میری محبت جرم نہیں رہتی، میں حالات اور دل کے ہاتھوں بے بس اور مجبور ہوں۔“

اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سردار کو دیکھا اور آگے کہنے لگی۔

”بتاؤں کہ میں کب تک اور کس طرح صبر کروں۔ میں تمہاری محبت کی بھوکی ہوں! خدا کے لیے تم زندگی کے متلاطم سمندر میں ڈولتی ہوئی یہ ڈانواں ڈول نیا اپنے بازوؤں کے مضبوط چپوؤں کے ذریعے کنارے تک پہنچانے میں میری مدد کرو۔ میں بار بار یہی کہوں گی کہ تمہاری محبت اور شوہر کی عدم موجودگی سے میں اپنے طوفان خیز جذبات پر قابو حاصل کرنے میں بالکل بے بس ہوچکی ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اگر دنیا کو میری ان حرکات کا علم ہوجائے تو وہ مجھے ذلیل ترین عورت سمجھے گی لیکن ہم دونوں اگر چاہیں گے تو دنیا کو اس بارے میں کچھ بھی نہ معلوم ہوگا۔ ہم دونوں اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ میری جوانی اس طرح گھل رہی ہے جیسے آگ پر برف پگھلتی ہے۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور ہاتھوں میں تشنجی کیفیت پیدا ہوگئی۔ ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس وقت وہ سرو کا ایک ایسا پودا دکھائی دے رہی تھی جو ہوا کے تیز جھونکوں کی وجہ سے خم ہوگیا اور آخر اس نے اپنا سر سردار

کے شانوں سے ٹکا دیا لیکن اس کا انتخاب غلط تھا۔ سردار نے نفرت اور حقارت سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے جو اس کی گردن میں حائل ہونے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے۔

وہ کہنے لگا۔ ”لڑکی! تو نہیں جانتی کہ ولی عہد شہزادہ میرے بیٹے کی مانند ہے، میں تیری ان شہوانی خواہشات کی بھینٹ چڑھنے کے بجائے یہ بات پسند کروں گا کہ کوئی میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے چیل کووں کو کھلا دے۔ میں ولی عہد کی بیوی اور ملک کی ہونے والی ملکہ کی حیثیت سے تیری عزت کرتا تھا۔“

اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید شرم سے پانی پانی ہوجاتی لیکن حرص و ہوس کی یہ پجارن چوٹ کھائی ہوئی غضب ناک ناگن کی مانند پھنکارتی ہوئی آگے بڑھی اور کہنے لگی۔ ”ذلیل کمینے! تیری یہ مجال کہ ہمارے ہی ٹکڑے کھائے، ہمیں ہی آنکھیں دکھائے، تیری یہ جرأت؟ اب میں تجھے یا تو ملک بدر کرادوں گی یا پھر تجھے ہلاک کردیا جائے گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے بال نوچ ڈالے، سینے پر سے قمیص چاک کرلی اور ہسٹریائی انداز میں کہنے لگی۔ ”ارے کوئی ہے دوڑو...... بچاؤ...... انتورپ کا سردار میری عزت پر ہاتھ ڈال رہا ہے۔“

یہ صورتِ حال سردار کے لیے بڑی پریشان کن تھی لیکن اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دنیا عورت کی بات کے آگے اس کی ایک نہ سنے گی اور بے گناہ ہونے کے باوجود اسے بے عزتی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکلا اور اپنے گھر پہنچا۔ دونوں بچوں کو گھوڑے پر سوار کیا اور کیلیس کے لیے روانہ ہوگیا۔

اُدھر شہزادی کی چیخ و پکار سن کر محل کے خدام دوڑے دوڑے اس کے کمرے میں پہنچے اور اس کی حالت اور امداد طلب آواز اور الفاظ سے صورتِ حال بہ خوبی بھانپ گئے اور انہیں یقین ہوگیا کہ سردار نے یقیناً کوئی ناشائستہ اور مذموم حرکت کی ہوگی۔ فوراً ہی سپاہیوں کا ایک دستہ سردار کے محل پہنچا اور اس نے اس کو غائب پاکر پہلے تو اس کا سازوسامان لوٹا اور پھر اشتعال میں آکر اس کے محل کا کافی حصہ ڈھا دیا۔

یہ خبر جب بادشاہ اور شہزادے کو پہنچی تو اس میں اس حد تک نمک مرچ لگ چکا تھا کہ اس کی اصلیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ بادشاہ نے روایتی انداز میں شاہی رائے کا اظہار فرمادیا کہ ”یہ نچلے درجے کے لوگ جو ترقی کرتے اور پروان چڑھتے ہیں ان سے وفاداری کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے بنجر زمین سے سمن کی پیدائش کی توقع کرنا۔ یہ سردار کا قصور نہیں ہمارا قصور ہے کہ ہم نے ایک ایسے شخص کو جو پہلے معمولی حیثیت کا آدمی تھا، اتنی بڑی حیثیت دے دی۔ نمک حرام۔“

بادشاہ نے اعلان کرادیا کہ ”جو شخص بھی سردار کو زندہ یا مردہ بادشاہ کے سامنے حاضر کرے گا، انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔“

سردار کو اگر افسوس تھا تو اس بات کا کہ اس کے فرار نے اس کی بے گناہی کو مجرمانہ رنگ دے دیا تھا لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ کیلیس پہنچا اور کسی پر اپنی اصلیت ظاہر کیے بغیر بھیس بدل کر لندن روانہ ہوگیا۔

وہ ایک فقیر کے بھیس میں تھا۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے اس نے بچوں کو دو باتیں سمجھا دیں تھیں کہ ان پر جو مصیبت نازل ہوئی ہے اسے صبر و سکون سے برداشت کریں اور اگر انہیں اپنی زندگی عزیز ہے تو وہ کسی قیمت پر بھی اپنی اصلیت نہ بتائیں اور نہ کسی پر یہ ظاہر کریں کہ وہ کہاں سے آئے ہیں۔ اس وقت لوئی نو برس کا تھا اور وائلٹ تقریباً سات برس کی...... انہوں نے اپنے باپ کی ہدایت سنی اور اس پر عمل پیرا ہوگئے۔

سردار نے ان دونوں کے نام بھی بدل دیئے تھے۔ لڑکے کا نام ”پیروتو“ اور لڑکی کا نام ”جانیتا“ رکھ دیا تھا۔ میلے کپڑوں میں فرانسیسی فقیروں کی طرح ان تینوں نے لندن کی گلیوں میں گھومنا شروع کردیا۔

ایک دن سردار ایک گرجا کے باہر کھڑا بھیک مانگ رہا تھا کہ شاہ انگلستان کے ایک جنرل کی بیوی کا اُدھر سے گزر ہوا۔ عورت کو اس پر ترس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟

جواب میں سردار نے اسے بتایا کہ وہ پکارڈی سے آیا ہے۔ اس کے سب سے بڑے بیٹے کی بداطواریوں نے اسے اپنے ننھے معصوم بچوں کے ساتھ گھر چھوڑنے اور دردر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیا ہے۔

عورت کو اس کی ننھی منی خوبصورت سی بچی بہت پسند آئی۔ کہنے لگی۔ ”اگر تم پسند کرو تو تمہاری اس بچی کو میں اپنے گھر لے جاسکتی ہوں۔ میں اس کی پرورش کروں گی اور اگر یہ میری فرماں بردار رہی تو میں کوئی اچھا سا رشتہ تلاش کرکے اس کا بیاہ کردوں گی۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

سردار اس عورت اور اس کے فوجی شوہر کو فرانس کی کئی شاہی دعوتوں میں دیکھ چکا تھا اور اس سے خوب اچھی طرح واقف تھا۔ عورت کی پیش کش سن کر اس کی باچھیں کھل گئیں اور اس نے فوراً ہاں کردی۔

آنسوؤں کے نہ تھمنے والے طوفان کے درمیان اس نے اس ننھی سی کلی کو اس نیک دل خاتون کے حوالے کردیا اور خود بیٹے کے ساتھ مانگتا کھاتا وہاں سے چل پڑا۔

اب وہ کسی قیمت پر بھی اس جزیرے میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس لیے ویلز پہنچ گیا۔ اب اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے کپڑے تار تار تھے اور چلتے چلتے پیروں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ پیرو تو اس کے کندھے پر سوار تھا۔

اس شہر میں بھی شاہ برطانیہ کا ایک جنرل رہا کرتا تھا۔ اس کے گھر یہ دونوں باپ بیٹے اکثر بھیک مانگنے جاتے، جنرل کی کوٹھی کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا میدان تھا جس میں جنرل اور دوسرے برطانوی امراء کے بچے کھیلا کرتے تھے۔

پیرو تو بھی کبھی کبھی ان کے کھیل میں شامل ہو جاتا اور چونکہ شکل وصورت کے اعتبار سے وہ ان سے کسی طرح کم نہ تھا لہٰذا یہاں کے بچے جلد ہی اس سے مانوس ہو گئے، وہ جب بھی ان کے ساتھ کھیلتا تو یا تو ان کا ہم پلہ ثابت ہوتا یا ان پر بھاری پڑتا۔

جنرل نے اکثر اس لڑکے کو کھیلتے ہوئے دیکھا تو اس میں اسے بڑے جوہر دکھائی دیئے، جب اس نے لوگوں سے اس کے بارے میں پوچھا تو اسے یہ جان کر بے حد حیرت ہوئی کہ وہ بھکاری کا بیٹا ہے۔ جنرل ایک مردم شناس تجربہ کار اور زمانہ چشیدہ شخص تھا۔ اس نے سردار سے لڑکے کو مانگ لیا اور اسے یقین دلایا کہ اس کی بہتر سے بہتر پرورش کی جائے گی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں! سردار تو اس موقع کی تاک میں تھا ہی، اس نے فوراً ہی لڑکے کو جنرل کے حوالے کردیا لیکن اس موقع پر شفقت پدری نے جوش مارا اور بے چارہ اپنے آنسوؤں کو دل کے غم خانے میں چھپائے وہاں سے لوٹ آیا۔

اس واقعے کے بعد سردار، انگلستان سے چل کر آئرلینڈ کے شہر اسٹینڈ فورڈ پہنچا اور یہاں اس نے ایک نواب کے سائیس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی اور بڑی جفاکشی اور محنت سے کئی سال ملازمت میں گزار دیئے۔ لڑکی جنرل کے گھر میں (وائلٹ) جانتا کے نئے نام سے پرورش پا رہی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ یہاں تک کہ اس پر شباب آنے لگا جنرل اور اس کی بیوی اسے دیکھ کر جیتے تھے اور گھر کا ہر فرد اس کے حسن اور شخصیت کا سحر قبول کر چکا تھا اور ہر شخص کی رائے تھی کہ یہ لڑکی شاہانہ زندگی کے قابل ہے، خود وہ نیک دل خاتون جو اسے لے کر آئی تھی، اکثر یہی سوچتی تھی کہ اس لڑکی نے جو سلیقہ سیکھا ہے اور زندگی کی جو قدریں اپنائی ہیں، ان کے پیش نظر اس کی شادی کسی بڑے معزز گھرانے میں ہونی چاہیے لیکن قدرت جو ہر بات کا فیصلہ منصفانہ کرتی ہے اس کی اصلیت سے واقف تھی اور اسے کچھ اور ہی منظور تھا۔

اس انگریز جنرل کا ایک بیٹا تھا جو اوصاف میں بے مثال، شریف، باوضع اور بہادر تھا اور اس کی یہی خوبیاں اسے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بنائے ہوئے تھیں۔ اس کی عمر جانتا سے تقریباً چھ سال زیادہ تھی۔ اس کا حسن وجمال اور اس کی سیرت دیکھ کر یہ نوجوان اسے اپنا دل دے بیٹھا اور رفتہ رفتہ یہ عالم ہو گیا کہ جانتا کے علاوہ دنیا کی حسین سے حسین عورت اس کی نظروں میں نہ جچتی۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ واردات قلب کے اظہار کی راہ میں کئی مشکلات حائل تھیں۔ پہلی تو یہ کہ یہ لڑکی ایک چھوٹے خاندان کی تصور کی جارہی تھی۔ لہٰذا اس صورت میں وہ اپنا مدعا ظاہر کرکے ان کی ناراضی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ یہ سن کر والدین بھی کیا کہیں گے کہ اس کے عظیم المرتبت خاندان کے چشم وچراغ نے دل بھی لگایا تو ایک کمتر درجے کی لڑکی سے نتیجہ یہ ہوا کہ جتنا اس نے عشق کی چنگاری کو خونِ دل سے بجھانا چاہا۔ دل کے خون نے تیل بن کر اسے اتنا ہی بھڑکایا اور ایک دن یہ صاحبزادے صاحب فراش ہو گئے۔

بڑے بڑے نامی گرامی ڈاکٹر بلائے گئے لیکن کوئی بھی شخص مرضِ دل کی تشخیص نہ کرسکا اور مرض لاعلاج قرار دے دیا گیا۔ ماں باپ کے غم واندوہ کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ بہت پوچھتے۔ ”بیٹا! بتاؤ تو آخر تمہاری اس بیماری کا سبب کیا ہے؟“

لیکن جواب آہوں اور ٹھنڈی سانسوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ یا پھر گہری عمیق خاموشی..... اثنائے راہ..... ایک نوجوان لیکن قابل ڈاکٹر مریض کی نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھا اس کی کیفیات کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک جانتا کمرے میں داخل ہوئی، جانتا نے نہایت احتیاط اور احترام سے اسے دوا پیش کی۔ نوجوان مریض نے جب اسے دیکھا تو خاموشی سے اس کے گلگوں رخساروں کو دیکھتا ہی چلا گیا۔

غبارِ عشق دل سے نکلا اور اس کے تمام جسم پر چھا گیا۔ عرشے دھندلی ہونے لگی اور جانتا کے چہرے کی روشنی اور چمک دمک اس کی نگاہوں کا مرکز بنتی چلی گئی وہ کسی ان دیکھی دنیا میں کھو گیا۔ یہ دنیا لذائز حیات کی دنیا تھی۔ حسرتوں کی دنیا تھی۔ امیدوں اور ارمانوں کی دنیا تھی۔ اور ڈاکٹر اس کی ان کیفیات کا مطالعہ کررہا تھا۔ اس نے نبض کی رفتار بھی بڑھتی محسوس کی اور یہ رفتار..... اس وقت تک قائم رہی جب تک جانتا کمرے میں موجود رہی اور جب وہ کمرے سے چلی گئی تو نوجوان جیسے تنویمی کیفیت سے آزاد ہو گیا۔ سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور جانتا کو کمرے میں نہ پا کر گردن جھکالی اور اس کی نبض پھر معمول پر آگئی۔ اس کے چہرے پر کرب اور حزن وملال کے تاثرات ڈاکٹر صاف پڑھ رہا تھا۔ وہ معاملے کی اصلیت کو تو پہنچ چکا تھا لیکن اپنی قائم کردہ رائے مزید پختہ کرنے کی غرض سے اس نے ایک خادمہ کے ذریعے جانتا کو بلوایا اور جب وہ کمرے میں واپس آئی تو ڈاکٹر نے پھر یہ محسوس کیا کہ نبض کی رفتار ایک بار پھر تیز ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر اچھل پڑا۔ اس نے پاس کھڑی جانتا سے کچھ نہ کہا۔ وہ حیرت سے کبھی ڈاکٹر کو دیکھتی کبھی مریض پر نظر ڈالتی۔ ڈاکٹر خاموشی سے باہر چلا گیا اور جنرل اور اس کی بیوی کو ایک طرف بلا کر ان سے کہا۔

”آپ کے ان صاحبزادے کو کوئی مرض نہیں ہے یہ جانتا کے عشق میں بری طرح گرفتار ہیں اور میری رائے میں اگر لڑکے کی اس خواہش کا احترام نہ کیا گیا تو اس کی زندگی کی ضمانت کچھ زیادہ عرصے کے لیے نہیں دی جاسکے گی۔ اور یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ میں نے لڑکی کے انداز سے یہ بات بھی محسوس کی ہے کہ وہ آپ کے صاحبزادے کی اس دلی کیفیت سے بالکل واقف نہیں ہے۔ اب آپ خود ہی اپنے بیٹے کے حق میں اچھا یا برا فیصلہ کرسکتے ہیں۔“

ڈاکٹر کے یہ الفاظ جنرل اور اس کی بیوی کے لیے ناامیدی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں امید کی کرن تھے اور اب وہ کم از کم ایک ایسا راستہ ضرور پاسکتے تھے جس پر چل کر وہ اپنے لختِ جگر کی زندگی بچا سکتے تھے لیکن انہیں فکر تھی تو اس بات کی کہ آیا وہ جانتا اور اپنے بیٹے کو شادی کے بندھن میں باندھ بھی سکیں گے یا نہیں؟ لیکن یہ تو بعد کی بات تھی، ابھی تو ضرورت اس بات کی تھی کہ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا اس کی تصدیق کرنی چاہیے۔ یہ سوچ کر نہایت خوشی کے عالم میں دونوں بیٹے کے پاس پہنچے۔

ماں نے کہا۔ ”میرے جگر کے ٹکڑے تمہیں آخر ہو کیا گیا ہے؟ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اپنی کوئی خواہش مجھ سے اس قدر چھپاؤ گے کہ موت کا مہیب سایہ سر پر منڈلانے لگے گا اور تم چپ چاپ رہو گے۔ تم مجھے اپنے رازِ دل سے آگاہ کرو بیٹے۔ تم یقین کرو کہ میں تمہارے لیے ہر وہ کام کروں گی جو خود اپنے لیے کرسکتی ہوں۔ خواہ وہ کتنا ہی غیر پسندیدہ کیوں نہ ہو، تمہاری سعادت مندی کی ادا خدا کو بھا گئی اور اس نے ایسا انتظام فرمایا کہ کسی ناخوشگوار حادثے سے قبل ہی تمہاری اس بیماری کا سبب جان گئے۔ بھلا یہ کون سی بری بات ہے کہ تم کسی سے محبت کرتے ہو۔ تم مجھے فوراً اس لڑکی کا نام بتاؤ تاکہ میں ضروری انتظامات کرکے تمہیں اس دکھ سے نجات دلاؤں۔“

بیٹے کو پہلے تو جھجک سی محسوس ہوئی لیکن آخر ہمت کرکے بولا۔ ”ماں، دراصل جانتا وہ لڑکی ہے جسے میں دنیا کی تمام حسین چیزوں سے زیادہ پیار کرتا ہوں لیکن افسوس کہ اس نے میری آنکھوں کی تحریر کبھی پڑھنے کی کوشش نہ کی، میرے دل میں جھانکنے کی کبھی کوشش نہ کی۔ اس کی بے التفاتی اور اپنی جھجک کے تحت میں اسے اور آپ کو اپنے رازِ دل سے آگاہ نہ کرسکا۔“

عورت بڑی سمجھدار تھی۔ اس نے محسوس کرلیا کہ ایسے موقعوں پر سختی برتنے کے بجائے نرمی اور مصالحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بولی۔ ”ارے بس اتنی سی بات! اچھا اب تمام فکریں ذہن سے نکال دو اور اپنا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو اور دیکھو کہ میں کیا کرتی ہوں۔“

حالات نے پلٹا کھایا اور نوجوان کی صحت بہتر ہوتی چلی گئی۔

ایک دن جانتا اور نوجوان کی ماں دونوں ایک کمرے میں بیٹھی تھیں کہ ماں نے لڑکی کو مذاق ہی مذاق میں چھیڑا۔ کہنے لگی۔ ”اری جانتا اب تو تو اچھی خاصی بڑی ہو گئی ہے۔ خیر سے شادی کے قابل ہے، بھلا اب تک تجھ پر کسی کی آنکھ پڑی یا نہیں اور تو نے بھی کسی کو دل دیا ہے یا نہیں؟“

لڑکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ کہنے لگی۔ ”بھلا مجھ جیسی بدنصیب لڑکی سے کون عشق کرے گا، جسے حالات نے اپنا گھر بار چھوڑنے اور یوں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلنے پر مجبور کردیا ہو، غربت ہی میرا سب سے بڑا قصور ہے۔“

خاتون نے کہا۔ ”اچھا، میں تو یہ سمجھتی تھی کہ تو اب تک کسی کو تلاش بھی کرچکی ہو گی، خیر اچھا ہی ہوا۔ میں بتاؤں،

WWW.PAKSOCIETY.COM

اگر تو تیار ہو تو میں ایک ایسے نوجوان سے تجھے منسوب کر سکتی ہوں جو تیری زندگی کا رنگ نکھار دے گا۔''

''آپ میری بزرگ ہیں، آپ نے میری پرورش اپنی بیٹی کی طرح کی ہے۔ آپ کا ہر حکم بجالانا میرا فرض ہے۔ اگر آپ نے میرے لیے کسی شخص کا انتخاب کیا ہے تو میں اس بارے میں آپ کے احسانات کے پیش نظر سر تسلیم خم کرتی ہوں۔ ورنہ کم از کم اس مسئلے میں خود کچھ نہیں کرنا چاہتی، کیونکہ عصمت اور عفت کے سواء مجھ سے سب کچھ چھن چکا ہے اور عصمت اور عفت کی حفاظت کا میں عہد کر چکی ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک حفاظت!''

بوڑھی خاتون کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے ایفائے عہد کی راہ میں لڑکی کے عزم کو رکاوٹ پا رہی ہے لیکن دل ہی دل میں وہ جانتا کے خیالات سے متفق تھی' کہنے لگی۔ ''فرض کرو شاہ انگلستان جو ایک نوجوان جنرل ہے، تمہاری رفاقت کی تمنا کرے، بتاؤ کیا تم اس کی درخواست ٹھکرا دو گی۔''

لڑکی بولی۔ ''بادشاہ مقتدر ہے' وہ طاقت کے بل بوتے پر جو چاہے کر سکتا ہے لیکن جہاں تک میری دلی رضا مندی کا سوال ہے' وہ مجھے حاصل کرنے میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔''

جنرل کی بیوی نے جانتا کے یہ تیور دیکھے تو خاموش رہی لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ لڑکی کا یہ عزم آزمائے گی ضرور، چنانچہ اس نے آکر بیٹے کو بتایا۔

''سنو بیٹے! معاملہ سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ بس ذرا تمہاری صحت بہتر ہو جائے تو میں کسی دن اسے تمہارے کمرے میں بھیج دوں گی اور پھر باقی سب کچھ تم پر منحصر ہے کہ تم اسے کس طرح رام کرتے ہو۔ بظاہر یہ بات بڑی بری اور تکلیف دہ دکھائی دیتی ہے کہ میں تمہارے لیے دلالہ یا کٹنی کا کردار ادا کروں لیکن خیر مجھے تمہاری زندگی اور خوشیاں دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز ہیں۔''

ماں کی ان باتوں سے نوجوان مایوس ہو گیا اور اس کی حالت پھر خراب ہونے لگی۔

ایک بار پھر اس کی ماں نے جانتا سے اس بارے میں کھل کر بات کی لیکن لڑکی کا ارادہ پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ سخت معلوم ہوتا تھا۔ آخر تنگ آکر وہ اپنے شوہر کے پاس چلی گئی اور تمام حالات سے اسے مطلع کیا لیکن اس کا شوہر ایک ایسی لڑکی کے ساتھ، جس کے خاندان اور نسل کا کوئی پتا نہ ہو، اپنے لڑکے کی شادی پر تیار نہ تھا۔ البتہ لڑکی کو بیٹے کی داشتہ بنا کر رکھنے میں اسے کوئی اعتراض نہ تھا لیکن جب اسے یہ خدشہ ہوا کہ اس کا بیٹا کنوارا ہی اس دنیا سے سدھار جائے گا تو وہ مجبوراً اس شادی پر رضامند ہو گیا۔

باپ نے جیسے ہی اپنی رضامندی کا اظہار کیا جانتا سے اس نوجون کی شادی کر دی گئی۔ اب لڑکی بہت خوش تھی کہ اتنی طویل اور دکھ بھری زندگی کے بعد اسے پُرمسرت ازدواجی زندگی نصیب ہو گئی لیکن اتنے بڑے گھرانے کی بہو بن جانے کے بعد بھی اس نے کبھی یہ کوشش نہ کی کہ اپنی اوقات بھول کر بات کرے۔

☆☆☆

ادھر پیروتو جس نے شاہ برطانیہ کے ایک دوسرے جنرل کے گھر پرورش پائی تھی اب ایک بانکا سجیلا جوان بن چکا تھا۔ اس کی وجاہت، بہادری اور شمشیر زنی کے قصے تمام ویلز میں زبان زدِ عام تھے اور پورے جزیرے میں اس جیسا حسین اور خوبرو نوجوان کوئی نہ تھا۔ جس طرح تقدیر نے معصوم جانتا کو نظر انداز نہ کیا تھا، بالکل اس طرح اس نوجوان پر بھی مہربان تھی۔ اس دوران ویلز میں اچانک طاعون کی وبا پھوٹ پڑی، جزیرے کی آدھی آبادی اس وبا کا شکار ہو گئی، جو لوگ باقی بچے، ان میں سے بیشتر جزیرے سے بھاگ کر دوسری جگہوں پر پناہ گزیں ہو گئے۔ خود وہ نیک دل جنرل اور اس کا پورا کنبہ جس نے پیروتو کی پرورش کی تھی اس وبا کا شکار ہو گیا۔ جنرل کے گھر میں جو لوگ اس وبا سے محفوظ رہے ان میں پیروتو کے علاوہ جنرل کی ایک نوجوان بیٹی اور چند نوکر چاکر تھے۔

وبا کے خاتمے پر اس لڑکی نے دوسرے زندہ بچ جانے والے لوگوں کے مشورے سے پیروتو سے شادی کر لی اور اس طرح ویلز کے جزیرے میں بے سہارا اور بے آسرا داخل ہونے والا نوجوان ایک برطانوی جنرل کے کثیر ترکے کا واحد مالک بن چکا تھا۔

شاہ برطانیہ کو اس جنرل کی موت کی خبر ملی تو اس نے پیروتو کی جوانمردی کی شہرت سن کر اسے آنجہانی جنرل کی جگہ ریزروفوج کا جنرل مقرر کر دیا۔

☆☆☆

انٹورپ کے سردار والٹر کو فرانس چھوڑے ہوئے اٹھارہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے سارے مصائب اور آلام نہایت بہادری اور خندہ پیشانی سے برداشت کیے تھے، وہ ایک نہایت معمولی آدمی کی حیثیت سے آئرلینڈ

میں زندگی گزار رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ بچوں کی خیریت معلوم کی جائے، اب سردار بہت بوڑھا ہو چکا تھا۔ ہاتھ کھردرے ہو گئے تھے۔ سخت محنت اور مشقت کی وجہ سے بازو فولاد کی مانند سخت اور ٹانگیں بہت مضبوط ہو گئی تھیں۔ پھر بھی چہرے پر بڑھاپے کے آثار بہت گہرے تھے۔

پہلے وہ ویلز پہنچا تو پتا چلا کہ اس کا بیٹا پیروتو شاہ برطانیہ کا بہت بڑا فوجی جنرل بن چکا ہے، اس کے پاس دولت کے انبار ہیں اور نہایت خوش حال زندگی گزار رہا ہے۔ معلوم کر کے اسے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا، لیکن وہ پیروتو کے سامنے خود کو اس وقت تک نہیں لانا چاہتا تھا جب تک کہ اپنی پیاری بیٹی جانتا کا حال معلوم نہ کر لے۔ ویلز سے وہ لندن پہنچا اور یہاں آکر اس نے اس عورت کا پتا معلوم کیا جس کے سپرد اس نے اپنی بیٹی کی تھی، وہ جب اس محل میں پہنچا، جہاں وہ خاتون رہتی تھی تو اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ اس کی بیٹی کی شادی اس نیک دل خاتون کے لڑکے سے ہو چکی ہے۔ اسے اپنی زندگی کے جملہ آلام ومصائب اپنے بچوں کی کامیابی کے مقابلے میں نہایت معمولی معلوم ہوئے، اس نے اپنی لڑکی کو دیکھنے کے لیے فقیر کے بھیس میں اس کے گھر کے چکر لگانے شروع کر دیے۔

اس حالت میں ایک دن اس کی ملاقات لڑکی کے شوہر سے ہو گئی۔ لڑکی کا شوہر دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ اس نے جو اس بوڑھے کو اس خستہ حالی میں دیکھا تو اسے بڑا رحم آیا۔ نوکر کو آواز دے کر حکم دیا کہ اس فقیر کو گھر کے اندر لے جائے اور اسے کھلائے پلائے۔ نوکر نے حکم کی تعمیل کی۔

اب جانتا کے کئی بچے تھے اور یہ سب خوبصورت اور صحت مند تھے۔ سب سے بڑے بچے کی عمر نو سال تھی۔ انہوں نے جو بوڑھے فقیر کو کھانا کھاتے دیکھا تو اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے اور اس سے کھیلنے لگے، ان کی بھولی بھالی حرکتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ نہ جانے کب سے بوڑھے کو جانتے ہیں یا پھر شاید کسی غیبی طاقت نے ان کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ ان کا نانا ہے۔

بوڑھے کو جب پتا چلا کہ یہ اس کے نواسے ہیں تو اس نے انہیں خوب لپٹا لپٹا کر پیار کیا اور بڑی شفقت سے پیش آیا۔ بچوں کے استاد یا اتالیق کو یہ بات شاید پسند نہ آئی کہ اتنے بڑے گھرانے کے بچے ایک فقیر سے اس قدر بے تکلف ہوں۔ اس نے انہیں آواز دینی شروع کر دی.... بچوں کے ماں باپ باہر نکل آئے اور انہوں نے بچوں کو ڈانٹا کہ اگر انہوں نے اتالیق کی بات نہ مانی تو پٹائی ہو گی۔ لیکن بچے اڑے رہے۔ سب سے بڑا لڑکا کہنے لگا۔

''ڈیڈی! یہ بابا تو بہت اچھے ہیں، یہ تو ماسٹر صاحب سے بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔''

''ڈیڈی! انہیں گھر میں رکھ لیجیے نا۔'' لڑکی ٹھنکی۔

''ہاں ڈیڈی! رکھ لیجیے نا۔ دیکھیے نا کتنے پیارے ہیں، یہ بابا ہم سے بہت پیار کرتے ہیں۔'' لڑکے نے اور زیادہ اصرار کیا۔ بچوں کی ان بھولی بھالی باتوں پر بوڑھا سردار اور جانتا دونوں ہنس پڑے۔ جب جانتا اس کے سامنے آئی تو بوڑھا اس کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ اس وقت وہ اس کا باپ نہیں ایک فقیر تھا۔ لیکن مطمئن تھا اور مسکرا رہا تھا کہ اس کی بچی آخر اتنے کٹھن دن دیکھنے کے بعد اپنی منزل پا چکی ہے۔ لیکن لڑکی اپنے باپ کو نہ پہچان سکی تھی۔ بھلا کہاں اٹھارہ سال پہلے کا سرخ وسفید صحت مند سردار اور کہاں یہ سوکھا پتلا، مدقوق ہڈیوں کا ڈھانچا۔ زمین آسمان کا فرق تھا۔ ماں نے بچوں کو مچلتے دیکھ کر ان کے اتالیق کو ہدایت کر دی کہ وہ ان سے اس بوڑھے کے معاملے میں زبردستی نہ کرے۔

یہ شور وشغب سن کر بچوں کا دادا بھی وہیں آ گیا۔ اس سے اتالیق نے بچوں کی شکایت کر دی۔ وہ جانتا کو پہلے ہی ناپسند کرتا تھا، کہنے لگا۔

''چھوڑو جی' جیسی روح ویسے فرشتے، ماں کی طرف سے یہ فقیروں کی اولادیں، بھلا فقیروں اور بھک منگوں کو پسند نہ کریں گی تو اور کسے کریں گے؟''

یہ حقارت آمیز گفتگو سن کر سردار والٹر کا دل خون ہو کر رہ گیا لیکن قہر درویش بر جان درویش، کرتا کیا؟ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا اور سوچ لیا کہ اب تک جہاں اتنی ذلت برداشت کی ہے وہاں یہ اور سہی۔

بچوں کے باپ کو بھی یہ دیکھ کر بے حد دکھ ہوا کہ اس کے بچے ایک بھک منگے کو اپنے گھر میں رکھنا چاہتے ہیں لیکن وہ بچوں سے اس قدر محبت کرتا تھا کہ اسے ان کا ہر مطالبہ منظور تھا لیکن ان کی دل آزاری منظور نہ تھی۔ چنانچہ خادم کو بلا کر حکم دیا کہ اگر یہ بوڑھا ان بچوں میں رہنا چاہے تو اسے محل میں نوکر رکھ لیا جائے۔

جب بوڑھے کے سامنے ملازمت کی پیش کش کی گئی تو بوڑھے نے فوراً بچوں کے باپ جیاشیتو سے کہا۔ ''کیوں نہیں، میں تندرست اور توانا ہوں، اگر مجھے حضور ملازمت

دیں گے تو کیوں نہ کروں گا۔ کون نہیں چاہتا کہ اپنے قوتِ بازو سے حاصل کی ہوئی روزی پر گزر بسر کرے لیکن افسوس کہ میں حضور کے گھوڑوں کی نگہداشت کے سوا کوئی اور خدمت نہ انجام دے سکوں گا۔"

بوڑھے کا یہ جواب سن کر نوجوان مسکرایا۔ "اچھا تو دیکھو ہمارا ایک عربی النسل گھوڑا تمہاری تحویل میں رہے گا۔ ہم نے ابھی کچھ دنوں پہلے خریدا تھا۔ تم اس کی دیکھ بھال کرو گے۔"

بوڑھے نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں دن رات ایک کر دیا، کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ بچوں کے ساتھ کھیلتا۔ وقت کے ساتھ بچے اس سے زیادہ مانوس ہوتے چلے جا رہے تھے اور نوکر اور خدام بھی اس کی شریفانہ اور صاف ستھری عادتوں کے گرویدہ تھے۔ وہ لوگ بھی اپنا اپنا کام ختم کر کے اس کے گرد جمع ہو جاتے اور اس طرح ایک دوسرے کا دکھ درد سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کرتے رہتے۔

ادھر تو جلاوطن سردار اپنی زندگی کے دن اس طرح پورے کر رہا تھا۔ ادھر شاہ فرانس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے نے سنبھال لی۔ مرنے سے پہلے فرانس کے بادشاہ نے جرمنوں سے متعدد معاہدے کر لیے تھے۔ جرمنوں سے کیے جانے والے عارضی صلح نامے کی مدت اب ختم ہو چکی تھی۔ اس لیے نئے بادشاہ نے جرمن کے خلاف شدید جنگ شروع کر دی اس موقع پر شاہ برطانیہ نے جو شاہ فرانس کا رشتہ دار تھا فرانس کی مدد کے لیے انگریز فوج بھیجی۔ اس فوج کی کمان پیروتو اور جیاشیتو کے ہاتھوں میں تھی۔

جیاشیتو کے ساتھ سردار والٹر بھی اس کے ایک سائیس کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہوا۔ اسے ابھی تک کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ میدانِ جنگ میں آ کر جیاشیتو پر اس کے حقیقی جوہر کھلے کیونکہ وہ ایک بہادر سپاہی اور اعلیٰ درجے کا جنگی ماہر ثابت ہو رہا تھا۔ فوج کو کس طرف سے آگے بڑھایا جائے، کہاں سے پیچھے ہٹایا جائے۔ دشمن کو کس مقام پر اور کیسے گھیرا جائے، کہاں سے پیچھے ہٹا جائے۔ یہ تمام فیصلے کرتے وقت جیاشیتو اپنے اس سائیس کی رائے ضرور جاننا چاہتا اور جب بھی اس کے مشورے پر عمل کرتا کامیاب رہتا۔

ادھر تو شاہ فرانس جرمنوں سے مصروفِ پیکار تھا۔ ادھر اس کی ملکہ شدید بیمار تھی۔ جب بچنے کی کوئی آس نہ رہی تو اس نے رون کے آرک بشپ کو بلوایا۔ آرک بشپ سارے فرانس میں روحانیت کے نقطہ نظر سے اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ بشپ کے سامنے ملکہ نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور اپنے کرتوت بخشوائے، گناہوں کے اعتراف کے دوران اس نے وہ واقعہ بھی بیان کر دیا جو اس کہانی کی ابتدا میں بیان کیا جا چکا ہے۔

ملکہ نے موقع پر موجود امراء، اور وزراء سے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بے چارے سردار انتورپ بے وجہ فرانس سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور نہ معلوم اب زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ اگر وہ کہیں زندہ بھی ہیں تو معلوم نہیں کس حال میں ہوں اور ان کے بچوں کا کیا بنا ہو؟"

اس نے حاضرین سے درخواست کی کہ اگر اس کی موت واقع ہو جائے تو وہ بادشاہ سے درخواست کریں کہ سردار والٹر اور ان کے بچوں کا پتا چلایا جائے اور انہیں ان کی چھینی ہوئی املاک واپس کی جائے اور ان کا وقار فرانس میں بحال کیا جائے تاکہ میری روح کو دوسری دنیا میں سکون مل سکے۔"

یہ پیغام دینے کے چند دنوں بعد ملکہ چل بسی۔

☆☆☆

یہ انکشاف اس قدر اچانک اور غیر متوقع تھا کہ بادشاہ کے تمام مصاحبین انگشت بدنداں رہ گئے۔ آناً فاناً یہ خبر پورے فرانس میں مشہور ہو گئی۔ ہر شخص کی زبان پر انتورپ کے جلاوطن سردار والٹر کا ذکر تھا۔

اڑتی اڑتی یہ خبر جب بادشاہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے فوراً پورے فرانس اور دوست ملکوں میں اعلان کر دیا کہ جو شخص بھی سردار والٹر اور اس کے بچوں کے بارے میں بادشاہ کو اطلاع بہم پہنچائے گا یا انہیں پیش کرے گا تو اسے کثیر رقم انعام میں دی جائے گی۔

بادشاہ کو دکھ تھا کہ اتنا وفادار شخص اس کی ملکہ کی بے راہ روی کے سبب چھن گیا۔ اگر وہ جنگ میں اس کے ساتھ ہوتا تو اس کے مشورے اس کی ہمت بندھاتے۔

سردار انتورپ نے جب خود یہ اعلان سنا اور اسے اس کی صحت پر یقین ہو گیا تو وہ جیاشیتو کے پاس پہنچا اور کہا۔ "حضور! اگر آپ خادم کے ساتھ جنرل پیروتو کے پاس چلنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو یہ خادم بتا دے گا کہ سردار والٹر اور اس کے بچے کس حال میں ہیں؟"

حیرت سے جیاشیتو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور بوکھلاہٹ کے انداز میں وہ تقریباً دوڑتا ہوا سردار کے ساتھ

جنرل پیروتو کے کیمپ تک آیا۔ جب کیمپ میں پہنچا تو پیروتو جیاشیو سے اس کی آمد کے بارے میں سوال کرنا ہی چاہتا تھا کہ سردار نے وقت ضائع کیے بغیر کہنا شروع کیا۔ "پیروتو سنو، جیاشیتو نے تمہاری بہن سے شادی کی تھی تو اسے باپ کی طرف سے کوئی جہیز نہ ملا تھا۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ صرف جیاشیتو کو بادشاہ سے ملنے والی کثیر رقم کا حقدار ہونا چاہیے اور یہ مذکورہ رقم بادشاہ کو سردار انتورپ کے بارے میں بتا کر حاصل کریں گے۔ اور پیروتو..... سردار انتورپ کے بیٹے ہو۔"

پھر بوڑھے نے سر جھکا کر کہا۔ "میں سردار انتورپ ہوں۔ اور واملکٹ مسز جیاشیتو تمہاری بہن ہے۔ تمہارا اصل نام لوئی ہے تم وہ وقت یاد کرو جب میں تم دونوں بہن بھائی کو کندھوں پر سوار کر کے لندن لے کر آیا تھا اور میں نے مصلحتاً تم دونوں کے نام بدل دیئے تھے۔"

سردار کی باتیں سن کر پیروتو کے چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا رہا۔ اس نے غور سے جھریوں بھرے بوڑھے چہرے اور سخت کھردرے ہاتھوں، تنی ہوئی گردن اور سیدھی کمر کو دیکھا تو اٹھارہ بیس سال پہلے کے واقعات اس کے ذہن میں تصویر کی طرح گزرتے چلے گئے۔ اور پھر وہ بوڑھے کے قدموں میں گر پڑا اس کی ہچکی بندھ گئی، اور وہ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گیا کہ آواز نہ نکلتی تھی، وہ بڑی دیر تک اس عالم میں پڑا رہا۔

بوڑھا خود بھی کھڑا رو رہا تھا لیکن خوشی اور غم کے امتزاج نے بوڑھے کے بازوؤں کی قوت بھی وقتی طور پر سلب کر لی تھی جسے استعمال کر کے وہ اپنے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا سکتا۔ بہت دیر تک دونوں اس عالم میں رہے۔ خود جیاشیتو حیران تھا کہ ایسے موقع پر کیا کرے، آخر وہ آگے بڑھا اور اپنے سالے لوئی یعنی پیروتو کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ جب تینوں کے حواس بجا ہوئے تو پیروتو نے کہا۔ "اف خدایا! میں سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ آپ کی یہ حالت بنے گی۔"

پھر جب جیاشیتو کو اس سلوک کا احساس ہوا جو اس نے اپنے اس بزرگ کے ساتھ دورانِ ملازمت روا رکھے تھے تو شرم سے پانی پانی ہو گیا اور قدموں میں گر کر معافی مانگنے لگا۔ والٹر نے فراخ دلی سے اسے معاف کر دیا اور اپنے سینے سے لگا کر دعائیں دیں۔ وہ دیر تک ایک دوسرے کے حالات سے واقفیت حاصل کرتے رہے۔ جب باتیں کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تو جیاشیتو اور پیروتو کے مابین مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ ان بڑے میاں کو ڈھنگ کا لباس پہننے کو دیا جائے لیکن سردار نے عمدہ لباس پہننے سے انکار کر دیا اور خواہش ظاہر کی کہ پہلے جیاشیتو بادشاہ سے اپنا انعام حاصل کرے اور اس کے بعد اسے اس حال میں جس حال میں وہ اس وقت ان کے سامنے ہے دربار میں پیش کرے تاکہ بادشاہ عبرت پکڑے اور آئندہ کسی کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرے۔

اس کے بعد یہ تینوں بادشاہ کے حضور پہنچے۔ جیاشیتو نے بادشاہ سے انعام کا مطالبہ کیا تو جواب میں اس کے سامنے دولت کے ڈھیر لگا دیئے گئے اور حکم ہوا کہ فوراً سردار والٹر اور اس کے بچوں کو پیش کیا جائے۔ جیاشیتو فوراً پیروتو اور اپنے سائیس کی طرف مڑا اور کہنے لگا۔ "حضور والا باپ بیٹے تو یہ رہے، اور سردار صاحب کی بیٹی میری بیوی ہے اور اگر خدا نے چاہا تو جلد ہی اسے بھی دربار میں پیش کروں گا۔"

سردار فوراً ہی بادشاہ کے قدموں میں گر پڑا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بادشاہ نے بوڑھے سردار کو اپنے قدموں سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا... اور بدسلوکی کی معذرت چاہی، اس کے بعد پیروتو کی طرف مڑا اور اسے بھی گلے سے لگا کر دوستانہ انداز میں پیٹھ تھپتھپائی پھر اس نے حکم دیا کہ سردار والٹر کو فوراً اس کے شایانِ شان پوشاک اور سواری کے لیے گھوڑا فراہم کیا جائے اور وہ تمام مراعات عطا کی جائیں جو انہیں پہلے حاصل تھیں۔ پھر حکم ہوا کہ سردار کی تمام املاک اور دولت جو فرانس میں سردار کی جلاوطنی کے بعد رہ گئی تھی۔ اور جس پر حکومت نے قبضہ کر لیا تھا انہیں فوراً واپس کی جائے، ان احکامات سے فارغ ہو کر اس نے تینوں کے حالات تفصیل سے دریافت کیے۔

سردار نے اپنے داماد جیاشیتو سے کہا۔ "دیکھو تمہیں جو دولت بادشاہ سے انعام میں ملی ہے وہ میری طرف سے میری بیٹی کا جہیز ہے اور اپنی والدہ اور والد سے کہہ دینا کہ ان کے پوتی پوتے اپنے ماں باپ کی طرف سے کسی فقیر یا نچلے گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے۔"

جیاشیتو اور پیروتو اپنی اپنی بیویوں کو لے کر پیرس آ گئے۔ سب لوگ سردار سے مل کر بے حد خوش تھے۔ اب ایک بار پھر سردار کے عروج کا دور شروع ہو چکا تھا اور سردار کو اب پہلے سے بھی زیادہ اثر و رسوخ اور اقتدار حاصل ہو چکا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم انڈسٹری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں۔ لیکن جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بڑی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بھی، کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی دسویں کڑی

ازمیر ترکی کا ایک اہم اور تاریخی شہر ہے۔ عیسائیوں کے لیے اس کی حیثیت ایک متبرک مقام جیسی ہے، ازمیر شہر کے نزدیک ہی ایک پہاڑی پر بہت سے قدآور اور سرسبز درخت لگے ہوئے ہیں۔ اس پہاڑی پر پھیلے درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی عبادت گاہ ہے۔ خان صاحب کا کہنا تھا کہ اس پرانی تاریخی عمارت کو نہ دیکھیں۔ اس ویران جگہ پر بھلا کون رہتا ہے جہاں آمد و رفت بھی بہت مشکل ہے۔ مگر بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ اس عمارت کو بھی دیکھ لیا جائے کہ ہم پاکستان واپس جا کر سب کو بتا سکیں کہ ہم نے ترکی کا چپّا چپّا دیکھ لیا ہے۔

ہم نے کہا۔ ''بٹ صاحب ترکی بہت بڑا ملک ہے۔ ہم اس کا چپّا چپّا تو کئی ماہ میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر میں سوار ہو کر ترکی کا ایک طائرانہ جائزہ لے لیں جیسے ہمارے وزیر اور سفیر دورہ کرتے ہیں۔ پھر ہم بڑے وثوق سے کہہ سکیں گے کہ ہم نے ترکی کا چپّا چپّا دیکھ لیا ہے۔

بٹ صاحب کے اصرار پر ہم لوگ اس چھوٹی سی پہاڑی پر گئے۔ اس ٹیلا نما پہاڑی پر ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا حالانکہ ازمیر اتنا سرسبز شہر نہیں ہے۔ اس کے چاروں طرف خشک پہاڑیاں ہیں جن پر سبزہ نہیں اگتا۔ یہ ایک نیم پہاڑی علاقہ ہے مگر اس پہاڑی اور اس کے اردگرد کا علاقہ سبزے سے بھرا ہوا ہے۔ یہ درخت کافی پرانے نظر آتے ہیں لیکن ابھی تک سرسبز ہیں۔

پاس گئے تو یوں لگا جیسے کسی عبادت گاہ کے سامنے کھڑے ہیں۔ آس پاس تو دور دور تک کوئی شخص نہ تھا مگر شاید ہم لوگوں کی گفتگو سن کر ایک راہبانہ لباس میں ملبوس صاحب نمودار ہوئے۔ نزدیک پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ ایک راہب ہی ہیں اور اس عبادت گاہ کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔

ان صاحب نے خالص ترکی زبان میں بات چیت شروع کی۔ ہم سب تو فیل ہو گئے لیکن مرزا اشرف نے ان کے ساتھ ترکی زبان میں گفتگو کی۔ مرزا اشرف دراصل ترکی میں کئی سال سے مقیم ہیں ترکی جانتے تو ہیں مگر اتنی کہ کام چلا لیتے ہیں۔

راہب ساٹھ ستر سال کے تھے۔ سفید ڈاڑھی اور سفید راہبانہ لباس کی وجہ سے عبادت گار بھی لگتے تھے۔

ہمارے کہنے پر مرزا اشرف نے ان سے پوچھا کہ اس ویران جگہ پر آپ نے جو عبادت گاہ بنائی ہے کیا کوئی یہاں عبادت کرنے بھی آتا ہے؟

جواب میں انہوں نے یہ کہہ کر ہمیں حیران کر دیا کہ یہ کوئی گرجا گھر نہیں ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت مریم نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے اور یہیں وفات

پائی تھی۔ اس لحاظ سے تو یہ بہت پرانی عمارت ہونی چاہیے تھی مگر غالباً اس کی مرمت اور دیکھ بھال کی وجہ سے یہ بہت اچھی حالت میں تھی۔ عبادت گاہ کا کوئی ایک حصہ بھی شکستہ نہیں تھا۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا جیسے یہ تیس چالیس سال پرانی عمارت ہے۔

ہم نے کہا کہ اس اعتبار سے تو یہ مسیحوں کے لیے سب سے مقدس عمارت ہے مگر یہ تو سنسان اور ویران نظر آتی ہے۔

راہب نے جواب دیا کہ عام طور پر یہاں بیرونی سیاح آتے ہیں اور اس عمارت کی تصاویر اتارتے ہیں۔ عمارت کے اندر وہ کمرا ابھی اسی حالت میں موجود ہے جب حضرت مریم اس میں رہا کرتی تھیں۔

ان کا یہ انکشاف ہم سب کے لیے بھی حیران کن تھا کیونکہ حضرت مریم کی مسلمان بھی عزت کرتے ہیں اور انہیں ایک معتبر ہستی کا درجہ دیتے ہیں۔ پادری صاحب نے بتایا کہ اس عمارت کی دیکھ بھال پر چار افراد مامور ہیں جو سب کے سب مرد ہیں۔ عبادت گاہ کے اخراجات ایک مشن برداشت کرتا ہے۔

بٹ صاحب کا اصرار تھا کہ ہمیں اندر سے بھی یہ عمارت دیکھنی چاہیے۔ کم از کم حضرت مریم کا کمرا تو دیکھ ہی لیں۔ مگر ہم نے محسوس کیا کہ پادری صاحب ہمیں یہ کمرا دکھانے کے خواہش مند نظر نہیں آتے تھے۔

بہرحال خان صاحب نے اس عمارت کی باہر ہی سے مختلف زاویوں سے تصاویر بنائیں۔

بٹ صاحب کا کہنا تھا کہ عبادت گاہ کے سامنے ہم سب کی تصویر بھی بنانی چاہیے تاکہ سند رہے اور لوگ یقین کر لیں کہ واقعی ہم اس عبادت گاہ میں گئے تھے۔

مرزا اشرف بولے ''لیکن اس کا ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اس عمارت میں حضرت مریم نے اپنی زندگی کے آخری ایام گزارے تھے۔''

پادری صاحب خوش مزاج نظر آتے تھے۔ وہ سمجھے کہ ہم لوگ تصویریں بنوانے پر جھگڑ رہے ہیں کہ کون تصویر میں شامل ہو اور کون نہ ہو۔

انہوں نے فوراً پیشکش کر دی کہ وہ ہم سب کی تصاویر بنا دیں گے اس طرح سب لوگ تصویر میں ایک ساتھ نظر آجائیں گے۔ ہم نے ان کی محبت بھری پیشکش قبول کر لی۔ اس طرح سب کی تصویر بنائی گئی مگر اس وقت خیال ہی نہ رہا کہ تصویر کو سنبھال کر رکھا جائے۔ یہ کیمرا بٹ صاحب کے پاس رکھوایا گیا تھا مگر جب ہوٹل پہنچ کر دیکھا تو کیمرا ہی غائب تھا۔ اس طرح یہ تاریخی تصویریں غائب ہو گئیں لیکن اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

عمارت کا نقشہ آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم نے حضرت مریم کی آخری رہائش گاہ بھی دیکھ لی۔ اس بات پر مسیحی یقین رکھتے ہیں مگر اس میں کتنی حقیقت ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

اگلے دن ہم لوگوں کو پروگرام کے مطابق یاموکلے (اگر نام میں غلطی ہوجائے تو معاف کیجیے گا کیونکہ ترک لکھتے کچھ ہیں اور بولتے کچھ اور ہی ہیں۔ راستے میں ہمارے ڈرائیور نے (جو انگریزی میں سدھ بدھ رکھتا تھا) ہمارے کہنے پر اپے سس کے کھنڈر بھی دکھا دیے۔ یہ جگہ ضلع ازمیر کی حدود میں ہے۔ جس کی تاریخ چھ ہزار قبل مسیح ہے۔

بٹ صاحب اس بات پر بہت بڑبڑایا کرتے تھے کہ اس ملک میں ہر چیز ہزاروں سال پرانی کیوں ہے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چھ ہزار سال پہلے کی عمارت کے یہ کھنڈر ہیں تو اس کا ثبوت کیا ہے کہ واقعی یہ چھ ہزار قبل مسیح سے تعلق رکھتے ہیں۔

آپ ذرا حساب لگا کر دیکھئے کہ چھ ہزار سال قبل کی خبر کی تصدیق کا ذریعہ کیا ہے۔ چھ ہزار سال قبل وہ کون شخص تھا جس نے یہ حساب لگایا ہے اور اس کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنے پرانے زمانے کی بات صرف اندازہ یا گپ شپ ہے۔ آج کل تو ایک سو سال پہلے کی بات یاد نہیں رہتی وہ کون آہنی دماغ انسان تھا جس نے چھ ہزار سال پہلے اس عمارت کی تاریخ لکھی اور کہیں چھپا کر رکھ دی۔

خان صاحب بولے ”بٹ صاحب ایسی جاہلانہ باتیں نہ کیا کریں۔ لوگ مذاق اڑائیں گے۔“

”بٹ صاحب نے جواب میں کہا۔ ”اچھا خان صاحب اگر آپ یہ بتا دیں کہ کس مہینے کی کس تاریخ کو آپ پیدا ہوئے تھے تو میں آپ کو پچاس ہزار ترکی لیرا دوں گا۔“

خان صاحب اپنا سر کھجانے لگے۔ ”مجھے تو یاد نہیں مگر ہمارے خاندان میں ہر بچے کی تاریخ پیدائش اور وقت لکھ لیا جاتا ہے۔“

”یعنی خود آپ کو یاد نہیں؟“

”کچھ ٹھیک سے نہیں یاد رہا۔ نہ تاریخ، نہ دن، نہ مہینا، نہ وقت۔“

”خان صاحب آپ کو تو اپنی تاریخ پیدائش تک یاد نہیں اور چھ ہزار قبل ہونے والے واقعات پر آپ یقین رکھتے ہیں کہ جب پیدائش کی کوئی تاریخ ہی یاد نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ پیدا ہی نہیں ہوئے۔“

”کیا فضول باتیں کر رہے ہو۔ اگر میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا تو اس وقت آپ کے سامنے کون کھڑا ہے؟“

”کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کمال، جمال، الہ دین کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ خان صاحب ثبوت کے بغیر تو آپ کی پیدائش بھی مشکوک ہے۔“

”اب تم سے دماغ کون مارے۔“ یہ کہہ کر خان صاحب آگے چل پڑے۔ ”بھئی کوئی تو تاریخ ہوگی ورنہ میں پیدا کیسے ہوتا۔“

”جب جواب نہ ہو تو لوگ اسی طرح کہتے ہیں۔“

یہ شہر سکندر اعظم کے ایک جنرل نے آباد کیا تھا جس کے نام سے یہ آج تک جانا جاتا ہے۔

بٹ صاحب نے بہت تعریف کی۔ بولے۔ ”دیکھو یار، سکندر مقدونیہ کا رہنے والا تھا۔ وہ یونانی تھا اور کم عمری میں ہی اپنے والد کی موت کے بعد اس نے اپنی چھوٹی سی سلطنت کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس زمانے میں تو صرف گھوڑے اور خچر ہی استعمال کیے جاتے تھے۔ آج کل کی طرح پختہ سڑکیں تھیں نہ ائرپورٹ، ہوائی جہاز نہ کاریں۔ اس کے باوجود دنیا کے جس ملک جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اپنی فوج کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ شمالی علاقے فتح کرنے کے بعد اس نے ایران کا رخ کیا پھر ہندوستان پہنچ گیا۔ یورپ میں بھی وہ آیا تھا۔ اور اتنے بڑے کام کرنے کے بعد وہ صرف 32 سال کی عمر میں اچانک وفات پا گیا۔ میں تو سوچتا ہوں وہ عجیب و غریب آدمی تھا۔“

خان صاحب بولے۔ ”غریب تو وہ ہرگز نہیں تھا، جو شخص آدھی دنیا کو فتح کرے آپ اس کو غریب کیسے کہہ سکتے ہیں۔ البتہ اسے عجیب ضرور کہا جاتا ہے۔“

مرزا اشرف نے کہا۔ ”اگر سکندر کی کھوپڑی مل جاتی تو سائنسدان ریسرچ کر سکتے تھے کہ یہ کس قسم کا دماغ ہے۔“

”بھئی، یہ ترک تو شروع سے ہی ذہین اور میتھمیٹک کے ماہر تھے۔“ بٹ صاحب بولے۔

”آپ نے یہ کیسے جانا؟“

”اب دیکھ لو۔ زمین کے نیچے انہوں نے شہر بنا رکھے ہیں۔ آج کل تو یہ راستے استعمال نہیں ہوتے ہوں گے مگر اس زمانے میں یہ بہت کارآمد ہوتے ہوں گے۔“

واقعی آج سے سیکڑوں سال قبل اس طرح کے کام وہی لوگ کر سکتے ہیں... جو عام لوگوں کو آسانیاں پہنچانا چاہتے ہوں گے اور ان کے لیے روزمرہ کے مسائل کو آسان کرنے کے خواہش مند ہوں گے۔ زیرزمین اتنی طویل سرنگ بنا دینا جس میں روشنی اور ہوا کا بھی گزر ہوسکے اتنے طویل عرصے پہلے کے انجینئروں کے لیے ایک کارنامے سے کم نہ ہوگا۔ آج کل جدید ترین آلات کی مدد سے جو تعمیرات کی جاتی ہیں وہ اتنی زیادہ حیران کن نہیں ہیں لیکن صدیوں پہلے... جدید ترین آلات کے بغیر اس قسم کی تعمیرات کرنا انسانی عقل سے بالاتر ہے۔ مثال کے طور پر ایفل ٹاور کو دیکھیے، مصر میں بھاری بھرکم پتھروں کی مدد سے جو اہرام بنائے گئے ہیں آج کا انسان انہیں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ صدیوں پہلے ایسی عظیم الشان اور شاندار عمارتیں تعمیر کرنے والے انجینئر کس قدر ذہین اور قابل ہوتے ہوں گے۔ بٹ صاحب جب ہمارے ساتھ اہرام دیکھنے گئے تھے تو انہوں نے پرزور طریقے پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ صدیوں قبل ایسا کام کرنا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کام ضرور دیوزادوں سے کرایا ہوگا۔

ہم نے کہا۔ ”بٹ صاحب یہ اہرام مصر کے فرعونوں نے بنوائے ہیں۔ ان کے قبضے میں جن یا دیو نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے فوراً دلیل پیش کردی ”حضرت سلیمان علیہ السلام کو جن اور دیو پر برتری حاصل تھی۔“

خان صاحب نے مشورہ دیا کہ ان سے بحث کرکے بلاوجہ وقت ضائع نہ کیجیے۔ انہیں تو فرعونوں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا زمانہ بھی یاد نہیں ہے مگر بٹ صاحب بدستور اس بات پر قائم رہے کہ یہ کام انسانوں کا نہیں ہوسکتا۔ جن اور دیو ہی ایسے کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔

ازمیر ایک خوبصورت شہر ہے۔ سمندر تو ہم نے ترکی میں ہر جگہ دیکھا۔ کہیں وسیع سمندر اور کہیں اس کا حصہ آپ کو کہیں نہ کہیں نظر آجاتا ہے۔ ایک زمانے میں ہمیں شوق تھا کہ سمندر دیکھیں۔ پاکستان میں اور یورپ میں تو ہم نے سمندر دیکھا۔ انگلستان بھی ایک ایسا ملک ہے جہاں چند میل چلنے کے بعد یہ ممکن ہی نہیں کہ سمندر آپ کو نظر نہ آئے۔ لیکن ترکی میں ہم نے اتنا زیادہ سمندر دیکھا کہ زندگی بھر کی حسرت پوری ہوگئی ہے۔ یہاں سمندر کا رنگ گہرا سبز ہوتا ہے۔ ازمیر کا سمندر بھی اسی رنگ کا تھا لیکن یہ مکمل سمندر نہیں تھا۔ شہر کے حصے سے دوسرے حصے کو جاتے ہوئے یہ سمندر کا مختصر سا ٹکڑا یا کھاڑی نظر آجاتی تھی۔

ازمیر میں سمندر زیادہ اچھا لگتا ہے کیونکہ یہاں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ
فروری 2014ء کی سرخیزی
جاسوسی کے شمارے کی حرارت انگیزی

پہلی سوغات ● انسانی اور انسانیت کو ختم کردینے والے دشمنوں کی لرزہ خیز داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی فکر انگیز حقیقت نگاری
گرداب ● واقعات کے نئے گرداب میں گرفتار کرداروں کا آغاز و انجام اسما قادری کا سلسلہ
جواری ● احمد اقبال کے شربار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز
مغرب کے نرالے انداز ● مغرب کی تہذیب اور ماحول کی عکاس جرم اور محبت کی ناقابل فراموش کہانیاں
سرورق کی کہانیاں
پہلی کہانی ● وطن سے دور دیارِ غیر میں رونما ہونے والے سنسنی خیز حادثات کی پرتجسس کہانی، کاشف زبیر کی شمولیت
دوسری کہانی ● پراسرار اور انہونی کہانیوں کے خالق سرور اکرم کی ایک اور شاہکار سرورق کہانی
چیلی نکتہ چینی
آپ کے تبصرے... مشورے... محبتیں... شکایتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کتھائیں

استنبول کی طرح سبزہ زار اور خوبصورت درخت زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ خشک پہاڑیاں ہیں۔ خدا کی قدرت سے اگر کہیں سمندر نظر آجائے تو یہ آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ ازمیر کے سفر کا پروگرام خان صاحب نے پہلے ہی طے کرلیا تھا۔ ہم نے یہاں قدیم ترین یادگار عمارتیں دیکھیں۔ بیماریوں کو ختم کرنے والے پانی کے چشمے دیکھے۔ قدیم زمانے کے قلعے دیکھے مگر ٹوٹا پھوٹا کوئی نہ دیکھا۔ ترکوں نے سیکڑوں بلکہ ہزاروں سال پرانی یادگاروں کو اس طرح سنبھال کر اور سجا کر رکھا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اتنا زیادہ پرانا ہے۔ ہمارے یہاں تو ہم شالیمار باغ اور شاہی قلعے کو کھنڈر بنانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان یادگاروں کے آس پاس نوسیدہ سی بستیاں آباد ہوگئی ہیں جس کی وجہ سے ان کا رقبہ سکڑتا جارہا ہے۔ جہاں تک عمارتوں کی مرمت کا کام ہے یہ تمام سال جاری رہتا ہے اور اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو عمارتیں ناپید ہوجائیں گی مگر مرمت کرنے والے مزدور پھر بھی مصروف رہیں گے۔ کبھی کسی افسر نے جاکر یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ شاہی قلعے جتنی وسیع وعریض اور عظیم الشان عمارت کے لیے دو چار مزدوروں سے یہ کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ البتہ مزدور اپنے کام سے لگے رہیں گے خواہ قلعے کی عمارت رہے یا نہ رہے۔

سب سے پہلا مسئلہ ہوٹل میں کمرا حاصل کرنے کا تھا۔ ہم لوگ کیونکہ ایڈوانس بکنگ کرائے بغیر اچانک پہنچ گئے تھے اس لیے پہلے تو ٹیکسی والے کی خدمات حاصل کی گئیں جس نے ہر ہوٹل میں جاکر تین کمروں کی درخواست کی مگر کہیں نہ تھے

کسی نے بتایا کہ آپ دفتر اطلاعات سے رجوع کریں۔ یہ دفتر خاصا کشادہ تھا اور یہاں درجنوں سیاح بیٹھے تھے مگر ان کے مسائل حل کرنے والی صرف ایک خاتون تھیں، وہ ازحد مصروف تھیں۔ مختلف لوگ ان سے مختلف سوالات کررہے تھے۔ کوئی شہر کا نقشہ مانگ رہا تھا۔ کسی کو ہوٹل میں کمرا درکار تھا مگر وہ بڑی خوش مزاجی سے سب کے کام آرہی تھیں۔ پاس ہی ایک طشتری میں سینڈوچ بھی رکھے ہوئے تھے۔ جب موقع ملتا تو تھوڑا سا سینڈوچ چکھ لیتیں۔ لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ اس قدر مصروفیات کے باوجود وہ میک اپ درست کرنے کے لیے وقت ضرور نکال لیتی تھیں۔

خان صاحب نے اس پر اعتراض کیا تو بٹ صاحب نے کہا کہ خوبصورت نظر آنا، میک اپ درست کرنا ہر عورت کا پیدائشی حق ہے۔

"اگر پیدائشی حق ہوتا تو لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اس کا میک اپ کردیا جاتا۔" خان صاحب نے اعتراض کیا۔ "یا پھر وہ میک اپ کے ساتھ دنیا میں آتی مگر وہ تو جب دنیا میں آتی ہے تو روتی ہوئی آتی ہے۔"

"جی ہاں۔ اسی لیے وہ چیخ چیخ کر کہتی ہے میرا میک اپ کردو۔"

ازمیر میں زیادہ تر سڑکیں چوڑی نہیں ہیں۔ اگر یہ سڑکیں یا گلیاں ہمارے ملک میں ہوں تو چوبیس گھنٹے جام رہے اور کوئی کار اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکے۔ سب مل کر اتنے ہارن بجائیں کہ کاروں میں سوار لوگ اپنی کاریں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔

شہر میں داخل ہوتے ہی ایک کشادہ چوک نظر آتا ہے۔ یہ چوک نہیں ہے دراصل یہ آرکسٹرا ہال ہے جو ہر طرف سے کھلا ہوا ہے۔ سامنے سلیقے سے کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ یہاں اکثر آرکسٹرا کے مظاہرے کیے جاتے ہیں جنہیں دیکھنے اور سننے کا کوئی معاوضہ نہیں ہے۔ ہم شاید بتا چکے ہیں کہ ترک قوم موسیقی کی دلدادہ ہے۔ موسیقی کے پروگراموں میں خاندان کا بچہ، بوڑھا، مرد عورت سبھی شریک ہوکر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس چوک سے آگے پھر کچھ گلیوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ یہ گلیاں دراصل ایک بہت کشادہ اور خوبصورت راستہ ہے اس کو پھولوں اور درختوں سے سجایا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک ریونیو کے داخلے کا راستہ ہے۔ اس میں داخل ہونے کے لیے ایک بہت بڑا دروازہ ہے اس کو ہرکولیس گیٹ کہا جاتا ہے۔

بٹ صاحب بہت دیر سے خاموش تھے۔ اچانک بول پڑے۔ "اب آپ کہیں گے یہ گیٹ ہرکولیس نے بنوایا تھا۔"

ازمیر ہی نہیں سارا ترکی دراصل بذاتِ خود ایک تاریخ ہے۔ بقول بٹ صاحب کے یہاں تو نئی سے نئی چیز بھی کئی سو یا کئی ہزار سال پرانی ہے۔

"یہ عمارت کتنی پرانی ہے؟"

"جی یہ چار سو قبل مسیح کی ہے۔"

"اور یہ محل؟"

"جی، یہ کل چھ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔"

"بھائی ان کی مرمت اور آرائش کون کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو کئی لوگ برسوں تک اپنے گھروں پر

سفیدی تک نہیں کراتے۔"

جواب ملتا ہے "انہیں پرانی چیزوں سے پیار ہوگا۔"

اس سے آگے بڑھے تو پاموکھالے کے صحت بخش چشمے ہیں۔ ان چشموں کے پانی سے بے شمار لوگ تندرست ہوچکے ہیں۔ پاموکھالے کے نزدیک بہت بڑی لائبریری ہے، یہاں ہر وقت اس طرح لگتا ہے جیسے کوئی موسیقی کا پروگرام ہورہا ہے۔ یہاں پڑھنے والے آنے والوں سے کم نظر آتے ہیں۔ ان چشموں کا... پانی گڑھوں میں اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ جلدی بیماریوں کے مریض ان گڑھوں کے پانی میں غوطے لگاتے ہیں۔ بہت سے تندرست ہوجاتے ہیں لیکن ایسے بھی ہیں جو چشموں میں نہانے کے باوجود وفات پاجاتے ہیں۔ جو لوگ تندرست نہیں ہوتے اور مرجاتے ہیں ان کی قبریں آس پاس ہی بنادی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک بہت بڑا قبرستان بن گیا ہے۔

یونیسکو نے پاموکھالے کے چشموں کو دنیا کی یادگار جگہوں میں شامل کرلیا ہے۔

ابھی تک ہم نے کسی معقول ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ انتخاب ہمیں نہیں ہوٹل کو کرنا تھا کیونکہ ہوٹلوں میں کمرے خالی نہیں تھے۔ ہر جگہ یہی جواب ملتا تھا کہ آپ نے ایڈوانس بکنگ کیوں نہیں کرائی، ایڈوانس بکنگ کیا کراتے ہمیں تو یہی معلوم نہ تھا کہ ہم کہاں جائیں گے اور کہاں قیام کریں گے۔

ایک ہوٹل کے ریسپشن پر ہم گئے تو ایک اسمارٹ لیکن عبایہ پہنے خاتون بیٹھی تھیں۔ ان کی انگریزی بھی بس ایسی ہی تھی جیسی ہماری ترکی تھی۔

بٹ صاحب بار بار کہہ رہے تھے "میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ ترکی جانا ہے تو زبان سیکھو۔"

ہم نے کہا "بٹ صاحب ہم تو دنیا میں نہ جانے کہاں کہاں جاتے ہیں۔ کتنے ملکوں کی زبان ہم سیکھیں۔ ہماری تو عمر ہی زبانیں سیکھنے میں ختم ہوجائے گی۔"

انہوں نے اپنا پہیوں والا بیگ فرش پر رکھ دیا اور بولے۔ "میں تو اب ہوٹل ڈھونڈنے کہیں نہیں جاؤں گا۔ اس ہوٹل میں رہوں گا یا پھر سیدھا پاکستان جاؤں گا۔"

ہم نے کہا۔ "بٹ صاحب، یہاں کوئی ائرپورٹ نہیں ہے۔ کیا پیدل ہی پاکستان جائیں گے۔"

خاتون نے دوبار پاکستان کا نام سنا، اپنی جگہ سے اٹھ کر آئیں اور بٹ صاحب کی طرف انگلی سے اشارہ کرکے پوچھا۔ "پاکستان؟"

ہم سب نے بھی اپنی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "پاکستان، پاکستان۔"

انہوں نے ترکی زبان میں کچھ کہا شاید مطلب یہ تھا کہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟

خان صاحب نے کہا۔ "اب تو بتادیا نا اب ہم کہاں جائیں۔ ریلوے ٹرمنل جائیں یا ائرپورٹ۔"

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں کہیں بھی جانے سے منع کیا اور تیز تیز چلتی ہوئی ایک طرف چلی گئیں۔

"اب یہ کہاں گئی ہیں؟" بٹ صاحب نے پوچھا۔

"چوکیدار کو بلانے!"

"کیا یہ ہمیں ہوٹل سے باہر نکال دیں گی؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ ایک خاتون منیجر اور دو منیجر نما حضرات کے ساتھ واپس آئیں۔ ان سب نے ہمیں السلام علیکم کہا، جواب میں ہم سب نے بھی بیک آواز "وعلیکم السلام" کہا۔

وہ لوگ ہماری طرف دیکھتے ہوئے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ ان میں منیجر صاحب انگریزی کے ماہر تھے لیکن ان کی یہ انگریزی کوئی انگریز بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ بمشکل انہوں نے ہم سے پوچھا "ہم کتنے دن رہیں گے؟"

"دو تین دن۔"

یہ سن کر ان سب نے پھر آپس میں مشورہ کیا۔ پھر ہمیں اشاروں سے اطمینان دلا کر کچھ دور جاکر ایک کونے میں کھڑے ہوکر میٹنگ کرنے لگے۔

کچھ دیر باہمی مشورہ کرنے کے بعد وہ ہمارے پاس آئے اور جو کچھ کہا اس کا ترجمہ یہ تھا کہ آپ اگر برا نہ مانیں تو میرے کمرے میں دو مہمان رہ جائیں۔ باقی دونوں مہمان ہمارے اسٹاف کے کمرے میں رہ جائیں۔ منظور؟

خان صاحب نے کہا "بھائی یہ تو ہمیں سرونٹ روم میں رکھ رہے ہیں۔"

ہم نے کہا "خان صاحب ناشکری نہ کریں، اللہ نے سر چھپانے کو چھت دے دی ہے آپ پھر بھی خوش نہیں ہیں۔"

بٹ صاحب نے کہا۔ "مشرف صاحب، ان سے پوچھیے کہ کیا ہمیں ان کمروں کا کرایہ بھی دینا ہوگا؟"

"آفاقی صاحب اچھا نہیں لگتا اس طرح کا سوال پوچھنا۔ کرایہ لیں گے یا نہیں لیں گے یہ تو ہمارے رخصت ہوتے وقت معلوم ہوجائے گا۔"

بٹ صاحب نے داد دی۔ "خان صاحب اتنے دن

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے بعد آپ نے پہلی عقل کی بات کی ہے۔"
خاتون منیجر کے کہنے پر لوڈر نے ہم لوگوں کا سامان اٹھایا اور چل پڑا۔
"آپ ان کے ساتھ جایئے۔ یہ آپ کو آپ لوگوں کے کمرے دکھادیں گے۔"
اس ہوٹل کے بھی کمرے ایک جیسے تھے۔ لوڈر نے دروازہ کھول کر سوٹ کیس اندر رکھے۔ مسکرایا اور مرحبا کہہ کر رخصت ہوگیا۔
خان صاحب نے کہا۔ "اصولی طور پر ہمیں اس لوڈر کو ٹپ بھی دینی چاہیے تھے۔"
ہم نے انہیں مشورہ دیا کہ کسی ترک کو ٹپ دینے کی غلطی نہ کیجیے گا ورنہ وہ آپ کو اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دے گا۔
"آپ کو کبھی کسی ترک نے پھینکا تھا؟"
"ہم نے اسے ٹپ دی ہی نہیں ورنہ شاید یہیں پھینک دیتا یا نہ پھینکتا۔"
مرزا مشرف صاحب ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے بولے۔ "ایک بات یاد رکھیے گا۔ یہ ترک قوم بہت خوددار اور غیور ہوتی ہے۔ آپ نے سڑکوں پر کسی کو بھیک مانگتے دیکھا؟"
"اب تک تو نہیں دیکھا۔"
"آئندہ بھی نہیں دیکھیں گے۔ یہ روزی کمانے کے لیے چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کرلیتے ہیں مگر بھیک نہیں مانگتے۔ اول تو آپ یہاں چھوٹے بڑے امیر غریب کا فرق ہی نہیں دیکھیں گے۔ اپنے نوکر سے بھی تمیز سے بات کرتے ہیں۔ نوکر ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا بھی کھالیتے ہیں۔ یہ اونچ نیچ، امیری غریبی کا فرق ان میں نہیں ہوتا یہ سب لوگ ایک دوسرے کو برابر سمجھتے ہیں۔ دراصل ترک کبھی غلام نہیں رہے اس لیے ان میں احساسِ کمتری یا برتری بھی نہیں ہے۔"
"مرزا مشرف صاحب آپ تو بہت سمجھ دار نکل رہے ہیں۔" بٹ صاحب نے کہا۔
اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی، ریسپشن والی خاتون اندر داخل ہوئیں۔ ہم سب کو دیکھ کر مسکرائیں اور ترکی زبان میں کچھ کہا جس کا جواب بھی مرزا صاحب نے مسکراتے ہوئے دیا۔ خاتون نے الماری سے کچھ کپڑے اور باتھ روم میں سے کچھ سامان اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لٹکی ہوئی ٹوکری میں ڈالا۔ ایک بار پھر مسکرائیں اور اللہ حافظ کہہ کر چلی گئیں۔
مشرف صاحب نے بتایا کہ وہ کمرے سے اپنا ذاتی سامان لینے آئی تھیں بشرطیکہ ہمیں اعتراض نہ ہو۔
"بھئی اعتراض کیسا۔ ان کا کمرا ہے، ان کا سامان ہے ہم روکنے والے کون ہیں۔"
خان صاحب نے کہا۔ "بٹ صاحب دراصل وہ اپنا میک اپ کا سامان لے گئی ہیں۔ آپ کو دیکھ کر انہوں نے سوچا ہوگا کہ کہیں کچھ لے ہی نہ جائیں۔"
"فضول باتیں مت کرو۔ میں عورتوں کے میک اپ کے سامان کا کیا کروں گا؟"
"بھئی گھر جا کر بھابی کو دکھا سکتے ہو تمہارے لیے تحفہ لایا ہوں۔"
سارے دن کی تھکاوٹ سے تھک گئے تھے اس لیے فیصلہ ہوا کہ جلد کھانا کھا کر سو جائیں۔
"آج تو سو جائیں گے مگر کل کریں گے کیا؟"
"صبح ناشتے کے بعد ہم بودرم چلیں گے۔"
"یہ کیا چیز ہے۔"
"سمجھ لو کہ زمین پر جنت ہے۔ یہاں دو سمندر آکر ملتے ہیں۔ دراصل یہ مالدار لوگوں کی تفریح گاہ ہے۔ بودرم کا ساحل دنیا کے حسین ترین ساحلوں میں سے ایک ہے۔"
"مرزا صاحب، بلاوجہ کا رعب نہ ڈالو۔ بھئی ساحل تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں سمندر جہاں زمین کو چھوتا ہے اس کو ساحل کہتے ہیں۔ ساحل پر ہوتا ہی کیا ہے۔ سمندر کا نیلا پانی۔ دور دور تک پھیلا ہوا ساحل۔ یہاں لوگ کپڑے وغیرہ اتار کر دھوپ میں اوندھے سیدھے پڑ جاتے ہیں اور سارے دن دھوپ کھاتے ہیں۔ زیادہ گرمی لگے تو ساتھ ہی چھاتے کے نیچے لکڑی کی آرام کرسی بچھی ہوتی ہے۔ اس پر لیٹ کر دنیا کا نظارہ کرتے ہیں۔ کچھ عورتیں اور مرد غسل کا لباس پہن کر سمندر میں ڈبکیاں کھاتے ہیں یا تیرتے رہتے ہیں۔ بھئی سارے ساحل ایک جیسے ہوتے ہیں۔"
"اچھا ٹھیک ہے۔" مرزا مشرف نے بہلانے کے لیے کہا۔ "کل خود جا کر دیکھ لینا کہ خوبصورت ساحل کیا ہوتا ہے؟"
نہا دھو کر تازہ دم ہو کر ڈائننگ روم میں گئے۔ خوبصورت ڈائننگ روم تھا۔ ایک خاتون ویٹر نے ہم سب کو ایک ایک مینو کارڈ دے دیا۔
ہم نے کہا۔ "ہمارا مشورہ مانیں تو مینو کارڈ میں صرف کباب پر نظر ڈالیں ورنہ یہاں آنے والے تو عجیب و غریب چیزیں بھی کھالیتے ہیں، ہم تو بس ڈونر کباب کھائیں گے۔"

سب لوگوں نے ڈونر کباب کے حق میں ہاتھ اٹھادیے۔ ٹرکش ویٹریس اپنی زبان میں کچھ کہتی رہی مگر سب نے "تھینک یو" کہہ کر اسے ٹال دیا۔
"یہ کیا کہہ رہی تھی؟" اس کے جانے کے بعد ہم سب نے مرزا صاحب سے پوچھا۔
"بہت معقول بات کررہی تھی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ اگر آپ سب کو کباب ہی کھانے ہیں تو مختلف قسم کے کباب کھایئے۔ سب ایک ہی قسم کے کباب کیوں کھا رہے ہیں۔"
"بات معقول کہی لڑکی نے۔" خان صاحب نے کہا۔
"معلوم ہوا کہ ترکی کی لڑکیاں بہت سمجھدار ہوتی ہیں۔" بٹ صاحب نے تعریف کی۔
"لڑکیاں بہت سمجھدار نہیں ہوتیں دراصل آپ ہی ناسمجھ ہیں۔"
اب ہمیں بودرم جانا تھا۔ ترک اس لفظ کو کسی اور طرح ادا کرتے ہیں لیکن انگریزی میں اسے Bodnum کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں ایشین سی اور میڈیٹیریم آپس میں گلے ملتے ہیں۔ اپنے ملک میں ہم نے دو دریاؤں کے بہنے کا تو سنا تھا اور دیکھا بھی تھا لیکن دو سمندروں کا یہ ملاپ ایک عجیب نظارہ تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ... صبح طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔
ترکی چاروں بلکہ تین طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے۔ ہر طرف ساحل ہی ساحل ہیں۔ بٹ صاحب نے تجویز پیش کی کہ ایک چھوٹا سا سمندر یہ ہمیں بھی قرض کے طور پر دے دیں۔
بودرم کا ساحل دنیا کا حسین ترین ساحل کہا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر قوم اپنی چیزوں کو دنیا کی حسین ترین کہتی ہے لیکن درحقیقت یہ ساحلی علاقہ انتہائی خوبصورت تھا۔ یہ امریکا سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ساحل حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ سامنے ہوٹلوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ مختلف ترکی اور انگریزی ناموں کے ہوٹل یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے ہوئے ہیں۔ باہر سے ہوٹل صرف عمارت ہی نظر آتی ہے لیکن اگر ہوٹل کے خوشنما باغ سے گزر کر اندر داخل ہوں تو ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔ ہر ہوٹل کے ساتھ ایک ساحلی حصہ دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ فرش سبزے سے بھرا ہوا ہے۔ جگہ جگہ باغ میں بیٹھنے کے لیے چھوٹی چھوٹی خوبصورت کٹیائیں بنی ہوئی ہیں۔ یہ کٹیا ہوٹل کے کرائے میں شامل نہیں ہوتی۔ اگر آپ ساحل کو نزدیک سے دیکھنا اور تیراکی کرنا چاہتے ہیں تو یہ سب سے عمدہ جگہ ہے۔ دنیا کے امیر ترین لوگ ہی یہاں بغرض سیر و تفریح آتے ہیں۔ ہوٹل کے ساحل کا ایک حصہ موٹر بوٹس اور خوبصورت بجرے نما کشتیوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہ دراصل پارکنگ کی جگہ۔ یہاں آنے والے اپنے ذاتی چھوٹے چھوٹے جہازوں میں.... آتے ہیں۔ ساحل کے سامنے والے لان میں جگہ جگہ خوبصورت بار بنے ہوئے ہیں۔ بار کے اوپر کی طرف ایک خوبصورت چھت ہوتی ہے۔ باقی چاروں طرف سے یہ کھلا ہوا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر دھوپ بہت تیز ہو یا برش ہوجائے تو آپ ان باروں میں بیٹھ کر موسم سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ قدرت کی فیاضی اور انسان کی ہنرمندی نے اس جگہ کو واقعی جنت کا ٹکڑا بنادیا ہے۔ رات کے وقت پانی میں تیرنے اور غوطے کھانے کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے اور ایک خوبصورت آرکسٹرا مختلف قسم کی دھنیں بکھیرتا رہتا ہے۔ اگر چاندنی رات ہو تو اس ماحول میں کئی گنا زیادہ اثر پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔
ہم لوگ کرائے کی کار لے کر گئے تھے اس لیے بڑے گیٹ پہ ہمیں کسی نے نہیں روکا۔ سوچا ہوگا ہوٹل کے مہمان ہوں گے۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا لیکن ساحل ہر طرح کے شوق کا مظاہرہ کیا جارہا تھا۔ حسین اور رعنا یورپین خواتین محض غسل کے مختصر رنگین ملبوسات میں تتلیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھیں۔ یورپ کے ساحلوں پر مرد اور عورت کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ لباس سے بھی بے نیاز ہوتے ہیں۔ جو چاہے لباس پہنیں نہ جی چاہے تو کچھ بھی نہ پہنیں۔ سمندر کا ساحل ایسی جگہ ہے جہاں دنیا بھر سے زیادہ آزادی میسر ہوتی ہے۔ نہ روک نہ ٹوک۔ آپ چاہیں لیٹیں چاہے بیٹھیں، چاہے سمندر میں غوطے کھائیں یا تیراکی کے کرتب دکھائیں کوئی آپ کو کچھ نہیں کہے گا بلکہ آپ کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نہ محرم ہے نہ نامحرم۔ ہر شخص اپنی پسند کے مشغلے میں مصروف نظر آتا ہے۔
ایک طرف کچھ خواتین ایکسرسائز کرتی نظر آئیں۔ دوسری جانب کچھ مرد حضرات قلابازیاں کھا رہے ہیں یا زمین پہ اوندھے سیدھے پڑے ہیں۔ اگر لوگ اسے جنت کہتے ہیں تو درست ہی کہتے ہیں کہ یہ جنت ہے لیکن گناہگاروں کی جنت۔ ساحل پر جگہ جگہ آرام دہ کرسیاں پڑی ہیں جن پر رنگین پھولدار چھاتے لگے ہوئے ہیں۔
بٹ صاحب نے کہا "کیا پُرفضا جگہ ہے۔ میرا تو جی

WWW.PAKSOCIETY.COM

چاہتا ہے کہ سبز گھاس پر لیٹ جاؤں۔"

"لیٹنے کی تو اجازت ہے مگر چارا سمجھ کر گھاس چرنے نہ لگنا۔"

مشرف صاحب اور خان صاحب آرام کرسیوں پر نیم دراز ہوگئے۔ مرزا مشرف نے تو کوئی فلمی گیت گنگنانا بھی شروع کردیا۔

مگر وہ جو کہا ہے کسی نے کہ دنیا کسی کو خوش دیکھنا نہیں چاہتی۔ قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر رنگین خوبصورت یونیفارم میں ایک دراز قد خوبصورت مرد اور ایک متناسب جسم کی اسمارٹ خاتون ہمارے سامنے کھڑے تھے۔

دونوں نے بڑے ادب سے سلام کیا اور پھر ایک سنہری طشتری ہمارے سامنے پیش کردی۔ ہم سمجھے شاید پان چھالیا پیش کررہے ہیں مگر طشتری میں دو کاغذ کے ٹکڑے تھے۔

خان صاحب نے فوراً جیب سے اپنی پڑھنے والی عینک نکال کر ناک پر رکھی اور کاغذات کا مطالعہ شروع کردیا۔

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے انگریزی میں پوچھا۔ ان کا جواب سن کر مرد نے ترکی زبان میں خاتون سے کچھ کہا۔ انہوں نے انگریزی میں ہم سے کہا۔

"سر، آپ اس ہوٹل میں مہمان تو نہیں ہیں۔"

"نہیں، ہم تو سیاح ہیں۔"

بٹ صاحب نے کہا۔ "یہ مسٹر آفاقی ہیں۔ یہ فلم ڈائریکٹر ہیں۔ ہم لوگ شوٹنگ کے لیے ترکی میں لوکیشنز دیکھنے آئے ہیں۔"

اس نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ انڈیا سے آئے ہیں۔"

"نہیں ہم پاکستان سے آئے ہیں۔"

"پاکستان!" دونوں کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں۔

مرد نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام سلیمان ہے اور یہ مس خالدہ ہیں۔ میں اس ہوٹل کا کیئر ٹیکر ہوں اور یہ ہیڈ منیجر۔"

مس خالدہ کے ہاتھ بڑھانے سے پہلے بٹ صاحب نے بڑی گرمجوشی سے ان سے ہاتھ ملایا۔ "گڈ ٹو سی یو۔"

مس خالدہ نے سوالیہ نظروں سے سلیمان کی طرف دیکھا جس نے بتایا کہ یہ آپ کو کہہ رہے ہیں کہ آپ سے مل کر انہیں بہت خوشی ہوئی۔

خالدہ نے جو کہا شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے بھی آپ سب سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔

سلیمان نے ایک کرسی گھسیٹی اور ہم لوگوں کو دیکھ کر مسکرایا۔

بٹ صاحب نے کہا "ہم سے ضرور کوئی حماقت ہوئی ہے جو یہ مسکرا رہا ہے۔"

مرزا مشرف بولے "نہیں مسکرانا تو ان لوگوں کی عادت ہے اگر پاس سے بھی گزر جائیں تو جان نہ پہچان مسکراتے ضرور ہیں۔"

"خوش مزاج لوگ۔"

ہم نے سلیمان سے پوچھا۔ "یہ کاغذ کیسے ہیں؟"

وہ کچھ شرمندہ سا ہوگیا۔ کہنے لگا دراصل یہ کرسیاں صرف ہوٹل میں قیام کرنے والوں کے لیے ہیں اگر باہر سے کوئی آکر کرسی استعمال کرے تو اس سے کرسی کا کرایہ لیا جاتا ہے۔"

"اور یہ دوسرا کاغذ کیا یہ بھی بل ہے۔"

وہ مزید شرمندہ نظر آنے لگا۔ "جو لوگ ہوٹل میں مہمان نہیں ہوتے ان سے ہوٹل میں آنے کی فیس داخلہ لی جاتی ہے۔"

"دونوں بلوں کی رقم کتنی ہے؟" خان صاحب نے پوچھا۔

"معاف کیجیے گا، غلطی ہوگئی۔ آپ تو ہمارے مہمان ہیں۔ اتنی دور پاکستان سے آئے ہیں۔ دیکھیے، میں آپ کو اپنے منیجر سے ملواتا ہوں اگر آپ اس ہوٹل میں اپنی فلم کی شوٹنگ کرنا چاہیں تو میں مالک اور منیجر سے سفارش کرکے یہ بندوبست کرادوں گا لیکن آپ کو شوٹنگ کے دوران میں اسی ہوٹل میں قیام کرنا ہوگا۔"

"کیوں نہیں، یہ تو بہت خوبصورت جگہ ہے۔"

اس کے بعد ہم نے خان صاحب، مشرف صاحب اور بٹ صاحب سے ان کا تعارف کرایا۔

بٹ صاحب کا گورا رنگ اور بھوری آنکھیں دیکھ کر اس نے پوچھا "کیا مسٹر بٹ بھی پاکستانی ہیں؟"

ہمارے جواب دینے سے پہلے بٹ صاحب فخریہ انداز میں بول پڑے۔ "ارے آپ پاکستان کو کیا سمجھتے ہیں۔ پاکستان کے لوگ آپ ترکوں کی طرح بہت شاندار اور خوبصورت ہوتے ہیں اور میں تو کشمیری ہوں۔"

"تو کیا کشمیر پاکستان میں نہیں ہے؟"

"ارے کشمیر تو پاکستان ہی کا حصہ ہے جس پر انڈیا نے زبردستی قبضہ کررکھا ہے۔ آپ اخبار تو پڑھتے ہوں گے؟"

میں اخبار نہیں پڑھتا مگر ہمارے منیجر مجھے دنیا میں کیا ہورہا ہے خبریں بتاتے رہتے ہیں۔ ہاں یاد آیا وہ کہہ رہے تھے کہ پاکستان نے انڈیا کے کشمیر پر قبضہ کررکھا ہے۔ اس کے لیے

دونوں ملکوں میں جنگ بھی ہوچکی ہے۔"

ہم نے کہا۔ "آپ کے منیجر نے آپ کو غلط بتایا ہے۔ آیئے ہمیں ان سے ملوادیجیے۔"

ساحلی علاقہ طے کرکے ہم ہوٹل کی عمارت میں داخل ہوئے۔ واللہ جی خوش ہوگیا ہوٹل کے اندر کی عمارت اور زیادہ شاندار اور سجی ہوئی تھی۔ فرش پر قیمتی ترکی قالین، خوبصورت قیمتی پردے، صوفے ایسے کہ بیٹھو تو لگتا ہے آپ نرم بادلوں پر بیٹھ گئے ہیں۔ عمارت بھی بہت خوبصورت، فرنیچر سے آراستہ گیلریاں، ہر طرف آرائش کی قیمتی چیزیں سجی ہوئی، یوں لگتا تھا جیسے ہم کسی اور ہی دنیا میں آئے ہیں۔ سلیمان نے ہمیں بتایا کہ اس ہوٹل کا مالک مسلمان ہے اور اس کے ملک میں آٹھ دس ہوٹل ہیں۔

کئی راہداریاں طے کرکے ہم ایک شاندار دروازے پر پہنچے۔ سلیمان نے دروازے پر دستک دی۔

جواب میں آواز آئی "یس؟"

سلیمان کے ساتھ ہم سب کمرے میں چلے گئے۔ خالدہ پہلے ہی ہم سے رخصت ہوچکی تھی۔ ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک وسیع و عریض کمرا تھا اور اس قدر شاندار کہ لگتا تھا... کسی بادشاہ کے محل میں آگئے ہیں۔

سامنے ایک بڑی سی آبنوسی میز کے سامنے گہرے کالے رنگ کے صاحب شاندار سوٹ پہنے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہم سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

منیجر نے ہم لوگوں کا تعارف کرایا تو انہوں نے اٹھ کر ہم لوگوں سے مصافحہ کیا اور گرمجوشی سے استقبال کیا۔

انہوں نے اپنا نام فریڈ بتایا ان کا تعلق جنوبی افریقا سے تھا۔

دنیا بھر کے بہترین ہوٹلوں میں وہ کام کرچکے ہیں اور بہت اچھے منتظم ہیں۔ دیکھنے میں وہ 35، 40 سال کے نظر آتے تھے۔

ہم نے ان سے کہا۔ مسٹر الفریڈ، اتنی چھوٹی عمر میں آپ نے اتنے بہت سے ملکوں میں کام کرلیا۔ بڑی تعریف کی بات ہے۔"

وہ مسکرائے تو ان کے سفید موتیوں جیسے دانت چمکتے نظر آئے۔

انہوں نے پہلے تو ہم لوگوں کو تشریف رکھنے کو کہا۔ پھر بولے "میں اتنا کم عمر بھی نہیں ہوں جتنا کہ نظر آتا ہوں میری عمر 62 سال ہے۔"

ٹیپو سلطان اپنے مقبوضہ علاقے واپس لینا چاہتا تھا۔ حصولِ مقصد کے لیے اس نے فرانسیسیوں کا تعاون حاصل کیا۔ اپریل 1798ء میں کچھ فرانسیسی اس کی مدد کو آئے۔ لارڈ ولزلی موقع کی نزاکت کو بھانپ گیا۔ مرہٹوں اور نظام کو ایک بار پھر اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا..... 1799ء کے مارچ میں ٹیپو سلطان سدھ سیر کے مقام پر جنرل سٹارٹ اور ملاولی کے مقام پر جنرل ہیرس سے شکست کھا کر قلعہ سرنگا پٹم میں محصور ہوگیا۔ انگریزوں نے 4 مئی 1799ء کو قلعہ پر بھی قبضہ کرتے ہوئے اس کی تقسیم شروع کردی۔ انہوں نے شمال مشرقی حصہ نظام کے حوالے کردیا۔ کومینڈر، کنارا، ورٹناور اور سرنگا پٹم اپنے پاس رکھے اور باقی علاقہ ریاست میسور کے پرانے ہندو خاندان کے ایک راجکمار کے حوالے کردیا۔ ٹیپو سلطان جنگ میں لڑتے لڑتے راہی ملکِ عدم ہوا۔ انگریزوں نے اس کی لاش دیکھ کر کہا۔ "آج ہندوستان ہمارا ہے۔"

مرسلہ: ناہید نسیم، لاہور

یہ سن کر ہم سب کو بہت حیرت ہوئی۔ انہوں نے پوچھا "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟ کافی یا کچھ اور؟"

ہم نے کہا "کچھ اور ہم نہیں پیتے اگر کافی بنوادیں تو مہربانی ہوگی مگر کافی زیادہ گاڑھی نہ ہو۔"

وہ پھر مسکرائے اور ان کے موتیوں جیسے دانت چمکتے نظر آئے۔ "آپ انگلش کافی پسند کریں گے۔"

"بالکل وہی۔" ہم سب نے ایک زبان ہوکر کہا۔

"آپ کا تعلق فلموں سے ہے؟ مجھے انڈین فلموں میں ناچ اور گانے بہت اچھے لگتے ہیں۔"

ہم نے کہا "انڈیا دوسرا ملک ہے۔ ہمارا تعلق پاکستان سے ہے۔"

"اوہ، سوری! دراصل پاکستانی فلم میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ کیا وہ انڈین فلم جیسی ہوتی ہے۔"

ہم نے انہیں دونوں ملکوں کی فلموں کے بارے میں بتایا۔ الفریڈ یہ باتیں سن کر خاصے متاثر لگتے تھے۔

انہوں نے پوچھا۔ "آپ اپنی فلم کب شروع کرنا چاہتے ہیں؟ ہوٹل کے کن حصوں میں شوٹنگ کرنا چاہتے ہیں؟ آپ کا اسکرپٹ بھی ہمیں دیکھنا ہوگا۔"

کچھ دیر کے لیے تو ہم سب ایک دوسرے کا منہ ہی دیکھتے رہے۔ منیجر صاحب نے بلاوجہ ہمیں ایک مشکل میں ڈال

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیا تھا۔ ہم فلم کے لیے لوکیشنز دیکھنے نہیں بلکہ استنبول اور ترکی دیکھنے آئے تھے۔ مگر ان کے سوالوں کا جواب تو دینا ہی تھا۔

ہم نے بتایا کہ ان کی تمام ضروریات، ہم آیندہ چند ماہ میں مکمل کردیں گے کیونکہ ہمارا پراجیکٹ ابھی ابتدائی مراحل میں ہے۔

"کیا آپ ترکی کے اداکاروں کو بھی فلم میں شامل کریں گے؟"

ہم نے بڑے غور وخوض کے بعد کہا۔ "دیکھئے فلم کا اسکرپٹ مکمل کرنے میں کافی وقت لگتا ہے۔ اسکرپٹ مکمل ہونے کے بعد ہی موزوں فن کاروں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔"

انہوں نے خوش دلی سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "اگر میری خدمت درکار ہو تو میں حاضر ہوں۔"

"کیا آپ نے کبھی فلم یا ٹی وی ڈرامے میں کام کیا ہے؟"

بولے "کیا تو نہیں مگر کرلیں گے۔ میں آپ کے لیے دوسرے اداکاروں کے انتخاب میں بھی مدد دے سکتا ہوں۔ ہمارے اسٹاف کے کئی لوگ بھی فلم میں کام کرنا پسند کریں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ہم نے کہا۔

اس کے بعد کاروباری باتیں شروع ہوگئیں۔

"دیکھیے مسٹر آفاقی" وہ بہت سنجیدگی سے بولے۔ "ہمارا ہوٹل سیون اسٹار ہوٹل ہے اس لیے یہاں رئیس بھی زیادہ ہیں۔ یہاں صرف بہت دولت مند لوگ ہی ٹھہرتے ہیں۔"

"جی۔ وہ تو نظر آرہا ہے۔"

"دیکھیے آپ پاکستان سے آئے ہیں جو ہمارا برادر ملک ہے۔ ہم آپ کے لیے کافی رعایت کردیں گے مگر شوٹنگ کے دنوں میں آپ کے یونٹ کو یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔ اسی لیے میں آپ سے ایڈوانس بکنگ کے لیے وقت مانگ رہا ہوں۔"

ہم نے کسی کروڑ پتی فلم ساز کی طرح بے نیازی سے پوچھا۔ "مثلاً آپ ہمیں کیا ریٹس دیں گے۔"

بولے۔ "آپ کے لیے کمروں اور سوئٹس کا کرایہ کم کردیا جائے گا۔"

"مثلاً کتنا۔"

بولے۔ "دیکھیے ہم کمرے کا ایک رات کا کرایہ چار سو ڈالرز وصول کرتے ہیں۔ آپ کے لیے دس فیصد کم کردیں گے۔ مگر یہ رئیس سیل ٹیکس اور دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔" بٹ صاحب... بے پروائی سے بولے۔

"اور دیکھیے اس میں ناشتا اور کھانا شامل نہیں ہے۔"

"وہ تو ظاہر ہے۔" بٹ صاحب نے مرعوب کن انداز میں کہا۔

"یقیناً آپ سب جانتے ہوں گے کیونکہ ساری دنیا میں فلموں کی شوٹنگ کرتے رہے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔"

مسٹر فرید نے تیسری بار کافی اور سینڈوچز کا آرڈر دیا پھر بولے۔ "ازمیر کے آس پاس کے علاقوں میں اگر آپ شوٹنگ کرنا چاہیں گے تو ہم آپ کو اجازت دلانے میں بھی مدد کرسکتے ہیں۔ اگر آپ کو پانی کے اندر پیراکی کرنے والی لڑکیوں کی ضرورت ہوئی تو میں آپ کو ان سے بھی ملوا سکتا ہوں۔"

یہ سن کر پہلی بار بٹ صاحب مسکرائے۔ "یہ بہت اچھا آئیڈیا ہے۔ دراصل ہماری فلم میں انڈر واٹر شوٹنگ بھی ہوگی۔"

مسٹر فرید مسکرائے۔ "پھر تو آپ کو بہت آسانی رہے گی۔ کیونکہ ہمارے ہوٹل کے نزدیک ہی ایک سوئمنگ پول ہے جس میں پانی کے اندر ہی پیراکی کی جاتی ہے۔ آپ کہیں گے تو ان سے بھی آپ کو دس پرسنٹ رعایت دلا سکتے ہیں۔ البتہ ان کا کرایہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔"

"کتنا زیادہ؟"

"دیکھیے، انہیں ایک روز اپنا سوئمنگ پول بند کرنا پڑے گا۔ ایک روز کا کرایہ وہ کم از کم ایک ہزار ڈالر تو لیں گے۔"

اب یہ رقوم ہمارے دل پر بہت بوجھ بن چکی تھیں۔ مسٹر فرید کے حساب سے تو ہم ان کے ہوٹل میں دو روز بھی شوٹنگ نہیں کرسکتے تھے بلکہ ہمارا بجٹ ان کے آدھے دن کے بجٹ سے بھی آدھا تھا۔ بٹ صاحب کے اشارے پر مرزا مشرف نے گھڑی دیکھی اور کہا۔ "آفاقی صاحب ہماری ایک اور اپائنٹمنٹ ہے۔"

"ہاں ہاں، خوب یاد دلایا آپ نے۔" ہم نے مسٹر فرید کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" حالانکہ ہمارا ہارٹ فیل ہونے والا تھا۔

انہوں نے بھی بہت گرمجوشی سے مصافحہ کیا بلکہ ہم سب سے مصافحے کیے اور بولے۔ "آپ جب چاہیں ای میل پر مجھ سے رابطہ کرسکتے ہیں۔"

ہم جب اس ہوٹل کی عمارت سے باہر نکلے تو یوں لگا جیسے بلیک ہول سے نکل کر تازہ فضا میں آگئے ہیں۔

پہاڑیوں کا آدم خور

انجم فاروق ساحلی

دور تک پھیلے اس پہاڑی سلسلے میں ایک آدم خور شیر نے قیامت مچا رکھی تھی۔ آئے دن ایک نہ ایک آدمی کو اٹھا کرلے جاتا تھا۔ حکومت نے بطور خاص ہدایت کی کہ اس شیر کا شکار کیا جائے مگر وہ شیر تو چھلاوا تھا، گاؤں والے اسے "بُری آتما" کہتے، کچھ لوگ بھوت سمجھتے مگر اس کی حقیقت کچھ اور نکلی۔

شکاریات کے شوقینوں کی مدارات

کافی عرصہ پہلے کی بات ہے جب صوبہ بہار کے ایک انگریزی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک بنگال ٹائیگر پہاڑپور کے علاقے میں مسلسل اُدھم مچا رہا ہے۔ اس نے پچاس سے زیادہ انسانوں کی جان لے لی ہے۔

سرکار کی طرف سے اس آدم خور کو مارنے کے لیے دس ہزار روپے کا انعام مقرر کیا گیا تھا۔ بہتیرے شکاریوں نے کوشش کی، ہاتھ پاؤں مارے لیکن ناکام واپس ہوئے۔ شیر کے خوف سے لوگوں کا بازار میں جانا مشکل ہوگیا۔ رات تو رات دن کے وقت بھی لوگ گھروں میں بند رہا کرتے۔

جب میں وہاں پہنچا اور یہ پتا لگانے کی کوشش کی کہ شیر... فی الحال کس علاقے میں ہے تو بھی کچھ پتا نہ چل سکا۔ جنگلوں اور پہاڑوں کے درمیان بسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں گھومتا رہا۔ کافی لوگ آدم خور کے خوف سے اپنا گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ جو موجود تھے ان کے چہرے بھی خوف سے زرد تھے۔ گاؤں سنسان اور ویران تھے۔

میں پہاڑپور اسٹیشن پہنچا تھا کہ دور سے ڈنکا بجنے کی آواز سنائی دی۔ میں اس طرف بڑھ گیا۔ آگے چل کر دیکھا، ریلوے ملازمین لائن کی مرمت کررہے تھے۔ دونوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانب بڑے سائز کا ڈنکا بجایا جارہا تھا۔ یہ سب اس خون آشام، خوفناک آدم خور کے خوف کی وجہ سے تھا کیونکہ آدم خور ریلوے ملازمین کی بھی جان لے چکا تھا۔

جنوب کی طرف ایک پہاڑی گاؤں تھا جہاں کے لوگوں نے نقل مکانی نہیں کی تھی۔ میں پانچ شکاریوں پر مشتمل اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں جا پہنچا۔ گاؤں میں کئی زخمی موجود تھے جنہیں شیر نے گھائل کیا تھا۔ ہم نے وہاں کے لوگوں سے شیر کی تلاش میں چلنے کی درخواست کی لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ وہ سب ڈرے ہوئے تھے۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے کہا کہ وہ شیر نہیں بھوت ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے دیوتا بنادیا۔ ان لوگوں میں سے ایک دلیر آدمی نے کافی غوروخوض کے بعد ہمارے ساتھ چلنے کی ہامی بھرلی کیونکہ اس کا ایک لڑکا شیر کا شکار ہو چکا تھا۔

جب میں نے اس بوڑھے شخص سے بیٹے کے متعلق دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ اس دن وہ دونوں باپ بیٹا جنگل سے باہر پہاڑ کی ڈھال پر میدان میں گائے چرا رہے تھے کہ اچانک جنگل سے شیر نمودار ہوا اور ایک ہی جست میں لڑکے کو اٹھالے گیا۔ وہ درندہ اٹھارہ سالہ لڑکے کی کمر میں دانت پیوست کیے اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے بلی چوہے کو منہ میں دبا کر بھاگتی ہے۔

بوڑھے نے بتایا کہ میں بیٹے کی محبت میں شیر کے پیچھے بھاگا مگر وہ بہت تیزی سے بھاگتا ہوا جھاڑیوں میں گم ہوگیا اور میں روتا پیٹتا واپس آگیا۔ بوڑھے نے باتوں باتوں میں بتایا کہ شیر جس دن کسی انسان کی جان لیتا ہے پہاڑ پور کے اسٹیشن کے قریب پانی میں بیٹھ جاتا ہے اور وہیں سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

چنانچہ ہم اس بوڑھے کے ساتھ تالاب پر گئے جو پہاڑ پور اسٹیشن کے قریب ریلوے انجن میں پانی بھرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ تالاب کے اطراف میں لمبی لمبی خشک گھاس بکھری ہوئی تھی اور نزدیک میں کوئی بڑا درخت بھی نہیں تھا جہاں مچان باندھنے کا انتظام کیا جاسکے۔ چنانچہ مشاورت کے بعد ایک تین فٹ گہرا گڑھا کھودنے کی تجویز سامنے آئی۔ جہاں سے آدم خور کو قریب سے مارا جاسکتا تھا۔ ہم لوگوں نے تین فٹ گہرا گڑھا بنایا جو اتنا چوڑا تھا کہ اس میں چھ آدمی آرام سے بیٹھ سکتے تھے۔ جب تک لوگ گڑھا کھود رہے تھے ہم نے آدم خور کے پاؤں کے نشانات کی تلاش شروع کردی۔ صرف ایک راستے پر شیر کے پاؤں کے نشانات ملے جس سے یہ پتا چلا کہ یہ نر ہے اور اس کی عمر چھ سال سے کم نہیں۔ اطراف میں چیتل، سانبھر اور کڑے کے پاؤں کے نشانات ملے۔ بہرحال اس دن سرِشام ہم لوگ ہلکا پھلکا کھانا کھا کر گڑھے میں بیٹھ گئے۔ ٹارچ سے روشنی دکھانے والے کو ہدایت کردی کہ جب تک میں روشنی دکھانے کا اشارہ نہ کروں ہرگز ٹارچ نہ جلانا۔

سورج غروب ہوتے ہی کڑوں کا ایک غول آیا اور پانی پی کر چلا گیا۔ ان میں سے ایک خوب صورت نر کو دیکھ کر طبیعت مچل گئی لیکن غیر ضروری شکار شیر کو چوکنا کرسکتا تھا اس لیے میں نے رائفل جھکالی۔ رات دس بجے کے بعد چیتل اور دس بارہ سانبھر آئے اور پانی پی کر روانہ ہوگئے۔ بارہ بجے کے بعد دو چیتے آئے اور جیسے کتے دوڑ دوڑ کر کھیلتے غراتے ہیں اسی انداز میں کودتے ہوئے واپس چلے گئے۔ فضا پر پُرہول سناٹا چھا گیا۔

رات کے دو بجے ہوں گے چاندنی پورے طور پر چٹکی ہوئی تھی کہ یکا یک ایک بڑے سینگ والا سانبھر بہت تیزی سے ہم لوگوں کی طرف دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے پیچھے ایک شیر بھی تھا جو پیچھا کرتا ہوا آرہا تھا مگر سانبھر جھاڑیوں میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ شیر تالاب کے کنارے کھڑا ہوکر اِدھر اُدھر نگاہیں پھرانے لگا پھر وہ دو قدم گڑھے کی طرف آیا شاید اس نے انسانی مہک پالی تھی۔ میں نے جلدی سے کھڑے ہوکر رائفل سیدھی کی اور دو فائر کردیے۔ ایک گولی اس کے سر کی کھال کو چھیدتی ہوئی گزر گئی اور دوسری اس کی ایک ٹانگ کو زخمی کرکے درخت کے تنے میں جا لگی۔

شیر بھاگ گیا میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ وہ آدم خور شیر نہیں جس کی ہمیں تلاش ہے۔

پوری رات برباد ہوگئی تھی۔ اب میں نے یہ ارادہ کیا کہ ہم جنگلی علاقے میں جاکر آدم خور کا سراغ نکالیں گے۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم نکل پڑے۔ گھنے جنگل کی پگڈنڈیوں سے گزر کر ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچنا ہوتا تھا۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا اور ہر لمحہ آدم خور سے اچانک ملاقات ہوجانے کا اندیشہ تھا۔

ابھی آدھے سے کچھ زیادہ راستہ طے کیا ہوگا کہ اچانک پہاڑ کی چڑھائی پر نالے کے اندر سفید کپڑے کی دھجیاں نظر آئیں۔ ہم چونک پڑے اور فوراً کپڑے کی دھجی کی طرف چل پڑے۔ نزدیک جاکر دیکھا تین فٹ گہرے گڑھے میں ایک جوان لڑکی کی لاش سوکے پتّوں سے چھپائی گئی تھی۔

سفید ساڑی کا نچلا حصہ کمر کے پاس سے پھٹا ہوا تھا۔ ہم نے بہت آہستگی سے پتے ہٹائے تو کمر پر چار دانتوں کے نشانات تھے، خون بہہ کر جسم پر پھیل گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا یہ آج صبح ہی کی لاش ہے۔ اس کے علاوہ جسم پر کہیں کوئی زخم نہیں تھا۔

دن کے دس بج رہے تھے اور گاؤں تک پہنچنے کے لیے پچیس منٹ اور چلنا پڑتا تھا چونکہ شیر نے اس عورت کا گوشت نہیں کھایا تھا اس لیے اس کے جلد ہی لوٹنے کے امکانات زیادہ نمایاں تھے۔ ایسا بھی ہوسکتا تھا کہ شیر نزدیک ہی کسی سایہ دار درخت کے نیچے گھاس پر سویا ہوا ہو۔

تلاش کرنے پر وہ مل جاتا مگر ہم لوگوں میں سے کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس کا پیچھا کرتے۔ اوپر جانے کا کوئی اچھا راستہ نہیں تھا اور جنگل بے حد گھنا تھا۔ ہم لوگوں نے طے کیا کہ وہیں درخت پر بیٹھ کر شیر کا انتظار کیا جائے۔ وہ ضرور یہاں آئے گا۔ چنانچہ دو دو آدمی الگ الگ اس کے آنے کے راستے پر پیڑ پسند کرکے اس پر بیٹھ گئے۔ بیٹھنا مشکل تھا کیونکہ چارپائی یا رولا نہیں باندھا گیا تھا۔ ہم لوگ کسی طرح درخت پر جسم چھپا کر بیٹھے تھے اور اپنی اپنی رائفل پر گرفت مضبوط کردی۔

دن کے بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے ہوں گے کہ پہاڑ کے اوپری حصے سے کسی جانور کے چلنے کی آہٹ تھوڑی تھوڑی دیر بعد سنائی دینے لگی۔ ہم لوگوں نے اپنی نظر، دماغ اور کان پوری طرح اس طرف لگادیے۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سوگز اوپر کوئی چل رہا ہے۔ ہم لوگ اپنے جسموں کو بالکل ساکت وصامت کیے بیٹھے تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ آدم خور شیر ضرور آئے گا اور جب مور کے چلّانے کی آواز آئی لگی تو یہ یقین اور بھی پختہ ہوگیا کہ شیر آرہا ہے۔ گو یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ وہی آدم خور شیر ہو جس کا ہم انتظار کررہے ہیں۔

دونوں درخت جن پر ہم بیٹھے تھے ایک دوسرے سے پچاس گز کی دوری پر تھے۔ مردہ عورت کا جسم دونوں درختوں کے درمیان زمین پر پڑا تھا۔ میں نے ساتھیوں کو سمجھا دیا تھا کہ جب تک شیر درمیان میں نہ آجائے فائرنگ نہ کی جائے۔ لگ بھگ ساٹھ فٹ اوپر کی طرف شیر پہلی بار نظر آیا۔ صرف جھلک تھی پورا جسم دکھائی نہیں دیا تھا۔

کچھ وقفے تک تو وہ دھیرے دھیرے چھپ کر چلتا رہا مگر جب اسے یقین ہوگیا کہ یہاں کوئی خطرہ نہیں تو... وہ تیزی سے لاش کے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔ اس وقت ہم سانس روکے بالکل ساکت بیٹھے تھے۔ شیر اپنی زبان سے اپنے ہونٹ کا بیرونی حصہ چاٹنے لگا تھا۔ وہ اپنی تیز نظریں عورت کے جسم پر جمائے ہوئے تھا۔ اس کا سر بڑا، اگلے پاؤں موٹے اور چوڑے تھے۔ خونی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

شیر لاش پر جھکا اور اس نے پوری لاش کو کمر سے پکڑ کر اس طرح آسانی سے اٹھالیا جیسے کوئی بلی چوہے کو اٹھاتی ہے۔ اس نے ایک مسطح زمین پر لاکر لاش کو ڈال دیا اور اس کا جسم نوچنے لگا۔ یہ بڑا بھیانک منظر تھا۔

آدم خور اوپری ڈھال والے شکاری کے بالکل سامنے کوئی پچیس گز کی دوری پر تھا۔ جیسے ہی دوسرا لقمہ کھا کر اس نے سر اٹھایا۔ دو رائفلوں کی گولیاں چلیں۔ گولی کے دھوئیں کے ساتھ ہی فوراً ہی شیر جست مار کر شکاری تک پہنچا لیکن درخت کے تنے سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

اب اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم نے اپنی رائفل سے پہلی گولی اس کے اگلے پاؤں کے جوائنٹ (جوڑ) پر ماری، شیر کچھ دیر تک زندہ رہا مگر اس کے زخم گہرے تھے۔ ہم پچیس فٹ کی دوری سے دیکھ رہے تھے کہ اس کی دم تھرتھرا رہی ہے۔ پاؤں سے خون نکل رہا تھا، پیٹ سے بھی نکل رہا تھا۔ ڈھلوان پر موجود شکاری کی گولیاں شیر کے پیٹ میں لگی تھیں۔ شیر بڑے زور سے اذیت بھرے انداز میں دہاڑا۔ سارا ماحول ہل کر رہ گیا۔ پرندے چیختے چلّاتے ہوئے درختوں سے اڑ کر اِدھر اُدھر اڑتے چلے گئے۔ جھاڑیوں میں چھپے چھوٹے چھوٹے جانور خرگوش، چوہے، جنگلی بلّے وغیرہ بھاگنے لگے۔ شیر تڑپ تڑپ کر کراہنے لگا۔ اس کے اردگرد اس کے خون کا چشمہ سا بن گیا تھا۔ منظر بڑا بھیانک تھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد ہم لوگ درختوں سے اتر آئے۔ ہم لوگوں نے دور ہی سے.... آدم خور پر پتھر پھینکنے شروع کردیے کہ اس کے مردہ ہونے کا یقین ہوجائے۔ جب یقین کامل ہوگیا تو ہم لوگوں نے آگے بڑھ کر آدم خور کا معائنہ شروع کردیا۔ ہمارے ڈھلوان والے ساتھیوں کی گولیاں اس کے پاؤں کے جوڑوں میں اور میری گولیاں اس کے پاؤں کے معذور ہوگیا تھا۔ سرسری معائنے سے پتا چلتا تھا کہ آدم خور شیر جوان ہے اور وزن کوئی ڈھائی من سے زیادہ ہے۔ لمبائی چھ فٹ کے قریب تھی۔ ایک بوڑھے چرواہے کو گاؤں روانہ کردیا گیا۔ گاؤں سے مردوں، عورتوں اور لڑکوں کا ہجوم آپہنچا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعدِ قید

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

لوگ اس کی پرستش پر مجبور تھے۔ ہر ایک اس کے لیے رطب اللسان تھا۔ لوگ تعریف کرکے نہیں تھکتے تھے کیونکہ وہ ایک خطرناک مجرم تھا۔ اس نے امریکا اور کینیڈا کے محکمہ پولیس کی نیندیں اڑادی تھیں مگر اب جرم کے خلاف جہاد میں مصروف تھا۔ اسے خاصی پذیرائی مل رہی تھی کہ اس کے چہرے کا ملمّع اترگیا۔

دورُخی زندگی گزارنے والے انوکھے مجرم کی کتھا

دروازے پر مسلسل دستک دی جارہی تھی لیکن نارمن ریان رات بہت دیر سے سویا تھا اس لیے اس کی آنکھ نہیں کھلی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھا۔ غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ تکیے کے نیچے رینگ گیا مگر ریوالور وہاں کہاں تھا۔ نارمن اپنی حرکت پر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔ کوئی اس کے کمرے کا دروازہ پیٹ رہا تھا۔

اس کے لیے اب اسے ریوالور نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ صرف نارمن ریان تھا۔ چور، بدمعاش یا ڈاکو نارمن نہیں تھا۔

ریوالور، گولیاں، فائرنگ، یہ سب اس کے ماضی کی باتیں تھیں۔ کینیڈا میں ہر شخص جانتا تھا کہ اب اس کا دامن ان تمام برائیوں سے بالکل پاک ہے۔ پورے ملک میں کوئی سابق چور، سابق بدمعاش، سابق ڈاکو بھی اس عزت احترام کا مستحق نہیں ٹھہرا جو نارمن ریان کو حاصل تھا۔

نارمن نے ایک جماہی لے کر سرہانے رکھا ہوا گون پہنا اور ننگے پیر ہی دروازہ کھولنے چل دیا۔ پٹ کھلتے ہی اسے دو چیزیں ایک ساتھ نظر آئیں۔ پہلی چیز ایک سرخ آنکھوں والا ستا ہوا خوف زدہ سا چہرہ تھا اور دوسری چیز اعشاریہ 38 بور کا ریوالور جس کی نال اس کے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

نووارد اجنبی دروازہ کھلتے ہی نارمن کو دھکا دے کر کمرے میں گھس آیا۔

”تم ریان ہو نا؟“ اس نے پوچھا۔ نارمن نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔“ اجنبی نے کہا۔ ”میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور نہیں جانتا کہ کیا کروں؟“

”کیسی مصیبت؟“ نارمن نے سوال کیا۔

جواب میں اس شخص نے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کا ایک بنڈل نکالا اور کمرے میں رکھی ہوئی میز پر اچھال دیا۔

”شاید میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”میں ابھی ایک بیکری لوٹ کر آرہا ہوں۔“

”اور اب کیا کرنا چاہتے ہو؟“ نارمن نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ اس شخص نے اپنی دھن میں جواب دیا۔ ”پہلے ہی میری پریشانیاں کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ چوری مجھے برباد کردے گی۔ دس سال سے کم سزا نہیں ہوگی، بیکری کے کلرک نے مجھے دیکھ لیا ہے اور وہ یقیناً تصویر دیکھ کر مجھے پہچان لے گا۔“

”اگر تم یہ سب کچھ پہلے سے جانتے تھے تو تم نے یہ حرکت کی ہی کیوں؟“

اس شخص نے اپنا ریوالور بھی میز پر رکھ دیا۔ ”مجھے روپے کی شدید ضرورت تھی۔ مگر میری جیب میں ایک سینٹ تک نہیں تھا۔ میری ماں بہت بیمار ہے۔ اس کے علاج کے لیے کسی نہ کسی طرح رقم فراہم کرنی تھی۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔“

”مگر تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟“ نارمن نے پوچھا۔

”اس لیے کہ اب تم ایک بااثر آدمی ہو اور اس معاملے کو رفع دفع کراسکتے ہو۔ یہ رقم لے جاکر بیکری والے کو

واپس کردو اور پولیس سے کہو کہ وہ اس سلسلے میں مزید کوئی کارروائی نہ کرے۔ پولیس تمہاری بات نہیں ٹال سکے گی۔“

”بے شک پولیس میری بات رد نہیں کرے گی۔“ نارمن نے کہا۔ ”تمہیں گرفتار بھی نہیں کیا جائے گا۔ مگر کب تک......؟ ہفتے دو ہفتے بعد پھر تم کوئی اور حرکت کربیٹھو گے۔ ہوسکتا ہے کسی کو قتل ہی کردو۔ نا بابا نہ میں اس معاملے میں پڑنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“

”میرا یقین کرو، میں اب کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔“ اس شخص نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ میں صرف ایک شرط پر تمہیں اس مصیبت سے نجات دلاسکتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ تم آئندہ جائز طریقے سے محنت کرکے روزی کمانے کا وعدہ کرو۔ میں خود تمہارے لیے کوئی ملازمت تلاش کردوں گا... اور تم پوری دیانت داری سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دوگے۔“

اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں اس مہربانی کا تو تصور بھی نہیں کرسکتا۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اگر تم میرے لیے اتنا کچھ کرسکتے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ تم اس دنیا کے عظیم ترین انسان ہو۔ بلکہ انسان نہیں فرشتہ ہو۔“

اور نارمن ریان نے جو کچھ کہا تھا کردکھایا۔ وہ بیکری والے سے جاکر ملا، جرائم کے خلاف اس کی مجاہدانہ کوششوں نے پورے ملک میں اس کا نام مشہور کردیا تھا۔

ہر فرد اور ہر طبقہ اس کے خیالات کی حمایت کرتا تھا۔ سوسائٹی کے معزز لوگ ہوں یا انتظامیہ کے اعلیٰ حکام۔ حد یہ کہ وزیراعظم تک اس کے مداحوں میں شامل تھے۔ نارمن نے بیکری والے کو لوٹی ہوئی رقم واپس کردی اور پولیس افسروں سے یہ وعدہ لینے میں بھی کامیاب ہوگیا کہ وہ یہ کیس ختم کردیں گے۔ پھر اس نے ایک بڑے کارخانے دار کو فون کرکے اس شخص کے لیے ملازمت کا بندوبست بھی کردیا۔

The Globe.

RED RYAN, PAL, OFFICER ARE SLAIN

Three Shot Dead in Sarnia Liquor Store Hold-Up

ARABS KILL BRITISH SOLDIER

MESSENGER REPEATS ON THEFT TOUR

Ryan Kills Policeman Before Bullet Blast Ends Career of Crime

NAZIS DENIED SACRAMENTS IN HOLLAND

SEVEN DROWN WHEN 2 BOATS ARE CAPSIZED

Markham Murder Is Laid to Ryan

The Globe, May 25, 1936

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس طرح کے نیک کام نارمن ریان کی زندگی کا معمول بن چکے تھے۔ لیکن اس واقعے کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ یہ نارمن کا آخری اصلاحی کارنامہ تھا۔ ایک گولی عنقریب اس کی مختصر ایماندار زندگی کا خاتمہ کرنے والی تھی۔

نارمن ریان ایک ایسا آدمی تھا جسے کینیڈا کی تاریخ کا حیرت انگیز مجرم بن کر ابھرنا تھا۔

وہ 1895 میں ٹورنٹو کے ایک شریف آئرش خاندان میں پیدا ہوا تھا۔ قانون سے اس کا پہلا تصادم اس وقت ہوا جب اس کی عمر صرف تیرہ سال تھی۔ اس نے ایک سائیکل چرائی تھی اور پکڑا گیا۔ یہ محض ابتدا تھی۔ اس کے بعد نوجوان ریان جرم کی دنیا میں برابر آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ 1909ء میں اسے لوٹ مار، ڈاکا زنی اور مار پیٹ کے مختلف جرائم میں بارہ سال کی سزا ہوگئی۔

وہ 1921ء تک جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بند رہا۔ بعد میں جب اس نے بدی کے خلاف اپنی جنگ شروع کی تو وہ اپنے بارے میں اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ ایک ایسا احمق نوجوان تھا جس نے ایسی زندگی اختیار کی جو ذلت و رسوائی کے اندھیروں سے شروع ہو کر جیل کی تاریک کوٹھری میں ختم ہوتی ہے۔

☆☆☆

بارہ سال جیل میں گزارنے کے بعد رہا ہوا تو اس کے ارادے کہیں اور بلند ہوگئے۔ اس نے ایک بڑا بینک لوٹنے کا منصوبہ بنایا مگر بدقسمتی سے عمل درآمد کرنے سے پہلے پکڑا گیا۔ اس مرتبہ اسے سات سال کی سزا سنائی گئی اور کنگسٹن کے قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ لیکن وہ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جیل میں اس کا رویہ اتنا باغیانہ اور سرکشی کا تھا کہ سارے حکام اس کی اصلاح سے مایوس ہو چکے تھے، اسے پیرول پر رہا کرنا بھی خطرناک سمجھا جانے لگا تھا۔ لیکن نارمن سات سال تک جیل میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔

پیرول پر رہائی کی بھی اسے چنداں فکر نہیں تھی۔ اس نے چار دوسرے مجرموں کے ساتھ مل کر جیل کی فیکٹری سے ضروری اوزار چوری کیے اور دو سال بعد ہی پہریداروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قید خانے سے بھاگ نکلا۔

پولیس نے بلڈ ہاؤنڈ کتوں کے ساتھ اس کا تعاقب کیا اور ایک دلدلی علاقے میں اسے چاروں ساتھیوں سمیت گھیر لیا۔ نارمن اور اس کے دوست ایک ندی کے اندر اتر گئے۔

پانی کے نیچے چھپے ہوئے وہ نرکلوں سے سانس لیتے رہے۔

تعاقب کرنے والوں نے سمجھا کہ وہ دریا پار کر گئے ہیں۔ وہ بھی کشتیوں کے ذریعے دوسری طرف پہنچے مگر یہاں کتے ان کی بو پانے میں ناکام رہے۔ کئی گھنٹے ضائع کرنے کے بعد پولیس آخر واپس چلی گئی۔

سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے پانچوں قیدی پانی سے باہر نکلے۔ وہ اس ڈر سے آگ بھی نہیں جلا سکتے تھے کہ آگ کا دھواں کہیں قانون کے محافظوں کو پھر ان کی طرف متوجہ نہ کر دے۔ وہ سب دوسرے دن صبح تک سردی میں کانپتے رہے۔ نارمن نے سورج طلوع ہوتے ہی بستی کی جانب قدم بڑھا دیئے اور آبادی میں آ کر پہلی جو کار نظر آئی اسے چرا لیا پھر وہ اس کار میں ٹورنٹو پہنچ گئے۔

اپنے فرار کے ایک ہفتے بعد یہ گروہ مختلف چھوٹی چھوٹی چوریوں کے ذریعے لباس اور ہتھیار حاصل کر چکا تھا۔ مسلح ہوتے ہی نارمن نے اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لیے بینک آف نووا اسکوٹیا کی ٹورنٹو برانچ پر ڈاکا مارا اور پچھتر سیکنڈ کی مختصر کارروائی کے بعد ساڑھے تین ہزار ڈالر اڑانے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ کوئی بڑی ڈکیتی نہیں تھی۔ لیکن پانچوں ساتھی اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے کسی معقول رقم کے خواہش مند ضرور تھے۔

بہرطور..... رقم ہاتھ میں آتے ہی انہوں نے نہایت مناسب فیصلہ کیا کہ اگر وہ ایک ساتھ رہے تو ان کے پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ اس لیے انہیں اپنا اپنا حصہ لے کر الگ الگ ہو جانا چاہیے۔

مگر نارمن اور ایک دوسرے مفرور آرتھر براؤن نے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ونڈسر کے سرحدی شہر سے ریاست ہائے متحدہ امریکا میں داخل ہوئے۔ جہاں انہوں نے مینا پولس اور سینٹ پال کو اپنی آئندہ کارروائیوں کے لیے مرکز قرار دیا۔

بدقسمتی سے انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک مخبر نے انہیں دیکھ کر نہ صرف پہچان لیا ہے بلکہ فوراً ہی اس کی اطلاع بھی پولیس کو دے دی ہے۔ امریکا میں ان کی موجودگی کی خبر کینیڈا بھیجی گئی جہاں سے انسپکٹر والٹر اور کنگسٹن جیل کے ڈپٹی وارڈن ٹکر کو ان کی گرفتاری کے لیے روانہ کیا گیا۔

نارمن اور آرتھر براؤن کے فوٹو کثیر تعداد میں چھپوائے گئے اور انہیں دس ملحقہ ریاستوں کے پولیس اسٹیشن بھیج دیئے گئے۔ جہاں جہاں ان کے دیکھے جانے کی خبر ملتی، پولیس فوراً اس مقام پر پہنچ کر تحقیقات شروع کر دیتی۔ لیکن کافی دوڑ دھوپ کے بعد بھی نارمن اور اس کا دوست گرفتار نہیں کیے جا سکے۔ یہاں تک کہ خود نارمن نے اس کا موقع فراہم کر دیا۔ اس نے ایک رات کسی عورت کے ساتھ گزاری اور وہ اسے اتنی پسند آئی کہ اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اتنا ہی نہیں اس نے یہ خوش خبری اپنے رشتے داروں کو پہنچانی بھی ضروری سمجھی۔ پولیس کو جو اس کے دوستوں اور عزیزوں کی ڈاک پر کڑی نگاہ رکھے ہوئے تھی کسی ایسے ہی سنہرے موقع کی تلاش تھی۔ اس نے خاموشی سے اس پوسٹ بکس نمبر اور مقام نوٹ کیا، جسے نارمن نے جوابی پتے کے طور پر لکھا تھا اور خط متعلقہ فرد کو پوسٹ کر دیا۔

دو دن بعد پولیس اس ڈاک خانے کی نگرانی پر مامور کر دی گئی۔ جیسے ہی نارمن اور آرتھر اپنی ڈاک لینے وہاں پہنچے ایک کلرک نے ان کی نشاندہی کر دی۔ نارمن نے کلرک کو اشارہ کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنا ریوالور نکالتا، سادہ لباس والے پولیس سراغ رساں کی گولی نے اس کا پاؤں زخمی کر دیا اور وہ فرش پر گر گیا۔

اثنائے راہ..... آرتھر کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے پولیس کو تعاقب سے باز رکھنے کے لیے ڈاک خانے پر کئی گولیاں بھی چلائیں۔ اس فائرنگ نے قریب کھڑے ہوئے ایک ٹریفک کانسٹیبل کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ اسے پکڑنے دوڑا تو آرتھر نے اس کے پیٹ میں گولی مار دی۔ اس کے بعد وہ ایک کباڑیے کی دکان میں گھس کر اس کے عقبی دروازے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

نارمن ریان کو مینا پولس کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔ پولیس اس امکان پر غور کر رہی تھی کہ اگر آرتھر کی گولی سے زخمی ٹریفک کانسٹیبل مر جاتا ہے تو نارمن پر قتل کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے یا نہیں.....

نارمن کے وکیل کا استدلال تھا کہ اس کا موکل ڈاک خانے کے اندر ہی زخمی ہو کر گر پڑا تھا جبکہ کانسٹیبل کو ڈاک خانے کے باہر آرتھر نے فرار ہوتے ہوئے گولی ماری تھی اور یہ واقعہ اس کے زخمی ہونے کے بعد پیش آیا۔ اس لیے اسے کسی بھی طرح قتل یا اقدامِ قتل کا مرتکب نہیں سمجھا جا سکتا۔

بہرطور خوش قسمتی سے ٹریفک کانسٹیبل بچ گیا۔ چنانچہ مینا پولس کے حکام نے نارمن کو کینیڈا کی پولیس کے حوالے کر دیا تاکہ وہاں اس پر ٹورنٹو میں بینک لوٹنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے۔

آرتھر براؤن کو کبھی ٹورنٹو نہیں لایا جا سکا۔ اسے مینا پولس نے ایک عورت کے مکان میں گھیر لیا تھا جہاں وہ پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارا گیا۔

اپنے مقدمے کی سماعت کے دوران نارمن نے مختلف چوریوں اور ڈکیتیوں کا اعتراف کرتے ہوئے ڈینگ ماری کہ وہ اب تک دو لاکھ ڈالر حاصل کر چکا ہے۔ ان میں پانچ ہزار ڈالر کی ایک ایسی بینک ڈکیتی بھی شامل تھی جس کے بارے میں پولیس کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ نارمن کا کارنامہ ہو سکتا ہے۔

عدالت نے اس کے مجرمانہ ریکارڈ کے پیشِ نظر کسی قسم کی رعایت یا ہمدردی سے کام نہیں لیا اور جج نے اس کے متعلق انتہائی سخت تبصرہ کرتے ہوئے اسے دوبارہ کنگسٹن کے جیل خانے میں بھیج دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے عمر قید کی سزا سنا دی۔

☆☆☆

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب نارمن ریان جیتے جی قید خانے سے باہر نہیں آ سکے گا۔ کیونکہ اس جیسے عادی مجرموں کے لیے پیرول پر رہا ہونے کا امکان بھی نہ ہونے کا برابر تھا۔ لیکن نارمن کے بارے میں حکام اور پبلک کا اندازہ ایک بار پھر غلط ثابت ہوا۔

جج کی زبانی اپنی تقدیر کا فیصلہ سننے کے بعد ہی سے اس میں ایک عجیب تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوگئی تھی اور جب اسے کنگسٹن کے جیل خانے میں واپس بھیجا گیا تو وہ ایک بالکل مختلف آدمی نظر آ رہا تھا۔

جیل خانے کے حکام ایک سرکش اور فسادی عادی مجرم کے استقبال کی تیاری کر رہے تھے مگر نارمن ریان ایک صلح جو قناعت پسند اور خاموش طبع انسان کی حیثیت سے ان کے سامنے پہنچا تھا۔

کنگسٹن کے حکام کو یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوا کہ نارمن جیل میں اپنے پرانے ساتھیوں یا دوسرے عام بدمعاشوں سے بھی کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا تھا۔

نارمن کی اس حیرت انگیز تبدیلی کا ایک خوشگوار اثر فوراً ظاہر ہوگیا۔ عدالت نے اسے عمر قید کے ساتھ تیس کوڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

مارنے کی بھی سزا سنائی تھی مگر یہ سزا اسے نہیں دی گئی۔

نارمن نے جلد ہی اپنے آپ کو جیل کے مختلف کاموں میں مصروف کرلیا۔ اپنے خالی وقت میں وہ ایک ایسا قفل ایجاد کرنے میں لگا رہتا جسے چور اور ڈاکو نہ توڑ سکیں۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس کی ایک عادی مجرم سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے شریفانہ اطوار سے خوش ہوکر وارڈن نے اسے اس کی ایجاد کے سلسلے میں کام کرنے کی ہر ممکن سہولت فراہم کی۔ دو سال کی محنت اور مسلسل کوششوں کے بعد آخر نارمن سچ مچ ایک ایسا قفل بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اپنی ایجاد کینیڈین حکومت کو بھیجی تاکہ یہ تالا بڑے پیمانے پر تیار کرکے بینکوں اور ڈاک خانوں میں استعمال کیا جاسکے۔ ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ اسے اپنی ایجاد کے سلسلے میں کسی قسم کے معاوضے کی خواہش نہیں ہے۔

ڈاک خانے والوں نے اس کے قفل کو کارآمد قرار دیا مگر چونکہ وہ بے حد وزنی اور بڑا تھا اس لیے عملی طور پر اس کی افادیت کچھ زیادہ نہیں تھی۔ اگرچہ نارمن کی ایجاد شکریے کے ساتھ اسے واپس کردی گئی تھی، مگر اخبارات میں اس واقعے کی بڑی تشہیر ہوئی۔ کچھ اخبارات نے اس سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور افسوس کیا کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے میں اس وقت کامیاب ہوا جب اس کی زندگی عملاً اس کے کسی کام نہیں آسکتی۔

نارمن نے اخبارات کے مدیروں کو خطوط لکھ کر ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور پُرزور الفاظ میں یقین دلایا کہ ”کوئی شخص اپنے گناہوں پر اتنا شرمندہ اور تائب نہ ہوگا جتنا میں ہوں۔ کسی کو اپنی زندگی اکارت جانے کا اتنا افسوس نہ ہوگا جتنا کہ مجھے ہے، میرے لیے اس دنیا اور زندگی میں کوئی جاذبیت کوئی کشش نہیں رہ گئی ہے۔ صرف ایک امید ہے جس کے سہارے جینے کی کوشش کررہا ہوں کہ شاید میری زندگی کے واقعات اس نوجوان نسل کی رہنمائی کرسکیں جو اندھادھند جرم و گناہ کے راستوں پر دوڑتی چلی جارہی ہے۔“

☆☆☆

نارمن ریان نے ان پولیس افسروں کو بھی خطوط لکھے جو اسے گرفتار کرانے کی جدوجہد میں شریک رہے تھے، اس نے اس سرکاری وکیل کی بھی تعریف کی جس نے اس کے خلاف مقدمہ لڑا تھا اور ان جج صاحب کے فیصلے کو بھی سراہا جن کی عدالت نے اسے عمر قید کی سزا دی تھی۔

تقریباً ہر خط میں اس نے اسی خیال کا اظہار کیا تھا کہ جرائم کی زندگی کبھی سرسبز نہیں ہوتی، ان میں سے بہت سے خطوط اخبارات میں بھی شائع ہوئے اور آہستہ آہستہ عوام میں یہ احساس اجاگر ہونے لگا کہ نارمن کی زندگی بہرحال اتنی رائگاں نہیں جتنی وہ سمجھتے تھے اور یہ کہ اب بھی اسے بچانے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

ایک پادری جو کنگسٹن کے جیل خانے میں عام طور پر نارمن سے ملنے جاتا رہتا تھا۔ اس کی ذہنی و روحانی تبدیلی سے بے حد متاثر ہوا۔ ٹورنٹو کے ایک بااثر اخبار کا مدیر بھی اس کے مداحوں میں شامل ہوگیا۔ وہ اپنے اخبار میں اکثر نارمن کے خطوط شائع کرنے لگا یہاں تک کہ اس جج نے بھی جس نے نارمن کو زندگی بھر کے لیے جیل کی سزا دی تھی، اور جو ملک کے سخت انصاف پسند ججوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔ ایک اخباری بیان میں اعلان کیا کہ اس کے خیال میں اب نارمن ریان نے اپنے آپ کو آزادی کا مستحق ثابت کردیا ہے۔

نارمن نے اپنی ذہنی تبدیلی کی ایک روشن مثال پیش کی جس کے بعد شاید ہی کسی کو اس کی نیک نیتی اور شرافت میں شبہ ہوتا۔ ہوا یہ کہ جب کنگسٹن کے پانچ سو قیدیوں نے مسلح بغاوت کردی اور جیل خانے کے عملے کو قابو میں کرکے فرار ہونے کی کوشش کی تو نارمن نے نہ صرف یہ کہ ان کا ساتھ دینے سے انکار کردیا... بلکہ ان کے خلاف لڑ کر عملے کی زندگی بچانے کے علاوہ دو سرغنہ قیدیوں کو بھی گرفتار کرلیا۔ اس کی مزاحمت نے بغاوت کچلنے اور قیدیوں پر دوبارہ قابو پانے میں حکام کی بے حد مدد کی۔

اس واقعے کی خبر جب اخبارات میں آئی تو نارمن عوام کی نظروں میں ایک ہیرو کی حیثیت اختیار کرگیا۔ 1932ء کے اواخر میں نارمن نے پیرول پر رہا کیے جانے کی درخواست دی۔ اس وقت تک ملک کے سیکڑوں، ہزاروں افراد اس کے ہمدرد اور ہمنوا ہو چکے تھے۔ اور جب پیرول بورڈ نے اس کی درخواست مسترد کردی تو اخبارات نے اس فیصلے کے خلاف خبروں اور اداریوں کا ایک طوفان کھڑا کردیا۔

ایک اخبار نے لکھا۔ ”اگر نارمن ریان..... ابھی تک اپنی اصلاح اور تائب زندگی سے حکام کو مطمئن نہیں کرسکا تو ہم نہیں سمجھتے کہ کینیڈا میں کوئی بھی مجرم پیرول پر رہا ہونے کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔“

اتفاق سے نارمن کی درخواست مسترد کیے جانے کے کچھ دن بعد اس کی بہن کا انتقال ہوگیا، جیل کے حکام نے

عوامی دباؤ کے پیشِ نظر اسے مسلح گارڈ کی نگرانی میں بہن کی تدفین میں شریک ہونے کی اجازت دے دی۔ پھر جب بہن کی قبر پر آنسو بہاتے ہوئے نارمن ریان کے فوٹو اخبارات میں شائع ہوئے تو نہ صرف اس کے ہمدردوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہوگیا بلکہ انہوں نے ملک کی ایک نمایاں ترین شخصیت کا دل بھی گداز کردیا۔

کینیڈا کے وزیراعظم نے محسوس کیا کہ اب وقت آگیا ہے جب نارمن کو معاشرے میں اپنا صحیح مقام پیدا کرنے کا موقع دیا جائے.... انہوں نے وزارتِ انصاف کے نام ایک حکم جاری کرتے ہوئے نارمن ریان کو رہا کرنے کی ہدایت دے دی۔

اس کے چند ماہ بعد نارمن نے ایک آزاد انسان کی حیثیت سے کنگسٹن کے جیل خانے سے باہر قدم رکھا۔ عوام کا دشمن نمبر ایک..... اب ہیرو نمبر ون..... بن چکا تھا۔

رہا ہوتے ہی نارمن نے ایک نئی زندگی کی ابتدا کردی تھی۔ اسے ملازمت کی بے شمار پیشکشیں کی گئی تھیں مگر اس نے ایک آٹو موبائل سیلز مین کی نوکری کو اس شرط پر قبول کیا کہ وہ اپنے ذہن میں مختلف اصلاحی پروگرام رکھتا ہے۔ اپنے پروگراموں کو بروئے کار لانے کے لیے اسے وقتاً فوقتاً چھٹی کی ضرورت ہوگی جس پر کارخانے کی انتظامیہ کی جانب سے کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ یہ اس کی زندگی کا مقصد ہے جس کی اہمیت اس کی نظروں میں اپنے پیٹ کے لیے روٹی کمانے سے کہیں زیادہ ہے۔“

نارمن ریان نے اخباروں اور ماہناموں میں درجنوں کے حساب سے مضامین بھی لکھے جن میں جرائم کی گھناؤنی زندگی اور معاشرے پر ان کے برے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ اس نے اس موضوع پر ایک جامع کتاب لکھنے کا اعلان بھی کیا۔ اس نے مختلف مذہبی اور اخلاقی تنظیموں کے جلسوں میں جرائم کے خلاف لیکچر بھی دیئے اور خود اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں لوگوں کو اس شیطانی راستے سے بچ کر چلنے کی تلقین کی۔

وہ بڑی باقاعدگی سے چرچ بھی جایا کرتا تھا اور وہاں وعظ و نصیحت کرتا رہتا تھا۔ اس نے بار بار اس خیال کا اعلان کیا کہ اگر سوسائٹی نے جرائم کے خلاف منظم جدوجہد نہیں کی تو بہت جلد جرم و گناہ کی ایک زبردست لہر اٹھے گی اور عوام کا سکون تہ و بالا کردے گی۔ اس کے ساتھ ہر خط ہر مضمون اور ہر تقریر کے خاتمے پر وہ اپنے اس دلی صدمے کا اظہار بھی کرتا تھا کہ بدی کے خلاف تنہا اس کے جہاد کا کوئی مفید اثر مرتب نہیں ہورہا۔

اس کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی جس کی نشاندہی نارمن کرتا رہا تھا۔

دسمبر 1935ء میں اونٹاریو کے ایک بینک پر ڈاکا پڑا اور ڈاکو کثیر رقم لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ ٹورنٹو کے قریبی شہر مرکھام میں ڈکیتی کی ایک واردات کے بعد فرار ہوتے ہوئے ڈاکوؤں نے ایک معزز شہری کو انتہائی سفاکی سے قتل کردیا۔

چند روز بعد ایک بڑے گروہ نے کیوبک کے ایک بینک پر ڈاکا ڈالا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے بعد گولیاں چلاتے ہوئے فرار ہوگئے۔ بڑے بڑے اسٹورز اور گوداموں کے تالے توڑے جانے لگے اور مزاحمت کرنے والے کئی چوکیداروں کو قتل کیا جانے لگا۔

نارمن حالات کی اس رفتار پر غم و افسوس کا اظہار کرتا رہا۔ اس نے عوام سے اپیل کی کہ وہ مجرموں کو گرفتار کرانے کے سلسلے میں ہر ممکن طریقے پر قانون کی مدد کریں۔ اس نے کہا کہ ”ہر وہ مجرم جو سزا دیے بغیر چھوڑ دیا جاتا ہے، اس برائی اور بدی کو فروغ دینے میں معاون ہوتا ہے جس کے خلاف ہم مصروفِ جہاد ہیں۔“

ہر وقوع پذیر ہونے والا جرم نارمن ریان کے لیے ایک تازہ زخم بن کر نمودار ہوتا تھا۔ اس کی ناامیدی اور مایوسی بڑھتی جارہی تھی کہ اپنے نیک مقصد سے تمام تر جدوجہد کے بعد بھی اسے کوئی کامیابی حاصل نہیں ہورہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنے مقصد سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ سابق مجرم جو اپنے گناہوں پر پشیمان ہوکر اپنی زندگی تبدیل کرنا چاہتے تھے، اسے بہت بڑا سہارا سمجھتے تھے۔ کیونکہ نارمن ریان نے اپنے اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان میں سے بیشتر کو جگہ جگہ کام پر لگا دیا تھا اور انہیں تلقین کرتا رہتا تھا کہ وہ آئندہ نیک دلی سے ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔

نارمن کو ایک شدید غم اس وقت پہنچا جب اس کا بہترین دوست انتقال کرگیا۔ وہ ایڈیٹر جس نے اپنے اخبار کے ذریعے اس کی رہائی کے سلسلے میں ان تھک کوشش کی تھی۔ نارمن اس کے جنازے میں شامل ہوا۔ اس نے بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ”سچی بات یہ ہے کہ میں گزشتہ دنوں اپنے مقصد کی ناکامی سے اتنا بددل اور مایوس ہوگیا تھا کہ اپنا جہاد ختم کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔ لیکن میرے دوست کی اچانک موت نے مجھے نیا عزم اور حوصلہ بخشا ہے۔ اب میں اپنے اس دوست کی یاد میں جس نے میرے لیے اتنا کچھ کیا تھا، بدی کے خلاف اپنی جنگ آخری دم تک لڑنے اور جاری رکھنے کا عہد کرتا ہوں۔“

یہ بیان نارمن کے ہمدردوں اور بہی خواہوں کے لیے ایک خوش خبری سے کم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ سب اس خیال سے افسردہ تھے کہ کہیں ان کا ہیرو مایوس ہوکر اپنی زندگی ہی نہ ختم کرلے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ آج کل نارمن کا طرزِ عمل کچھ عجیب سا ہوگیا ہے۔ وہ بعض اوقات دل گرفتہ ہوکر کئی کئی دن کے لیے غائب ہوجاتا اور اس کے چہرے کا رنگ بھی ان دنوں پھیکا پڑرہا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہوا صرف یہ تھا کہ اس کے گہرے سرخ بال سیاہی مائل ہوگئے تھے جس کی وجہ سے اس کا چہرہ جو پہلے کبھی سرخ و سپید نہیں تھا۔ بالوں کی سیاہی کے پس منظر میں کچھ زرد نظر آنے لگا تھا۔

23 مئی 1936ء کو جبکہ نارمن ریان کا آخری اصلاحی مضمون شائع ہوئے چند ہی دن گزرے تھے دو مسلح آدمی سارنیا کے ایک وائن اسٹور میں داخل ہوئے، اس وقت دکان میں عملے کے افراد کے علاوہ کئی گاہک بھی موجود تھے۔

دونوں ڈاکوؤں نے ان سب کو ایک قطار میں کھڑا کردیا۔ پھر ان میں سے ایک گہرے بھورے بالوں والے دبلے پتلے آدمی نے دکان کے کاؤنٹر سے نقدی اور نوٹ اٹھا اٹھا کر اپنی جیبوں میں بھرنے شروع کردیے۔ ڈکیتی جس منظم اور پُرسکون طریقے پر جاری تھی اس سے مجرموں کا تجربہ کار اور مشاق ہونے کا ثبوت ملتا تھا مگر بدقسمتی سے اس وقت ایک ایسی بات پیش آئی جس کی پہلے سے کسی کو کوئی امید نہیں تھی۔

کسی ڈاکو نے یہ نہیں دیکھا کہ دکان کے دروازے سے.... گزرتے ایک آدمی نے یہ منظر دیکھ کر پولیس کو مطلع کردیا ہے۔ ڈاکو لوٹ مار کرکے جانے ہی والے تھے کہ تین پولیس کانسٹیبل آپہنچے۔ بھورے بالوں والے آدمی نے کسی تامل کے بغیر گولی چلادی۔ ایک کانسٹیبل گر پڑا۔ مگر باقی دو کانسٹیبل یونہی بیکار نہیں کھڑے رہے۔ انہوں نے جوابی فائرنگ کی۔

جب کچھ سکون ہوا تو دیکھا کہ دونوں ڈاکو مردہ حالت میں نیچے پڑے ہوئے تھے۔

اس تازہ ڈکیتی کی واردات کی خبر پورے کینیڈا میں آگ کے شعلوں کی طرح پھیل گئی، جس کی بڑی معقول اور حیرت انگیز وجہ تھی۔ جب ایک ڈاکو کی انگلیوں کے نشانات اس بھورے بالوں والے کے نشانات جس نے کانسٹیبل پر گولی چلائی تھی، پولیس ریکارڈ سے چیک کیے گئے تو انکشاف ہوا کہ وہ نارمن ریان..... کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

بہت سے لوگوں نے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کردیا۔ مگر آخر نہیں یہی نہیں اور بھی بہت سی باتیں تسلیم کرنی پڑیں۔

نارمن کا دوسرا ساتھی ایک اور رسوائے زمانہ ڈاکو ثابت ہوا اور جب اس کے اور اس کے ساتھی کے ریوالور آتشیں اسلحہ کے ماہروں نے چیک کیے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ جرائم کی نئی لہر کا ذمے دار ان دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ایک طرف نارمن عوام اور پولیس کے سامنے بگلا بھگت بنا ہوا تھا تو دوسری جانب وہ پورے صوبے میں ہونے والے بیشتر جرائم کا ارتکاب بھی کررہا تھا۔

اس کے مکروفریب کی داستان کینیڈا کی تاریخ جرائم میں اپنی مثال آپ تھی، جس وقت وہ کسی علاقے کے شرفا کو لیکچر پلار ہا ہوتا تھا، اس وقت اس کا ذہن گردونواح میں اپنے آیندہ شکار کا جائزہ لینے میں بھی مصروف ہوتا تھا۔ یہ دلچسپ انکشاف بھی ہوا کہ عموماً ایسے لیکچر کے بعد اس علاقے میں جرم کی کوئی نہ کوئی واردات ضرور ہوتی تھی۔ نارمن اپنا وعظ ختم کرتے ہی اس بدی کا ارتکاب کرنے دوڑ جاتا تھا جس کے خلاف اس نے کچھ دیر قبل اپنی تقریر ختم کی تھی۔

ان تمام باتوں کے باوجود جہاں تک شہرت کا تعلق ہے تو وہ نارمن ریان کو اپنی زندگی میں بھی اتنی نہ ملی ہوگی جتنی اسے اپنی موت کے بعد حاصل ہوئی۔ اس کے جنازے کے جلوس میں ہزارہا لوگ شریک تھے جو اپنے جذبۂ تجسّس سے مجبور ہوکر اس شخص کی صورت دیکھنے آئے تھے جس نے ان کے حسنِ ظن اور خوش اعتقادی کے ساتھ اتنا زبردست فریب کیا تھا۔ مزید ستم ظریفی یہ کہ بعد میں درجنوں افراد نے پولیس رپورٹ درج کرائی کہ اس ہجوم سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہے۔ نارمن ریان اس وقت جہاں کہیں بھی موجود ہو، یہ سن کر ضرور مسکرایا ہوگا۔

ایک فلمی اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ بالی وڈ کی اتنی بڑی فلمی صنعت میں بدنظمی، بے ترتیبی بہت زیادہ ہے۔ اس کے مقابلے میں تامل ناڈو (چنائے سابق مدراس) میں فلم بندی بہت نظم وضبط کے ساتھ کی جاتی ہے۔ وقت کی پابندی ہر ایک کے لیے لازم ہے خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلم اسٹار کیوں نہ ہو اس کا وقت مقررہ پر سیٹ پر موجود ہونا لازمی ہے۔ شام کو پانچ بجے شوٹنگ ختم کردی جاتی ہے۔ فلموں کے اسکرپٹ مکمل ہوتے ہیں اس لیے ایک دن میں زیادہ کام ہوتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

درمیان میں گپ شپ کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے چالیس دن میں شوٹنگ مکمل ہوجاتی ہے۔

ممبئی کے فلم سازوں کے بارے میں ایک شکایت یہ ہے کہ وہ نظم وضبط کا خیال نہیں کرتے۔ چند بڑے اسٹارز کے سوا سبھی دیر سے سیٹ پر آتے ہیں۔ فلم کا اسکرپٹ مکمل نہیں ہوتا اس لیے سیٹ پر ہدایت کار اور مصنف کے مابین اسکرپٹ کے بارے میں بحث پر بہت وقت ضائع ہوجاتا ہے۔ چنائے کے برعکس یہاں پر کارکن کو اس کی ذمہ داری کے بارے میں پہلے سے آگاہ نہیں کیا جاتا جس کی وجہ سے وہ خودکار مشین کی طرح کام نہیں کرتے۔ چنائے میں ہالی وڈ کے انداز میں کام ہوتا ہے۔ اسکرپٹ مکمل ہوتا ہے۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر اور کیمرامین کو پہلے ہی ان کے کاموں کے بارے میں بتادیا جاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ ایک شاٹ مکمل ہونے کے بعد ہدایت کار اپنی کرسی پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ باقی لوگ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہدایت کار کو مطلع کرتے ہیں۔ ہر اداکار کو اپنے مکالمے یاد ہوتے ہیں کیونکہ یہ پہلے ہی انہیں دے دیئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے دوسرا شاٹ منٹوں میں اوکے ہوجاتا ہے۔

ممبئی کے بہت سے فلم ساز قسطوں میں معاوضہ ادا کرتے ہیں اور عام طور پر نصف معاوضہ فلم کی ریلیز کے وقت ادا کیا جاتا ہے مگر ایسے فلم سازوں کی کمی نہیں ہے جو باقی رقم ادا کرتے وقت معذرت کردیتے ہیں کہ فلم اوور بجٹ ہوگئی۔ (لاگت زیادہ ہوگئی) اس لیے فلم ساز کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح وہ اداکاروں کا معاوضہ ہضم کرجاتے ہیں۔

ہالی وڈ میں آج کل ہالی وڈ سے زیادہ فلمیں بنائی جاتی ہیں جن پر کروڑوں کی لاگت آتی ہے اور فلمیں اربوں روپے کمائی ہیں اس کے باوجود بڑے اداکاروں کا معاوضہ نہ دینے کی بات عجیب سی لگتی ہے۔

اب تو ہمارے ہاں فلم انڈسٹری ہی مفلوج ہوچکی ہے مگر جن دنوں یہاں فلمی صنعت کا عروج تھا اس وقت یہاں بھی بالکل یہی صورتِ حال تھی۔ فلم کی لاگت بڑھ جانے اور ڈسٹری بیوٹرز کی طرف سے پوری رقم نہ ملنے کے بہانے اکثر فلم ساز اداکاروں کا بقایا ہضم کرلیا کرتے تھے بلکہ ان کے سامنے اپنی پریشانیوں اور مفلسی کا رونا اس طرح روتے تھے کہ اداکاروں کو بھی ترس آجاتا تھا اور وہ صبر کرکے بیٹھ جاتے تھے۔ فلموں کی شوٹنگ کے بارے میں بھی ممبئی جیسی ہی صورتِ حال تھی۔ اسکرپٹ مکمل نہ ہونے کی وجہ سے سیٹ پر کام رک جاتا تھا۔ کیونکہ ہدایت کار اور کہانی نویس بحث میں مصروف ہوجاتے تھے۔ اس کے بعد اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی ڈیوٹی تھی کہ وہ مکالمے اداکاروں کو یاد کرائے کیونکہ انہیں پہلے سے مکالمے اور اسکرپٹ نہیں دیا جاتا تھا۔

وقت کی پابندی کے بارے میں بھارتی میگزین نے لکھا ہے کہ دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور نرگس کے سوا کوئی فنکار وقت پر سیٹ پر نہیں پہنچتا تھا۔ ہماری فلمی صنعت میں بھی شوٹنگ کے لیے بروقت پہنچ جانا ہر فن کار ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ جو اداکار وقت پر سیٹ پر پہنچ جاتے تھے ان میں محمد علی، وحید مراد اور شبنم، آغا طالش شامل ہیں۔ محمد علی ایک زمانے میں ایک دن میں تین فلموں میں شوٹنگ کرتے تھے یعنی صبح سات بجے سے دس بجے تک ٹیڈی شفٹ، ساڑھے دس سے چھ بجے شام تک دوسری شفٹ اور سات بجے سے رات گئے، بعض اوقات صبح تک تیسری شفٹ۔ اس کے باوجود وہ صبح کی شفٹ پر بروقت پہنچ جاتے تھے۔ ہماری فلم ساز کی حیثیت سے پہلی فلم ''کنیز'' تھی جس کے ایک گانے کی فلم بندی میں تیرہ مہینے لگ گئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ یہ ایک گانا تھا جس میں محمد علی، زیبا اور وحید مراد تینوں شامل تھے۔ یہ تینوں اداکار ان دنوں بہت مصروف ہوگئے تھے اس لیے تینوں کی ایک ہی دن اور ایک ہی وقت کی ڈیٹ لینا بہت مشکل تھا۔ ڈیٹ مل جاتی تھی تو کوئی بیمار ہوجاتا تھا۔ کسی کی فلائٹ لیٹ ہوجاتی تھی۔ کسی کو مری سے آتے ہوئے دیر ہوجاتی تھی۔ محمد علی ان دنوں تین فلموں کی شوٹنگ کررہے تھے۔ فلم ''جان پہچان'' کی شوٹنگ رات گئے تک جاری رہتی تھی۔

ایک بار محمد علی صاحب جان پہچان کی شوٹنگ ختم کرکے صبح چھ بجے اپنے گھر پہنچے۔ شیو کیا، نہادھو کر تیار ہوئے اور سات بجے صبح آؤٹ ڈور لوکیشن پر پہنچ گئے۔ کار کی بڑی سیٹ باہر نکالی ایک درخت کے سائے میں بچھائی اور سوگئے۔

زیبا لاہور پہنچ چکی تھیں۔ ان کا صبح سویرے فون آیا کہ مجھے شدید بخار ہوگیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہنس پڑیں۔

ہم نے پوچھا۔ ''بخار کی خوش خبری سناتے ہوئے ہنسنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ کوئی نیا بہانہ ہے؟''

کہنے لگیں ''میں یہی سمجھتی تھی کہ یہ سن کر تم یہی کہو گے۔ یقین نہ آئے تو خود آکر دیکھ لو۔''

ہم گلبرگ میں ان کی کوٹھی پر پہنچے تو ہمیں دیکھ کر وہ

کی والدہ لالی جی بھی ہنس پڑیں۔

ہم نے پوچھا۔ ''لالی جی کیا واقعی زیبا بیمار ہیں یا کوئی بہانہ ہے؟''

کہنے لگیں ''یہی سوچ کر میں ہنس رہی تھی۔ تم خود اندر جا کر دیکھ لو، زیبا کو واقعی بہت تیز بخار ہے۔''

بیڈروم میں زیبا نیم دراز تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر دوائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں واقعی بہت تیز بخار تھا لہٰذا شوٹنگ کینسل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ لوکیشن پر پہنچے تو محمد علی صاحب درختوں کی چھاؤں میں کار کی سیٹ پر بے خبر سو رہے تھے۔ ہم نے انہیں جگایا اور مطلع کیا کہ شوٹنگ کینسل ہوگئی ہے۔

وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ''مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

ہم نے کہا کہ پروڈکشن منیجر بھول گیا تھا۔ اس کو بھی صبح سویرے ہی خبر ملی تھی اور اسے سارے انتظامات کینسل کرنے تھے۔

محمد علی مسکراتے ہوئے اٹھے۔ کار میں سیٹ رکھی اور رخصت ہوگئے۔

محمد علی اور شبنم ہمارے ساتھ فلم ''میرے ہم سفر'' کی شوٹنگ کے لیے یورپ بھی گئے تھے۔ ''آندھی یا طوفان، شوٹنگ ہو یا ملتوی ہوجائے، محمد علی اور شبنم ٹھیک صبح سات بجے ہوٹل کی لابی میں موجود ہوتے تھے۔ وحید مراد اور آغا طالش کا بھی یہی دستور تھا۔ ہمارے لڑنے جھگڑنے کی وجہ سے دوسرے اداکار بھی عموماً ہماری شوٹنگ پر مقررہ وقت پر پہنچ جاتے تھے لیکن فلمی صنعت میں عام طور پر رواج یہی تھا کہ وقت پر کوئی بھی شوٹنگ پر نہیں پہنچتا تھا۔

آپ نے کبھی غور کیا کہ فلموں کے ولن اب کہاں چلے گئے؟

پچھلے دنوں انڈیا کے معروف ولن اور کیریکٹر ایکٹر امریش پوری کی خودنوشت پڑھتے ہوئے اچانک یہ خیال آیا۔ امریش بھی اپنی سوانح لکھنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ ان کے حالاتِ زندگی، تجربات اور تاثرات پڑھ کر بہت کچھ حاصل ہوتا ہے۔

انہوں نے 40 سال کی عمر میں اداکاری شروع کی تھی اور اداکاری کا آغاز تھیٹر سے کیا تھا۔ انہوں نے تھیٹر کے عظیم ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے درجنوں مشہور ڈراموں میں کام کیا

اور تھیٹر کی دنیا میں مشہور ہوگئے۔ جب فلموں میں اداکاری کی تو انہیں بہت چھوٹے چھوٹے اور معمولی کردار ملے لیکن ان کا دراز قد، تیکھے مگر کرخت نقوش اور گونجدار آواز کے باعث ان کی اداکاری کو پسند کیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب وہ ہدایت کاروں کی نظروں میں آئے تو انہیں بڑے اور اہم کردار ملنے لگے۔ اب ان کا شمار ممتاز منفی اداکاروں (ولن) میں ہونے لگا۔ اوپر تلے فلمیں کامیاب ہونے لگیں۔ امریش پوری کو بہت اچھے ہدایت کاروں اور فلم سازوں نے اپنی فلموں میں اہم کردار دینے شروع کردیے۔ یہاں تک کہ ہالی وڈ کے معروف ہدایت کار مارک سیگل نے انہیں اپنی ایک فلم میں ایک اچھا کردار دیا اور ان کی اداکاری سے اتنے خوش ہوئے کہ انہیں تعریفی سرٹیفکیٹ دیا اور خواہش ظاہر کی کہ اگر کوئی اور کردار ان کے لیے موزوں لگا تو وہ انہیں ضرور اپنی فلم میں کاسٹ کریں گے۔

امریش پوری پنجابی تھے لیکن اپنے والد کی ملازمت کے باعث مختلف شہروں میں رہے۔ ابتدائی تعلیم شملہ میں حاصل کی۔ اس کے بعد جالندھر اور دہلی جا کر رہنے لگے۔ تعلیم مکمل کرنے کا موقع ملا۔ اداکاری کا کیڑا ان کے دماغ میں کلبلاتا رہتا تھا۔ بمبئی پہنچ کر انہوں نے وہیں اپنا ٹھکانا بنالیا۔ انہوں نے تامل، تیلگو اور ملیالم فلموں میں بھی کام کیا۔ وہ ان زبانوں سے بالکل ناواقف تھے مگر اپنے مکالمے انگریزی میں لکھ کر یاد کرلیا کرتے تھے۔ مکالموں کا مفہوم انہیں ہدایت کار سمجھا دیا کرتے تھے اس لیے فلم دیکھنے والوں کو شبہ بھی نہیں گزرتا تھا کہ وہ یہ زبان نہیں جانتے۔ جب ان علاقوں کے فلم بین ان سے آٹو گراف لیتے اور اپنی زبان میں ان سے بات کرتے تو یہ جان کر حیران ہوجاتے تھے کہ وہ اس زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔

امریش پوری نے چار سو سے زائد فلموں اور ڈراموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

صنعت کی ''خدمت'' کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ فلم سازوں کو فلم بنانے کے لیے خام فلم دینے کا لائسنس جاری کرنے کا اختیار حاصل کرلیا۔ لائسنس جاری کرنے کے عوض نیفڈیک کمیشن وصول کرتی تھی جسے فلمی صنعت پر ''جرمانہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ رفتہ رفتہ نیفڈیک ختم ہوگئی۔ دفاتر بند ہوگئے۔ عملے کو فارغ کردیا گیا۔ کھیل ختم۔ پیسا ہضم۔

اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں قائم ہونے والی فلم کارپوریشن نے بھی بیک وقت کام شروع کیا تھا مگر وہاں کے ایم ڈی فلم سازی کی تربیت بیرونِ ملک سے لے کر آنے والے خیرالکبیر صاحب تھے۔ کارپوریشن کے دوسرے ڈائریکٹرز بھی تربیت یافتہ تھے۔ ایک ڈائریکٹر نذیر صاحب تھے۔ بہت اچھے اور فلمی صنعت کی خدمت میں پیش پیش۔ ہمیں 1969ء میں مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ فلم کارپوریشن شہر سے کچھ دور ایک منزلہ عمارت میں تھی۔ کارپوریشن نے ڈھاکا میں ایک لیبارٹری بھی قائم کی تھی۔ یہ صوبے کی واحد لیبارٹری تھی۔ اس لیے فلم ساز مع تقسیم کار، اداکار اور سینما گھروں کے مالک سب اس کے محتاج تھے۔ ڈھاکا میں فلم کارپوریشن فلم سازوں کو سرمایہ بھی فراہم کرتی تھی جس کے ضائع ہونے کا خطرہ نہیں تھا کیونکہ فلم کی ڈیولپمنٹ اور پرنٹنگ کارپوریشن کی لیبارٹری میں ہوتی تھی اس لیے سب اس کے بنائے ہوئے اصولوں کی پابندی کرنے پر مجبور تھے۔

بنگلہ دیش بن جانے کے پانچ چھ سال بعد ہمیں ڈھاکا جانے کا اتفاق ہوا۔ پرانے دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ فلم ساز، ہدایت کار اور اداکار خان عطا الرحمٰن نے ہماری بہت خاطر داری کی اور ہمیں پرانے دوستوں سے ملایا۔ وہ ہمیں فلم کارپوریشن لے کر گئے تو ہم حیران رہ گئے۔ اب یہاں ایک پانچ منزلہ خوبصورت عمارت تھی جس میں کمپیوٹر کے ذریعے کئی کام ہوتے تھے۔ لیبارٹری میں رنگین فلموں کے لیے بہت جدید لیبارٹری تھی۔ ایڈیٹنگ روم اتنے صاف ستھرے اور جدید ساز و سامان سے لیس تھے کہ کسی مغربی ملک کا گمان گزرتا تھا۔ یہ پانچ منزلہ عمارت تھی جس میں کارپوریشن کے دفاتر لیبارٹری، ایڈیٹنگ روم اور دیگر تمام ضروریات کا سامان موجود تھا۔

خان عطا نے ہمیں ایم ڈی صاحب سے ملایا۔ ان کا نام کرنل کمال تھا۔ انہوں نے لاہور ہی میں تعلیم پائی تھی۔ روانی سے اردو بولتے تھے۔ انہوں نے ہمیں کارپوریشن کی کارکردگی سے آگاہ کیا۔ بنگلہ دیش کی فلم صنعت کے تمام شعبے فلم کارپوریشن کے محتاج تھے۔ اس وقت ایم ڈی کے دفتر میں ایک میٹنگ جاری تھی جس میں فلم ساز اور سینما گھروں کے مالک موجود تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ سینما گھروں نے اپنے کرائے بہت زیادہ بڑھادیے تھے جس کے خلاف فلم سازوں نے احتجاج کیا۔ دونوں فریقوں نے اپنے مسائل پیش کیے۔ ایم ڈی نے فیصلہ دیا کہ سینما گھر والے اس طرح کرایہ نہیں بڑھا سکتے۔ لہٰذا سینما گھروں کا کرایہ مقرر کردیا گیا جس کی پابندی سینما والوں پر لازمی تھی۔

یہ داستان آپ کو محض اس لیے بتائی گئی ہے تاکہ اندازہ لگاسکیں کہ ہماری بیوروکریسی نے نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کو کس طرح تباہ و برباد کیا جبکہ ڈھاکا میں قائم ہونے والی فلم کارپوریشن نے کتنی ترقی کی اور فلمی صنعت کو کس طرح نظم وضبط کا پابند بنایا۔ ایم ڈی کمال الدین صاحب نے ہمیں بتایا کہ فلم کارپوریشن فلم سازوں کو اسٹوڈیو اور لیبارٹری کی سہولت کے علاوہ نقد رقم بھی برائے نام کمیشن پر دیتی ہے۔ شاعر نے شاید ایسے ہی مواقع کے لیے کہا ہے

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

ذکر فلمی ولن کا ہورہا تھا مگر بات کہیں اور نکل گئی۔ دیکھا جائے تو نیفڈیک اور دوسرے ناموں سے قومی خزانہ لوٹنے اور لٹانے والے بھی قوم کے ولن کہے جاسکتے ہیں۔ مگر اب اس قسم کے ولن بھی نہیں رہے۔

فلموں سے ولن کے غائب ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ کہانیوں کا انداز بدل گیا ہے۔ اب فلموں کے ہیرو ہی ولن کی ذمہ داریاں بھی ادا کردیتے ہیں۔ یا پھر کہانیاں اس قسم کی ہوتی ہیں جن میں ولن کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہیروئنوں کے لباس کی طرح ولن بھی اب غائب ہوتے جارہے ہیں۔ اب ہندوستانی فلموں میں پران، امریش پوری، کنہیالال، مختار، انور حسین، جیون جیسے ولن نظر نہیں آتے۔ اسی طرح پاکستانی فلموں میں مظہر شاہ، ساون، علاؤ الدین اور اسلم پرویز، مصطفیٰ قریشی جیسے ولن نظر نہیں آتے۔

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ فلموں میں انتہائی خراب نظر آنے والے ولن ذاتی زندگی میں بہت خوش اخلاق، رحمدل اور انتہائی شریف ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے پران، امریش پوری، مختار، انور حسین اور دوسرے ولن انتہائی خوش

ایف ڈی سی اسٹوڈیو (ڈھاکا بنگلہ دیش) کے باہر کا منظر

اخلاق تھے۔ اسی طرح پاکستان میں علاؤ الدین، طالش، مصطفیٰ قریشی، اسلم پرویز ذاتی زندگی میں بہت ہنس مکھ اور خوش اخلاق تھے۔ ولن کی بجائے اب ہندوستانی اور پاکستانی فلموں میں دو ہیرو کاسٹ کرنے کا رواج عام ہوگیا ہے۔ کسی زمانے میں ولن ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کا مرکزی کردار ہوتا تھا۔ کہانی اسی کے گرد گھومتی تھی۔ بلکہ اکثر اس کے بغیر فلم کی کہانی آگے ہی نہیں بڑھتی تھی۔ مگر اب فلموں میں کہانی ہی نہیں ہوتی۔ واقعات ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی واقعے کے لیے ولن کی ضرورت پیش آجائے تو اس کردار کے لیے کسی بھی بڑے آدمی کو پکڑ لیا جاتا ہے اور فلم آگے بڑھتی رہتی ہے۔

ہندوستانی فلموں میں یہ رجحان اب عام ہوچکا ہے کہ ہیرو ہی ولن بھی ہوتا ہے۔ اکشے کمار نے فلم ''اجنبی میں'' فردین خان نے فلم ''خدا'' میں، سنیل سیٹھی نے فلم ''میں ہوں نا'' میں، اکشے کھنہ نے فلم ''ہمراز میں'' اجے دیوگن نے فلم ''خاکی'' میں، سیف علی خان نے فلم ''اوم کارا'' میں ہیرو ہوتے ہوئے بھی ولن کے انداز میں کام کیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ولن ایک ایسا کردار ہوتا ہے جس سے فلم دیکھنے والے نفرت کرتے ہیں۔ اس کا جتنا اچھا کردار ہوگا اور اس کو وہ جتنی زیادہ بے رحمی سے نبھائے گا فلم دیکھنے والے اس سے اتنی ہی زیادہ نفرت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ ہیرو اگر ولن کا انداز اختیار کرلے تو فلم دیکھنے والے اس سے زیادہ نفرت نہیں کرسکتے۔ ولن برائی کا دوسرا نام ہے۔ ولن جتنا زیادہ برا ہوگا اتنا ہی اچھا ولن ہوگا۔ اس کو ولن ہونے کے لیے کوئی دلیل درکار نہیں ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ ہے ہی ایک برا آدمی جبکہ ہیرو اگر ولن جیسا کردار کرے تو دیکھنے والوں کو یہ بتانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کررہا ہے۔

ولن کا کردار ادا کرنے والوں کے پاس بھی دلائل موجود ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ولن دراصل معاشرے کی برائیوں کا آئینہ ہوتا ہے۔ ڈاکوؤں کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ ملک کے کئی حصوں پر ان کی حکمرانی ہے اسی لیے ایک زمانے میں ولن عموماً ڈاکو ہوتا تھا۔ ان میں سے کچھ ڈاکو امیروں کو لوٹ کر غریبوں میں ان کی دولت تقسیم کردیا کرتے تھے۔ ایسے ولن کو بھی ہیرو کی طرح مقبولیت اور عوام کی ہمدردیاں حاصل ہوتی تھیں۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اب فلموں میں یا تو کہانیاں ہی نہیں ہوتیں اور اگر ہوتی بھی ہیں تو ان میں ناچ گانا، مار دھاڑ، دوڑ بھاگ اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ولن کے کردار کی گنجائش ہی نہیں محسوس ہوتی۔ بے چارہ ولن۔

پچھلے دنوں ہندوستان میں صنعتِ فلم سازی کے سو سال مکمل ہونے کے بعد انڈسٹری کی 100 ویں سالگرہ منائی گئی۔ تقریبات منعقد ہوئیں۔ اخبارات و جرائد نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خصوصی نمبر شائع کیے۔ سیمینار، منعقد ہوئے لیکن پاکستان میں اس موقع پر خاموشی چھائی رہی۔ میڈیا میں بھارتی فلموں کی ایک صدی پوری کرنے کا ''تذکرہ'' ہوتا رہا ہے۔ لیکن ہماری فلمی صنعت نے اس بارے میں جمائی تک نہیں لی۔ اور سچ پوچھیے تو فلمی صنعت ہمارے ملک میں اب باقی ہی کہاں رہی ہے۔ پہلے قومی زبان اردو کی فلموں کا صفایا ہوا۔ اس کے بعد پنجابی فلمیں چاردن کی چاندنی میں نہاتی رہی۔ آخر ان کی چاندنی بھی ڈھل گئی اور اندھیری رات چھا گئی۔ پشتو فلمیں ذرا زیادہ سخت جان ثابت ہوئیں لیکن ان کی تعداد بھی گھٹ کر تین چار فلمیں سالانہ رہ گئی ہے۔ تو پھر کیسی فلمی صنعت اور کہاں کی فلمی صنعت۔ جی تو چاہتا ہے کہ جس طرح غالب نے غدر کے بعد اپنے خطوط میں دہلی کا نوحہ لکھا تھا اسی طرح پاکستان کی گم ہوگئی فلمی صنعت کا بھی نوحہ لکھیں۔ ہم نے اور کچھ دوسرے لوگوں نے فلمی صنعت کی موت پر نوحے لکھے بھی لیکن اب نوحہ خواں بھی نہ رہے۔ فلمی صنعت کا بظاہر قصہ ہی ختم ہوگیا۔ سال میں چار چھ فلمیں بن جانے کو فلمی صنعت نہیں کہتے۔ کہاں یہ کہ ڈیڑھ سو فلمیں ایک سال میں ریلیز ہوتی تھیں اور فلمیں لگانے کے لیے فلم سازوں کو سینما گھر مہنگے داموں بھی نہیں ملتے تھے اور کہاں یہ کہ سینما گھر ٹوٹ گئے۔ ان کی جگہ پلازا اور ہوٹل بن گئے۔ بھارتی فلموں کی آمد شروع ہوئی تو اب کچھ لوگوں نے سینما پلیکس بنانے شروع کردیے ہیں۔ سینما پلیکس دراصل ایک ہی عمارت ہوتی ہے جس میں تین چار چھوٹے سینما.... ہوتے ہیں۔ اس طرح اب فلمی گلشن کا کاروبار چل پڑا ہے۔

پاکستانی فلمی صنعت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ دور جب پاکستان نہیں بنا تھا لیکن بمبئی، مدراس، کلکتہ کی طرح لاہور بھی فلم سازی کا ایک مرکز بن کر ابھرا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ جب لاہور کی بنی ہوئی فلم ریلیز ہوتی تھی تو بمبئی اور کلکتہ والے اپنی فلمیں روک لیا کرتے تھے کیونکہ لاہور کی فلموں نے اوپر تلے بہت کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ پہلے یہاں پنجابی فلموں سے آغاز ہوا تھا لیکن جب اردو فلمیں بھی لاہور میں بنائی جانے لگیں تو ہندوستان کے دوسرے شہروں کے فلم سازوں کو احساس ہوا کہ ایک اور مدِمقابل بھی سامنے آگیا ہے۔ شوکت حسین رضوی کی ہدایات میں بنی ہوئی نور جہاں کی فلم ''خاندان'' نے لاہور کی فلمی صنعت کی کایا پلٹ دی۔ خاندان سارے ہندوستان میں ہٹ ہوئی تھی اور نور جہاں کے گائے ہوئے نغمے سارے ملک میں لوگ گاتے پھرتے تھے۔ اس زمانے میں ریڈیو کے سوا کوئی دوسرا پبلسٹی کا ذریعہ نہیں تھا اور ریڈیو بھی ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا تھا لیکن سپرہٹ گانا چاہے کسی شہر کا بنا ہوا ہو فقیر اور راہ گیر سفر کرتے ہوئے گاتے پھرتے تھے۔ کوئی سائیکل سوار گانا گاتا ہوا گزر جاتا تو سننے والے دیر تک اس گانے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اس طرح فلمی گانے جو مقبول ہوتے تھے وہ گھر بیٹھی خواتین بھی سن لیا کرتی تھیں اور موقع پا کر خود بھی گنگنایا کرتی تھیں۔

اسی لیے ہم یہاں لاہور کی فلموں کا جو ذکر کرنے لگے ہیں وہ بھی دراصل پاکستانی فلمیں ہی کہی جاسکتی ہیں۔

لاہور میں پہلی خاموش فلم 1920ء میں بنائی گئی تھی۔ اس وقت لاہور میں نو سینما گھر تھے جن میں سے زیادہ تر بھاٹی گیٹ یا اس کے گردونواح میں تھے۔ خاموش فلموں کے زمانے میں سازندے اسکرین کے سامنے چھپ کر بیٹھ جاتے تھے۔ گانا ہو یا پس منظر موسیقی، یہی سازندے ہدایت کار کی ہدایات کے مطابق ساز فراہم کرتے تھے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ خاموش فلم میں بھی میوزک ہوتا تھا لیکن یہ فلم اسکرین کے باہر بجایا اور گایا جاتا تھا۔ پہلے اس وقت دنیا اتنی مختصر نہیں ہوئی تھی لیکن فلم کی خبریں اخبارات و جرائد کے ذریعے لوگوں تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ہالی وڈ، بمبئی کلکتہ، مدراس میں جو خاموش فلمیں بنائی جاتی تھیں وہ لاہور والے بھی دیکھتے تھے۔ زندہ دلانِ لاہور سیر و تفریح اور دلچسپی کے منتظر رہتے ہیں اس لیے زندہ دل کہلاتے ہیں۔

لاہور میں جو پہلی خاموش فلم بنائی گئی اس کا نام ڈاٹرس آف ٹوڈے Daughters of to day تھا۔ اس زمانے میں ڈراموں اور پھر فلموں کے دو نام ہوتے تھے۔ ایک اردو اور دوسرا انگریزی۔ یہ فلم مہتا صاحب نے بنائی تھی۔ وہ ریلوے سے ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ شوقین آدمی تھے۔ انہوں نے فلم بنانے کا ارادہ کیا تو لندن سے ایک کیمرا منگایا۔ اس فلم کے ہدایت کار بھی جی کے مہتا ہی تھے۔ نوعمر اور فلموں کے رسیا اے آر کاردار ان کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے۔ اے آر کاردار کو فلموں سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی تھی۔ وہ خوش نویس تھے مگر فلم کے شوق میں انہوں نے سارے کام ٹھکرا دیے۔ کاردار نے اس فلم میں اداکاری بھی کی تھی۔ وہ فلم کے ہیرو تھے کیونکہ فلم میں کام کرنے کے لیے اداکار دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ اسٹوڈیو تو کوئی تھا

نہیں اس لیے یہ فلم کھلے آسمان کے نیچے سورج کی روشنی میں فلمائی گئی تھی۔

مہتا صاحب تو ایک فلم بنانے کے بعد ہمت ہار گئے لیکن اے آر کاردار کے دماغ میں فلم کا کیڑا چھوڑ گئے۔ کاردار نے سوچ لیا تھا کہ اب فلم بنانے کے سوا اور کچھ نہیں کرنا۔ ان کے دوست ایم اسماعیل نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اسماعیل صاحب خوش نویس اور آرٹسٹ تھے۔ پوسٹر بنایا کرتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی انہوں نے یار کی خاطر بھی لاہور نہیں چھوڑا اور کاردار کے ساتھ بمبئی نہیں گئے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی اسماعیل صاحب مقامی فلموں میں کام کرتے رہے۔ انتہائی مہذب، خوش اخلاق اور محبت کرنے والے آدمی تھے۔ ہم نے انہیں فلم کے سیٹ پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ادھیڑ عمر کے تھے لیکن صحت اچھی تھی۔ دراز قد، قبول صورت تھے مگر پاکستان بننے کے بعد کیریکٹر ایکٹر یا ولن کے کردار ہی ادا کرتے تھے۔ پنجابی اردو دونوں زبانیں روانی اور اچھے تلفظ کے ساتھ بولتے تھے۔ اے آر کاردار (عبدالرشید) کو اگر لاہور کی فلموں کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ انہوں نے ہی لاہور میں فلم سازی کی داغ بیل ڈالی تھی مگر ہندوستان میں کوئی ان کا نام تک نہیں لیتا حالانکہ فلموں میں ان کے کارنامے قابلِ تعریف ہیں۔ بمبئی میں آباد ہونے کے بعد وہ وہیں کے ہوگئے اور بے حد کامیاب فلمیں بنائیں۔ قیام پاکستان کے بعد وہ اور محبوب خان جائزہ لینے کے لیے یہاں آئے تھے۔ کراچی میں تو اس وقت فلم سازی کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ لاہور میں پرانے اسٹوڈیو جل کر راکھ یا کھنڈر بن چکے تھے۔ اچھے ہنرمند اور ایکٹر نہیں تھے سوائے ان کے جو بمبئی سے آچکے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہاں سرمائے کی کمی تھی۔ یہ حالات دیکھ کر کاردار صاحب اور محبوب صاحب نے پاکستان میں آکر ڈیرا ڈالنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور واپس بمبئی چلے گئے جہاں فلمی صنعت میں انہوں نے بے حد شہرت عزت اور دولت کمائی۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ ''فلم عورت'' کی تکمیل کے بعد محبوب خان نے فلم کی ہیروئن سردار اختر سے شادی کرلی تھی اور سردار اختر نے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان کی بہن سے کاردار صاحب نے شادی کرلی تھی جس کے بعد یہ دونوں ہم زلف بن گئے تھے اور مل کر کام کرتے اور ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔

کاردار اور اسماعیل صاحب نے فلم بنانے کا ارادہ کیا تو اپنا سارا سامان فروخت کردیا اور 1928ء میں راوی روڈ پر دریا کنارے ایک اسٹوڈیو تعمیر کیا۔ اس کی دیواریں ٹین کی تھیں۔ چھت نہیں تھی۔ لائٹس میسر نہ تھیں اس لیے یہاں بھی کھلے آسمان تلے دن کے وقت ہی شوٹنگ ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے بھاٹی گیٹ ہی لاہور میں فلم سازی کا پہلا مرکز تھا۔ اسماعیل صاحب اور کاردار صاحب کی رہائش بھی بھاٹی دروازے میں ہی تھی۔ راوی کنارے اسٹوڈیو بنانے کا مقصد یہ تھا کہ یہ آبادی کے شور سے دور تھا۔ یہاں بے شمار درختوں کے ذخیرے تھے (جو ہمارے پاکستان آنے کے بعد بھی موجود تھے) نزدیک ہی دریائے راوی تھا۔ یہ جگہ اور یہ مناظر آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے بہت موزوں تھے۔ دریا کے پار شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے مقبرے تھے جو کہ اس وقت بہت اچھی حالت میں تھے اور یہاں شوٹنگ کی جاسکتی تھی۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے فلم اسٹوڈیو کے لیے بہت مناسب تھی جس سے کاردار صاحب نے بہت فائدہ اٹھایا۔

کاردار کے اسٹوڈیو میں بنائی جانے والی پہلی خاموش فلم ''حسن کا ڈاکو'' عرف Mysterious eagle تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار کاردار بذاتِ خود تھے گویا حسن کا ڈاکو اے آر کاردار کی پہلی تخلیق تھی۔ اس فلم کے ہیرو بھی کاردار ہی تھے۔ گلزار بیگم ہیروئن تھیں جو تھیٹر میں بھی کام کرتی تھیں۔

حسن کا ڈاکو ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی جس نے کاردار اور ایم اسماعیل کا حوصلہ بڑھایا مگر اس فلم کے بعد کاردار نے فلموں میں اداکاری ترک کردی تھی۔

کاردار کی دوسری فلم ''سرفروش'' تھی۔ اس کا پورا نام سرفروش عرف بہادر دل والا تھا۔ اس زمانے کے خوبصورت اور مقبول اداکار گل حمید اس فلم کے ہیرو تھے۔ گل حمید دراز قد، مقبول اور خوبصورت اداکار تھے۔ یوں سمجھیے کہ وہ اپنے وقت کے دلیپ کمار تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی فلموں میں گل حمید سے زیادہ خوبصورت اور مردانہ حسن کا شاہکار کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ گل حمید کے بارے میں تفصیل سے پہلے بھی بتایا جاچکا ہے۔ (گل حمید پر شاہد جہانگیر شاہد کا ایک مضمون مارچ 2013ء میں لگ چکا ہے۔ مدیر) ''سرفروش'' بہت کامیاب تھی۔ لاہور کی اس فلم نے بمبئی اور کلکتہ کے فلم سازوں کو بھی چونکا دیا اور لاہور کا شمار بھی فلمیں بنانے والے شہر میں ہونے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

1931ء میں بمبئی میں بولتی فلم ''عالم آرا'' بنائی گئی تھی۔ یہ فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک دلکش تجربہ تھا۔ اے آر کاردار کب نچلے بیٹھ سکتے تھے۔ انہوں نے 1932ء میں خاموش فلم ''ہیر رانجھا'' بنا ڈالی۔ ہیر رانجھا پنجاب کی ناقابلِ فراموش رومانی داستان کہلاتی ہے اور کئی بار کئی زبانوں میں بنائی گئی اور اکثر بہت کامیاب ہوئی۔ اداکار اور فلم ساز اعجاز کی اردو میں بنائی جانے والی رنگین فلم ''ہیر رانجھا'' بھی بے حد مقبول ہوئی تھی۔ مسعود پرویز اس کے ہدایت کار تھے۔ یہ ایک یادگار فلم ہے اور رہے گی جسے پاکستان کے باہر بھی بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد بمبئی میں اردو میں ہیر رانجھا بنائی جو زیادہ کامیابی نہیں حاصل کرسکی۔ صوفی شاعر وارث شاہ کی لکھی ہوئی اس داستان کو تصوف کی تعلیم بھی کہا جاتا ہے اور پنجابی کی ''رومیو جیولیٹ'' بھی۔

''ہیر رانجھا'' ایسی داستان اور ایسی فلم ہے جو برصغیر کے تمام لوگوں کو یکساں پسند ہے۔ ہندو، مسلمان، سکھ سب ہیر رانجھا کے عاشق ہیں۔ ایک زمانے میں ہیر گانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک لافانی داستان ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ خواجہ خورشید انور کی اس فلم کے لیے بنائے ہوئے گیت بھی ناقابلِ فراموش ہیں اس لیے ریکارڈ کے طور پر یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ لاہور کی پہلی بولتی فلم ہیر رانجھا تھی جو اے آر کاردار نے بنائی تھی۔ لاہور اور برصغیر کی فلمی تاریخ میں یہ حقیقت ہمیشہ موجود رہے گی اور جو بھی برصغیر کی فلمی تاریخ کے بارے میں تحقیق کرے گا وہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کرسکتا۔

لاہور کی فلمی صنعت میں دو اور شخصیات کو بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ان میں ایک روپ کے شوری تھے اور دوسرے سیٹھ پنچولی تھے۔ پنچولی گجراتی تھے مگر قیام پاکستان تک یہیں مقیم رہے۔ انہوں نے فلم اسٹوڈیو اور سینما گھر بھی بنائے۔

فلم ''خاندان'' کے فلم ساز بھی وہی تھے۔ آغاز میں وہ کلکتہ کے سیٹھ کرنانی سے سرمایہ لے کر کام کرتے تھے مگر بعد میں جب خود کامیاب ہوئے تو پھر انہوں نے لاہور کی فلمی صنعت کے لیے بہت کام کیا۔ انہیں لاہور کی فلمی تاریخ میں کبھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

حال ہی میں بمبئی میں لاہور کی فلمی صنعت کے بارے میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں لیکن یاسین گریجہ اس پر روشنی ڈالنے والے پہلے صحافی اور مصنف تھے۔ ان کے بعد مصنف، صحافی پرویز راہی نے لاہور کی فلمی صنعت کے لیے بہت تفصیل سے لکھا۔ اے آر کاردار کے بارے میں بھی ایک کی ایک کتاب بمبئی کی فلمی دنیا میں بہت پسند کی گئی۔ ان ان دونوں کتابوں کا اب انگریزی میں بھی ترجمہ کیا جارہا ہے۔ لاہور میں زیادہ تر پنجابی فلمیں بنائی جاتی تھیں جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی جاتی تھیں۔ اردو فلمیں لاہور میں بنائی گئیں تو وہ بھی سارے ہندوستان میں پسند کی گئیں۔

قیام پاکستان کے بعد بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی تو لاہور کے ہندو اور سکھ ہنرمند اور اداکار بمبئی چلے گئے اور بمبئی سے بہت سے نامور فن کار لاہور آگئے جنہوں نے پاکستان میں فلمی صنعت کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔

پنچولی، شوری، بی آر چوپڑہ اور بہت سے اداکار لاہور سے بمبئی چلے گئے۔ اس علاقے میں رہنے والے بہت سے لوگوں نے بمبئی کی فلمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ لاہور ہمیشہ سے ثقافتی مرکز رہا ہے۔ مسلمان، ہندو، سکھ ... اور کرسچن فنونِ لطیفہ کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد نامور ہندو سکھ تو ہندوستان چلے گئے لیکن کرسچن کافی عرصے تک نمایاں رہے۔ موسیقی اور سازندہ سازی میں وہ پیش پیش تھے۔ فلموں میں خوبصورت اور بے باک کرسچن لڑکیاں ایکسٹرا کے طور پر کام کرتی تھیں۔ کرسچن آبادی میں ڈانس گھر بھی تھے جہاں ثقافتی سرگرمیاں ہوتی رہتی تھیں اور معاوضہ بھی زیادہ دیتی تھیں۔ اس زمانے میں کرسمس لاہور میں بڑے زور وشور سے منایا جاتا تھا۔ اب وہ کرسچن بھی برائے نام ہی رہ گئے ہیں بلکہ نظر ہی نہیں آتے۔ ان کے ناچ گھر ویران ہوگئے ہیں۔ لاہور میں تھیٹر کمپنیاں بھی کافی مشہور تھیں۔ تھیٹر کے فنکار کلکتہ اور دوسرے شہروں میں بھی جایا کرتے تھے۔ ایک طرف ناچ گھر تھے تو دوسری طرف ..... اولیائے کرام کے عرس پر قوالیاں بھی ہوتی تھیں۔ قوالی ہر شعبے میں پسند کی جاتی تھیں۔ جادوگر اپنے کمالات اور سرکس والے میلوں ٹھیلوں میں اپنے کرتب دکھا کر لوگوں کا دل بہلاتے تھے۔ لاہور میں ہر طرح کی تفریحی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ مشاعرے، گانوں کی تقریبات، سرکس، جادوگروں کے کمالات، پتلیوں کے تماشے، بندروں، بکری اور ریچھ کی مدد سے تماشا دکھانے والے شہر میں گلی گلی گھوم کر بچوں اور بڑوں کے دل لبھاتے اور روزگار حاصل کرتے تھے۔ بسنت ایسا

تہوار ہے جو بہت شان وشوکت اور دھوم دھام سے منایا جاتا تھا..... جب ڈور کی جگہ خطرناک ڈور سے پتنگیں اڑانے کا طریقہ عام ہوگیا اور بے شمار لوگ خصوصاً عورتیں اور بچے اس دھات کی ڈور کی وجہ سے ہلاک اور زخمی ہونے لگے تو بسنت پر پابندی لگ گئی اور وہ تہوار جس میں حصہ لینے کے لیے دوسرے ملکوں سے بھی شوقین آیا کرتے تھے نہیں منایا جاتا۔ شہریوں اور من چلوں پر کتنا ظلم ہے کہ حکومت کی کوتاہیوں کی سزا ان لوگوں کو ملے جو اس رنگین تہوار سے اب محروم ہوگئے ہیں۔ باقاعدہ فلموں کا زمانہ آیا تو لاہور کے سینما گھروں پر لوگ ٹوٹ پڑے۔ یہ تصور عام تھا کہ جو فلم لاہور میں ہٹ ہوجائے وہ کسی شہر میں فلاپ نہیں ہوسکتی۔

تقسیم سے پہلے لاہور میں جو کامیاب فلمیں بنائی گئیں ان میں خاندان، خزانچی، اور دوستی سارے ہندوستان میں بہت مقبول ہوئی تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد پنجاب سے بمبئی جاکر فلمی صنعت کو سجایا ان میں دلیپ کمار، ناصر خان، پران، دیو آنند، کامنی کوشل، کرن دیوان، پرتھوی راج کپور اور ان کی فیملی، مینا شوری، ثریا، مدھو بالا، مینا کماری، بیگم پارہ، شیام، کے ایل سہگل، نور جہاں، شیاما نے بمبئی جاکر فلمی صنعت میں بہت نمایاں کام کیا۔ شیاما کا اصلی نام خورشید اختر تھا اور وہ باغبان پورہ کے علاقے میں رہتی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد بمبئی چلی گئیں اور پھر واپس نہیں آئیں۔

کاردار صاحب کے معاون خصوصی بھی بمبئی چلے گئے تھے مگر کئی سال بعد پاکستان واپس آکر انہوں نے چند فلموں کی ہدایت کاری کی، فلم ''بہار و پھول برساؤ'' کی تکمیل کے دوران ہی وہ ہارٹ فیل ہوجانے کی وجہ سے وفات پاگئے۔ بعد میں یہ فلم ہدایت کار حسن طارق نے مکمل کی تھی۔ لاہور سے بمبئی جانے والوں میں اداکار امر جنہوں نے فلم میلہ میں دلیپ کمار کے والد کا کردار ادا کیا تھا، بھی شامل تھے۔ دیو آنند کے بھائی چیتن آنند پہلے ہی بمبئی جاچکے تھے، دیو آنند نے بھی بمبئی کا رخ کیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے لاہور میں تعلیم حاصل کی تھی۔

گلوکاری میں لازوال شہرت پانے والے محمد رفیع لاہور کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے بھی لاہور چھوڑ کر بمبئی میں ٹھکانا بنالیا اور بے حد شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ گلوکارہ شمشاد بیگم بھی لاہور ہی سے بمبئی گئی تھیں۔ قیام پاکستان سے قبل موسیقار جھنڈے خان، خورشید انور، فیروز

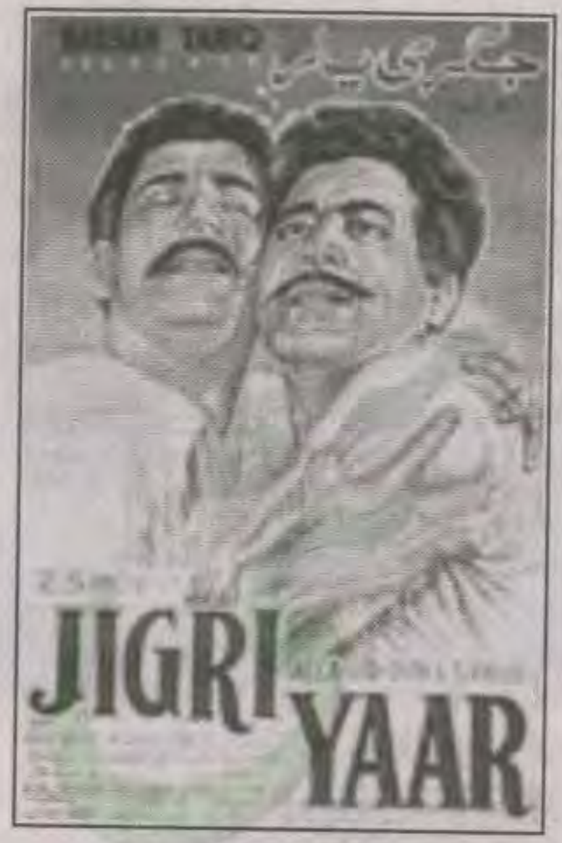

نظامی، ماسٹر غلام حیدر، خیام، حسن لعل بھگت رام اور موسیقار ونود بمبئی جاکر دھومیں مچا رہے تھے۔ ونود ہی نے مقبول گانا بنایا تھا جس کے بول یہ تھے۔

لارا لپا لارا لپا لائی رکھ دا
اڈی ٹپا اڈی ٹپ لائی رکھ دا

یہ گانا مینا شوری پر فلمایا گیا تھا جس کے بعد وہ ''لارالپا گرل'' مشہور ہوگئی تھیں۔ پنجابی موسیقاروں نے بمبئی کی فلمی دنیا میں موسیقی میں انقلاب برپا کردیا اور گانوں میں پنجابی ردھم اور لوک گیتوں کا رنگ پیدا کیا۔ ایک اور مشہور موسیقار شیام سندر بھی لاہور ہی سے بمبئی گئے تھے۔ ہدایت کار کیدار شرما، موسیقار اوپی دتہ، افسانہ نگار کرشن چندر سعادت حسن منٹو، نغمہ نگار تنویر نقوی لاہور ہی سے بمبئی گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد سعادت حسن منٹو اور تنویر نقوی لاہور واپس آگئے تھے۔ موسیقار ونود کا اصلی نام ایرک رابرٹس تھا۔ موسیقار ونود اور شیام سندر جوانی میں ہی انتقال کرگئے تھے۔ اگر اور جیتے رہتے تو بہت ساری کامیابیاں سمیٹتے۔ موسیقار پریم دھون بھی لاہور سے بمبئی گئے تھے۔ انہوں نے لاہور کے ایف سی کالج سے تعلیم حاصل کی تھی۔ موسیقار اوپی نیر نے بھی لاہور چھوڑ کر بمبئی میں ٹھکانا بنایا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ ان کا مشہور گانا

پریتم آن ملو، دکھیا جیا بلائے پریتم آن ملو

آج بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ لاہور سے جانے والوں میں اداکار آئی ایس جوہر۔ صحافی بی آر چوپڑا، راما نند ساگر، گلشن رائے، اداکار اوم پرکاش، اداکار جیون، مصنف اور افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، نغمہ نگار نقش لائل پوری نے بھی لاہور ہی سے رختِ سفر باندھ کر بمبئی کا رخ کیا تھا۔ پنجابی گلوکارائیں اور بہنیں سریندر کور اور پرکاش کور کے علاوہ پشپا پہلے لاہور ہی میں تھیں مگر نقلِ وطن کرنا پڑی۔ ایس ایم یوسف، نذیر اجمیری اور نجم نقوی بمبئی سے پاکستان آ گئے تھے۔

نقلِ وطن کا سلسلہ دو طرفہ تھا۔ لاہور سے بہت سے نگینے بمبئی چلے گئے تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بمبئی سے مسلمان فن کاروں اور ہنر مندوں نے بھی ہجرت کر کے لاہور میں ڈیرا جمالیا تھا۔ ان میں فلم ساز، اداکار، ہدایت کار نذیر، ان کی بیگم سورن لتا شامل تھے۔ نذیر صاحب بمبئی سے لاہور آ گئے مگر ان کے بھانجے کے آصف بمبئی میں ہی رہے اور مغلِ اعظم جیسی شاہکار فلم بنائی۔ اداکار نصرت کاردار نے فلم ''درد'' میں منور سلطانہ کے مقابلے میں ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اے آر کاردار تو بمبئی میں رہ گئے مگر نصرت کاردار لاہور آ گئے اور کئی فلموں میں اداکاری کی۔ گلوکار محمد رفیع بمبئی چلے گئے تھے مگر ان کے والدین اور بیوی بچے لاہور ہی میں رہے۔

شاعر ساحر لدھیانوی قیامِ پاکستان کے وقت لاہور میں تھے مگر کمیونسٹ ہونے کے الزام میں گرفتاری سے خوف زدہ ہو کر وہ بمبئی چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے بہت شہرت اور دولت کمائی۔ اداکارہ ثریا ان کی والدہ ونانی لاہور ہی سے بمبئی گئی تھیں اور وہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ بمبئی سے لاہور واپس آنے والوں میں شوکت حسین رضوی، میڈم نور جہاں، اداکارہ راگنی نمایاں نام ہیں۔ فلم ساز و ہدایت کار سبطین فضلی اور ان کے بھائی حسنین فضلی بھی پاکستان بن جانے کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ معروف فلم ساز مصنف اور ہدایت کار ڈبلیو زیڈ احمد بھی اپنی شہرت اور شالیمار اسٹوڈیوز چھوڑ کر لاہور آن بسے تھے۔ قیام پاکستان کے موقع پر بہت بڑے پیمانے پر نقل مکانی ہوئی تھی اور فن کاروں کا بھی تبادلہ ہوا تھا۔ لیکن یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لاہور میں کیسے کیسے فنکار، مصنف اور موسیقار تھے اور یہ صحیح معنوں میں ثقافتی مرکز تھا۔

ہالی وڈ کی فلمی صنعت تو شروع سے ہی اسی نام سے قائم ہے لیکن جب انڈین فلم انڈسٹری نے ہالی وڈ کی ہمسری کرنے کا سوچا تو ہالی وڈ کے مقابلے میں اپنی فلمی صنعت کو بھی کوئی نام دینے کا فیصلہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بھارت کی فلم انڈسٹری کا نام ''بولی وڈ'' ہو گیا۔ یہ تبدیلی قیام پاکستان کے بعد رونما ہوئی ہے۔ متحدہ ہندوستان میں بمبئی کی فلمی صنعت کو صرف بمبئی کی فلم انڈسٹری کہا جاتا تھا۔ یہ بھی خیال رہے کہ بولی وڈ صرف بمبئی کی فلم انڈسٹری کا نام ہے۔ کلکتہ، مدراس (چنائے) کی فلمی صنعتیں آج بھی اپنے شہر کے نام سے منسوب ہیں۔

بمبئی کی فلم انڈسٹری جب بولی وڈ بنی تو پاکستانی فلم سازوں کو بھی پاکستان کی فلمی صنعت کو اچھا سا نام دینے کی سوجھی کیونکہ ہمارے اکثر فلم ساز ہمیشہ سے بمبئی کی فلمی صنعت اور فلموں کی نقل کرتے آئے ہیں اور اس بات کو ایک اعزاز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کی فلمی صنعت لالی وڈ بن گئی۔ انگریزی میں اسے لولی وڈ لکھا جاتا ہے لیکن دراصل یہ لالی وڈ ہے۔ پاکستان کی فلمی صنعت کا مرکز لاہور تھا اس لیے لاہور سے ''لا'' اور ہالی وڈ سے ''وڈ'' لے کر پاکستانی فلمی صنعت کو لالی وڈ بنا دیا گیا۔ کچھ کالم نگار مزاح کے انداز میں اسے ''لالی پوپ'' سے بھی منسوب کرتے ہیں۔

لالی وڈ کا نام ہماری فلمی صنعت کو راس نہیں آیا کیونکہ لالی وڈ بننے کے بعد ہی رفتہ رفتہ اس کا زوال شروع ہو گیا۔ آج ہماری... فلمی صنعت ختم ہو چکی ہے۔ اب ایک نئی فلمی صنعت جنم لے رہی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ فلمی صنعت کا یہ نیا جنم صحیح معنوں میں ایک تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ فلمی صنعت ہو گی۔ فلمی صنعت کے پہلے جنم میں عروج حاصل کرنے کے زمانے میں بڑے بڑے ہنر مند، مصنف، موسیقار، ہدایت کار، گلوکار اور دوسرے شعبوں سے وابستہ نامور لوگ موجود تھے جنہوں نے ہندوستان کی فلموں کے پائے کی فلمیں بنائیں۔ جس زمانے میں بھارتی فلموں کی درآمد پر پابندی نہیں لگی تھی پاکستان کے سینما گھروں میں بھی ہندوستان کی بڑی بڑی فلموں کے مقابلے میں کامیابی حاصل کرتی تھیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پاکستان بنے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے اور پاکستانی اداکار بھی اب پہچانے جاتے تھے۔ سنتوش کمار، درپن، صبیحہ خانم، شمی، یوسف خان، نیر سلطانہ، سدھیر جیسے فن کاروں کی فلمیں ریلیز

ہو چکی تھیں اور کامیاب بھی ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے جب ابتدائی زمانے میں فلمیں بنائی گئی تھیں ان میں کام کرنے والے فن کاروں کے نام اور چہرے کوئی نہیں جانتا تھا، نہ ہی وہ اچھے فن کار تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی فلمی صنعت میں پختگی اور خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔ پاکستان کی فلموں کی کہانیاں، مکالمے، نغمات، ہدایت کاری، اداکاری، معیاری کہی جا سکتی ہے۔ 1951ء میں پنجابی فلم ''چن وے'' ریلیز ہوئی جس پر ہدایت کار کی حیثیت سے نور جہاں کا نام دیا گیا تھا لیکن دراصل یہ فلم سید شوکت حسین رضوی نے ڈائریکٹ کی تھی۔ یہ ایک کامیاب فلم تھی اور فلم بینوں نے اسے پسند کیا تھا۔ اس کے بعد فضلی صاحب کی فلم ''دوپٹہ'' کی نمائش ہوئی اور یہ فلم انتہائی کامیاب رہی۔ ہر اعتبار سے یہ ایک اچھی فلم تھی۔ اس زمانے میں ہندوستان اور پاکستان میں فلموں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا لیکن پاکستانی فلمیں ابتدا میں اس معیار کی نہیں تھیں کہ ہندوستان کے فلم ڈسٹری بیوٹر انہیں لے جاتے۔

''دوپٹہ'' ایک معروف اور کامیاب ہدایت کار کی فلم تھی کیونکہ فضلی برادرز کو ہندوستانی جانتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں بہت اچھی اور کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔ ان کی فلمیں معاشرتی اور مسلم پس منظر کے ساتھ بنائی جاتی تھیں مسلمانوں کے علاوہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی انہیں پسند کرتے تھے۔ ''دوپٹہ'' کی ہیروئن نور جہاں بھی ہندوستان میں ایک جانا پہچانا چہرہ اور مقبول فنکارہ کے طور پر جانی جاتی تھیں۔ اس لیے ''دوپٹہ'' ہندوستان برآمد کی گئی۔ دوپٹہ، ہر اعتبار سے ایک بہت اچھی فلم تھی، ہندوستان کے فلمی پرچوں نے اس فلم کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا۔ بمبئی کے انگریزی ہفتہ وار فلم فیئر نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے تبصرے پر سرخی لگائی۔ ''خبردار پاکستانی آ گئے ہیں۔''

پاکستانی فلم کامیابی سے کلکتہ کے سینما گھر میں چل رہی تھی۔ متعصب ہندوؤں نے اس سینما گھر کو نذرِ آتش کر دیا اور دھمکی دی کہ پاکستانی فلم جس شہر کے سینما میں بھی دکھائی جائے گی اس سینما گھر کو جلا دیا جائے گا۔ اس واقعے کے بعد ''دوپٹہ'' کی نمائش ہندوستان میں روک دی گئی اور اسے ڈبوں میں بند کر کے رکھ دیا گیا۔ لیکن یہ اس بات کا اعلان تھا کہ پاکستان کی فلمی صنعت بھی اب بالغ ہو گئی ہے اور ہندوستانی فلموں کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

صدر ایوب خان کے دور میں جب 1962 میں

امجد خان، گبر سنگھ کے مشہور کردار میں

بھارتی فلموں کی نمائش پر مکمل پابندی لگا دی گئی تو فلم ڈسٹری بیوٹرز، سنیما گھروں کے مالکوں اور سرمایہ کاروں نے پاکستانی فلموں کی تیاری پر سرمایہ لگانا شروع کر دیا۔ وہ بااثر اور دولت مند تقسیم کار جو بھارتی فلموں کی درآمد کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے تھے مجبوراً پاکستان میں فلموں پر سرمایہ کاری شروع کر دی۔ آغا جی اے گل نے پاکستانی فلمیں خرید کر ان کی نمائش شروع کر دی۔ پھر خود بھی فلم سازی شروع کر دی اور دوسرے فلم سازوں کو سہولتیں بھی دینے لگے۔ انہوں نے ایور نیو اسٹوڈیوز کے نام سے لاہور میں ایشیا کا خوبصورت ترین اسٹوڈیو بنایا۔ پاکستان میں فلمی صنعت کو فروغ دینے میں آغا جی اے گل کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

ملک یاری جن کی درآمد شدہ بھارتی فلم ''جال'' کے خلاف بھارتی فلموں کی بندش کی مہم کا آغاز ہوا تھا اور جو بھارتی فلمیں درآمد کرنے کی کوششوں میں آخر دم تک مصروف رہے۔ بندش کے بعد وہ بھی پاکستانی فلموں کی تقسیم کاری اور فلم سازی میں مصروف ہو گئے۔ انہوں نے باری اسٹوڈیو کے نام سے بہت بڑا اسٹوڈیو بھی بنایا۔ انہوں نے یکے والی اور ماہی منڈا جیسی پنجابی فلموں سے بے شمار دولت کمائی۔ بھارتی فلموں کی درآمد سے وہ سالوں میں بھی اتنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پیسا نہیں کما سکتے تھے۔ بھارتی فلموں کی درآمد پر بندش نے پاکستان کی فلمی صنعت کا حلیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کی فلمی صنعت ایک بڑی فلمی صنعت بن گئی جہاں سال میں سو سوا سو فلمیں ریلیز کی جاتی تھیں۔ فلموں کی تعداد بڑھی تو نئے نئے سنیما گھر بھی وجود میں آ گئے۔ مزید فلمی نگار خانے بن گئے پھر بھی فلم سازوں کو شوٹنگ کے لیے جگہ دستیاب نہیں ہوتی تھی۔ باری اسٹوڈیو، اشفاق ملک کا اسٹوڈیو، اقبال شہزاد کا سینے پل اسٹوڈیو، اور شباب کیرانوی کا شباب اسٹوڈیو ہر وقت مصروف رہنے لگے۔ کچھ لوگوں نے کیمرا اور ساؤنڈ ریکارڈنگ کا سامان خرید کر آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے یہ ساز و سامان کرائے پر دینا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے نقشہ بدل گیا۔ فلمی دنیا میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ کراچی میں ایسٹرن فلم اسٹوڈیو میں بھی فلم سازی شروع ہوگئی۔ ڈھاکا میں فلمی صنعت کا آغاز بنگلہ زبان کی فلموں سے ہوا لیکن اس کے بعد وہاں کی بنائی ہوئی ایک اردو فلم نے مغربی پاکستان میں بے پناہ کامیابی حاصل کی تو ڈھاکا میں بھی اردو فلمیں بنائی جانے لگیں۔ کراچی، ڈھاکا اور لاہور میں نئے نئے اداکار، گلوکار اور موسیقار سامنے آئے، اور تینوں شہروں کے فنکاروں کا باہمی تبادلہ اور مشترک فلم سازی کا آغاز ہوا۔ وہ پاکستانی فلمی صنعت کے عروج کا دور تھا۔ خوش حالی اور کام کی کثرت کا دور دورہ تھا۔ لاکھوں افراد (فلمی صنعت سے وابستہ افراد کے اہلِ خاندان) فلمی صنعت سے اپنا پیٹ پالتے تھے۔ وہ اب مشکلات سے دوچار ہیں۔

پاکستان میں رنگین فلموں کا آغاز ہوا تو فلموں کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا۔ ڈھاکا میں ظہیر ریحان نے پاکستان کی پہلی سنیما اسکوپ فلم بنائی۔ مختصر یہ کہ پاکستان کی فلمی صنعت خوش حالی اور ترقی کی منزلیں چھونے لگی۔ اس کے بعد جو خزاں کی ہوا چلی تو سب کچھ سوکھے پتوں کی طرح بکھر گیا۔ مشرقی پاکستان میں بہت معیاری اردو فلمیں بنائی گئیں جو مغربی پاکستان میں بہت مقبول ہوئیں، ڈھاکا میں فلموں میں نئے نئے تجربات کیے گئے۔ نئے نئے چہرے فلموں میں متعارف کرائے گئے جو اسٹار بن گئے۔ ندیم کراچی سے گلوکاری کرنے کے لیے ڈھاکا گئے تھے لیکن تقدیر اور ہدایت کار احتشام نے انہیں فلم ''چکوری'' کا ہیرو بنا دیا۔ انہوں نے ڈھاکا میں کامیابیاں حاصل کیں اور ان کی فلمیں مغربی پاکستان میں بھی بہت مقبول ہوئیں تو مغربی پاکستان کے فلم ساز اور ہدایت کار انہیں مغربی پاکستان کی فلموں میں کام کرنے پر مجبور کرنے لگے اور بالآخر وہ یہیں آ کر رہ گئے۔ ان کی شادی فلم ساز و ہدایت کار احتشام کی صاحب زادی فرزانہ سے ہوئی تھی۔ فرزانہ اور احتشام ان کے مغربی پاکستان آنے کے حق میں نہ تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہاں جائیں گے تو وہیں کے ہو کر رہ جائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔ مغربی پاکستان میں لاہور فلمی مرکز تھا۔ کراچی میں بھی فلمیں بنائی جا رہی تھیں۔ فلمی ماحول مشرقی پاکستان سے بالکل مختلف تھا۔

جب شبنم کی پہلی اردو فلم ''تلاش'' مغربی پاکستان میں سپر ہٹ ہوئی تو مغربی پاکستان کے فلم ساز اور ہدایت کار بھی قطار باندھ کر انہیں مغربی پاکستان لانے کے لیے پہنچ گئے۔ انہوں نے کافی دیر غور و خوض کیا مگر پھر مغربی پاکستان آئیں تو یہیں کی ہو کر رہ گئیں۔ انہوں نے 25 سال سے زائد عرصے مغربی پاکستان میں کام کیا۔ ان کے ساتھ ان کے شوہر روبن گھوش بھی بزنس کے طور پر پاکستان کی فلمی صنعت کو مل گئے۔ مشرقی پاکستان کے اداکار اور ہدایت کار رحمٰن پہلے تو مغربی پاکستان آنے کے مخالف تھے اور جب شبنم یہاں آئیں تو رحمٰن نے ان کے اس فیصلے کا بہت مذاق اڑایا۔ انہوں نے اردو فلمیں بنائیں جو کامیاب ہوئیں۔ ڈھاکا میں ان کی فلمی جوڑی شبنم تھیں۔ کچھ عرصے بعد رحمٰن بھی پاکستان آ گئے اور نہ صرف بہت اچھی فلمیں بنائیں بلکہ دوسرے فلم سازوں کی فلموں میں بھی کام کیا۔ مشرقی پاکستان سے لانے کے لیے شبانہ پر بھی بہت زور ڈالا گیا۔ انہوں نے مغربی پاکستان کی چند فلموں میں کام تو کیا مگر ڈھاکا واپس چلی گئیں۔ مشرقی پاکستان سے نذر الاسلام جیسے ذہین ہدایت کار مغربی پاکستان آئے اور انہوں نے بہت کامیاب اور خوبصورت فلمیں بنائیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک ایڈیٹر تھے مگر ڈھاکا میں ہی انہوں نے ہدایت کاری شروع کر دی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ نذر الاسلام، شبنم اور روبن گھوش نے پاکستانی فلمی صنعت کو یادگار فلمیں دیں۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد گلوکارہ رونا لیلیٰ ڈھاکا چلی گئیں۔ انہوں نے بمبئی میں بھی قسمت آزمائی کی لیکن وہاں کی فلمی دنیا میں وہ گلوکارہ کی حیثیت سے جگہ نہیں حاصل کر سکیں۔ رونا لیلیٰ اس کے بعد مختصر دوروں پر کراچی اور لاہور آتی رہی ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا بھر کے موسیقی پروگرام میں وہ مغربی پاکستان میں بنائی ہوئی فلموں

کے گیت ہی گاتی ہیں۔ انہیں ناشاد نے گلوکارہ بنایا تھا اور پھر مغربی پاکستان کے موسیقاروں کی دھنیں گا کر انہوں نے اپنی علیحدہ پہچان بنالی تھی۔ رونا لیلیٰ کی آواز میں کشش تھی۔ وہ سریلی تھیں اور ہر قسم کے گانے گا سکتی تھیں۔ جب انہوں نے فلم کا پہلا نغمہ گایا اس وقت ان کی عمر چودہ سال تھی۔ مغربی پاکستان کے موسیقاروں نے ان کی صلاحیتوں کو دریافت کیا اور ساری دنیا میں اس آواز کو پھیلا دیا۔ ان کا پاکستانی فلموں میں گلوکارہ بن کر نام پیدا کرنا ان کی قدرتی صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ میڈم نور جہاں، اقبال بیگم، ناہید نیازی، زبیدہ خانم، بعد میں ناہید اختر جیسی گلوکاراؤں کے ہوتے ہوئے انہوں نے اپنا مقام بنالیا۔ یہ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور خوبصورت آواز کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

جن دنوں پاکستان کی فلمی صنعت عروج پر تھی اس وقت مختلف شعبوں میں بڑے نام موجود تھے۔ مرد گلوکاروں میں مہدی حسن، اخلاق احمد، مجیب عالم، احمد رشدی، سلیم رضا اور مسعود رانا جیسے گلوکاروں کا دور دورہ تھا۔ خواتین گلوکاراؤں کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔ موسیقار بھی بے مثال تھے۔ خواجہ خورشید انور، رشید عطرے، جی اے چشتی، نثار بزمی، سہیل رعنا، روبن گھوش، ماسٹر غلام حیدر اور دوسرے ماہر فن موسیقاروں کا جمگھٹا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی فلموں کی موسیقی بہت اچھی ہوتی تھی۔ انڈیا نے سیکڑوں پاکستانی فلمی گانوں کو ہو بہو اسی طرح اپنا کر اپنی فلموں میں پیش کیا یا معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ان پر ہاتھ صاف کیا۔ درجنوں پاکستانی فلموں کو بھی ہو بہو یا معمولی تبدیلیوں کے ساتھ بھارتی فلموں میں پیش کیا گیا۔ دراصل بالی وڈ کی فلموں کا انحصار ہی ہالی وڈ یا علاقائی فلموں پر ہے۔ کہانیاں وہیں سے لے کر معمولی تبدیلی کے بعد پیش کر دی جاتی ہیں۔ کسی زمانے میں ہمارے پاکستانی فلم ساز مجبوراً یا مصلحتاً بھارتی فلموں کے چربے بناتے تھے جس کا بھارتی فلم سازوں اور میڈیا نے دنیا بھر میں ڈھنڈورا پیٹ دیا اور انہیں بتایا کہ آپ پاکستانی چربہ فلم دیکھنے کی بجائے اصل بھارتی فلم کیوں نہیں دیکھتے۔ اس طرح بیرونِ ملک انہوں نے پاکستانیوں اور ہندوستانیوں کو پاکستانی فلموں سے بدظن کر دیا۔ اس زمانے میں پاکستانی فلمیں بھی روس اور یورپ کے شہروں میں دکھائی جاتی تھیں۔ اس جھوٹی مہم کے بعد

پاکستانی فلموں کی بیرونِ ملک مارکیٹ ختم ہوگئی۔

دیکھیے پاکستانی فلموں کے ابتدائی دور سے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔

1951ء میں میڈم نور جہاں کی ''چن وے'' ریلیز ہوئی، انہیں پاکستان کی پہلی خاتون ہدایت کارہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد سلمیٰ ممتاز، زینت بیگم نے بھی ہدایت کاری کے فرائض سرانجام دیے۔ سنگیتا، شمیم آرا نے خاتون ہدایت کاروں کی حیثیت سے بہت شہرت اور کامیابی حاصل کی۔

1952ء میں سید فقیر احمد شاہ نے فلم ''جگا ڈاکو'' بنائی جس کے ہدایت کار تنویر رضوی تھے۔ یہ فلم کامیابی حاصل نہیں کر سکی لیکن اس دور میں فلمیں بننی شروع ہوگئی تھیں۔

1954ء میں ایور ریڈی پکچرز نے پنجابی فلم ''سسّی'' بنائی جس کے ایگزیکٹو پروڈیوسر ایم اے خان سینئر تھے۔ اس فلم میں سدھیر اور صبیحہ خانم نے مرکزی کردار کیے تھے۔ کامیڈین نذر کی کامیڈی نے اس فلم کی مقبولیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس فلم کی کہانی عزیز میرٹھی نے لکھی تھی، اس فلم نے گولڈن جوبلی منائی اور ایک ہی سنیما میں پچاس ہفتے چلتی رہی۔ سسّی کو ہر جگہ مقبولیت حاصل ہوئی یہاں تک کہ مشرقی پاکستان میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی اس فلم نے بہت اچھا بزنس کیا۔ اس فلم کے ذریعے مغربی پاکستان کے فلم سازوں کو معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان میں پاکستانی فلموں کے لیے وسیع میدان موجود ہے۔ سسی کے بعد مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی فلموں کے لیے تقسیم کاروں نے معاوضے میں اضافہ کردیا تھا۔

فلمی صنعت نے ترقی کی بہت سی منزلیں طے کرلی تھیں اور بہت اچھی فلمیں بنائی جارہی تھیں جو بھارتی فلموں کی ہم پلہ تھیں۔ 1958ء میں فلموں کی مقبولیت اور اعلیٰ معیار دیکھ کر پاکستان کے سب سے مقبول فلمی ہفت روزہ نے نگار ایوارڈ کا اجرا کیا۔ نگار کے مالک اور ایڈیٹر الیاس رشیدی نے پاکستانی فلمی صنعت کے لیے قابلِ قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ نگار ایوارڈ کا اجرا بھی اسی کا ایک حصہ تھا۔ نگار ایوارڈ کو پاکستان کا فلم فیئر ایوارڈ کہا جاسکتا ہے۔ یہ باقاعدگی سے دیا جاتا تھا۔ اس کی مقبولیت اور حسن کی وجہ سے بڑے بڑے لوگ تقریب کے دعوت نامے حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

فلمی صنعت سے وابستہ ممتاز ہستیوں کے علاوہ معزز مہمانِ خصوصی بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ ایک بار ذوالفقار علی بھٹو نے بھی ایوارڈ تقسیم کیے تھے۔ اس وقت وہ ملک کی کابینہ میں شامل تھے۔ اس تقریب میں لاہور اور کراچی کے فن کاروں اور ہنر مندوں کے علاوہ معززین بھی مدعو کیے جاتے تھے۔ غیر ملکی سفیر بھی ''نگار'' ایوارڈ کی تقریبات میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ نگار ایوارڈ نے پاکستان میں فلمی صنعت کی قدر و قیمت بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا جس کا سہرا الیاس رشیدی مرحوم کے سر ہے۔

پاکستان کی فلموں نے ہر شعبے میں قابلِ ذکر ترقی کی تھی۔ بہت اچھے مصنف فلموں کے اسکرپٹ لکھ رہے تھے۔ ذہین ہدایت کار اپنی تخلیق کے ذریعے فلم بینوں کو مطمئن کررہے تھے۔ ان میں ایس ایم یوسف کے علاوہ ڈبلیو زیڈ احمد، سیف الدین سیف، خلیل احمد، حسن طارق، نذر السلام، ایس سلیمان، فرید احمد، سبطین فضلی، شوکت حسین رضوی، لقمان احمد جیسے لوگ شامل تھے۔ نغمہ نگاروں میں جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض نے بھی پاکستانی فلموں کے نغمات لکھے۔ ان کے علاوہ سیف الدین، قتیل شفائی، مسرور انور، حمایت علی شاعر، سرور بارہ بنکوی جیسے اعلیٰ سطح کے شاعر بھی فلموں کے لیے نغمات لکھ رہے تھے۔

سدھیر، محمد علی، ندیم، وحید مراد، سید کمال، حبیب، یوسف خان، درپن جیسے ہیرو پاکستان کی فلمی صنعت کو ملے ہوئے تھے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرتے ہیں یعنی جدوجہد اور محنت کرتے ہیں۔

پاکستان میں باہر کے فلم سازوں نے آکر فلمیں بنانے کا سلسلہ بھوانی جنکشن سے شروع ہوگیا تھا۔ کئی نوجوان پاکستانی معاون کے طور پر اس یونٹ سے منسلک تھے۔ انہوں نے جارجیو کرجیسے عالمی شہرت یافتہ ہدایت کار سے بہت کچھ سیکھا۔ ہدایت کار قدیر غوری اور اداکارہ نیلو بھی اس یونٹ سے وابستہ رہے تھے۔

یہ اردو فلموں کے ساتھ ساتھ پنجابی فلموں کے عروج کا بھی دور تھا۔ بہت کامیاب تفریحی اور ایکشن پنجابی فلمیں بنائی جارہی تھیں۔ اس زمانے میں پنجابی فلمیں بھی کثرت سے بنائی جاتی تھیں اس لیے اس کے ہدایت کار، اداکار اور اداکارائیں زیادہ تر پنجابی فلموں میں ہی کام کرتے تھے۔ پہلے سدھیر ایکشن ہیرو تھے۔ ان کے بعد یوسف خان اور اکمل کا دور آیا، سلطان راہی کی وحشی جٹ اور مولا جٹ نے طوفان برپا کردیا تھا۔ ہیروئنوں میں نیلو اردو، پنجابی دونوں زبانوں کی فلموں کی ہیروئن تھیں۔ ان کے علاوہ رانی، آسیہ، نغمہ، فردوس، ممتاز (یہ دونوں زبانوں کی فلموں میں کام کرتی تھیں) بھی پنجابی فلموں کی مقبول ہیروئن تھیں۔ ان کے بعد انجمن نے آکر اپنی علیٰحدہ جگہ بنالی۔ ان کی اور سلطان راہی کی جوڑی پنجابی فلموں کی مقبول ترین فلمی جوڑی تھی۔

یہ کہانی اب ختم ہوچکی ہے۔ اسٹوڈیوز اور سینما گھر پلازا اور گودام بن چکے ہیں۔ فلمیں برائے نام بنتی ہیں۔ پنجابی کے علاوہ پشتو فلموں نے بھی کافی جگہ بنالی تھی مگر اب وہ بھی آخری ہچکیاں لے رہی ہیں۔ ''عمر ماروی'' سندھی کی پہلی فلم تھی۔ اس کے بعد بھی گنتی کی سندھی فلمیں بنائی گئیں مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصے تک نہیں چل سکا۔ اب تو ہر طرف خاک اُڑ رہی ہے۔ پرانے لوگ پرانی یادیں تازہ کرتے رہتے ہیں۔ بقول غالب اب تو یہ حال ہے کہ

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

جاری ہے

فروری

منظر امام

عیسوی سن کا یہ دوسرا مہینہ۔ اس مہینے میں کب کون سے اہم واقعات رونما ہوئے۔ مختصر مختصر انداز میں قارئین کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھ کر معلومات کی خاطر پیش کیا گیا لیکن ابھی مزید اہم واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ پھر کبھی کیا جائے گا۔

معلومات میں اضافے کے لیے اسے ضرور پڑھیں

گزشتہ ماہ آپ نے جنوری کے بارے میں پڑھا، اب آپ کے سامنے ہے فروری۔

جولین اور جارجین کلینڈر کے مطابق عیسوی سال کا دوسرا مہینا، سب سے چھوٹا مہینا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں عام طور پر 28 دن ہوتے ہیں۔ لیپ کے سال میں 29 دن۔

فروری کا نام رومن نام Februariovs سے لیا گیا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ 713 B.C تک اسے سال کا آخری مہینا خیال کیا جاتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

پھر 450BC میں سال کا دوسرا مہینا قرار پایا۔
اس مہینے کو بلیک ہسٹری منتھ بھی کہا جاتا ہے۔ بلکہ ایک گانا بھی ہے Black history month
اسی مناسبت سے یہ دن امریکا اور کینیڈا میں منایا جاتا ہے۔
اس کا آغاز بلیک ہسٹری ویک سے ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا 1969 میں سیاہ فام طالب علموں نے کی۔ پھر یہ دنیا کے دوسرے ملکوں تک جا پہنچا۔ 1987 میں برطانیہ میں منایا جانے لگا اور 1995 میں کینیڈا میں۔
اب ہم فروری کے مہینے کی ہر تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں۔

پہلی فروری

اس تاریخ کو نیشنل فریڈم ڈے منایا جاتا ہے۔
1920 میں رائل کینڈین پولیس فورس کا قیام عمل میں آیا۔
اس تاریخ کو رابن سن کروز ڈے بھی منایا جاتا ہے۔ رابن سن کروز ایک مشہور مہم جو کردار ہے جس کو انگلینڈ کے ناول نگار Daniel befe نے تخلیق کیا تھا۔
یہ ناول ایک تاریخی فکشن ہے اور اسے کلاسک کی حیثیت حاصل ہے۔ 25 اپریل 1719 کو اس ناول کی پہلی اشاعت ہوئی تھی۔
یہ کردار اتنا جاندار ہے کہ بہت سے لوگ اسے زندہ سمجھنے لگے تھے۔ اس ناول کو ایک طرح کا سفر نامہ بھی کہا جا سکتا ہے، ڈینل نے رابن سن کروز کے اور ایڈونچر بھی تحریر کیے ہیں۔ اس کردار پر بے شمار فلمیں بھی بن چکی ہیں۔
اسی تاریخ کو امریکا میں 1790 میں سپریم کورٹ کی پہلی میٹنگ بھی ہوئی تھی۔
پہلی فروری 1978 کو لاہور میں علامہ اقبال کے گھر کو میوزیم کا درجہ دیا گیا۔
اسی تاریخ کو 2002 میں کراچی میں ایک افسوسناک سانحہ رونما ہوا۔ وال اسٹریٹ جرنل کے صحافی ڈینیل پرل کا قتل اسی تاریخ کو ہوا۔
اور جہاں تک ایجادات کے شعبے کا تعلق ہے تو آئزاک برگس اور ولیم لانگ نے اسٹیم شپ کی کارکردگی بہتر بنانے کا تجربہ کیا۔ یہ تجربہ پہلی فروری 1788 میں کیا گیا تھا۔
پہلی فروری 1983 میں میتھیوز اور ٹانسل نے ڈیجیٹل وائس میل سروس متعارف کروایا۔

دوفروری

اس تاریخ کو امریکا اور کینیڈا میں Ground Hogday منایا جاتا ہے۔ اسے ایک طرح شگون کہہ سکتے ہیں۔
سردی کی شدت سے تنگ آئے ہوئے لوگوں کے لیے اس دن کی بہت اہمیت ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر گراؤنڈ ہاگ (کیڑا) اگر اپنے سائے کو نہیں دیکھ سکتا تو سردی کے جلد ختم ہونے کا امکان ہے اور اگر دیکھ لیتا ہے تو سردی کچھ دنوں تک برقرار رہے گی۔
ایجادات میں 2 فروری 1869 کو جیمس اولیور نے لوہے کا ہل متعارف کروایا۔ اور اسی تاریخ کو 1892 میں بوتل کیپ کو پینٹ کیا گیا تھا۔
دوفروری 1953 کو اس وقت کے پاکستانی صدر اسکندر مرزا نے گڈو بیراج کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔
دوفروری (عیسوی حساب سے) بہاولپور میں حضرت صاحب امیر کا عرس منایا جائے گا۔ (حجری حساب سے پہلی ربیع الثانی)

3 فروری

اس تاریخ سے کئی ایسے واقعات منسوب ہیں جو آج تک اپنے اثرات رکھتے ہیں۔
عالمی تناظر میں 3 فروری 1973 کو ویت نام میں ہونے والی بے مقصد جنگ کا خاتمہ ہوا۔ جس میں سوائے خون ریزی کے اور کچھ نہیں ہونا تھا۔ 3 فروری 1997ء کو پاکستان میں الیکشن بھی ہوا تھا۔
اسی تاریخ کو بچوں کے لیے سیمسن اسٹریٹ کے ایک کردار ایلمو کی برتھ ڈے بھی منائی جاتی ہے۔ بچوں کے لیے تخلیق کیے ہوئے ان کرداروں کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ ہر دور کے کردار ہوتے ہیں۔
یہ تاریخ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس تاریخ کو 1821 میں دنیا کی پہلی لیڈی ڈاکٹر الزبیتھ جیک ول کی پیدائش ہوئی تھی۔
1690 کی یہ تاریخ اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ اسی تاریخ کو پہلی بار امریکا کے میساچوسٹس میں کاغذ کا نوٹ متعارف کروایا گیا تھا۔ جو آج تک پوری دنیا میں چلتا ہے۔ اس ایجاد نے معاشی سفر کو تیز تر کر دیا تھا۔
3 فروری 1962 کو راولپنڈی میں مشہور شاعر ڈاکٹر محمد سعید فضل کریم کی پیدائش ہوئی۔ ان کی وجہ شہرت

ان کے غیر منقوطہ مجموعے ہیں۔
نعتوں کے مجموعے کا نام "ممدوح .. کردگار" ہے۔
اور حمدیہ شاعری کا مجموعہ الحمد للہ ہے۔
3 فروری (بہ مطابق 2 ربیع الثانی) لاہور میں حضرت بابا شاہ جمال کا عرس منایا جائے گا۔ آپ حسینی سید تھے۔ آپ کے والد سید احمد شاہ خود بھی ایک بہت بڑے بزرگ تھے۔ صوفیوں کا معروضی سلسلہ آپ ہی سے شروع ہوا۔ آپ کی پیدائش 1588 کی ہے۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں آپ کی رہائش اچھرہ لاہور میں تھی۔ جب اکبر نے دین الٰہی شروع کیا تو آپ نے اس کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی تھی۔ آپ کے مزار کے ساتھ ایک مسجد اور ایک قبرستان بھی ہے۔ آپ کے مزار پر ہر جمعرات کو مجلس ہوتی ہے۔ سوسال سے ڈھول بجا کر دھمال کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ پوسائیں نام کے ایک مشہور فقیر یہ ڈھول بجایا کرتے تھے۔ ڈھول بجانے والوں میں گونگا سائیں اور مٹھو سائیں بھی بہت مشہور ہوئے۔

4 فروری

اس تاریخ کو بھی ایک ڈے منایا جاتا ہے جسے ویکیوم ڈے کہتے ہیں۔
2004 میں چار فروری کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور وہ ہے فیس بک کا آغاز۔ جی ہاں فیس بک کا آغاز چار فروری ہی کو ہوا تھا۔

پانچ 5 فروری

اس دن یا تاریخ کا آغاز دو یوم سے ہوتا ہے۔ ایک ہے Weathermans day دوسرا ہے Disaster day۔
ڈزاسٹر ڈے میں اسکولوں کے بچوں کو کسی بھی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ خدانہ کرے کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو انہیں اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ یا کس طرح اپنی اور دوسروں کی مدد کرنی چاہیے۔
پانچ فروری 1934 کو بیس بال کے عظیم سیاہ فام کھلاڑی Hankaaron کی پیدائش الباما میں ہوئی تھی۔ اس شخص کو امریکی کھلاڑیوں کی تاریخ میں ایک لیجنڈ تصور کیا جاتا ہے۔
ایجادات کی دنیا میں اس تاریخ کو 1861 میں سیموئل گوڈیل نام کے ایک محقق نے پہلی متحرک تصویر دکھانے کی مشین ایجاد کی۔
اس ایجاد نے انقلاب برپا کر دیا اور چلتی پھرتی فلموں کا دور شروع ہو گیا۔ جو اب ترقی کرتے کرتے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے۔
اسی تاریخ کو 1990 میں پاکستان میں پہلی بار کشمیر ڈے منایا گیا جو آج تک منایا جاتا ہے۔
پانچ فروری کو کوٹ مٹھن میں حضرت غلام فرید کا عرس منایا جائے گا (بہ مطابق 4 ربیع الثانی) آپ کا زمانہ 1845-1901 کا ہے۔
آپ چشتی نظامی سلسلے کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ آپ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ والدین کی موت کے بعد آپ کے بڑے بھائی نے آپ کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق ادا کیا۔
آپ بے شمار زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ آپ ایک معروف اسکالر بھی تھے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ دیوانِ فرید (سرائیکی) 1882 میں شائع ہوا۔ اردو ترجمے کے ساتھ 1884 میں اشاعت ہوئی تھی۔
آپ کے فارسی کلام کے مجموعے کا نام مناقب محبوبیہ ہے۔ رحیم یار خان میں آپ کے نام سے غلام فرید کالج بھی قائم کیا گیا ہے۔

6 فروری

1895 میں بیس بال کے عظیم ترین کھلاڑی Babaruth کی پیدائش ہوئی۔ یہ کھلاڑی سات مرتبہ ورلڈ سیریز چیمپئن بنا۔ بیس بال کے کھلاڑی اس کو اپنا آئیڈیل تصور کرتے ہیں۔ کھیل ہی کے حوالے سے یہ تاریخ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ ایک مشہور کھیل Manopoly کا آغاز ہوا۔ یہ زمانہ ہے 1935 کا اور آج یہ کھیل پوری دنیا میں کھیلا جاتا ہے۔
اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے تو پاکستان کی تاریخ میں یہ تاریخ بہت اہم ہے۔ 6 فروری 1979 میں محمد احمد خان کے قتل کے کیس میں سپریم کورٹ نے ذوالفقار علی بھٹو کو نامزد کر دیا۔

سات فروری

7 فروری مشہور ادیب چارلس ڈکنز کی پیدائش کی تاریخ ہے۔
یہ مشہور ادیب 7 فروری 1812 کو انگلینڈ میں پیدا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا تھا۔ ڈکنز کو کٹوریہ عہد کا سب سے بڑا ناول نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے 1842 میں امریکا کا پہلا دورہ کیا تھا۔ ڈکنز کی وفات 9 جون 1870 کو انگلینڈ میں ہوئی تھی۔

اس کے مشہور ترین ناولز میں twocities A Tale o اور Great expectations، oliver twist شامل ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے اور فروخت ہوتے ہیں۔

8 فروری

1910 میں اس تاریخ کو بوائے اسکاؤٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ ایک انتہائی مفید تنظیم ہے اور اس کی افادیت کو پوری دنیا میں تسلیم کیا گیا ہے۔ آج کل دنیا کے ہر ملک میں بوائے اسکاؤٹ موجود ہیں۔

اسی تاریخ کو مصنف جولس ورن کی پیدائش ہوئی تھی۔

پاکستان کے حوالے سے اس تاریخ کی اس لیے اہمیت ہے کہ 8 فروری 1949 کو آزاد کشمیر کی حکومت نے مظفر آباد کو دارالخلافہ قرار دیا تھا۔

ایجادات میں بھی اس تاریخ سے ایک اہم ایجاد منسوب ہے۔ 8 فروری 1916 کو چارلس کیرنگ نے سیلف اسٹارٹنگ مشین ایجاد کی تھی۔

9 فروری

ہر دن کی طرح اس تاریخ کی بھی اہمیت ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بھی تاریخ نہیں ہوگی جب دنیا بھر میں کوئی اہم واقعہ رونما نہ ہوا ہو یا کسی ایسے بچے کی پیدائش نہ ہوئی ہو جسے آگے چل کر شہرت حاصل کرنی ہے۔

9 فروری 1870 میں نیشن ویدر سروس کا آغاز ہوا۔ اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے اور وہ ہے دانتوں کے درد کا دن۔ میرا خیال ہے کہ اس کی ابتدا دندان سازوں نے کی ہوگی۔

پاکستان کے لیے نو فروری 1951 اس لیے اہم ہے کہ اس تاریخ کو پاکستان کی پہلی مردم شماری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ 1984 کو پہلی بار طلبہ تنظیموں پر پابندی لگائی گئی تھی۔

10 فروری

اس تاریخ کو امبریلا ڈے یعنی چھتریوں کا دن منایا جاتا ہے۔

دس فروری 1976 کو جیکوبی نے دھویں اور حرارت کے امتزاج سے الارم بنایا تھا۔

11 فروری

اس تاریخ کی اس لیے اہمیت ہے کہ یہ تاریخ ولادت حضرت امام حسن عسکری کی تاریخ ہے۔ یہاں پھر واضح کردوں کہ یہ ہجری تاریخ نہیں ہے۔ ویسے آپ کی ولادت 232 ہجری میں ہوئی تھی۔ آپ امامیہ سلسلے کے گیارہویں امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ آپ کے والد محترم دسویں امام حضرت علی الہادی تھے۔ آپ کی پیدائش مدینہ میں ہوئی۔ آپ کو صرف چھ برس کی عمر میں امامت ملی تھی اور آپ کا انتقال صرف 28 برس کی عمر میں زہر سے ہوا۔

آپ کا مزار عراق میں ہے۔

اس تاریخ کو بھی کئی دن منائے جاتے جیسے Milk day spiled Do not cry over یہ دن اسکولوں میں بچوں کے لیے منایا جاتا ہے۔

اسی تاریخ کو وائٹ ٹی شرٹ ڈے بھی منایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی عظیم موجد تھامس ایڈیسن کے اعزاز میں National inventors day بھی منایا جاتا ہے۔ 1939 میں جین نولین کی پیدائش ہوئی تھی اور اسی تاریخ کو تھامس ایڈیسن 1847 میں پیدا ہوا تھا۔

ایڈیسن میلان اوہیو (امریکا) میں پیدا ہوا تھا.....

اس کی وفات 18 اکتوبر 1931 میں نیوجرسی میں ہوئی تھی۔

یہ وہ شخص تھا جس نے ایجادات کے ڈھیر لگادیے۔ اور آج تک پوری دنیا اس کی ایجادات سے فائدے اٹھا رہی ہے۔ اس نے ریڈیو گرافی اور ایکسرے مشین کے لیے Fluoroscape ایجاد کیا۔ موشن کیمرا ایجاد کیا۔ اور سب سے بڑی ایجاد بلب ہے جس سے پوری دنیا رات کے وقت روشن ہوجاتی ہے۔ یہ کہا جائے کہ اس نے اپنی ایجادات سے انسان پر احسان کیا ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔

گیارہ فروری 1996 کو پاکستان، ہندوستان اور سری لنکا نے کرکٹ ورلڈ کپ کی میزبانی کی تھی۔

12 فروری

اس تاریخ کو 1938 میں جوڈی بلوم کی پیدائش ہوئی اور اسی تاریخ کو 1804 میں امریکا کے عظیم صدر ابراہام لنکن کی پیدائش ہوئی تھی۔

اس سال کی بارہ فروری اس لحاظ سے اہم ہوگی کہ گیارہویں شریف منائی جائے گی (گیارہ ربیع الثانی) یہ شیخ حضرت عبدالقادر جیلانی کی تاریخ ہے۔

آپ کا پورا نام سید محی الدین ابو محمد عبدالقادر جیلانی تھا۔ آپ ایران کے شہر گیلان میں پیدا ہوئے۔ 470 ہجری۔ بغداد تشریف لے گئے اور وہیں وصال فرمایا۔ آپ تصوف میں سلسلہ قادریہ کے بانی ہیں۔ آپ کو غوث الاعظم اور پیران پیر بھی کہا جاتا ہے۔

یہ تاریخ پوری دنیا کی بچیوں کے لیے بہت زبردست اور خوشی کا تحفہ لے کر آئی۔ اور وہ ہے باربی ڈول۔ یہ گڑیا پہلی بار 1959 میں سامنے آئی تھی فروری کی بارہ تاریخ کو۔

اسی تاریخ کو 1983 میں ایک مفید ایجاد بھی سامنے آئی۔ نیوجرسی کے ایک شخص نے ایک ایسا توا بنایا جس سے پیزا کو اندر سے گرم کیا جاسکتا ہے۔ اس ایجاد کو پیچ میوں کا نام دیا گیا۔ اسی تاریخ کو 1966 میں شیخ مجیب الرحمان نے اپنے چھ نکات پیش کیے تھے۔

13 فروری

آج کی تاریخ (عیسوی لحاظ سے) مسلمانوں کے لیے بہت اہم ہے۔ کیونکہ اسی تاریخ کو پہلی ہجری میں نماز فرض ہوئی تھی۔

یہ نماز مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا تحفہ ہے۔ جس کی قرآن اور احادیث میں بار بار تاکید کی گئی ہے۔

13 فروری 1635 کو امریکا میں پہلے پبلک اسکول کا افتتاح ہوا۔ یہ اسکول بوسٹن میں قائم ہوا تھا۔ دل چسپ بات یہ تھی کہ بہت دنوں تک صرف ایک ہی بچہ پڑھنے کے لیے آتا رہا تھا۔

اور اب اس قدیم اسکول میں پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی ہے۔ اس اسکول میں پڑھنے والے بچے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔

13 فروری 1979 میں چارلس نے مردانہ گنج پن کے خاتمے کے لیے سلوشن ایجاد کیا تھا۔

13 فروری 1973 کو بیگم رعنا لیاقت علی خان پہلی خاتون گورنر سندھ مقرر ہوئیں۔ اس لحاظ سے یہ تاریخ بہت اہم ہے۔

14 فروری

یہ تاریخ پوری دنیا میں محبت اور پیار کی تاریخ ہے (یہ اور بات ہے کہ یہ ہماری روایت میں شامل نہیں ہے لیکن چونکہ یہاں بھی اس کا رواج چل پڑا ہے۔ اسی لیے ہم اس کا تذکرہ کررہے ہیں) اس کی ابتدا کے طور پر کئی کہانیاں مشہور ہیں جو ہر سال اسی تاریخ کے اخبارات وغیرہ میں دہرائی جاتی ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور سینٹ ویلنٹائن کی کہانی ہے۔ رومن عہد میں فوجیوں کی شادیوں پر پابندی لگادی گئی تھی۔ پھر اس شخص نے چوری چھپے شادیاں کروانی شروع کردیں۔

14 فروری 1854 کو ہوواک اسمتھ اور ڈینیل نے آگ بجھانے کا آلہ بنایا تھا۔

14 فروری 1958 کی تاریخ پاکستانیوں کے لیے اس لیے غم زدہ کردینے والی تاریخ ہے کہ اس تاریخ کو سردار عبدالرب نشتر جیسے محبِ وطن، پُرخلوص، ایماندار شخص کا انتقال ہوا۔ سردار صاحب بہت اچھے شاعر بھی تھے۔

15 فروری

1928 میں تومن برڈویل اور 1820 میں سوسن بی انتھونی کی پیدائش ہوئی تھی۔

16 فروری

1937 میں Dupunt نے نائلون پیٹنٹ کروایا تھا جس کا استعمال پوری دنیا میں کیا جاتا ہے۔ لیکن کتنے لوگ جانتے ہوں گے کہ اس میٹریل کو متعارف کس نے کروایا تھا۔

1923 میں (سولہ فروری) بادشاہ TuTs کا مقبرہ کھولا گیا تھا۔

سولہ فروری 1971 کو پاکستان اور چین کے تعاون سے بنائی گئی عظیم شاہراہ قراقرم ہائی وے کا افتتاح ہوا تھا۔

یہ سڑک انتہائی بلندی پر ہونے کی وجہ سے ایک عجوبے سے کم نہیں ہے اور پاک چین دوستی کی ایک زندہ مثال ہے۔

17 فروری:

اس تاریخ کو امریکا میں جارج واشنگٹن کے احترام میں پریسیڈنٹ ڈے منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو ابراہام لنکن کا بھی اعزاز دیا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو مزید دو یوم منائے جاتے ہیں، ایک ہے Rundom acts of kindness اور دوسرا ہے نیشنل پی ٹی اے فاؤنڈر

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈے اس کی ابتدا 1897 سے ہوئی تھی۔

17 فروری 1827 کو ایک بہت مفید ایجاد دنیا کے سامنے آئی ہے اور وہ ہے واشنگ مشین، یہ مشین اس تاریخ کو چیسٹر اسٹون نے پیٹنٹ کروائی تھی۔

پاکستان میں 17 فروری 1997 کو نواز شریف پہلی بار وزیراعظم منتخب ہوئے تھے۔

اس بار سترہ فروری کو دہلی میں حضرت نظام الدین اولیا کا عرس ہوگا۔ (16 ربیع الثانی) آپ ایک مشہور بزرگ ہیں۔ آپ کو سلطان المشائخ بھی کہا جاتا ہے۔

آپ کا تعلق سلسلۂ چشتیہ سے ہے۔ آپ کے رہنماؤں میں حضرت فریدالدین گنج شکر، حضرت بختیار کاکی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی جیسے بزرگ تھے۔ جبکہ آپ کے تلامذہ میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی اور حضرت امیر خسرو جیسے لوگ تھے۔ آپ کا مزار دہلی میں ہے۔

18 فروری

1930 میں ستارہ پلوٹو کی دریافت۔ یہ دریافت کلائڈ ٹام باگ کی ہے۔

امریکی تاریخ میں 18 فروری اس لیے اہم ہے کہ اسی تاریخ کو 1878 میں آگسٹ بارتھ ہولڈی نے مشہور مجسمہ آزادی کا ڈیزائن پیش کیا اور آج یہ مجسمہ امریکا کی قومی شناخت بن گیا ہے۔ یہ عظیم الشان مجسمہ فرانس کی طرف سے امریکا کو تحفے میں دیا گیا تھا۔ 19 جون 1885 کو یہ مجسمہ نیویارک کی بندرگاہ پر اترا تھا۔ ہزاروں لوگ اس کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

اس مجسمے کو 214 کو پیٹی میں 350 حصوں میں پہنچایا گیا تھا۔

اٹھارہ فروری 2008 کو پاکستان میں الیکشن کا انعقاد ہوا۔

اسی تاریخ کو لاہور میں حضرت موج دریا بخاریؒ کا عرس ہوگا۔ بہ مطابق 17 ربیع الثانی، یہ ان کا 239 واں عرس ہوگا۔ آپ شہنشاہ اکبر کے زمانے میں اُچ (بھاولپور) سے ہجرت کر کے لاہور تشریف لائے اور یہیں انتقال فرمایا۔ ان کا مزار مرید کے کے پاس ہے جسے اکبر نے بنوایا تھا۔

19 فروری

اس تاریخ کو 1878 میں کو ایڈیسن نے فونوگراف پیٹنٹ کروایا اور اسی تاریخ کو 1968 میں بچوں کا مشہور گیم مسٹر راجپر کے پڑوسی متعارف ہوا۔

20 فروری

انسانی تاریخ میں بیس فروری 1962 وہ تاریخ ہے جب پہلے انسان نے کرۂ ارض کا فضائی چکر لگایا تھا۔ اس شخص کا نام جان بیگن تھا اور اس جہاز کا نام فرینڈ شپ تھا۔ یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد خلائی سفر کے امکانات بڑھتے چلے گئے تھے۔

1872 میں پہلی بار ٹوتھ پک (خلال) پیٹنٹ کروایا گیا تھا۔ اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے اور وہ ہے Love your pat day

20 فروری 1846 کو جان ڈورنڈ نے موم بتیاں بنانے کا سانچہ بنایا تھا۔

پاکستان میں اس تاریخ کو یہ ہوا کہ 1999 میں پاکستان نے کرکٹ میں انڈیا کو شکست دی۔

21 فروری

اکیس فروری 1965 میں ایک بڑا سانحہ یہ رونما ہوا کہ امریکا کے مشہور سماجی اور مذہبی رہنما مالکم ایکس کو قتل کردیا گیا۔

مالکم کی پیدائش 1925 میں ہنداسکا میں ہوئی تھی۔ اس کا قتل نیویارک میں ہوا تھا۔ اس شخص نے کالوں کے حقوق کی خاطر برسوں جدوجہد کی۔

پاکستان کی قومی تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ اکیس فروری 1956 کو یہ طے پایا کہ پاکستان کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا اور اس تاریخ کا ایک اور اہم واقعہ 1974 کو ہوا۔ جب پاکستان نے بنگلہ دیش کو ایک الگ ملک کی حیثیت سے تسلیم کرلیا۔

21 فروری 1947 کو ایڈون لینڈ نے پہلا پولورائڈ کیمرا متعارف کروایا۔

اسی تاریخ کو معاہدۂ لاہور ہوا، سال ہے 1999۔ معاہدہ نواز شریف اور واجپائی کے درمیان ہوا تھا اور اسی تاریخ کو 1987 میں صدر ضیاالحق اچانک ہندوستان کے دورے پر پہنچ گئے۔

22 فروری

1732 کی بائیس فروری کو مشہور امریکی صدر جارج واشنگٹن کی پیدائش ہوئی تھی۔

پاکستان میں یہ ایک تاریخی دن ہے۔ کیونکہ 22 فروری 1974 کو لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا

انعقاد ہوا تھا۔ اور اسی تاریخ کو 1982 میں جوش صاحب کا انتقال ہوا تھا۔

جوش صاحب کی پیدائش 5 دسمبر 1894 کو ہوئی تھی۔ پورا نام شبیر حسن خان تھا۔ جوش تخلص کرتے تھے۔ 1914 میں سینئر کیمرج آگرہ سے پاس کیا۔ اس کے ساتھ ہی عربی اور فارسی کا مطالعہ بھی کرتے رہے۔ ٹیگور کے شانتی نکیتن میں بھی چھ ماہ گزارے۔ والد کی وفات کے بعد تعلیمی سلسلہ ختم ہوگیا لیکن شاعری جاری رہی۔ وہ 1958 میں ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوئے تھے۔ انہیں بے مثال مرثیہ گو، ایک باکمال نظم گو شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔

ان کی شاعری کی پہلی کتاب 1921 میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی بے شمار کتابیں ہیں۔ جیسے شعلہ و شبنم، جنون و حکمت، فکر و نشاط، نسیم و سلاسل وغیرہ۔ اس کے علاوہ مشہور سوانح عمری یادوں کی برات۔ انہیں ہندوستان کا سب سے بڑا اعزاز پدما بھوشن بھی حاصل ہے اور پاکستان میں ہلالِ امتیاز سے نوازا گیا ہے۔

22 فروری 1916 کو ارنسٹ الیگزنڈر نے ریڈیو ٹیوننگ سسٹم متعارف کروایا۔

23 فروری

اس تاریخ کو بھی ایک دن منایا جاتا ہے۔ اس دن International dog buscuit day منایا جاتا ہے۔

1945 میں IWO میں امریکا کا جھنڈا لہرایا گیا۔

1997 میں اس تاریخ کو نواز شریف نے قرض اتارو ملک سنوارو اسکیم متعارف کروائی۔ اس کے ساتھ ہی جمعہ کے بجائے اتوار کی چھٹی منظور کی گئی۔

24 فروری

Stave jobs1955 کی پیدائش کا دن ہے

1786 میں اسی تاریخ کو ولیم کارل کی پیدائش ہوئی اور اس تاریخ کو گورڈن کی برتھ ڈے بھی ہوتی ہے۔ گورڈن مشہور ٹی وی پروگرام سیمسن اسٹریٹ کا ایک کردار ہے۔

24 فروری 1857 کو پہلے ڈاک ٹکٹ کا اجرا ہوا تھا اور اسی تاریخ کو 1925 میں گراموفون ریکارڈ کا مشہور ٹریڈ مارک ہز ماسٹر وائس رجسٹرڈ ہوا تھا۔

24 فروری 1960 میں اسلام آباد کو دارالخلافہ بنانے کی منظوری دی گئی تھی اور اسی تاریخ کو 2003 میں سینیٹ کا الیکشن بھی ہوا تھا۔

25 فروری

1841 کو اسی تاریخ میں ایک بڑے آرٹسٹ پاٹر اگسٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔

اس تاریخ کو خاموشی کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔

25 فروری 1948 پاکستان میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس تاریخ کو اردو کو قومی زبان بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔

25 فروری 1985 کو پاکستان میں غیر پارٹی بنیاد پر الیکشن ہوئے تھے۔

1902 میں جان ہالینڈ نے آب دوز کا نقشہ پیش کیا تھا۔

26 فروری

1829 میں لیون اسٹراس کی پیدائش۔

1846 میں ولیم کوڈی کی پیدائش۔

26 فروری 1870 کو نیویارک کے پہلے سب وے کا افتتاح ہوا تھا۔

27 فروری

1935 میں یوری شیلوبز کی پیدائش۔

1807 میں مشہور امریکی شاعر لانگ فیلو کی پیدائش ہوئی۔ اس کا پورا نام ہنری واڈورتھ تھا۔

اس نے اتنی آسان زبان میں قدرت کے دل کش مناظر پر شاعری کی کہ انگریزی جاننے والا ہر شخص اس کی شاعری کا گرویدہ ہوگیا۔

اس نے بچوں کے لیے سادہ زبان میں شاعری کی۔ اسے اپنے وطن سے محبت تھی اور اس کی مٹی کی شاعری کرتا رہا۔

اس تاریخ کو 1902 میں جان اسٹین بیک کی پیدائش ہوئی۔

27 فروری 1900 کو فلیکس ہاف نے وہ مشہور دوا متعارف کروائی جسے پوری دنیا اسپرین کے نام سے جانتی ہے۔

28 فروری

اس تاریخ کو پبلک پلیسنگ ڈے منایا جاتا ہے۔

اس تاریخ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ 1849 میں بہت سے لوگ سونے کی تلاش میں سان فرانسسکو آئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

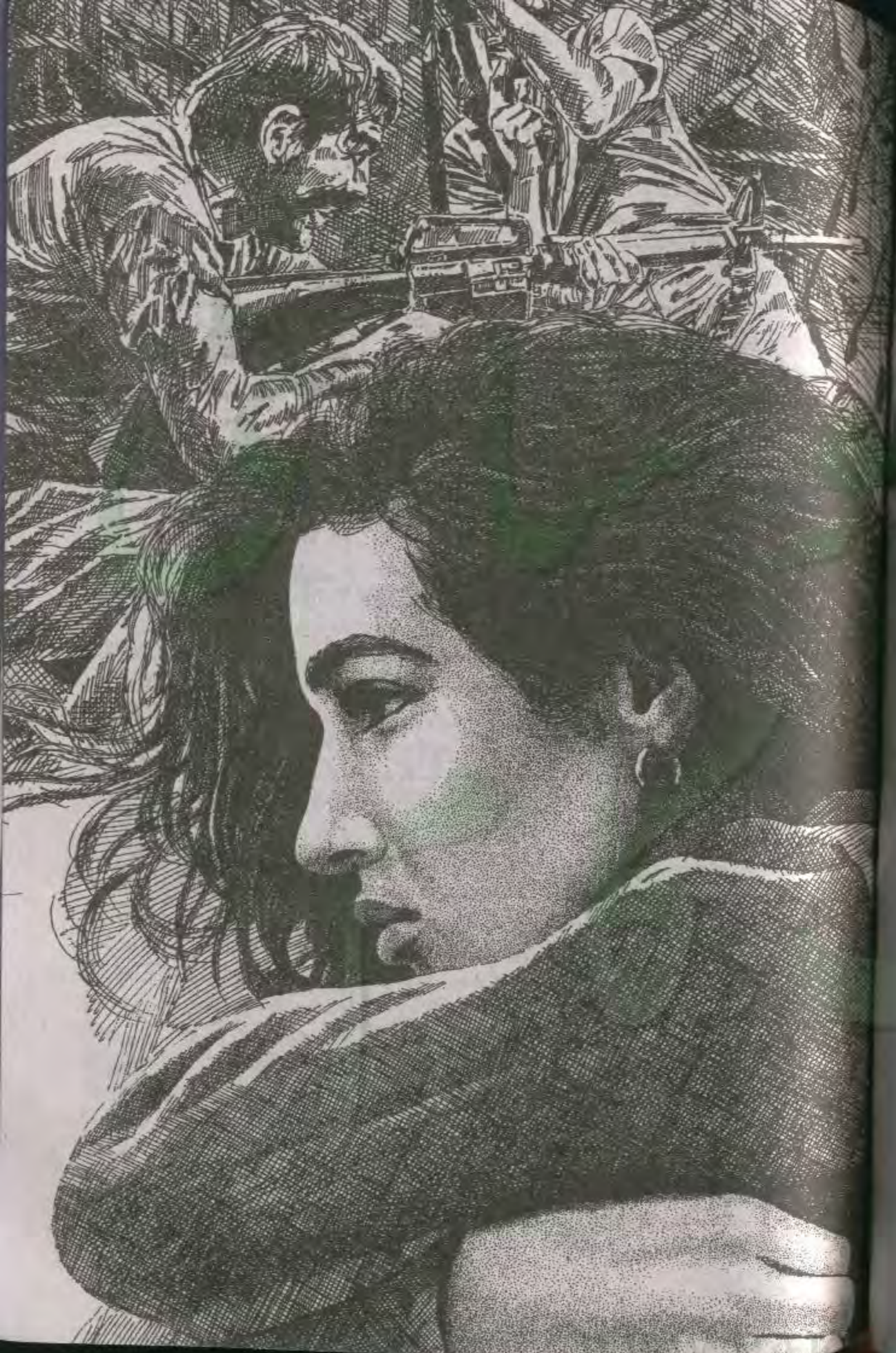

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط:82

وہ پیدایشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب — ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہیے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آگیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچادے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوالیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا ''نارتھ..... بکسٹ'' دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگالیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زروسکی نے ہم دونوں کو پکڑلیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جاری ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگادیا۔ اس گاڑی سے کرنل زروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپادیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو اسمٰعیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑلیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ یانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے یانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزاری۔ تو یانو رہا ہو جائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی دل آگیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ یانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا ''شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤں۔'' میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہماری پستول نکال کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام اور؟؟ کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوادیا۔ میں راض کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کررہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آگئی اور رامن کی آواز ابھری۔ ''ہلنا مت شہباز۔'' میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا، ہوٹل پہنچ کر اسکاپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کر کے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کرلوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کرلیا۔ اس نے بتایا کہ رامن راج کنور کو نکال لے گیا

ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ ہیلی کاپٹر سے راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کر کے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہوگیا۔

(اب آگے پڑھیں)

دھماکے سے ہیلی کاپٹر زمین یا پانی سے ٹکرایا اور چاروں طرف اندھیرا ہوگیا تھا مگر یہ اندھیرا ذہن کا نہیں تھا، سچ مچ اندھیرا ہوگیا تھا کیونکہ ہیلی کاپٹر پانی میں اتر گیا تھا۔ تصادم کے فوراً بعد دائیں طرف کی ٹوٹ جانے والی کھڑکی سے پانی کا دھارا اندر داخل ہوا تھا۔ اس وقت تک شور اتنا تھا کہ کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر جیسے ہی گرنے کے بعد انجن بند ہوا شور بھی کم ہونے لگا اور مجھے بیتو کی آواز آئی وہ چلّا رہا تھا۔ ''شوبی آپ ٹھیک ہے..... شوبی جواب دو.....''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں چلّایا۔ ''تم ٹھیک ہو۔''

''ہاں پر یہ بیلٹ نہیں کھل رہا۔''

میرے برابر میں سنکاری گھگیایا' آوازیں نکالتے ہوئے اپنی سیٹ بیلٹ کھولنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ کھولی اور ڈولتے ہیلی کاپٹر میں توازن قائم رکھتے ہوئے پیچھے کی طرف بڑھا۔ اب مجھے راج کنور کی آواز آئی۔ وہ بھی واویلا مچا رہا تھا اور یہ ایک پرفیکٹ کریش لینڈنگ ثابت ہوئی تھی جس میں سب بچ گئے تھے۔ پانی یہاں خاصا گہرا تھا کیونکہ ذرا سی دیر میں ہماری کمر... تک پانی آگیا تھا۔ میں نے ٹٹول کر بیتو کی سیٹ بیلٹ کھولی اور اس سے کہا۔ ''باہر نکلو۔''

بیتو نے آزاد ہوتے ہی ہیلی کاپٹر کا اپنی طرف والا سلائیڈنگ ڈور کھولنے کی کوشش شروع کردی۔ سنکاری فائدے میں رہا تھا اس کا سوئنگ ڈور تھا مگر اس کے کھلتے ہی پانی کا تازہ ریلا اندر آیا تھا۔ میں نے سنکاری سے پوچھا۔ ''ہم کہاں ہیں؟''

''آف کورس دریا میں...'' اس نے کانپتی آواز میں جواب دیا۔

''میں ملک کا پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے سوال واضح کیا۔ ''ہم انڈیا میں ہیں یا پاکستان میں؟''

''پتا نہیں اپنا حواس گم تھا۔ اِدھر بھی ہوسکتا ہے اور اُدھر بھی۔''

ہیلی کاپٹر اب ٹک گیا تھا اور مزید نیچے نہیں جارہا تھا اس کا مطلب تھا کہ یہاں پانی سات آٹھ فٹ سے زیادہ گہرا نہیں تھا۔ البتہ پانی بہنے سے ڈول رہا تھا۔ راج چلّا رہا تھا۔ ''مجھے نکالو یہاں سے میں ڈوب جاؤں گا۔''

''تم اسی قابل ہے۔'' بیتو نے اسے ڈانٹا۔ ''اپنا منہ بند کرو اور بھگوان سے اپنے پاپ کا معافی مانگو، ابھی تمہیں اس کے پاس جانا ہے۔''

''یہ چھوکرا کیا بولتا۔'' سنکاری نے گھبرا کر کہا اور ہیلی کاپٹر سے باہر نکل گیا۔ مجھے اس کی چیخ سنائی دی تھی۔ اس نے چلّانا شروع کردیا۔ ''ہم کو بچاؤ بائی گاڈ ہم تیرنا نہیں جانتا۔''

میرا لیپ ٹاپ والا بیگ کسی قدر بھیگ گیا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ اس میں لیپ ٹاپ محفوظ رہے گا۔ اب میں اسلحے والا بیگ تلاش کررہا تھا مگر وہ نہیں مل رہا تھا۔ بیتو دروازہ کھول کر باہر نکل گیا تھا اور اب پتا چلا کر مجھے بھی باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے کانوں پر چڑھا ہیڈفون اتار پھینکا اب پتا چلا کہ ہم سب کو کیوں چلّا چلّا کر بات کرنا پڑ رہی تھی کیونکہ ہیڈفون کی وجہ سے آواز کانوں تک کم آرہی تھی۔ میں نے بیتو سے بھی ہیڈفون اتارنے کو کہا۔ ''میں اسلحے والا بیگ تلاش کررہا ہوں اور اب چلّانا بند کردو۔''

''شوبی وہ میرے پاس ہے' اسے کیسے چھوڑ سکتا ہے۔''

اب ہیلی کاپٹر میں چار فٹ تک پانی بھر گیا تھا۔ یہ میرے سینے تک آگیا تھا۔ راج کنور نہ جانے کہاں تھا۔ اس کی آواز اب نہیں آرہی تھی لیکن میں باہر نکلنے لگا تو اس نے میری ٹانگ پکڑلی اور بولا۔ ''بھگوان کے لیے شہباز مجھے بھی نکالو' میں ڈوب جاؤں گا۔''

پلاسٹر والی ٹانگ کے ساتھ اس کے لیے تیرنا ممکن نہیں تھا مگر اس وقت مجھے اپنی پڑی تھی اسے کہاں سے بچاتا۔ میں ٹانگ جھٹک کر آگے بڑھا۔ بیتو اسکیز پر کھڑا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس نے ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے کھینچا کیونکہ ہیلی کاپٹر دوسری طرف جھک رہا تھا۔ میں نے نیچے دیکھا تو دریا کا پانی چمک رہا تھا۔ یہاں آسمان کہیں کہیں صاف تھا مگر چاند نہیں تھا اور ستارے نظر آرہے تھے۔ میں نے دریا کا مشرقی کنارہ دیکھا وہ کوئی سو فٹ دور تھا۔ پانی سست روی سے بہہ رہا تھا۔ سنکاری بھی ہیلی کاپٹر کی اسکیز سے چمٹا ہوا تھا۔ بیتو نے اسلحے والا بیگ شانے سے ٹانگ لیا تھا۔ وہ بولا۔ ''شوبی جلدی کرو، اس سے پہلے کوئی ادھر آئے ہم کو نکل جانا چاہیے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ راج کنور کونے میں خود کو پانی سے اوپر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا سر اور ایک شانہ پانی سے باہر تھا باقی جسم پانی میں تھا۔ میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور بیتو سے کہا۔ ''جلدی نکلو....''

بیتو کے پاس اسلحے والا وزنی بیگ تھا وہ اسے ہی لے جاتا تو کافی تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ''میرے پاس آجاؤ۔''

''ہم ڈوب جائے گا۔'' وہ ہیلی کاپٹر سے چمٹے ہوئے بولا۔

جواب میں میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچی اور وہ چیخ مار کر پانی میں گرا۔ میں نے اسے گھما کر اس کی گردن قابو میں کی اور دوسرے ہاتھ سے پانی کاٹتے ہوئے کنارے کی طرف جانے لگا۔ بیتو مجھ سے آگے تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ سو گز سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ درحقیقت ہم بالکل وسط میں گرے تھے۔ پچاس فٹ کے بعد میرے پاؤں زمین سے ٹکرانے لگے تھے۔ سنکاری بھی اب سنبھل گیا تھا۔ کنارے سے تیس فٹ پہلے پانی کم ہوگیا تھا اب ہم چل کر کنارے تک جارہے تھے۔ کہیں کہیں گڑھے آجاتے تو ہم غوطے کھا جاتے تھے۔ بیتو مجھ سے پہلے پہنچا۔ اس نے بیگ ریت پر پھینکا اور پلٹ کر آیا پھر مجھ سے سنکاری کو لے لیا۔ ہم کنارے پر پہنچے اور ریت پر گر گئے۔ بیتو ہانپ رہا تھا اور میری سانس بھی بے ترتیب تھی لیکن سنکاری جسے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا اس کی حالت سب سے بری تھی، وہ یوں منہ کھول کھول سانس لے رہا تھا جیسے سب سے زیادہ مشقت اسی نے کی ہو۔ میں واپس جانے کے لیے پلٹا تھا کہ بیتو نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''شوبی کدھر جاتا ہے۔''

میں راج کنور کو نظر انداز کر کے ہیلی کاپٹر سے نکل آیا تھا اگر میں اسے مرنے کے لیے چھوڑ دیتا تو وہ اس کا مستحق تھا۔ اسے بچانا مجھ پر بالکل بھی فرض نہیں تھا جب کہ وہ کئی بار مجھے مارنے کی پوری کوشش کر چکا تھا۔ اس وقت ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا کیونکہ ہیلی کاپٹر کریش معمولی واقعہ نہیں تھا اور یہ کریش میزائل کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم جس ملک کی حدود میں گرے تھے اس کے لوگ جلد یا بدیر یہاں پہنچنے والے تھے۔ مگر اس کے باوجود میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ اسے یوں بے بسی سے مرنے کے لیے چھوڑ دوں۔ میں نے بیتو کو آگاہ کیا۔ ''میں راج کنور کو لینے جارہا ہوں۔''

''چھوڑو شوبی مرنے دو اس کتے کو۔''

''نہیں وہ آگے ہمارے کام آئے گا۔'' میں نے کہا۔ اگر میں بیتو کو انسانیت کا بھاشن دیتا اور اس سے بحث کرتا تو اس کا وقت نہیں تھا۔ بیتو نے میرا بازو چھوڑا تو میں نے لیپ ٹاپ والا بیگ بھی اتار کر اسے دے دیا۔ بیتو کو بتایا۔ ''اس میں لیپ ٹاپ ہے۔''

میں نے پانی میں چھلانگ لگائی اور چلنے کے بجائے تیرتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی طرف جانے لگا۔ اس سے رفتار تیز ہو جاتی۔ ہیلی کاپٹر رفتہ رفتہ پانی میں ڈوب رہا تھا پانی میں گرنے سے اسے مزید نقصان نہیں ہوا۔ اس کے پر سلامت تھے بس دم کا ایک حصہ اڑ گیا تھا اور ایک طرف کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا۔ اپنے وزن کی وجہ سے وہ دریا کے کیچڑ میں دھنس رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس سے ہوا کہ وہ ایک ہی جگہ تھا۔ میں ہیلی کاپٹر تک پہنچا اور اسکیز پکڑ کر اوپر چڑھا۔ میں نے راج کنور کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر پانی بھر گیا تھا اور راج کنور کا ہیولا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے کنارے بیٹھ کر اپنے پاؤں اسکیز میں پھنسائے اور سانس روکتے ہوئے پشت کے بل پانی میں گیا۔ میرے ہاتھ راج کنور کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔

مجھے جا کر واپس آنے میں پانچ چھ منٹ تو لگے تھے اور اگر راج کنور ہمارے جاتے ہی ڈوب گیا تو اس کی زندگی کی توقع محال تھی۔ راج کنور پتا نہیں کہاں تھا؟ میرا سانس اکھڑنے لگا تھا کہ اچانک ہی اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اوپر ہوتے ہوئے اسے کھینچا اور سیدھا ہو کر اسے پانی سے باہر نکالا۔ راج کنور بے جان انداز میں جھول رہا تھا۔ یہاں اس کے پھیپھڑوں میں بھر جانے والا پانی روایتی ابتدائی امداد کے طریقے سے نکالنا مشکل تھا اس لیے

میں نے آسان طریقہ اختیار کیا اور اسے پیٹ کے بل کنارے پر لٹا دیا۔ اب اس کی ٹانگیں ہیلی کاپٹر کے کیبن کے اندر تھیں اور باقی دھڑ باہر جھول رہا تھا۔ اس کا سر نیچے کی طرف تھا۔ میں نے اس کی پشت پر مکے مارے۔ اس طرح اس کے پیٹ اور پھیپھڑوں میں بھر جانے والا پانی نکل جاتا۔ چند مکوں کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن پھر اس نے الٹی کی اور کھانسنے لگا۔ وہ ڈھیٹ تھا بچ گیا تھا۔ چند لمحے کھانسنے کے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور خود کو الٹے لٹکے پا کر گلا پھاڑ کر چلایا تھا۔

''خاموش رہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم بچ گئے ہو۔''

''میں مر جاؤں گا۔'' اس نے گھگیا کر کہا۔

''اگر یہی حرکتیں رہیں تو مرو گے بھی۔'' میں نے کہا اور پانی میں اتر کر اسے نیچے کھینچا تو وہ ذبح کیے جانے والے بکرے کی طرح بلبلایا۔

''میری ٹانگ....''

''اسے بھول جاؤ اور جان بچ جانے پر بھگوان کا شکر ادا کرو۔''

میں نے اسے بھی سنکاری کی طرح گردن سے پکڑا اور کنارے کی طرف کھینچنے لگا۔ یہ کسی ڈوبتے شخص کو جو تیرنا نہیں جانتا ہو بچانے کا بنیادی اصول ہے، اسے کبھی سامنے سے نہ پکڑو ورنہ وہ آپ کو چمٹ جائے گا اور بعض اوقات اس طرح ڈوبنے والے بچانے والے کو بھی لے ڈوبتے ہیں۔ سب سے آسان طریقہ ہے کہ پشت سے آکر بازو سے گردن اور سینہ جکڑ لو۔ اس سے ڈوبنے والا آپ کو نہیں پکڑ سکتا ہے۔ ابھی تک کسی طرف سے ہیلی کاپٹر کریش پر کوئی ردِعمل نہیں ہوا تھا۔ نہ آسمان سے اور نہ زمین سے۔ چاروں طرف تاریکی تھی اور اگر کوئی متوجہ ہوتا تو روشنی کے ساتھ آتا۔ شاید آس پاس کوئی آبادی بھی نہیں تھی اور پھر ہیلی کاپٹر بہت بلندی سے نہیں گرا تھا۔ اس لیے یہ دور سے نظر بھی نہیں آیا ہوگا۔ یہ دریا کی نشیبی وادی میں اڑ رہا تھا۔ دھماکا بھی زیادہ دور تک نہیں سنا گیا ہوگا۔ راج کنور سنکاری کے مقابلے میں زیادہ وزنی تھا اور اپنا ایک پاؤں استعمال کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ پھر اتنی دیر سانس رکنے سے بھی اس کی حالت بری ہو رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر کھانس رہا تھا۔ مشکل سے سہی مگر میں اسے کنارے تک لانے میں کامیاب رہا۔ بیتو بادلِ ناخواستہ آگیا اور اسے کھینچ کر کنارے لے گیا۔ اسے ریت پر پھینک کر اس نے مایوسی سے کہا۔ ''بچ گیا حرامی۔''

''انڈین فلموں کی روایت کے مطابق۔'' میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''ولن سب سے آخر میں مرتا ہے بعض اوقات ہیرو کے بھی بعد مرتا ہے۔''

سنکاری اب جان کے بجائے اپنے آنے والے مستقبل کے لیے فکرمند تھا اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ ''تم فلموں کی بات کرتا ہے، ادھر اپنا فلم بننے والا ہے۔ شوٹ آؤٹ ان راوی والا۔''

مجھے ہنسی آگئی۔ ''فکر مت کرو کسی کو پتا نہیں چلے گا تم بچ گئے ہو، خاموشی سے اپنے گھر چلے جاؤ۔''

''ابھی یہ ہیلی کاپٹر ملے گا تو جلد اس کے سیریل نمبر سے پتا چل جائے گا کہ یہ میرا ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس والا سیدھا میرے گھر آئے گا۔''

کیونکہ یہ میرا مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں نے اس پر سوچا نہیں تھا۔ مگر یہ سنکاری کا مسئلہ تھا اس نے سوچ لیا۔ میں نے کہا۔ ''فی الحال تو یہاں سے نکلنا ہے اس کے بعد سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔''

میں نے بیتو سے لیپ ٹاپ والا بیگ لے کر پشت پر پہن لیا۔ اسلحے والا بیگ بیتو نے اٹھا لیا تھا۔ میرا پستول پانی میں اچھی طرح بھیگا تھا مگر یہ ایک نمبر اسمتھ اینڈ ولسن تھا اس لیے امید تھی کہ یہ کام کرے گا۔ البتہ بعد میں اس کی صفائی ضروری تھی۔ دریا کا پانی سرد تھا مگر باہر آئے تو گرمی تھی اور کپڑے مشکل سے دس منٹ میں خاطر خواہ خشک ہو گئے۔ راج کنور کی حالت بہتر تھی مگر اس کی کھانسی جاری تھی اور وہ اس معاملے میں احتیاط سے کام بھی نہیں لے رہا تھا۔ اس کی بہ آواز بلند کھانسی یقیناً اس سناٹے میں خاصی دور تک سنائی دے رہی ہوگی۔ اس لیے بیتو نے اسے خبردار کیا۔ ''اپنا کھانسی بند کرو ورنہ گلا دبا کر بند کردے گا۔''

''میں .... کھانسی کیسے روکوں....'' راج کنور نے جواب دیا۔

''یہ حق بہ جانب ہے۔'' میں نے راج کنور سے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے اس کے کہنے پر عمل کرو۔''

بیتو نے کہا۔ ''اس مردے کو کون لے جائے گا؟''

''اسے سنکاری پائلٹ کرے گا۔'' میں نے کہا۔

سنکاری اب اپنے ہیلی کاپٹر کا ماتم کر رہا تھا، وہ اس کا ذریعۂ روزگار تھا اور اب یہ پانی میں پڑا تھا۔ اس نے حسرت سے کہا۔ ''ہم دوسرا نہیں لے سکتا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"یہ دلائے گا۔" میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اتنا دولت مند ہے کہ ایسے دس ہیلی کاپٹر دلا سکتا ہے۔"

سنکاری نے سرد آہ بھری۔ "کوئی فائدہ نہیں ہوگا مجھے ایجنسی والا لے جائے گا۔"

میں اور بیتو سارے بیگز لاد چکے تھے۔ بیتو نے ایک پستول نکال لیا تھا۔ اس کا بیگ واٹر پروف تھا اس لیے اسلحہ بھیگنے سے محفوظ رہا تھا۔ مجھے پتا چلا تو میں نے اپنا پستول واپس رکھ کر سائلنسر والا لے لیا۔ اس کا بس ایک اضافی میگزین باقی رہ گیا تھا۔ اسی لمحے ایک طرف سے بادل ہٹے اور چاند نکل آیا۔ اس سے ہمیں سمت کا تعین کرنے میں آسانی ہوئی۔ چاند مشرق کی طرف تھا اور یہ شاید سات یا آٹھ تاریخ کا چاند تھا۔ میں نے راج کنور کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا دوسری طرف سے سنکاری نے اسے سنبھال لیا اور ہم دریا کی ڈھلان پر اوپر چڑھنے لگے۔ کنارہ کم سے کم بھی تیس فٹ اونچا تھا۔ انڈیا نے اپنی طرف کے پشتے بہت اونچے رکھے تھے اور شدید سیلاب کی صورت میں شاید ہی پانی ان تک آتا ہوگا ۔ نیچے دریا کی مخصوص ریت تھی جس پر چلنا آسان کام نہیں تھا خاص طور سے جب آپ کسی کو سہارا دے کر چل رہے ہوں۔ پاؤں رکھنے پر یہ دبتی اور پھسلتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا ہم خشک دلدل پر چل رہے ہوں۔

راج کنور کی حالت اچھی نہیں تھی اور اس نے سارا بوجھ ہم دونوں پر ڈال رکھا تھا۔ کنارے تک آتے آتے سب کی حالت بری ہوگئی تھی سوائے بیتو کے کیونکہ وہ صرف بیگ سنبھالے خراماں خراماں ہمارے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اس نے اخلاقاً بھی راج کنور کو سہارا دینے کی کوشش نہیں کی اُس کا بس چلتا تو وہ اسے واپس پانی میں دھکا دے دیتا۔ پشتے پر پہنچ کر میں نے راج کنور کو چھوڑ دیا اور وہ کراہتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ فی الحال تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ ہم سرحد سے زیادہ دور نہیں تھے اور یہاں سیکورٹی فورس کا گشت جاری رہتا ہوگا۔ کسی وقت بھی کوئی آسکتا تھا اور یہاں بھاگنے کی جگہ نہیں تھی۔ دریا کے دوسری طرف دور تک میدان تھا جس میں جا بہ جا جھاڑیاں تھیں۔ ایسی جھاڑیاں مجھے اس وقت بھی ملی تھیں جب میں غلطی سے راستہ بھٹک کر انڈیا پہنچ گیا تھا۔ یہ سخت کانٹے دار جھاڑیاں تھیں مگر یہاں یہ فاصلے سے تھیں اور ان کے درمیان سے گزرنے کی جگہ تھی۔ اگر ضرورت پڑتی تو ہم ان میں پناہ لے سکتے تھے۔

چاند کی روشنی اتنی تھی کہ راستہ نظر آرہا تھا۔ چند منٹ آرام کے بعد میں نے راج کنور اور سنکاری سے کہا۔ "بس اٹھ جاؤ، ہمیں آگے جانا ہے۔"

"میں نہیں اٹھ سکتا۔" راج کنور نے کہا۔ "مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

"اس صورت میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔" میں نے پستول نکال کر اس کی طرف کیا تو اس نے کوئی حرکت نہیں کی اور مسکرانے لگا۔

"شہباز میں تمہیں جان گیا ہوں، تم انتہائی اشد ضرورت کے وقت ہی کسی کی جان لیتے ہو۔"

"پر ہم تو لے سکتا ہے۔" بیتو غرایا۔ "چلتا ہے یا تیرا اِدھر ہی مرڈر کرے۔"

"ہولی کرائسٹ۔" سنکاری نے سینے پر کراس بنایا۔ "ہم آنکھ بند کرلے۔"

"بہتر ہوگا اسے اٹھاؤ۔" میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا تو سنکاری نے بادلِ ناخواستہ اسے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ راج کنور چلنے میں جان بوجھ کر سستی کررہا تھا مگر جب بیتو نے اپنے پستول سے اس کا شانہ بجایا تو اس کی ساری سستی دور ہوگئی اور اس نے بلبلا کر مجھ سے کہا:

"شہباز یہ آدمی بہت ظالم ہے۔"

"اس کے برعکس یہ تمہارے ساتھ بہت رحم دلی کا مظاہرہ کررہا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اس کا سارا خاندان اور قبیلہ تم لوگوں کی ہوس اور سفاکی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔"

راج کنور چونکا۔ "اس کا تعلق قبائلیوں سے ہے؟"

"ہاں یہ تب سے میرے ساتھ ہے۔"

راج کنور نے مجھے مشکوک انداز میں دیکھا۔ "تمہیں اس سے کیا دل چسپی ہے؟"

"یہ میرا ساتھی ہے۔"

"میرا مطلب ہے...."

"اپنا مطلب اپنے پاس رکھو اور اب منہ بند کرکے چلو۔" میں نے اس بار سخت لہجہ اختیار کیا۔ ہم جھاڑیوں تک پہنچ گئے۔ اگر یہاں کوئی ہوتا تو ہماری آوازیں سن سکتا تھا۔ انسان پر آنے والی اکثر آفتیں اس پر زبان کے غیر ضروری استعمال کی وجہ سے آتی ہیں۔ "اب بالکل خاموشی سے چلنا ہے کوشش کرنی ہے کہ چلنے میں کوئی آواز نہ ہو میری بات سمجھ

رہے ہو نا۔"

راج کنور نے بادلِ ناخواستہ سر ہلایا۔ اسی دوران میں چاند بادلوں کے پیچھے چھپ گیا اور اب یہاں تاریکی تھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس قسم کی جھاڑیوں میں گڑھے بھی ہوتے ہیں، جب آدمی ان میں گرتا ہے تب پتا چلتا ہے۔ اس لیے میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا، باقی سب میرے پیچھے تھے۔ کچھ دیر میں آنکھیں کام کرنے لگیں تو چاند نکل آیا۔ آسمان پر بادلوں کی چاند کے ساتھ آنکھ مچولی جاری تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جب چاند ہوگا تب ہم سفر کریں گے اور تاریکی میں رک جائیں گے۔ جیسے ہی رکتے راج کنور اور سنکاری بیٹھ جاتے تھے۔ ایک بار وہ بیٹھے تو میں کہا۔ "زمین پر ہاتھ مارتے رہو یہاں سانپ ہوسکتے ہیں۔"

"اسنیک۔" سنکاری نے ہڑبڑا کر کہا۔ "کدھر ہے؟"

"ہے نہیں ہوسکتا ہے، وہ بے خبری میں تمہاری طرف آسکتا ہے۔ اس لیے زمین پر ہاتھ مارتے رہو۔"

"تب تو وہ جان کر آئے گا۔" سنکاری نے سادگی سے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

"نہیں سانپ ہمیشہ بے خبری میں انسان کے پاس آتا ہے اور پھر اس کے حرکت کرنے پر بے اختیار ڈس لیتا ہے۔ سانپ زمین پر ہلکی سی بھی دھمک سن لیتا ہے اگر اسے کہیں سے دھمک ملتی ہے تو وہ اس طرف جانے سے گریز کرتا ہے۔"

یہ سن کر سنکاری اور راج کنور جلدی جلدی زمین پر ہاتھ مارنے لگے۔ بیتو نے سنکاری سے کہا۔ "اتنا شور کائے کو کرتا ہے سانپ آئے تو بولو بھائی ہے اس کا، وہ ایسے ہی چلا جائے گا۔"

بیتو کا اشارہ راج کنور کی طرف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میری قسمت میرے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی تھی۔ میں کتنی کوشش کے بعد سرحد پار کرکے گیا تھا اور پھر بس سرزمین چھو کر واپس آگیا۔ مجھے سویرا کا کچھ خیال آیا جو بیتابی سے میری منتظر تھی۔ اسے پتا چلے گا کہ میں آکر واپس چلا گیا تو اس کے دل پر کیا گزرے گی؟ جب تک میں انڈیا میں تھا اس کا سارا وقت کس ٹینشن میں گزرا تھا یہ صرف وہی جانتی تھی، میں بھی صرف اندازہ کرسکتا تھا۔ میرے ساتھ جن کے دن رات میری فکر میں تھے اب دوبارہ اسی فکر میں رہیں گے۔ مگر میں کیا کرسکتا تھا۔ تقدیر نے پھر مجھے سرحد کے اس پار دھکیل دیا تھا۔ سادی بھی بیتو کی طرح اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے بھائیوں اور اپنی پر تعیش زندگی کی طرف واپس جاسکتی تھی مگر اس نے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ترجیح دی۔ وہ پہلے کمار سے وابستہ ہوئی۔ اس کے بعد وسیم نے اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اسے اپنا لیا۔ اب سادی ہماری فیملی کا ایسا جزو بن گئی تھی جس کے بغیر یہ خاندان نامکمل تھا۔

چند گھنٹے پہلے میں جتنی شدت اور بیتابی سے پاکستان جانے کے لیے بے چین تھا اب اتنی ہی شدت سے خواہش کررہا تھا کہ میں انڈیا کی سرزمین پر رہوں۔ میں نے اس علاقے کا نقشہ دیکھا تھا۔ یہاں راوی سرحد کے ساتھ لگ کر اس طرح بہتا ہے کہ کبھی ایک ملک اور کبھی دوسرے ملک میں ہوتا ہے اور کبھی یہ عین سرحد پر بہتا ہے اس لیے یقین سے کہنا بہت مشکل تھا کہ درحقیقت ہم کہاں تھے۔ میزائل سے بچنے کے لیے ہم نے شمال کا رخ کیا تھا اور ہمیں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں ملا تھا۔ اس کے بعد بھی ہیلی کاپٹر نے شاید دو تین منٹ پرواز کی تھی اور پھر کریش ہوا تھا۔ اس کا مطلب ہے ہم اس جگہ سے شاید بیس کلومیٹرز سے زیادہ دور نہیں آئے تھے۔ میں نے ذہن میں نقشہ تازہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے ٹھیک سے یاد نہیں آیا کہ شمال کی طرف راوی انڈیا میں بہتا تھا یا پاکستان میں۔

"شوبی چلنے کا نہیں ہے، اٹھاؤں اس حرامخور کو۔" بیتو نے مجھے ہلایا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ پاکستان میں رہ کر وہ بہت کم عرصے میں مخصوص الفاظ بولنے لگا تھا۔

"ہاں چلو۔" میں نے کہا اور بازو تھام کر راج کنور کو کھڑا کیا اس بار میں نے بھی اسے سہارا دیا تھا۔ مجھے راوی کا مقام تو یاد نہیں آیا تھا لیکن نقشے پر اس علاقے میں ایک انڈین سڑک یاد آئی تھی جو سرحد سے مشکل سے دو کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی۔ اگر ہم انڈیا میں تھے تو یہ سڑک ملنی چاہیے تھی اور سڑک پر کوئی نہ کوئی ٹریفک ہوگا۔ گاڑی مل جاتی تو ہم با آسانی یہاں سے نکل جاتے۔ پندرہ منٹ میں ہم نے شاید ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ دوبارہ اندھیرا ہوگیا۔ ہم آرام کرنے بیٹھے تھے کہ مجھے خیال آیا اور میں نے لیپ ٹاپ والا بیگ کمر سے اتارا۔ یہ اوپر سے خشک ہوگیا تھا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے پیراشوٹ کے کپڑے سے بنا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اندر پانی جاسکتا تھا لیکن جب میں نے لیپ ٹاپ نکالا تو وہ مکمل طور پر خشک تھا۔ مجھے خوشگوار حیرت

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئی۔ بیگ کے اندر ذرا بھی نمی نہیں تھی۔ لیپ ٹاپ کے ساتھ کرنسی کی گڈیاں اور انٹرنیٹ ڈیوائس بھی خشک تھی۔ میں نے لیپ ٹاپ کھولا تو اس کی اسکرین فوراً روشن ہوگئی تھی۔ میں نے سکون کا سانس لے کر انٹرنیٹ ڈیوائس نکال کر لگائی تو چند لمحے بعد اس کی روشنی جلنے لگی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ یہاں انٹرنیٹ کے سگنلز دستیاب تھے۔ مشکل سے ایک منٹ میں انٹرنیٹ کنکشن آن ہوگیا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے فوراً عبداللہ کا نمبر ملایا۔ وہ شاید منتظر تھا اس نے بیل مکمل ہونے سے پہلے کال ریسیو کر لی۔

"آپ....؟"

"ہاں پہنچ گئے ہیں...." میں نے مبہم انداز میں کہا۔ "مسئلہ ہوگیا تھا۔ پرندہ پانی میں اتر گیا۔ ہم سب ٹھیک ہیں۔"

"جناب ایاز نے دیکھ لیا تھا' نیچے سے روشنی کی لکیر لپکی تھی۔" عبداللہ بھی مبہم انداز میں بولا۔ "اس کے بعد سے ہم سب بہت پریشان تھے۔"

"تم لوگ فوراً واپس جاؤ اور وسیم کو کسی بھی جذباتی قدم سے روکو۔"

"ہم واپس جارہے ہیں۔ سفیر مسلسل وسیم سے رابطے کی کوشش کررہا ہے۔"

اسی لمحے سفیر کی آواز آئی۔ اس نے دہاڑ کر کہا۔ "کال کیوں نہیں ریسیو کررہا تھا.... ہاں سب سوتیلے ہیں تو ہی ایک سگا ہے.... شہباز آیا تھا پھر واپس چلا گیا ہے.... وہ بھی ایک سگا ہے نا.... ہاں سادی کو بڑے کنور نے اٹھوایا ہے.... شہباز کی اس سے بات ہوئی ہے.... وہ کل تک اس کے پاس پہنچ جائے گی.... شہباز کی کال آئی ہے.... اچھا اچھا۔" سفیر نے کہا اور عبداللہ سے موبائل لے کر مجھے وسیم کا نمبر بتایا۔ "اس الو کے پٹھے سے بات کر۔"

میں نے نمبر کاٹ کر وسیم کا نمبر ملایا۔ میں بلوٹوتھ ہینڈ فری کی مدد سے بات کررہا تھا اس لیے میں لیپ ٹاپ وہیں چھوڑ کر ان لوگوں سے ذرا دور چلا گیا تھا تاکہ وہ میری گفتگو نہ سن سکیں۔ واپس آکر میں نے دوبارہ کال ملائی اور وسیم نے کال ریسیو کی۔ "یہ آپ نے کیا کیا' آپ واپس کیوں چلے گئے؟"

"بڑے کنور کی شرط یہی تھی۔ میں نے اسے دھوکا دیا ہے اور دو دن کا وقت مانگا ہے۔ میری کوشش ہے کہ بارہ گھنٹے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں اور راستے میں ہی سادی کو واپس حاصل کرلوں۔"

"آپ اور بیتو ہیں۔" اس نے کہا۔ "کاش میں بھی آسکتا۔"

"ہرگز نہیں تم میں سے کوئی میرے حکم کے بغیر اس طرف نہیں آئے گا۔ میں اور بیتو کافی ہیں۔"

"شہباز صاحب۔" وسیم کی آواز بھرا گئی۔ "آپ جانتے ہیں وہ ماں بننے والی ہے۔"

"میں جانتا ہوں یار اور بڑے کنور کو بھی خبردار کردیا ہے، وہ بہرحال اس کا بھائی ہے۔ اس نے کہا وہ لاتے والوں سے کہے گا کہ سادی کا اس حوالے سے بھی خیال رکھے۔"

"اسے سادی کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"دبئی میں سادی کو کسی انڈین نے دیکھ لیا تھا۔ شاید اسی سے پتا چلا تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر میں واپس نہ آتا تو وہ اب بھی سادی کو نہ چھیڑتا۔ وہ خوش ہے کہ سادی اپنے گھر میں خوش ہے۔"

"خوش ہے۔" وسیم نے تلخی سے کہا۔ "یہ محبت ہے اس کی اپنی بہن سے؟"

"تم اسے ہمارے پیمانے سے مت ناپو۔ یہ ایلیٹ کلاس ہے۔ ان کی محبت کے پیمانے بھی الگ ہوتے ہیں۔"

"ابھی آپ کہاں ہیں؟"

"میرا اندازہ ہے کہ لکیر کے دوسری طرف ہیں مگر کنفرم نہیں ہے۔"

"سفیر بتا رہا تھا کہ آپ کو ہٹ کیا گیا تھا؟"

"ہاں بڑی خوفناک صورتِ حال تھی مگر بس اوپر والے نے رحم کیا۔" میں نے کہا۔ "میں پھر بات کروں گا، ابھی تو یہی بتانے کے لیے کال کی تھی۔ ایک بار پھر وارننگ دے دوں مجھ سے پوچھے بغیر کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔"

"آپ بے فکر رہیں میں اب ٹھیک ہوں۔ اسلام آباد کے پاس پہنچ گیا ہوں۔ وہ لوگ بھی پیچھے بکتے جھکتے آرہے ہیں۔"

"تیار ہوجاؤ سفیر سخت غصے میں ہے۔"

میں نے کال کاٹ دی اور ڈیوائس نکال کر لیپ ٹاپ دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔ اس کی بیٹری شاندار قسم کی تھی۔ ابھی بھی تین چوتھائی بیٹری تھی جب کہ میں اسے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ استعمال کر چکا تھا۔ ہمالیہ ہوٹل کے منیجر نے بہترین چیز منگوائی تھی۔ اسی طرح اسکائپ کریڈٹ کی وجہ

سے میرے لیے کہیں کال کرنا بہت آسان ہوگیا تھا۔ ہم دوبارہ روانہ ہوئے اور دس منٹ بعد ہی سڑک نظر آگئی بلکہ اس سے گزرنے والی گاڑیاں نظر آئی تھیں۔ ان کی روشنی کی وجہ سے ہمیں پتا چلا کہ ہم سڑک کے پاس پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے کچھ دور میں نے راج کنور کو بیتو کی نگرانی میں چھوڑا اور خود سنکاری کے ہمراہ سڑک تک آیا۔ یہ کوئی ہائی وے نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی ذیلی سڑک تھی جو گاؤں دیہاتوں کو دور دراز علاقوں سے ملاتی ہے۔ مطلب یہ ایک سڑک تھی اور زیادہ بڑی بھی نہیں تھی لیکن اس کا معیار بہت اچھا تھا۔ زمین سے اونچی اور ہموار سڑک تھی۔ رات کے وقت یہاں ٹریفک کم تھا۔ اس وقت دس بجنے والے تھے۔

کچھ دیر بعد ایک ٹرک نمودار ہوا وہ جنوب سے آرہا تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ "تم یہیں رکو میں ٹرک روکنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن غائب مت ہونا میں تمہیں تلاش کرلوں گا۔"

"ہم نہیں جائے اِدھر ہی رہے گا۔" اس نے یقین دلایا مگر میں اس پر نظر رکھے ہوئے سڑک پر آگیا ٹرک سو گز دور تھا اور اس کے ڈرائیور نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا۔ مگر اس نے رفتار کم کرنے کی زحمت نہیں کی حالانکہ میں مسلسل رکنے کا اشارہ کررہا تھا۔ مجھے اس کا خدشہ تھا اس لیے میں نے ٹرک روکنے کا بندوبست کرلیا تھا جیسے ہی وہ قریب آیا تو میں نے ایک طرف ہٹتے ہوئے ہاتھ میں موجود پتھر اس کی ونڈ اسکرین پر کھینچ مارا۔ ایک دھماکا ہوا۔ اسکرین ٹوٹی تو نہیں لیکن اس پر یقیناً بال آگیا تھا۔ ٹرک مجھ سے فٹ بھر کے فاصلے سے گزرا تھا۔ حسبِ توقع ڈرائیور نے مشتعل ہوکر ٹرک روکا اور نیچے اتر آیا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا اور میرے ٹوٹے کرنے کا اعلان کررہا تھا لیکن پاس آتے ہی اس کی زبان بند ہوگئی کیونکہ میں نے پستول نکال لیا تھا۔ وہ جوان عمر کا لمبا تڑنگا سکھ تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا کہ میں انڈیا پہنچ گیا تھا۔ سکھ بڑے جارحانہ موڈ میں آیا تھا اور پستول دیکھ کر اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔ مگر اس کی زبان نہیں رکی تھی۔ بس ٹون بدل گئی تھی۔

"اوئے.... سرکار.... اے کی ائے میں تے بس ایویں غصے وچ آگیا سی...."

"تے میں بھی محبت توں نکالا اے جانی۔" میں نے کہا۔ "گل اے ہے کہ سانوں لفٹ چاہیدی اے۔"

"توانوں۔" وہ چونکا۔ "ہور کون اے؟"

"پہلے تم بتاؤ ٹرک میں اور کون ہے؟"

"کوئی نہیں ہے جی میں کلاں واں۔" اس نے یقین دلایا مگر میں نے ٹرک میں دیکھ کر یقین کیا ٹرک خالی تھا۔ ڈرائیور کا نام اگر سنگھ تھا اور وہ ڈیوٹی کرکے گھر جارہا تھا۔ وہ اسی علاقے میں ٹرک چلاتا تھا اور بار برداری کا کام کرتا تھا۔ اگر اسے اعتراض تھا کہ لفٹ لینے کا یہ کون سا طریقہ ہے، پہلے پتھر مارا اور اب پستول نکال لیا تھا تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے سنکاری کو آواز دی وہ دوڑا ہوا آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "جا کر ان دونوں کو لے آؤ۔"

اگر سنگھ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ میں ڈاکو ہوں اس نے شبہے کا اظہار کیا۔ "تسی ڈاکو نہیں لگدے۔"

"ہاں نہیں لگتا۔" میں نے اقرار کیا۔

"پر تسی ہو۔"

"میں نہیں ہوں۔"

"تے فیر اے پستول...."

"ہر پستول والا ڈاکو نہیں ہوتا ہے۔" میں نے ڈانٹا۔ "پستول تو پولیس کے پاس ہوتی ہے اور فوج کے پاس بھی تو کیا وہ ڈاکو ہیں؟"

"نہیں جی پر وہ وردی میں ہوتے ہیں۔"

"بعض پولیس والے وردی میں نہیں ہوتے ہیں۔"

اگر سنگھ سکھ تھا مگر عقل سے پیدل نہیں تھا کہ مجھے خفیہ پولیس والا یا کسی خفیہ ایجنسی کا نمائندہ تسلیم کرلیتا۔ اسے بھی معلوم تھا وہ لوگ اس طرح پیدل مارے مارے نہیں پھرتے ہیں، ان کے پاس گاڑیاں اور تمام وسائل ہوتے ہیں۔ بہرحال اسے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ ہم ڈاکو نہیں ہیں اور اس کا ٹرک نہیں چھینیں گے۔ یہ ٹاٹا کا بہت پرانے ماڈل کا ٹرک تھا جو آج بھی بھارت کے گاؤں دیہاتوں میں استعمال ہورہا ہے۔ یہ سستا اور آسانی سے مرمت ہونے والا ٹرک ہے اس لیے عام دیہاتی بھی اسے افورڈ کرسکتا ہے اور وہ اپنی پیداوار منڈی تک پہنچانے اور اچھے دام وصول کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں دیہاتی کسان کو کسی قابل ہی نہیں چھوڑا گیا ہے۔ وہ آج بھی آڑھتیوں کا محتاج ہے۔ بیتو اور سنکاری راج کنور کو لے آئے اور وہ تینوں ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہوگئے۔ میں اگر سنگھ کے ساتھ ڈرائیونگ کمپارٹ میں آگیا۔ اس نے ٹرک اسٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا۔

"تسی کتھے جانا اے؟"

"تم کہاں جارہے ہو؟"

"میں ڈیرا بابا نانک جارہا ہوں وہیں کا رہنے والا ہوں۔" اس بار اس نے پنجابی چھوڑ کر صاف لہجے میں کہا۔

"تم پڑھے لکھے ہو؟"

"ہاں جی امرتسر کالج سے گریجویشن کیا ہے۔" اس نے فخر سے بتایا۔

"اور ٹرک چلا رہے ہو؟"

اس نے اسٹیئرنگ بیلنس کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔ "ہاں تو کیا برا ہے؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ واقعی گریجویشن کر کے ٹرک چلانے میں کیا برائی ہے۔ یہ ہمارا معاشرتی احساسِ کم تری ہے کہ پڑھا لکھا انسان کوئی محنت کا کام نہ کرے۔ یہ کم پڑھے لکھوں یا ان پڑھوں کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔ کم سے کم ہمارے ہاں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے اور میں نے اب تک سوائے دھکوں کے کچھ نہیں کھایا تھا۔ باقیوں کا نہیں پتا لیکن اس وقت میرا بھوک سے برا حال ہو رہا تھا۔ لفٹ مل گئی تھی اور ہم خطرے والی جگہ سے دور جارہے تھے اس لیے اب پیٹ کی فکر لگی اور میں نے اگلا سوال اسی سے متعلق کیا۔ "ہم سب بھوکے ہیں کھانے کو مل سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں جی۔" اس نے کہا۔ "میرے گھر چلو۔"

"میں تمہیں معاوضہ دوں گا۔ ونڈ اسکرین کے پیسے بھی لے لینا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "پھر ہمیں ہوشیار پور جانا ہے۔ اس کے لیے کوئی ٹیکسی یا گاڑی مل سکتی ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "ادھر بابا نانک میں کئی ٹیکسی والے ہیں پر اس وقت شاید ہی کوئی جانے کو تیار ہو۔"

"منہ مانگے معاوضے پر بھی نہیں جائے گا؟" میں نے پوچھا۔ "میں ڈبل دوں گا۔"

اس نے سر ہلایا۔ "پھر جائے گا۔ جب تسی چنگے بندے ہو تے فیر پستول کیوں نکالا؟"

"مجبوراً۔" میں نے کہا تو وہ بھونچکا رہ گیا۔

"مجبور ہو کر کون پستول نکالتا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ یہاں سڑک پر ڈاکوؤں نے ہماری گاڑی روکی اور سب لوٹ لیا۔"

"پر آپ کے پاس پستول تھا؟" اس نے اعتراض کیا۔

اس پر میں نے لطیفہ بیان کیا۔ "شکر ہے اس پر نظر نہیں پڑی ورنہ یہ بھی جاتا۔ ہم دو گھنٹے سے یہاں سڑک پر کسی گاڑی کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے مگر کوئی رکا نہیں، ہم رکے تھے اور لٹ گئے۔"

وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی پروا کیے بغیر اسٹوری آگے بڑھائی۔ "انہوں نے ہمیں لے جا کر دریا میں دھکیل دیا اور خود ہماری گاڑی لے کر فرار ہو گئے۔ یہ جو تم ہمارا حال دیکھ رہے ہو اسی وجہ سے ہے۔"

بادلِ ناخواستہ اس نے میرا سفید جھوٹ تسلیم کیا۔ وہ دکھی نظر آرہا تھا جیسے میں نے سکھوں والا لطیفہ اپنے نام سے بیان کر کے اس کا استحقاق مجروح کیا ہو۔ اس نے اصل نقطہ اعتراض اٹھایا۔ "وٹہ کیوں ماریا سی.... شیشے پر نشان پڑ گیا ہے۔"

"میں نے کہا نا اس کی بھی ادائیگی کروں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

ڈیرہ بابا نانک زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم مشکل سے دس منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ یہ ایک درمیانے درجے کا قصبہ تھا لیکن پکے گھروں سے خوشحالی جھلک رہی تھی۔ سرحد سے یہ مشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھا اور خوشحالی کی وجہ ظاہر تھی۔ یہاں کی معیشت اسمگلنگ پر مبنی تھی۔ مگر سارے ہی اسمگلر نہیں تھے۔ کچھ یقیناً اگر سنگھ کی طرح محنت کر کے کماتے ہوں گے۔ اس کا گھر قصبے کے شمال میں اور آخر میں تھا۔ اس نے ٹرک ایک احاطے کے ساتھ روکا اور بولا۔ "یہ میرا گھر ہے۔"

"گھر میں کون کون ہے؟"

"میری ماں، بھائی اور اس کی بیوی؟"

"تمہاری شادی نہیں ہوئی۔"

"پہلی نوں نے کون سے سکھ دیئے ہیں جو ماں دوسری لے کر آئے۔" اس نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا اور نیچے اتر گیا۔ وہ بھابی سے دل برداشتہ لگ رہا تھا۔ میں بھی نیچے آیا، بیتو بھی عقبی حصے سے کودا تھا۔ اگر سنگھ دروازے کی طرف بڑھا تو میں اس کے ساتھ تھا اگرچہ ابھی تک اپنے انداز سے وہ خطرناک نہیں لگا تھا مگر اب میں نے انسانوں کے ظاہری روپ پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے اوپر سے زنجیر ہٹائی اور اندر داخل ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ عام سا دیہاتی گھر تھا۔ تقریباً نصف کنال کا پلاٹ تھا اس پر درمیان میں چند کمرے بنے ہوئے تھے اور کمروں کے چاروں طرف

سیمنٹ کی شیٹوں سے برآمدہ بنا ہوا تھا۔ مکان پکی اینٹوں کا تھا۔ سامنے والے صحن میں نیم کے دو بڑے درخت تھے جن کے تلے چارپائیاں تھیں۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "بیٹھو جی۔"

وہ اندر جانے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ سے بولا۔ "اگر سنگھ تم مجھے مہمان بنا کر لائے ہو اس لیے مجھ پر فرض ہے کہ اس گھر کی سلامتی کا خیال رکھوں۔ کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ میں اپنا فرض بھول جاؤں۔"

"نہیں جی تسی اب مہمان ہو۔" اس نے کہا اور اندر بڑھ گیا۔ میں نے دروازے تک جا کر بیتو کو آواز دی۔

"ہاں شوبی۔" اس نے ٹرک کے پاس سے کہا۔

"ان دونوں کو بھی اندر لے آؤ۔"

ایک منٹ سے پہلے وہ تینوں اندر تھے۔ راج کنور کا تھکن اور تکلیف سے برا حال تھا اور سنکاری کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ وہ آتے ہی چارپائیوں پر ڈھیر ہو گئے۔ بیتو نے مجھ سے کہا۔ "شوبی ایک منٹ اِدھر آ کر ہمارا بات سنو۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک کونے میں آیا۔ بیتو نے دھیمی آواز میں کہا۔ "شوبی ان لوگوں کو بیکار میں اٹھائے پھر رہا ہے، دفع کرو۔ ہم کنور پیلس کی طرف چلتا ہے۔"

"جلدی مجھے بھی ہے لیکن ان دونوں کو نہیں چھوڑنا ہے۔ راج ایک ایسا سانپ ہے جسے فی الحال نہیں مارنا، سنکاری کو چھوڑ دیا اور وہ بھارتی پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو ہمارے بارے میں سب بک دے گا۔"

"اسے کیا معلوم کہ ہم کہاں جارہا ہے؟"

"وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اسے معلوم ہے کہ میں کتنی کوشش کر کے سرحد پار گیا تھا اور اب واپس آیا ہوں تو لازماً وہیں واپس جاؤں گا۔ کم سے کم وہ شملہ کی حد تک تو جانتا ہے کہ میں کہاں جا سکتا ہوں۔ پولیس میرے بارے میں جانتی ہے، اس سے پہلے بھی وادی میں ہونے والی لڑائی میں میرا نام آچکا ہے۔ پولیس مجھے وہیں تلاش کرے گی یا کم سے کم وہاں کی پولیس کو خبردار کر دے گی۔"

بیتو نے مجھے سنکاری کو ختم کرنے کا مشورہ نہیں دیا وہ جانتا تھا کہ میں کسی انسان کو اس طرح موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا تھا۔ خود بیتو بھی اس مزاج کا نہیں تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ "ہم نے انہیں کون سا اٹھا کر لے جانا ہے، یہ بھی گاڑی میں جائیں گے۔"

"راج کنور کتے کی طرح کراہ رہا تھا۔" بیتو نے مطلع کیا۔ "اسے تکلیف ہو رہا ہے۔"

راج کنور کو اس سفر میں جو جھٹکے برداشت کرنے پڑے تھے یقیناً اس کی جُڑ جانے والی ہڈی دوبارہ ہل گئی ہو گی۔ میں راج کنور کو اپنے ساتھ لے جانے کی نیت سے لے گیا تھا مگر وہ مجھ سے چمٹا ہوا واپس آ گیا۔ اگرچہ اس کے دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکی تھی کہ اسے واپسی کا بھی ایک کوڈ بتانا تھا جس کے بعد ہمیں انڈیا کے ریڈ زون سے گزرنے کی اجازت ملتی۔ اس سے پہلے ایک پاکستانی میزائل نے ہیلی کاپٹر کو ہٹ کر دیا تھا۔ پھر اسے ڈوبتے ہیلی کاپٹر سے بھی نکال لایا اور اب اسے ساتھ رکھنا مجبوری تھی۔ فی الحال میں نے سوچا نہیں تھا کہ اس کا کیا کرنا ہے؟ اسے درد ہو رہا تھا۔ اس کا علاج تو کوئی آرتھوپیڈک ہی کر سکتا تھا مگر ہم اس کے لیے پین کلر دوا لے سکتے تھے۔ چند منٹ بعد اگر سنگھ اندر سے برآمد ہوا تو میں نے اس سے پہلا سوال پین کلر کا ہی کیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "میں لاتا ہوں کھانے کا بول دیا ہے۔"

"کھانے میں کیا ہو گا؟" میں نے کہا۔ "میں ویجی ٹیرین ہوں گوشت نہیں کھاتا۔"

"یہاں گوشت ملے گا بھی نہیں۔" اس نے کہا۔

میں نے دل ہی دل میں اس سفید جھوٹ کی معافی مانگی اللہ سے جس نے اپنے بندے کو ہمیشہ بہترین گوشت کھلایا تھا۔ اگر سنگھ اندر سے لکڑی کی ایک میز اٹھا لایا اور اس نے پانی کا جگ اور گلاس رکھا تو سب ہی ٹوٹ پڑے تھے۔ خود میں دو گلاس پی گیا تھا تب مجھے پتا چلا کہ میں کتنا پیاسا تھا۔ ایک تو موسم گرم تھا دوسرے بھاگ دوڑ نے حشر کر دیا تھا۔ ہیلی کاپٹر کریش سے پہلے خون بھی خشک ہوا تھا۔ ہماری پیاس دیکھتے ہوئے اگر سنگھ دوبارہ پانی بھر کر لے آیا۔ اس نے معذرت کی کہ روٹی تیار ہونے میں کچھ دیر ہے۔ بیتو نے اس سے انگلی اٹھا کر سوال کیا۔ "لیٹرین کدھر ہے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے بیتو سے کہا اور اسے مکان کے عقبی صحن کی طرف لے گیا۔ چند منٹ بعد بیتو خوش باش اور صاف ستھرا ہو کر آیا تو میں نے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ پیچھے لائن سے لیٹرین اور غسل خانے بنے ہوئے تھے۔ دونوں پکے اور صاف ستھرے تھے۔ اندر پانی سمیت ہر سہولت تھی۔ میں نے لیٹرین اور غسل خانے دونوں سے استفادہ کیا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور بال ٹھیک کر کے میں خود کو خاصا بہتر انسان محسوس کرنے لگا تھا۔ کپڑے ریت والے پانی میں بھیگ کر خشک ہونے کے بعد عجیب سے ہو گئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ بہر حال اب ٹھیک تھے۔ ہمارے پاس مزید کپڑے نہیں تھے۔ بیتو نے جینز اور اوپر اسکن فٹ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اس لیے اس کا تو پتا نہیں چل رہا تھا۔ سنکاری نے فلائنگ جمپ سوٹ پہن رکھا تھا اور سب سے برا حال راج کنور کا تھا جس کا اسپتال کا سلکی لباس چرمرا گیا تھا۔ پلاسٹر کے اندر پانی چلا گیا تھا اور روئی بھیگی ہوئی تھی اسے دوبارہ پلاسٹر کی ضرورت تھی۔ میں نے اگر سنگھ سے کسی اسپتال کا پوچھا تو اس نے کہا:

"ادھر بٹالہ یا گورداسپور جانا پڑے گا۔ بٹالہ پاس ہے گورداسپور ذرا دور ہے لیکن وہاں سہولتیں بٹالہ سے زیادہ ہیں۔"

میں نے ذہن میں نقشہ تازہ کیا تو مجھے یاد آیا کہ شملہ اصل میں ہوشیار پور اور امرتسر سے بھی نیچے ہے یعنی میں گورداسپور کی طرف جاتا تو اوپر کی طرف نکل جاتا ہے اور عین ممکن ہے اس طرف سے شملہ جانے کا کوئی آسان راستہ بھی نہ ملتا تو میری معلومات کے مطابق کشمیر اور ہماچل پردیش کے درمیان راستے نہیں ہیں۔ اس لیے مجھے بٹالہ کی طرف جانا تھا۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ راج کنور کو علاج کی سہولت ملتی یا نہیں۔ بہر حال میں جلد از جلد شملہ اور پھر کنور پیلس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد کھانا آ گیا تھا۔ یہ تندور کی گرما گرم موٹی روٹیوں، سرسوں کے ساگ، آلو کی بھاجی اور اچار کے ساتھ لسی پر مشتمل تھا۔ بیتو کے چہرے پر بارہ بج گئے تھے کیونکہ وہ گوشت کے علاوہ کچھ کھاتا نہیں تھا۔ مگر اس وقت موقع نہیں تھا اس لیے اس نے یہ کھانا زہر مار کر لیا۔ البتہ میرے ساتھ سنکاری اور راج کنور نے بھی ڈٹ کر کھایا۔

یہاں بجلی تھی اور صحن میں بلب جل رہا تھا۔ لیکن اگر سنگھ نے مزید روشنی کے لیے ایک لالٹین کی شکل والی ایمر جنسی لائٹ بھی لا کر رکھ دی تھی۔ یہ میڈ ان چائنا تھی اور انڈیا چائنا کا دوست نہیں ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چین کی مصنوعات دنیا کے ہر گوشے میں پہنچ چکی ہیں۔ اس سے دوست دشمن سب مستفید ہوتے ہیں۔ سیر ہو کر کھانے کے بعد سب نے لسی کے گلاس چڑھائے اور پھر اونگھنے لگے تھے۔ اگر سنگھ نے بھی ہمارے ساتھ کھایا تھا اور سب کھایا تھا اس لیے مجھے شبہ نہیں ہوا کہ اس نے کوئی مکاری کرتے ہوئے کھانے میں کچھ ملایا ہو۔ کھانے کے بعد سب پر خمار طاری ہونے لگا تھا مگر یہ آرام کا موقع نہیں تھا۔ ہمیں یہاں سے روانہ ہونا تھا میں نے کھانے کے دوران ہی اگر سنگھ سے کہہ دیا تھا کہ وہ کسی ٹیکسی والے سے بات کرے ہمیں بٹالہ جانا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ بٹالہ کا سن کر کوئی نہ کوئی ٹیکسی والا تیار ہو جائے گا کیونکہ یہ صرف بیس میل دور تھا۔ اس سے آگے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی سواری مل جاتی۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ اگر سنگھ نے روانگی سے پہلے پوچھا۔

"ویسے بٹالہ تک کے یہاں سے سو روپے لگتے ہیں۔ پر کتنے پر معاملہ کر لوں۔"

"میں پانچ سو دوں گا۔" میں نے کہا تو اس کا منہ کھل گیا تھا۔

"پانچ سو دو گے آپ؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی دل چسپی محسوس کر کے کہا۔ "اگر تم لے جا سکتے ہو تو چلو اچھی بات ہے کسی اور کو ہمارے بارے میں علم بھی نہیں ہوگا۔"

"میں چلتا ہوں جی۔" وہ فوراً راضی ہو گیا تو میں نے اسے ہزار کا نوٹ دیا۔

"یہ تمہارا کرایہ اور کھانے کا بلکہ یہاں لانے کا بھی اور باقی سمجھ لو تمہاری ٹپ ہو گی۔" میں نے دوسرا نوٹ پیش کیا۔ "یہ شیشے کے ڈینٹ کے بدلے ہے۔"

وہ خوش ہوا تھا اس نے نوٹ لے لیے۔ "میں ماں کو بتا کر آتا ہوں۔ وہ مجھے رات کے بعد باہر نہیں جانے دیتی ہے۔"

اس دوران میں نہ تو اگر سنگھ کی ماں اور نہ ہی اس کی بھابی اور بھائی باہر آئے تھے۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا کہ کم سے کم لوگ ہمیں دیکھیں۔ یہاں گاؤں میں آتے ہوئے بھی کسی نے ہمیں اگر سنگھ کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اگر سنگھ آیا تو ہم تیار تھے۔ کھا پی کر جسم کی بیٹری چارج ہو گئی تھی۔ راج کنور کو آرام کا موقع ملا تو اس کی تکلیف میں بھی خاصی کمی آئی تھی پھر اسے پیراسیٹا مول کا انڈین ورژن دیا تھا۔ ہم پہلے کی طرح ٹرک میں سوار ہوئے یعنی بیتو، سنکاری اور راج کنور کے ساتھ پیچھے تھا۔ باڈی سے شکستہ حال نظر آنے والا ٹرک انجن اور سسپنشن کے لحاظ سے اچھی حالت میں تھا۔ اگر سنگھ اسے گلی سے نکالنے لگا تھا۔ جب ہم سڑک کی طرف روانہ ہوئے اور کراسنگ پر پہنچے تو مجھے جنوب کی طرف سے کئی روشنیاں گاؤں کی طرف مڑتی دکھائی دی تھیں۔ آنے والی گاڑیاں سات تھیں اور ان کی رفتار تیز

تھی۔ میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے اگر سنگھ سے کہا۔

"رفتار تیز رکھو ہمیں جلدی بٹالہ پہنچنا ہے۔"

"فکر نہ کرو آدھے گھنٹے میں پہنچا دوں گا۔"

"کوشش کرو ہم اس سے کم وقت میں پہنچ جائیں ورنہ نصف رات کے بعد ہوٹلوں میں جگہ بھی مشکل سے ملتی ہے۔ بازار اور دکانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔"

اس سڑک کی حالت بھی بہت اچھی تھی اور رات کے اس وقت ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر سنگھ نے رفتار بڑھائی اور ایک منٹ میں ٹرک تقریباً سو کلومیٹر فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑنے لگا۔ اس رفتار پر اس کی باڈی کے شکستہ حصے آواز دے رہے تھے مگر ان کے ٹوٹ کر الگ ہو جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے مڑ کر عقب والی چھوٹی سی کھڑکی کھولی اور بیتو کو آواز دی۔ وہ پاس ہی تھا۔ "ہاں شوبی.....؟"

"دیکھو اگر پیچھے کوئی گاڑی یا گاڑیاں آئیں تو فوراً بتانا۔"

"ہم دیکھتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہمارے پیچھے کون آئے گا؟" اگر سنگھ فکر مند ہو گیا۔

"کوئی نہیں.....تم فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو تم پوری رفتار سے ٹرک چلاؤ گے۔"

"خطرے کی بات ہے تو مجھے بتا دو۔"

"تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔" میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ اس وقت ہم بٹالا کی طرف جانے والے تیسرے سنگ میل کے پاس سے گزر رہے تھے۔ ابھی سترہ میل سے زیادہ کا سفر باقی تھا۔ کئی گاڑیوں کی روشنیاں دیکھ کر مجھے خیال آیا تھا کہ وہ انڈین سیکورٹی فورسز کے لوگ ہو سکتے تھے۔ وہ یقیناً ہیلی کاپٹر تک پہنچ گئے تھے اور اب ہماری تلاش میں تھے اگر وہ امرتسر کی طرف سے آئے تھے تو لازماً اس سے آگے ہی ہمیں تلاش کرتے۔ اس راستے میں کئی چھوٹے گاؤں آئے تھے اور بڑا قصبہ ڈیرا بابا نانک تھا۔ گویا ہماری تلاش کا دائرہ وسیع کیا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے یہ دائرہ پھیل کر ہم تک آتا ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ میں اس وقت کسی ایسے معاملے میں نہیں الجھنا چاہتا تھا کہ جس سے کنور پیلس کی طرف میرے سفر میں تاخیر ہو۔ اچانک بیتو نے عقب سے کہا۔

"شوبی دور دو گاڑیوں کا روشنی پیچھے آیا ہے وہ تیزی سے آ رہا ہے۔"

میں نے اسپیڈو میٹر دیکھا ٹرک کی رفتار سو سے اوپر تھی۔ لیکن آنے والی گاڑیاں اس سے کہیں تیز رفتار ہو سکتی تھیں۔ بارڈر سیکورٹی والوں کے پاس ہمیشہ بہترین گاڑیاں ہوتی ہیں۔ یہ ٹرک ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیں آ لیتے تو مقابلے کے سوا کوئی چارہ نہ رہتا۔ آنے والے تعداد میں زیادہ اور بہتر طور پر مسلح ہوتے۔ اگر ہم کسی طرح ان پر قابو پا بھی لیتے تو یقیناً یہ اطلاع اوپر تک پہنچ جاتی اور اس علاقے کو اسپاٹ کر کے وسیع پیمانے پر تلاش شروع کر دی جاتی۔ اس سلسلے میں فضا سے بھی مدد لی جا سکتی تھی۔ میں سوچ رہا تھا اور میں اس مسئلے کا کوئی پُرامن حل نکالنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے کہا۔ "اگر سنگھ میں نے فیصلہ بدل دیا اب ہمیں گورداسپور جانا ہے۔"

"کیوں جی؟"

"بس بدل دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم راستے میں کسی ذیلی سڑک سے مڑ جاؤ اور ٹرک کی روشنیاں بند کر دو۔"

"روشنیاں بند کر دوں تو ٹرک کیسے چلے گا یہ کچے میں اتر جائے گا۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں وہی کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں ڈبل معاوضہ دوں گا۔"

وہ چپ ہوا پھر اس نے ٹرک کی لائٹس بند کر دیں۔ اس نے ایک سوئچ دبایا تو بریک لائٹس بھی بند ہو گئیں یہ بات اس نے مجھے بتائی۔ اکثر ڈرائیور اس قسم کا مینول سسٹم بھی رکھتے ہیں تاکہ وائرنگ شارٹ ہو تو بیٹری کو بچایا جا سکے۔ "آگے وڑانچ نامی گاؤں ہے اس سے راستہ نکلتا ہے پر وہ بہت لمبا اور خراب ہے دو گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں وقت مسئلہ نہیں ہے اب۔"

بیتو نے پھر پیچھے سے اطلاع دی۔ "گاڑی تیزی سے آ رہا ہے شاید ایک میل دور ہے اب۔"

بیتو کی نظر بہت تیز تھی اس نے گاڑیاں خاصی پہلے دیکھ لی تھیں۔ اسی لمحے وڑانچ کی طرف مڑنے والی ذیلی سڑک آ گئی اور جیسے ہی ٹرک اس پر آیا جھٹکے لگنا شروع ہو گئے تھے۔ سڑک واقعی بہت خراب تھی۔ اگر سنگھ نے رفتار سست کرنا چاہی لیکن میں نے منع کر دیا۔ "اسی رفتار سے چلو۔" اگر سنگھ نے سوال نہیں کیا تھا لیکن وہ سمجھ رہا تھا کہ کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

گڑبڑ ہے۔ ہمارے پیچھے کچھ لوگ آرہے ہیں اور ان سے بچنے کے لیے ہم نے راستہ تبدیل کرایا تھا۔ سو تو نہیں مگر اسی کلومیٹرز کی رفتار بھی اس سڑک پر بہت زیادہ تھی۔ ٹرک اچھل رہا تھا اور ظاہر ہے ہم لوگ بھی اچھل رہے تھے۔ اب ٹرک کی باڈی زیادہ بھیانک آوازیں نکال رہی تھی۔ اگر سنگھ بتدریج رفتار کم کررہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب تک گاڑیاں ذیلی سڑک تک آئیں ہم اتنے دور جاچکے ہوں کہ ٹرک کا ہیولا بھی نظر نہ آئے۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''نظر رکھو کہ روشنیاں ہماری طرف تو نہیں مڑ رہی ہیں؟''

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' بیتو نے شور کی وجہ سے چلّا کر کہا۔ ''شوبی.... وہ ادھر مڑے ہیں۔''

میں نے اگر سنگھ سے کہا۔ ''سنو ہمارے پیچھے جان کے دشمن ہیں ہم تک آگئے تو ہمارے ساتھ تم بھی مارے جاؤ گے۔ یہاں ٹرک سمیت چھپنے کی کوئی جگہ ہے جو سڑک سے نظر نہ آئے۔''

''آگے ایک ڈیرا ہے اس کے چاروں طرف درخت ہیں اس موسم میں ویران ہوتا ہے۔ گندم کی کٹائی کے دنوں میں استعمال ہوتا ہے۔''

''بس تو وہیں چلو۔'' میں نے کہا اور بیتو سے پوچھا۔ ''دونوں گاڑیاں ہیں؟''

''نہیں ایک ہے دوسری سیدھی گزر گئی تھی۔''

اس کا مطلب تھا کہ انہیں پکا یقین نہیں تھا کہ ہم اس سڑک پر مڑے ہیں اس لیے ایک گاڑی اس طرف آئی ورنہ دونوں آتیں۔ میں نے اگر سنگھ سے پوچھا۔ ''ڈیرا کتنی دور ہے؟''

''بس کچھ دور ہے۔'' وہ بولا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سیدھا لیکن حوصلہ مند جوان تھا۔ پہلی بار مجھے پستول بدست دیکھ کر وہ گھبرا گیا تھا لیکن اس موقع پر اس نے حوصلے کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہ راستے اس کے لیے جانے پہچانے تھے اس لیے وہ بند ہیڈ لائٹس کے ساتھ بھی ڈرائیو کررہا تھا۔ کوئی ناواقف ہوتا تو اب تک ٹرک کو کئی بار کچے میں اتار چکا ہوتا۔ اس نے اچانک ہی ٹرک گھمایا تو وہ رفتار کی وجہ سے ذرا غیر متوازن ہوا تھا مگر اس نے فوراً ہی اسے قابو کرلیا۔ یہ راستہ بالکل کچا تھا اس لیے رفتار کم کرنا پڑی۔ درختوں کے درمیان سے گزرتے ہم ایک کچے احاطے میں داخل ہوئے۔ اس وقت وہاں ویرانی تھی ورنہ ٹرک کے انجن کی غراہٹ سن کر کوئی نہ کوئی تو آتا۔ اگر سنگھ نے چابی گھما کر انجن بند کردیا اور اچانک سناٹا ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ٹرک کا انجن کس قدر شور مچا رہا تھا۔ میں نے اگر سنگھ سے کہا۔

''نیچے اترو میرے ساتھ۔''

وہ نیچے اتر آیا۔ بیتو بھی نیچے آگیا تھا اور اس نے اسلحے والے بیگ کو حرز جاں بنایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لیے بھی اسے نہیں چھوڑ رہا تھا۔ ہم تینوں درختوں کے آخری حصے تک آئے جہاں سے ذیلی سڑک کچھ ہی دور تھی۔ میں نے سائلنسر والا پستول نکال لیا تھا۔ بیتو کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ اس نے آہستہ سے مجھ سے کہا۔ ''شوبی اگر وہ لوگ اِدھر آگیا تو....؟''

''ہم نے ان کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''ہم سمجھ گیا۔'' بیتو نے جواب دیا۔ اسی لمحے سڑک پر روشنی ہوئی اور ایک درمیانے سائز کی ملٹری جیپ تیزی سے گزری۔ وہ ٹرک کے تعاقب میں آگے نکل گئی تھی۔ میں نے اور اگر سنگھ نے سکون کا بہت بڑا سانس لیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''ہم واپس چلیں؟''

''نہیں ممکن ہے آگے دشمن موجود ہوں۔ واپس ڈیرا بابا نانک کی طرف بھی نہیں جاسکتے اس لیے یہیں رکو۔ جب آنے والے واپس چلے جائیں گے تو ہم آگے سفر کریں گے۔''

''یہ تو بارڈر سیکورٹی فورس کی جیپ تھی۔''

''ہاں لیکن ایسی جیپیں اب عام ہیں بارڈر پر رہنے والے بھی استعمال کرتے ہیں بلکہ اسمگلر بھی استعمال کرتے ہیں اس سے وہ شک سے بچ جاتے ہیں۔''

اگر سنگھ چونکا۔ ''یہ اسمگلر ہیں؟''

''یہ اس سے بڑے مجرم ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یہ یہاں آجائیں تو تم بھاگ جانا ان کے سامنے آگئے تو یہ بے دریغ تمہیں بھی اڑا دیں گے۔''

میں اگر سنگھ کو پکا کررہا تھا اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ یہ سچ مچ بارڈر سیکورٹی فورس والے ہیں تو شاید اس کی حُبّ الوطنی جاگ جاتی اور وہ بلاوجہ مصیبت بن جاتا۔ مجھے پورا اطمینان نہیں ہوا تھا اور میرا خیال تھا کہ جیپ واپس آئے گی کیونکہ ہم آگے نہیں ملیں گے تو ان کا شبہ آس پاس چھپنے والے مقامات کی طرف جائے گا اور وہ ایسی جگہیں چیک کریں گے جہاں ایک ٹرک چھپایا جاسکے۔ یہ ڈیرا اس کام

کے لیے موزوں تھا۔ جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا میرا شبہ بڑھتا جارہا تھا کہ جیپ واپس آئے گی اور یہ جگہ چیک کی جائے گی۔ یہ تو طے تھا کہ وہ یہاں آجاتے تو ہم نے ان کے ہاتھ نہیں آنا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ پھر ان کا کیا کرنا تھا؟'' میں اس پر غور کررہا تھا کہ سڑک کی طرف سے پھر روشنی نمودار ہوئی اور اس بار یہ مخالف سمت سے آئی تھی جس طرف جیپ گئی تھی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے جیپ وہاں آگئی اور اس راستے پر رکی جہاں سے ٹرک احاطے کی طرف مڑا تھا۔ جیپ کے ساتھ ہی ہم سب کے سانس بھی رک گئے تھے۔ پھر وہ آہستہ سے مڑی اور کچے پر اتر آئی۔ میں نے بیتو سے کہا۔

''واپس جاؤ اور ٹرک کے پاس گھات لگا لو جب میں کہوں تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو گرانے کی کوشش کرنا۔ میں سیٹی بجاؤں گا لیکن جب تک میں نہ کہوں تم نے کچھ نہیں کرنا ہے۔''

''جی شوبی۔'' بیتو نے کہا اور تاریکی میں رینگ گیا۔

'اگر سنگھ تم اس درخت پر چڑھ جاؤ اور خود کو شاخوں میں چھپا لو جب تک میں نہ کہوں نیچے مت آنا اگر تم نے ایسا کیا تو اپنی موت کے خود ذمّے دار ہوگے۔''

اس نے بغیر کچھ کہے میرے حکم کی تعمیل کی اور اوپر چڑھ گیا۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا درختوں پر چڑھنا اس کے لیے مشکل کام نہیں تھا۔ اس دوران میں جیپ ہمارے پاس سے گزری اور اس کی روشنی کے انعکاس سے بچنے کے لیے میں تنے کے پیچھے ہوگیا۔ جیپ کے اندر ہلکی روشنی تھی اور چار افراد صاف دکھائی دیے تھے ان میں سے دو آگے بیٹھے تھے اور دو پیچھے۔ سب فوجی وردیوں میں تھے اور میں نے بروقت اگر سنگھ کو اوپر چڑھایا تھا ورنہ وہ بھی ان کی وردیاں دیکھ لیتا۔ اسمگلر سیکورٹی فورس جیسی جیپ میں گھوم سکتے ہیں لیکن وہ فوجی وردیاں استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اوپر سے اگر سنگھ یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں جیپ کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا۔ احاطے کے گیٹ تک پہنچتے ہی جیپ والوں نے ٹرک دیکھ لیا تھا کیونکہ ان میں کھلبلی مچی تھی اور جیپ رک گئی تھی۔ فوراً ہی اس کی لائٹس آف ہوگئیں اور اس سے سائے اتر کر احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ پھیل گئے تھے مگر ان سورماؤں نے اندر جانے کی ہمت اور کوشش نہیں کی تھی۔

دو میری طرف آئے تھے اور دو دوسری طرف چلے گئے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اصولاً تو ٹرک نظر آتے ہی انہیں فوراً ریڈیو پر اپنے لوگوں سے رابطہ کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے وہ اس بڑے احاطے میں کارروائی کی کوشش کررہے تھے۔ اس طرح پھیلنے کا تو یہی مقصد ہوسکتا تھا۔ ان کے پاس خودکار ہتھیار تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے پاس صرف ایک پستول تھا۔ بیتو اندر تھا اور وہ اندر سے فوری مدد کو نہیں آسکتا تھا جب کہ میں نے اسے بغیر اشارے کے حرکت میں آنے سے منع کیا تھا۔ اب مجھے ہی ان سے نمٹنا تھا۔ میری طرف آنے والے دونوں افراد ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں تھے اگر ایک کے ساتھ کچھ ہوتا تو دوسرے کو فوراً پتا چل جاتا اور یہی میں نہیں چاہتا تھا۔ میں کونے والے کے ساتھ حرکت کرتا ہوا دائیں طرف جارہا تھا اور بہت پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا کہ میرے پیروں تلے آکر کوئی سوکھی لکڑی ٹوٹتی یا پتا چرمراتا تو وہ چوکنا ہوجاتے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ''بھوپت تو اس طرف جا دیکھ کوئی فرار نہ ہونے پائے۔''

بھوپت وہی تھا جس کے پیچھے میں تھا۔ وہ مزید آگے جانے لگا اور میں اس کے پیچھے تھا۔ بادل ہلکے ہوگئے تھے اس لیے چاند چھپے ہونے کے باوجود کسی قدر روشنی ہوگئی تھی اور کھلی جگہ پر دکھائی دے رہا تھا البتہ درختوں تلے تاریکی تھی۔ وہ کسی قدر بے احتیاطی سے چل رہا تھا۔ اس کے بھاری فوجی بوٹوں تلے آکر پتے چرمر کررہے تھے اور سوکھی شاخیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اس سے مجھے آسانی ہورہی تھی اور اب میں کسی قدر آسانی سے تعاقب کررہا تھا۔ میرا اس سے فاصلہ تقریباً بیس فٹ تھا لیکن میں اسے دس فٹ تک لانا چاہتا تھا اسی لیے اس کے قریب بھی جارہا تھا۔ وہ احاطے کے دوسرے کونے تک پہنچا اور اس طرف سے مڑا تھا کہ میں بھی تیزی سے کونے تک پہنچ گیا۔ میں نے جھانکا تو وہ کوئی دس بارہ فٹ آگے دیوار کے اوپر سے اندر جھانک رہا تھا اور پھر اس نے جس طرح عجلت میں رائفل اوپر کی اور کسی کا نشانہ لینے لگا۔

میری چھٹی حس نے بروقت خبردار کیا اور میں نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر اس کے سر کا نشانہ لے کر دو گولیاں چلائیں۔ عجلت کے باوجود گولیاں نشانے پر بیٹھی تھیں اسے جھٹکا لگا اور وہ جھول کر پیچھے آیا اور پھر نیچے گرا۔ رائفل چھوٹ کر نیچے گری اور کسی پتھر سے ٹکرائی کیونکہ اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ میں تیزی سے آگے آیا اور اسے کھینچ کر درختوں میں لے گیا۔ اس کی رائفل وہیں پڑی

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ آواز اس کے دوسرے ساتھی تک پہنچ گئی تھی۔ جب تک میں اسے درختوں تک لے گیا اس کا ساتھی کونے سے نمودار ہو چکا تھا اور وہ بہت خاموشی سے آیا تھا۔ میرے ہاتھ مرنے والے کی وردی ٹٹول رہے تھے۔ اس کے پاس رائفل کے اضافی میگزین اور نیام میں فوجی خنجر بھی تھا۔ میں نے خنجر نکال لیا۔ اتنی دیر میں اس کا ساتھی وہاں پہنچ گیا تھا جہاں بھوپت کی رائفل اور وہ خود گرا تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی۔

''بھوپت.....''

وہ مجھ سے کوئی بیس فٹ کے فاصلے پر تھا میں اسے نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اگر نشانہ خطا جاتا تو اس کی جوابی کارروائی سے اس کے ساتھیوں کو پتا چل جاتا۔ اس لیے میں نے سر کے بجائے اس کے جسم کا نشانہ لیا اور اس بار بھی دو گولیاں چلائیں۔ اس نے ہلکی سی چیخ ماری اور لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ دوسرے لمحے اسں نے رائفل کا رخ میری طرف کر کے برسٹ مارا تھا۔ میں بروقت نیچے گرا ورنہ اوپر سے گزرنے والی گولیاں مجھے چاٹ جاتیں۔ فوراً ہی میں کھسک کر ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا۔ دو گولیاں اسے لگی تھیں لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ اب اس نے فائرنگ بند کر دی تھی اور غرارے جیسی آواز نکال رہا تھا بعد میں پتا چلا کہ ایک گولی اس کے گلے سے گزر گئی تھی اور یہی جان لیوا تھی ورنہ دوسری گولی اس کے بائیں بازو میں لگی تھی۔ معاملہ کھلی جنگ تک جا پہنچا تھا۔ اب بیتو کو اشارے دینا مناسب ہوتا میں نے سیٹی بجائی۔ فوراً ہی دیوار کے دوسری طرف سے ایک لمحے کے لیے بیتو کا سر برآمد ہوا اور میں نے اس بار ہلکی سی سیٹی بجا کر اسے اپنے جائے وقوع سے آگاہ کیا۔ اس لڑائی کا اگلا مورچہ اسے سر کرنا تھا۔ میں درختوں کے مزید اندر جانے لگا اور میرے کان آہٹوں پر مرکوز تھے۔

باقی دو دوڑتے ہوئے آئے تھے لیکن اب محتاط تھے۔ اس کے باوجود ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ دیکھی یہاں درخت بہت پاس پاس تھے اور تنوں سے اچھی آڑ میسر تھی۔ مجھے وہ جگہ نظر آ رہی تھی جہاں بھوپت مارا گیا تھا اور اس کا ساتھی وہیں پڑا دم توڑ رہا تھا۔ آنے والے اس کے پاس آئے اور اپنے ساتھی کو گرے دیکھ کر انہوں نے یک دم زمین پر بیٹھتے ہوئے پوزیشن سنبھال لی۔ ایک کا رخ درختوں کی طرف تھا اور دوسرا دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے ان دونوں میں سے ایک جگہ پائے جانے کے امکانات تھے۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں بیتو بے خبری میں سر نکال کر معائنہ کرنے لگ جائے ان دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ضروری تھا۔ میں نے اس کا نشانہ لیا جو دیوار کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا۔ اس کا جسم کم نظر آ رہا تھا اس لیے نشانہ خطا گیا البتہ پستول سے نکلنے والا شعلہ دوسرے نے دیکھ لیا اور اس نے میری طرف برسٹ مارا اور چلّایا۔

''اِدھر ہے.....'' باقی الفاظ ناقابلِ اشاعت گالیوں پر مشتمل تھے۔ اس سے ظاہر تھا کہ اپنے ساتھی کے مارے جانے پر وہ کتنا مشتعل تھا۔ دوسرے نے بھی گھوم کر اس کا ساتھ دیا اور دو رائفلیں مجھ پر گولیاں برسانے لگیں۔ مگر میں ایک فائر کے بعد ہی خود کو آڑ میں کر چکا تھا اور اب بیتو کی طرف سے کارروائی کا منتظر تھا۔ ان دونوں کی طرف سے اندھادھند فائرنگ سے گولیاں درختوں کے تنوں اور شاخوں کو چھلنی کرتی گزر رہی تھیں۔ میں جس درخت کی آڑ میں تھا اگر اس کا تنا موٹا نہ ہوتا تو شاید کوئی گولی مجھے بھی چاٹ جاتی۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تیسری رائفل اس آتشیں نغمے میں شامل ہوئی تو دونوں سپاہیوں کی چیخوں نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ بیتو نے احتیاطاً پورا راؤنڈ چلا دیا تھا تاکہ ان کے بچنے اور جوابی کارروائی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ جب اس کی رائفل خاموش ہوئی تو میں نے بلند آواز سے کہا۔

''فائر مت کرنا میں باہر آ رہا ہوں۔''

''ایک منٹ ہم میگزین بدل لے۔'' بیتو بولا اور اپنا کام کر کے اس نے پکارا۔ ''اب آ جاؤ۔''

میں درختوں کے ساتھ آڑے ترچھے پڑے فوجیوں تک آیا۔ بیتو نے انہیں چھلنی کر دیا تھا۔ ایک کا سر بھی اڑ گیا تھا۔ میں نے خون کی پروا کیے بغیر ان میں سے ایک کی تلاشی لی اور مجھے ٹارچ مل گئی۔ اسے روشن کر کے میں نے پہلے چاروں کا معائنہ کیا اور اس دوران میں بیتو دیوار کے مورچے پر پوری طرح مستعد رہا تھا۔ چاروں میں سے کوئی نہیں بچا تھا۔ مجھے ان کو مار کر ذرا بھی افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ بھی ہمیں قتل کرنے کے ارادے سے آئے تھے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اصولاً انہیں کوشش کرنا چاہیے تھی کہ ہمیں زندہ پکڑیں اور اگر ہم ہتھیار نہ ڈالیں تب ہمیں ماریں مگر وہ تو پہلے ہی مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔ اگر میں بروقت بھوپت کو نہ مارتا تو وہ بیتو کو مار دیتا۔ میں نے بیتو کو

بتایا اس نے کہا۔

''ہم اِدھر ہی چھپا تھا شوبی۔''

''فائرنگ کی آواز دور تک گئی ہو گی۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے لیکن اس سے پہلے ان کی وردیاں اتارنی ہوں گی۔''

بیتو دیوار کود کر ادھر آ گیا۔ ''اور ان کی لاشیں؟''

''وہ یہاں درختوں میں چھوڑ دیں گے۔''

''شوبی ادھر ایک خالی کنواں ہے اس میں نہ ڈال دے۔'' بیتو نے دیوار کے پار اشارہ کیا۔

''پہلے وردیاں اور سامان۔'' میں نے کہا۔

جسے پہلے شوٹ کیا تھا اس کی وردی صاف ستھری تھی یعنی اس پر خون نہیں لگا تھا۔ البتہ باقیوں کی وردیاں خون آلود تھیں اور گولیوں کے سوراخ بھی ہو گئے تھے مگر ہمارے کام آ سکتی تھیں۔ وردیاں اتار کر ہم نے لاشیں دیوار کے دوسری طرف پھینکیں اور پھر بیتو ایک ایک کر کے انہیں اندھے کنویں میں پھینکنے لگا۔ لاشوں سے ہم نے سب اتار لیا تھا اب ان کی شناخت آسانی سے نہیں ہوتی۔ وردی کے ساتھ ان کی تمام چیزیں لے لی تھیں۔ بیتو صفائی میں لگا رہا۔ احاطے میں ایک کنواں تھا جس پر رہٹ لگا ہوا تھا میں نے رہٹ چلایا اور اس نے تین وردیاں دھوئیں۔ اس دوران میں ہم ٹرک بھی دیکھتے رہے تھے۔ دہشت زدہ راج کنور اور سنکاری اس میں موجود تھے۔ بیتو نے فوجی اسلحہ اور ایمونیشن بھی بیگ میں ڈال لیا تھا اور اب اس کا بیگ اتنا وزنی ہو گیا تھا کہ وہ بہ مشکل اٹھائے ہوئے تھا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا آگے نہ جانے ہمیں کون سے معرکے درپیش تھے اور معرکے اسلحے سے لڑے جاتے ہیں۔

مشکل سے آدھے گھنٹے میں یہ سارے کام نمٹا کر ہم روانگی کے لیے تیار تھے۔ اگر سنگھ کا پتا نہیں تھا کہ وہ درخت پر چڑھا ہوا تھا یا اتر کر بھاگ گیا تھا۔ اب مجھے اس سے مطلب نہیں تھا۔ میں نے صاف ستھری وردی پہنی اور اپنے کپڑے ساتھ رکھ لیے پھر جیپ اسٹارٹ کر کے ٹرک کے پاس لایا۔ ہم نے سارا سامان اس کے عقبی حصے میں واقع خانے میں ڈالا۔ جیپ کی چابیاں ایک لاش کے پاس سے ملی تھیں۔ جب سنکاری اور راج کنور کو نیچے اترنے کو کہا تو سنکاری نے کانپتی آواز میں پوچھا۔ ''یہ کیا ہوا تھا؟''

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔

''یہ گن شاٹ کیسا تھا؟''

''کون سا گن شاٹ؟'' میں نے پھر حیرت سے پوچھا۔

''اندر چلو۔'' بیتو نے کہا۔ ''ابھی اِدھر پولیس آ گیا تو اس سے پوچھنا پھر وہ تم کو بتائے گا۔''

راج کنور کی حالت ایک بار پھر بری ہو رہی تھی مگر وہ خاموش تھا البتہ اس نے جیپ میں بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''یہ بی ایس ایف کی جیپ ہے۔''

''ہاں ہے تو؟'' میں نے اعتراف کیا۔

''تب وہ کہاں ہیں؟''

''وہ ہمیں جیپ دے کر سونے چلا گیا ہے۔'' بیتو نے جواب دیا۔ ''اب ہم گشت کرے گا۔ تم کو اعتراض ہے؟''

راج کنور میں اعتراض کی جرأت نہیں تھی خاص طور سے بیتو کے سامنے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نوجوان اس کا دشمن ہے اور اس نے موقع دیا تو وہ اسے خوشی خوشی قتل کر دے گا۔ ویسے اسے اور سنکاری کو یقین تھا کہ ہم نے جیپ والوں کو مار دیا تھا اور اسی وجہ سے خاص طور سے سنکاری کی حالت بری تھی۔ میں نے جیپ باہر نکالی اور سڑک پر آ کر گورداسپور کی سمت روانہ ہو گیا۔ درحقیقت مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ سڑک کہاں نکلے گی میں اندازے سے سفر کر رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نقشہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے کچھ آگے جانے کے بعد لیپ ٹاپ آن کر کے انٹرنیٹ لگایا اور گوگل میپ پر علاقے کا نقشہ نکالا اور فوراً ہی میں نے وہ روٹ جان لیا جس پر مجھے سفر کرنا تھا۔ انڈیا میں انٹرنیٹ سسٹم بہت اچھا تھا۔ اس دور دراز دیہی علاقے میں بھی کام کر رہا تھا۔ میں نے لیپ ٹاپ بیتو کے حوالے کیا اور خود ڈرائیو کرنے لگا۔ نقشے کے مطابق یہ سڑک ایک قصبے کالا نواز پر نکلتی تھی اور یہاں سے ہائی وے پچیس جس پر ہم پہلے بھی سفر کرتے رہے تھے سیدھی گورداسپور جاتی تھی۔ کالا نواز کوئی چھ میل کے فاصلے پر تھا اور ہم دس منٹ بعد وہاں پہنچ گئے۔ ہائی وے پر آتے ہی میں نے جیپ کی رفتار تیز کی تھی۔ ابھی موقع نہیں تھا کہیں سکون سے بیٹھ کر میں شملہ تک اور اس سے آگے جانے والا آسان ترین روٹ نکال سکتا تھا۔

اس جیپ میں آسانی تھی کہ کہیں روکا نہیں جاتا لیکن اس پر زیادہ دیر تک سفر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ گورداسپور بڑا شہر تھا اور یہاں سے ہم کوئی گاڑی لے سکتے تھے جیپ کو کہیں چھوڑا جا سکتا تھا جہاں وہ فوری دستیاب نہ ہوتی۔ مگر رات کے اس پہر جب کہ ایک بجنے والا تھا ہمیں مشکل سے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی گاڑی ملتی اور اگر خطرہ اٹھا بھی لیتے تو کاغذات اور ہماری شناخت کا مسئلہ ہوتا۔ یہ بات یقینی تھی کہ ہمیں راستے میں کئی چیک پوسٹس سے گزرنا پڑے گا۔ راج کنور اور سنکاری کا ساتھ مصیبت بن جاتا اور ہم انہیں چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا اگر ہم اسی جیپ پر ہوشیار پور پہنچ جاتے تو وہاں ائرکلب سے کوئی ہیلی کاپٹر یا چھوٹا طیارہ مل سکتا تھا جو ہمیں گھنٹے سے بھی پہلے شملہ پہنچا سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے سے بھی پہلے ہم گورداسپور پہنچ گئے تھے لیکن میں نے شہر میں داخل ہونے سے گریز کیا اور ایک جگہ رک کر میپ کا معائنہ کیا۔ ہائی وے پچیس کا ایک انٹرلنک شہر سے باہر ہی آگے نکل رہا تھا اور تقریباً دس بارہ میل کے بعد یہ موٹر وے اے ون سے مل جاتی تھی اے ون کے ذریعے ہم ہوشیار پور جا سکتے تھے۔ میں نے یہی لنک استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس دوران میں بیتو نے ایک وردی پہن لی تھی جو اسے کسی قدر ڈھیلی تھی اور باقی دو وردیاں اس نے زبردستی راج کنور اور سنکاری کو پہنا دی تھیں۔ انہیں میگزین نکال کر رائفلیں بھی دے دی تھیں اب ہم بی ایس ایف والے نظر آ رہے تھے۔ راج کنور نے خبردار کیا۔

"ہم بالکل بھی فوجی نہیں لگ رہے ہیں اگر کسی کو شک ہو گیا تو....."

"تو ہم اسے پکڑ لے گا۔" بیتو نے اسے ڈانٹا۔ "اس لیے اپنا منہ بند رکھو اور چپ کر کے بیٹھو۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم اے ون پر تھے۔ ٹول پوسٹ سے ہم مزے سے گزر گئے۔ فوجی گاڑی دیکھتے ہی ہمیں اجازت مل گئی تھی اور پوسٹ والوں نے ہمارے یا گاڑی کے کاغذات مانگنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ میں ذرا تھک گیا تھا اس لیے ڈرائیونگ سیٹ بیتو کے سپرد کر دی اور خود آرام کرنے لگا۔ میرا فیصلہ فی الحال درست ثابت ہو رہا تھا۔ فوجی گاڑی کی وجہ سے ہمیں سہولت مل گئی تھی ورنہ لازمی بار بار ہماری چیکنگ ہوتی اور ہمارے پاس کاغذات نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ موٹروے پر آنے کے بعد بیتو نے سنکاری اور راج کنور سے رائفلیں لے لی تھیں کیونکہ ان کے دستوں سے کام لیا جا سکتا تھا۔ ہم دونوں ہی آگے تھے اور وہ پیچھے تھے۔ ہم جہاں سے موٹروے پر چڑھے تھے وہاں سے کوئی تیس میل کے بعد ایک لنک روڈ نکل کر ہوشیار پور جانے والی موٹروے کو ملا رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم مستقل سفر کرتے تو ایک گھنٹے میں وہاں پہنچ سکتے۔ ایاز نے بیتو کو ماہر ڈرائیور بنا دیا تھا یہی نہیں اسے مکینک کا کام بھی سکھایا تھا۔ بیتو نے فخر سے بتایا۔

"اگر پارٹ کا مسئلہ نہ ہو تو ہم ہر فالٹ ٹھیک کر سکتا ہے۔"

موٹروے پر آنے والے پہلے پیٹرول پمپ سے جیپ کا ٹینک فل کرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا اسٹور اور ری فریش منٹ کیفے بھی تھا میں نے وہاں سے کاغذی کپوں میں چائے اور کھانے پینے کا خاصا سامان لے لیا۔ اس کی راستے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ یہاں رش نہ ہونے کے برابر تھا اور زیادہ ملازمین بھی نہیں تھے اس لیے ہم بنا کسی مشکل کے وہاں سے آگے روانہ ہو گئے۔ اسٹور سے پین کلرز مل گئی تھیں میں نے وہی انرجی ڈرنک کے ساتھ راج کنور کو دے دیں۔ اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ "میرے پاؤں میں اندر زخم ہے اور پانی اسے خراب کر دے گا مجھے باقاعدہ ڈریسنگ اور نئے پلاسٹر کی ضرورت ہے۔"

اس پر بیتو نے اسے بتایا کہ اسے ڈھائی من لکڑی کی ضرورت ہے جو جلد اسے مل جائے گی۔ ہوشیار پور کی طرف جانے والے لنک پر مڑنے کے بعد میں نے سنکاری سے کہا۔ "کیا ہمیں ہوشیار پور کے کسی ائرکلب سے ہیلی کاپٹر یا چھوٹا طیارہ مل سکتا ہے۔"

"مشکل ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔ "رات کے وقت بہت کم طیارے اور ہیلی کاپٹر پرواز کر سکتا ہے، ان میں رات کو پرواز کرنے والے آلات نہیں ہوتے اسی طرح ائرکلب میں بھی رات کو ٹیک آف اور لینڈنگ کے آلات نہیں ہوتے۔"

"اوکے ہم صبح ہوتے ہی پرواز کر سکتے ہیں مگر رات کو بات کر سکتے ہیں تمہارا کوئی جاننے والا ہے جو ہمیں شملہ تک لے جا سکے؟"

"شملہ۔" سنکاری چونکا۔ "تم شملہ واپس جانا چاہتا ہے۔"

راج کنور بھی حیران ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کیوں واپس جا رہا تھا بس وہ حیران تھا۔ اس نے ایک دو بار پوچھا بھی کہ میں اتنے جتن سے سرحد.... پار کرنے کے بعد واپس کیوں آیا تھا لیکن میں نے اس کے سوال پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ راج کنور نے بھی تعجب سے کہا۔ "تم واپس جا رہے ہو مگر کیوں؟"

"اس سے تم دونوں کو کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے خشک لہجے میں کہا اور سنکاری سے بولا۔ "تم نے جواب نہیں دیا۔"

"میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔" سنکاری نے انکار کیا۔

"اوکے تب تم کسی پائلٹ کی تلاش میں ہماری مدد کرو گے جس کے پاس ذاتی طیارہ یا ہیلی کاپٹر ہو۔ تم خود پائلٹ ہو اور تمہارے پاس لائسنس کے ساتھ کاغذات بھی ہیں۔"

"وہ تو ہیں۔" اس نے مجبوراً اقرار کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ احاطے میں ہونے والی کارروائی کے بعد اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ وہ عام آدمی تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ میں نے بے دریغ فوجیوں کو مارا تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کے سامنے دو جرائم پیشہ افراد کو جہنم رسید کیا تھا مگر فوجیوں کا معاملہ مختلف تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب اس کا کیا کروں اسے چھوڑا تو وہ پولیس کے پاس جا سکتا تھا اسے کم سے کم شملہ تک میری منزل کا پتا تھا پھر وہ راج کنور کے بارے میں بتا سکتا تھا اب تک لازماً ایمبولینس کو پیش آنے والے حادثے کی اطلاع ریاست کی پولیس تک پہنچ گئی ہو گی اور پولیس کو معلوم ہو گا کہ اس میں کنور خاندان کا فرد تھا۔ کڑی سے کڑی ملانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ واپسی کے بعد سنکاری کو جانے دوں گا لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ساتھ ہونا ضروری تھا۔ ایک تو وہ میرے خلاف کچھ کر نہیں سکتا تھا دوسرے وہ پائلٹ تھا اور کسی موقع پر ہمارے کام آ سکتا تھا۔ یہ بات اس نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اس نے التجا کی۔

"میرے کو جانے دو میں پولیس یا کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔"

"وہ کیسے، تم گھر جاؤ گے اور پولیس وہاں موجود ہو گی بلکہ آرمی انٹیلی جنس کے بندے ہوں گے اور وہ تم سے تمہارے ہیلی کاپٹر کے بارے میں پوچھیں گے۔"

"میں کہہ دوں گا کچھ لوگوں نے ہیلی کاپٹر ہائر کیا اور مجھے ایک ویران جگہ چھوڑ کر ہیلی کاپٹر لے گئے۔ میں پہاڑوں میں بھٹکتا ہوا واپس آیا ہوں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ کسی کی بات پر یقین کرنے والے لوگ نہیں ہیں، وہ اپنے طریقے سے پوچھیں گے اور تم کسی صورت اپنی زبان بند نہیں رکھ سکو گے۔"

"ہم کوشش کر سکتا ہے۔"

"نہیں مجھے سوچنے دو میں کوئی ایسا طریقہ سوچوں گا جس میں میرے اور تمہارے لیے کوئی خطرہ نہ ہو۔"

فروری 2014ء گلابی موسم کی سوغات

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفلِ شعر و سخن

ملک صفدر حیات کی عرق ریزی.....

چال

چال ستاروں کی ہو یا انسانوں کی اگر..... کامیاب ہو جائے تو سمجھو کہ کچھ نہ کچھ انوکھا ہونے والا ہے..... آخری صفحات پر **عبدالرب بھٹی** کی پراثر تحریر

آخری شمع

ماضی کے اوراق سے ایک اور یادگار انتخاب **الیاس سیتاپوری** کے قلم کی روانی

پس زنداں

پردیس میں مانوس چہرے اپنے دیس کی محبت دلوں میں بڑھا دیتے ہیں..... **طاہر جاوید مغل** کا ایک خوب صورت تحفہ اپنے قارئین کے لیے

ماروی

روپ بدلتے چہرے..... مخالف سوچوں کا تلاطم اور معصوم کرداروں کے حوصلوں سے گندھی ایک دلفریب داستان..... **محی الدین نواب** کا شاہکار سلسلہ

اس کے علاوہ

کاشف زبیر، ڈاکٹر شیر شاہ سید، تنویر ریاض، سلیم انور اور امجد رئیس کی کاوشیں صرف آپ کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے اپنے لیے کافی لی تھی اگرچہ اس کا ذائقہ اتنا اچھا نہیں تھا مگر پھر بھی یہ کافی تھی۔ اس نے مجھے تازہ دم کردیا تھا باقی سب نے چائے لی تھی۔ بیتو انرجی ڈرنک سے شغل کر رہا تھا۔ سوا گھنٹے بعد ہم موٹروے سے ہوشیار پور میں داخل ہوئے۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے سڑکیں سنسان اور بندہ نہ بندے کی ذات تھی۔ البتہ پولیس والے گشت کر رہے تھے مگر کسی نے فوجی جیپ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے انٹرنیٹ پر ہی ائرکلب کی طرف جانے والا راستہ کھوج نکالا۔ چار بجے ہم ائرکلب کے پاس تھے۔ ایک جگہ رک کر ہم نے دوبارہ کپڑے بدلے اور عام حلیے میں آگئے۔ اس کے بعد جیپ سے ایسے نشانات مٹائے جن سے یہ دور سے ملٹری جیپ نظر آتی تھی۔ اس کے اندر موجود ریڈیو جسے میں نے سوار ہوتے ہی آف کردیا تھا اسے نکال کر ایک گڑھے میں پھینک دیا۔ نمبر پلیٹ پر اس طرح کیچڑ ملا کہ اس کا رنگ بھی چھپ گیا۔ اب اسے قریب سے دیکھے بغیر ملٹری جیپ قرار دینا مشکل تھا۔

ائرکلب کی پارکنگ میں بہت جگہ تھی اور رات کے گارڈ نے سنکاری کا پائلٹ لائسنس دیکھ کر ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے اپنے طور پر فرض کرلیا تھا کہ ہم سنکاری کے ساتھ تھے۔ یہ وہ ائرکلب تھا جہاں سے ہم نے جاتے ہوئے ایندھن بھروایا تھا۔ بیتو اور راج کنور کو جیپ میں چھوڑ کر میں اور سنکاری ائرکلب کی عمارت کی طرف آئے۔ وہ تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور صرف اس کے منیجر کے کمرے میں روشنی تھی مگر وہاں منیجر نہیں تھا بلکہ رات کا نگران تھا جو ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ اس نے لیٹ نائٹ آنے والی فلم لگا رکھی تھی جو غالباً بالغان کے لیے تھی۔ لاؤنج سے ہوتے ہوئے ہم بلا تکلف اندر پہنچ گئے اور جب دروازے سے اندر جھانکا تو وہ چونکا اور جلدی سے ٹی وی آف کرکے باہر آگیا۔ اس نے خفگی سے کہا۔ ”کون ہو تم لوگ اس طرح بغیر پرمیشن کے اندر کیوں آئے ہو؟“

”ادھر آنے کا واسطے پرمیشن کون لیتا ہے۔“ سنکاری نے کہا۔ ”مجھ کو پرمیشن نہیں چاہیے۔“ سنکاری نے اپنا پائلٹ لائسنس دکھایا۔ نوجوان ذرا مرعوب ہوا تھا۔

”اچھا تم پائلٹ ہو لیکن اس وقت یہاں فلائٹ کی پرمیشن نہیں ہے۔“

”ہم پہلے آگئے ہیں۔“ میں نے نوجوان سے کہا۔ ”تم یہاں کے نائٹ انچارج ہو؟“

اس نے سر ہلایا اور کسی قدر فخر سے بولا۔ ”ہاں میں یہاں کا نائٹ انچارج ہوں۔“

”ہمیں صبح کے قریب ایک ہیلی کاپٹر یا چھوٹا طیارہ چاہیے۔“

”مل جائے گا لیکن پائلٹ صبح ہی آئیں گے۔“ اس نے کہا۔

”سنو ہمیں ایمرجنسی میں جانا ہے۔“ میں نے ایک ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔ یہ آزمودہ نسخہ تھا جو اس بار بھی کام آیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ اس نے نیاز مندانہ انداز میں پوچھا:

”میں کیا کرسکتا ہوں سر؟“

”تمہارے پاس یقیناً ایسے پائلٹس کے کونٹیکٹ نمبرز ہوں گے جو انفرادی طور پر کمرشل فلائٹ لے جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ انہیں کسی کو جواب دہ ہونا نہیں پڑتا ہے۔ ہم براہِ راست ان سے بات کرسکتے ہیں۔“

اس نے سوچا اور سر ہلایا۔ ”ایک آدمی ہے۔ لیکن ابھی مشکل سے ملے گا۔ اس کی بیوی بہت خطرناک ہے۔ فون وہی ریسیو کرتی ہے اور ذرا سا شک ہو جائے تو ایسی گالیاں دیتی ہے۔“

”اس حد تک زن مرید شخص پائلٹ کیسے بن گیا؟“ سنکاری نے اعتراض کیا۔ ”اس کا تو لائسنس کینسل ہو جانا چاہیے۔“

”بیوی ایسی ہے۔“ نوجوان نے دانت نکالے۔ ”بالکل کترینہ کیف لگتی ہے۔“

”تب ٹھیک ہے۔“ سنکاری نے اپنا اعتراض واپس لے لیا۔

میں نے جان بوجھ کر نوجوان سے نام نہیں پوچھا ورنہ اپنا نام غلط بتانا پڑتا۔ ”اس کے پاس طیارہ کون سا ہے اور اس میں کتنے لوگ جاسکتے ہیں؟“

”ایک چھوٹا سیسنا ہے۔“ نوجوان نے بتایا۔ ”اس میں پائلٹ کے علاوہ چار آدمی جاسکتے ہیں۔“

”اتفاق سے ہم چار ہی ہیں۔“ میں نے کہا۔

نوجوان چونکا۔ ”چار.....؟ تم لوگ تو دو ہو۔“

”دو باہر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔“

”ان کو بھی اندر لے آؤ۔“ اس نے کہا۔ ”باہر تو خاصی گرمی ہے۔“

ائرکلب کی عمارت تو نہیں لیکن منیجر کا کمرا اے سی تھا۔

ہزار کا نوٹ پاکر نوجوان تابعدار خادم بن گیا تھا۔ وہ سنکاری کے ساتھ جاکر راج کنور کو خود اندر لانے پر کمر بستہ ہو گیا تھا اسے بڑی مشکل سے روکا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فوجی جیپ دیکھے۔ میں سنکاری کے ساتھ واپس گیا اور راج کنور کو لے آیا۔ بیتو اپنا اسلحے والا بیگ لا رہا تھا لیکن میں نے منع کر دیا۔ یہ مشکوک نظر آتا۔ ہم دونوں کے پاس پستول تھے اور فی الحال یہ بھی کافی تھے۔ ہم اندر آئے تو نوجوان نے ہمیں کولڈ ڈرنک ٹن پیش کیے۔ راج کنور کو ایک کاؤچ مل گئی تھی اس نے کولڈ ڈرنک کے ساتھ مزید پین کلر گولیاں نگلیں اور نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ سنکاری ایک کرسی پر بیٹھ کر اونگھنے لگا۔ اس کی بیزاری میں نشے سے دوری بھی شامل تھی اور اپنے مستقبل کی فکر بھی۔ اس کا واحد اثاثہ ہیلی کاپٹر کریش میں تباہ ہو گیا تھا اور اسے بھارتی ایجنسیوں کی تفتیش کے مرحلے سے بھی گزرنا تھا۔

”آپ لوگوں نے کہاں جانا ہے؟“

”دہلی۔“ میں نے مخالف سمت بتائی۔

اسے تعجب ہوا۔

”دہلی یہاں سے کتنی دور ہے۔“

”بائی روڈ کم سے کم دس گھنٹے لگیں گے اور بائی پلین ہم ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں پہنچ جائیں گے۔“

میں نے کہا اور راج کنور کی طرف اشارہ کیا۔ ”مسئلہ اس کا ہے۔ اسے جلد از جلد لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانا ہے اس کا خاص آپریشن ہوا ہے اور آپریٹ کرنے والا ڈاکٹر ہی دیکھ سکتا ہے۔ سڑک سے لے جانے میں اسے بہت تکلیف ہوتی۔“

نوجوان مطمئن ہو گیا۔ بیتو نے ٹی وی کا ریموٹ چلا کر آن کیا اور پھر چینل بدلنے لگا۔ اچانک ایک چینل پر وہ رکا۔ یہاں سے ٹی وی رپورٹر سول ایوی ایشن کے حوالے سے ہیلی کاپٹر کریش کی رپورٹ دے رہی تھی۔ لڑکی بتا رہی تھی کہ پاکستان انڈیا کی سرحد کے بالکل پاس کریش ہونے والا یہ ہیلی کاپٹر شملہ کے ایک ائرکلب میں رجسٹرڈ تھا اور اس کا پائلٹ بی اے سنکاری گزشتہ شام کچھ لوگوں کو لے کر ہمالیہ کی طرف گیا تھا مگر اب اس کا ہیلی کاپٹر دریائے راوی میں پڑا تھا۔ ہیلی کاپٹر کا پائلٹ اور دوسرے مسافر غائب تھے۔ پولیس اور بارڈر سیکورٹی فورس انٹیلی جنس اس معاملے میں تحقیق کر رہی تھی اور امید تھی کہ جلد سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔ لڑکی کی رپورٹ نامکمل تھی بی ایس ایف والے جس طرح ہمارے پیچھے آئے تھے اس سے لگ رہا تھا کہ انہیں بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا۔ یقیناً اس ہیلی کاپٹر کے بارے میں دفاعی حکام جانتے تھے کہ یہ ان کی طرف سے کلیرنس لے کر پاکستانی سرحد کے پار گیا تھا اور اسے واپسی میں نشانہ بنا گیا تھا اس لیے اب وہ اس کے مسافروں کی تلاش میں تھے۔

نوجوان کی توجہ ٹی وی کی طرف نہیں تھی اس لیے وہ بی اے سنکاری کے نام پر چونکا نہیں تھا۔ اس کے بجائے وہ اپنی کرسی سیٹ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بیتو کو گھورا تو اس نے جلدی سے چینل تبدیل کردیا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ دیر آرام کرلوں۔ میں گزشتہ بیس گھنٹے سے مسلسل جاگ رہا تھا اور حرکت میں تھا۔ جسم اب آرام طلب کر رہا تھا۔ میں نے بیتو سے کہا کہ میں کچھ دیر آرام کروں گا وہ سمجھ گیا کہ اب سب دیکھنا اس کی ذمے داری ہے اس نے مستعدی سے کہا۔ ”آپ سو جاؤ ہم جاگ رہا ہے۔“

میں ایک کرسی پر نیم دراز ہو گیا اور تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد مجھے نوجوان نے ہلایا۔ ”میری پائلٹ سے بات ہو گئی ہے وہ آنے والا ہے۔“

میں نے انگڑائی لی۔ ”یہ تم نے اچھا کیا..... یہ بتاؤ کوئی چائے کافی ملے گی ہم اس کی ادائیگی کریں گے۔“

”میرے پاس سامان ہے میں ابھی بناتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ساتھ میں واش روم سے فریش ہو جائیں۔“

واش روم اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر میں تازہ دم ہو گیا۔ بیتو جاگ رہا تھا میں نے اسے سونے کو کہا لیکن اس نے انکار کردیا۔ ”ہم ٹھیک ہے ذرا باہر سے آتا ہے۔“

اسے اسلحے کی فکر تھی اگرچہ جیپ لاک تھی مگر بیتو اپنی تسلی کرنے گیا تھا اس نے چالاکی سے کام لے کر ایک موقع پر جب نوجوان کمرے میں نہیں تھا ٹی وی کیبل کی تار ایک جگہ سے کاٹ دی تھی تاکہ وہ ٹی وی نہ دیکھ سکے۔ اس کا پورا امکان تھا کہ ہر چینل اب اس پر رپورٹنگ کر رہا ہوگا۔ ممکن ہے انڈیا کے اسٹوری ساز میڈیا نے اس دوران میں کوئی کہانی بھی بنالی ہو جب معاملہ پاکستان کا ہو انڈین میڈیا کے نزدیک سفید جھوٹ بولنا بھی جائز ہو جاتا ہے۔ پائلٹ سات بجے وہاں پہنچا اس وقت تک باہر بہت تیز روشنی ہو

چکی تھی۔موسم پرواز کے لیے ساز گار تھا۔ پائلٹ کا نام آڈیسی منکڈ تھا۔ وہ تقریباً پینتیس برس کا سیاہ رُو مگر اچھے نقوش والا آدمی تھا۔اگر اسے کترینا کیف جیسی بیوی مل گئی تھی تو اسے اس سے ڈرنا ہی چاہیے تھا۔کیونکہ معاملہ بزنس کا تھا اس لیے علیک سلیک کے بعد وہ مجھے لاؤنج میں الگ جگہ لے آیا۔اس نے پوچھا۔"کہاں جانا ہے اور صرف جانا ہے یا آنا بھی ہے؟"

"ہمیں شملہ جانا ہے۔" میں نے کہا۔"ممکن ہے واپس بھی آنا پڑے۔"

"اس صورت میں چالیس ہزار روپے ہوں گے۔" اس نے سر ہلایا۔"شملہ میں اسٹے بھی تمہارے ذمے ہوگا۔"

"میں پینتالیس ہزار دوں گا اسٹے اور کھانا پینا تمہارا اپنا ہوگا۔" میں نے کہا تو وہ خوش ہوگیا کہ میں نے کوئی بارگیننگ نہیں کی تھی۔"لیکن یہاں کسی کو ہماری منزل کا علم نہیں ہونا چاہیے۔تم ائرکلب والوں کو بھی نہیں بتاؤ گے۔"

"اے ٹی ایف کو بتانا پڑے گا۔"

"اسے بے شک بتاؤ.....میں عام لوگوں کے لیے منع کر رہا ہوں۔ ہمارے ساتھ ایک بڑی شخصیت ہے اس کا تعلق ایک سابق راجا خاندان سے ہے سیکورٹی کی وجہ سے ہم اس کا سفر پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔" اس نے سر ہلایا۔"مجھے رقم ایڈوانس میں چاہیے۔"

"پچیس تمہیں ابھی ملیں گے اور بیس واپسی کے وقت دوں گا۔" میں نے کہا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں کوئی ٹیکسی والا نہیں ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ رقم ایڈوانس میں چاہیے اور میں بتا دوں کہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ اسٹے نہیں کروں گا۔"

"ممکن ہے چوبیس گھنٹے سے زیادہ لگ جائیں تو...."

"معاوضے میں مزید پانچ ہزار کا اضافہ ہوگا۔"

"ٹھیک ہے.....لیکن تم کسی صورت میرے حکم کے بغیر واپس نہیں آؤ گے اور نہ فلائنگ کرو گے۔"

"ڈن۔" اس نے ہاتھ آگے کیا اور میں نے ہاتھ ملا کر اسے پینتالیس ہزار بھارتی روپے کے مساوی ڈالرز دے دیئے۔ریٹ انٹرنیٹ سے پتا چل گئے تھے۔ بھارتی روپے تیزی سے کم ہو رہے تھے کیونکہ اب تک ان سے ہی خرچ کر رہا تھا۔یورو کی ایک گڈی شیام اور رینا کو دی تھی۔ اس کے باوجود یورو اور ڈالرز کی صورت میں خاصی رقم موجود تھی۔اس لیے اب میں بھارتی کرنسی بچانے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ ہر جگہ ڈالرز اور یورو نہیں چلتے ہیں اور ان کا استعمال لوگوں کو چونکاتا بھی ہے۔میں اس کے ساتھ باہر آیا ایک طرف طیاروں کے ساتھ اس کا سیسنا اسکائی ہاک طیارہ کھڑا تھا۔طیارہ تقریباً نئی حالت میں تھا۔یہ اس کا نیا ماڈل تھا جس میں تین کے بجائے چار مسافروں کی گنجائش ہوتی ہے۔ایک پائلٹ کے ساتھ بیٹھتا ہے اور تین پیچھے آتے ہیں۔طیارے میں ایندھن بھرا ہوا تھا۔آڈیسی نے بتایا۔

"دو دن پہلے ایک پارٹی نے بکنگ کرائی تھی اور عین موقع پر پروگرام کینسل ہوگیا تب سے یہ ایسے ہی کھڑا ہے۔"

"تمہارا نقصان ہوا ہوگا؟"

"نہیں۔" اس نے دانت نکال کر کہا۔"میں ہمیشہ ایڈوانس لیتا ہوں اگر کوئی پروگرام کینسل کرتا ہے تو میں رول کے تحت ٹوٹکٹی پرسنٹ کاٹ کر واپس کرتا ہوں۔"

وہ ہوشیار آدمی تھا۔ سنکاری نے صرف دس ہزار روپے لیے تھے اور ایندھن بھی اسی رقم سے ڈلوایا تھا۔اس کے مقابلے میں آڈیسی یقیناً ہوشیار آدمی تھا۔میں نے اس سے پوچھا۔"کتنی دیر میں پرواز کے لیے تیار ہو سکتے ہو ہمیں جلد از جلد روانہ ہونا ہے۔"

"آدھا گھنٹا اور لگے گا مجھے طیارے کو چیک کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے تم اسے چیک کرو۔" میں نے واپس عمارت کی طرف جاتے ہوئے کہا۔"ہم آدھے گھنٹے میں آتے ہیں۔"

میں نے صرف چائے لی تھی اور باقی سب ناشتا کر رہے تھے ان ہی چیزوں سے جو میں نے پیٹرول پمپ کے اسٹور سے لی تھیں۔ بیتو نے مجھے ایک چاکلیٹ بن پکڑا دیا۔"کھا کر دیکھو مزے کا ہے۔"

"ہمیں آدھے گھنٹے میں روانہ ہونا ہے۔" میں نے کہا اور سنکاری کی طرف دیکھا۔"ہمیں ائرکلب سے جانے کے لیے گاڑی درکار ہوگی وہ کیسے ملے گی۔"

"تم کال کر کے کیب منگوا سکتے ہو۔" اس نے کہا اور دو کیب کمپنیوں کے نمبرز بتائے۔ میں نے اسی وقت ایک کیب کا نمبر ملایا اور ایک کیب شملہ کی ائر فیلڈ پر بھیجنے کو کہا۔میرے پاس ابھی تک ہمالیہ ہوٹل کے منیجر کا دیا موبائل

تھا اور کام آ رہا تھا۔سنکاری اور راج کنور سمجھنے سے قاصر تھے کہ میں کیا کر رہا تھا اور انہیں کیوں لیے لیے پھر رہا تھا۔گاڑی کا مسئلہ حل ہونے کے بعد میں باہر آیا اسلحے والا بیگ لا کر اندر بیتو کے حوالے کیا اور پھر جیپ لے کر ائر فیلڈ سے نکل آیا۔ کچھ دور آ کر جیپ ایک جگہ درختوں کے درمیان چھوڑی اور اس پر سے تمام ممکنہ جگہوں پر اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کر دیئے۔ جب تک میں پیدل واپس آیا آڈیسی طیارے کو پرواز کے لیے تیار کر چکا تھا۔کیونکہ گیٹ کیپر مجھے جاتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لیے اس نے واپسی کے وقت بغیر کسی اعتراض کے مجھے اندر آنے دیا۔آڈیسی اور اس کا طیارہ پرواز کے لیے تیار تھے۔میں اندر جا کر سب کو لے آیا۔راج کنور کو پیچھے سیٹ پر بٹھا دیا۔سنکاری کو اس کے ساتھ والی جگہ ملی تھی۔آڈیسی نے اسلحے والا بیگ دیکھا۔

"اس میں کیا ہے؟"

"اس میں کچھ آلات ہیں اور کچھ آٹو موبائل پرزے ہیں۔" میں نے بیگ کے بھاری پن کے پیشِ نظر گھڑ کر جھوٹ بولا۔بیتو بیگ سمیت پیچھے گھس گیا آڈیسی نے کہا۔

"بیگ سیٹ کے پیچھے خانے میں رکھ دو۔"

بیتو نے خانہ کھول کر بیگ اس میں رکھ دیا۔آڈیسی نے انجن چلانے سے پہلے ائر ٹریفک کنٹرولر سے ریڈیو پر اجازت لی اور اسے فلائٹ پلان بتایا گیا۔میں نے مداخلت نہیں کی۔میرا اندازہ تھا کہ انڈین انٹیلی جنس جس طرح سے میرا تعاقب کر رہی تھی وہ ہر جگہ مجھ سے گھنٹوں پیچھے تھے۔ اگر سب میرے پروگرام کے مطابق ہوتا تو ہم آج کے دن ہی سادی کو حاصل کر کے واپس آ سکتے تھے۔اس کے بعد واپسی کا لائحہ عمل طے کیا جاتا۔طیارے نے آٹھ بجے ٹیک آف کیا۔یہ زیادہ تیز طیارہ نہیں ہے۔اس کی زیادہ سے زیادہ رفتار دو سو کلومیٹرز فی گھنٹا ہے۔ ٹیک آف کے وقت کیبن پریشر نہ ہونے کی وجہ سے کانوں کو بے پناہ شور اور بوجھ کا سامنا کرنا پڑا تھا۔آڈیسی نے پرواز سے پہلے بتا دیا کہ الٹی آنے کی صورت میں سیٹ کے ساتھ تھیلی موجود تھی اسے استعمال کیا جائے۔مگر خوش قسمتی سے کسی کو ضرورت نہیں پڑی۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر آ کر طیارہ سیدھا ہوگیا۔ اب شور اور دباؤ کم ہوگیا تھا۔ ہم شملہ کی طرف اڑنے لگے۔ ہم کسی قدر جنوب مشرق کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے بتایا کہ شملہ طول البلد میں امرتسر اور لاہور سے بھی نیچے ہے لیکن کیونکہ یہ پہاڑوں میں ہے اس لیے اس کا موسم سرد اور تقریباً مری جیسا ہے۔آڈیسی نے کہا۔

"ہم آدھے گھنٹے بعد شملہ میں ہوں گے۔"

یعنی ہم ساڑھے آٹھ بجے شملہ میں ہوتے۔ میں نے سوچا کہ اگر وہاں سے کوئی فوروہیل ڈرائیو مل گئی تو ہم چار گھنٹے میں کنور پیلس کے پاس پہنچ سکتے تھے۔گاڑی ڈرائیور سمیت تلاش کی جا سکتی تھی۔میری ساری تگ و دو کا مرکز وقت بچانا تھا اور اس کے لیے میں خطرہ بھی مول لے رہا تھا۔اس طرح کھلے بندوں طیارے میں روانگی بالآخر بھارتی انٹیلی جنس کے علم میں آ جاتی اور تلاش کا دائرہ شملہ تک پہنچ جاتا۔ میرے پاس بس آج کا دن تھا رات یا کل صبح تک لازمی طیارے تک رسائی حاصل کر لی جاتی اور پھر میں آڈیسی کو استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ میرا منصوبہ تھا کہ آج کے دن سادی کو حاصل کر کے ہم واپس بھارتی پنجاب آ جاتے اور اس کے بعد میں عبداللہ سے کہتا کہ وہ ہمیں سرحد پار بلوانے کے لیے اپنے چینل استعمال کرے۔اس کے سرحد پار والوں سے تعلقات تھے۔شروع میں سنکاری اور راج کنور کا مسئلہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا مگر اب ان کا حل بھی سوچ لیا تھا۔ میں نے جو دوائیں امرتسر سنگھ سے پوچھ کر منگوائی تھیں ان کو استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی لیکن اب میں انہیں استعمال کر سکتا تھا۔

آٹھ بج کر پچیس منٹ پر آڈیسی نے طیارے کی بلندی کم کرنا شروع کر دی اور پریشر کی وجہ سے پھر ہمیں اسی تکلیف سے گزرنا پڑا تھا۔ بے پناہ شور اور کانوں پر ایسا دباؤ تھا کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے لگ رہے تھے۔آڈیسی اور سنکاری اس کے عادی تھے۔ مگر مجھے، بیتو اور راج کنور کو مشکل ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں شملہ کا وہی ائر فیلڈ دکھائی دینے لگا جہاں سنکاری کا ہیلی کاپٹر کھڑا ہوتا تھا۔سنکاری وہاں جانا پہچانا فرد تھا اس کا طیارے سے باہر آنا مناسب نہیں تھا۔اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ ان لوگوں کو طیارے میں چھوڑ کر کیب لینے جاؤں گا وہ پارکنگ میں ہو گی۔ طیارے سے براہِ راست ان لوگوں کو کیب میں منتقل کر کے ہم وہاں سے نکل جائیں گے۔سنکاری کا جیپ سوٹ توجہ کا مرکز بن سکتا تھا اس لیے اس کا نظروں میں نہ آنا ہی بہتر تھا۔آڈیسی نے ائرکلب والوں سے اترنے کی اجازت لی اور ایک منٹ بعد طیارہ لینڈ کر رہا تھا۔میں نے آڈیسی سے کہا۔"طیارے کو الگ تھلگ جگہ روکنا۔"

اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور طیارے کو ٹیکسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

کراتا ائرکلب کی عمارت سے کچھ دور ایک جگہ پارک کر دیا۔ میں نیچے اتر آیا اور راج کنور سے کہا۔ ”آپ بیٹھیں میں گاڑی یہیں لاتا ہوں۔“

میں نے باہر نکل کر کیب کے دفتر کال کی تو بتایا گیا کہ مذکورہ کیب پہنچ گئی ہے اور پارکنگ میں ہماری منتظر ہے۔ پارکنگ میں ایک بڑی سفید کار کھڑی تھی۔ یہ نیا ماڈل تھا اور اگر اس پر کیب کا مخصوص نشان نہ ہوتا تو اسے کسی صورت ٹیکسی تسلیم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ڈرائیور اندر موجود تھا۔ میں نے شیشہ بجایا تو اس نے شیشہ نیچے کیا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا میں نے کہا۔ ”کیب میں نے ہائر کی ہے دروازہ کھولو۔“

اس نے بیک سیٹ کا دروازہ کھولا اور میرے اندر بیٹھتے ہی ادائیگی کا مطالبہ کر دیا۔ میں نے بدمزگی سے کہا۔ ”میں بھاگا نہیں جا رہا منزل پر پہنچ کر تمہیں ادائیگی کر دی جائے گی۔“

اس نے دوبارہ مطالبہ نہیں کیا اور میری رہنمائی میں کیب کورن وے پر پارک طیارے تک لے آیا۔ میں نے کیب اس طرح رکوائی کہ وہ طیارے اور عمارت کے درمیان میں آ گئی۔ وجہ میں نے بیمار راج کنور کو قرار دیا جسے کم سے کم تکلیف کے ساتھ ٹیکسی میں منتقل کرنا تھا۔ راج سے پہلے بیتو نے سنکاری کو پھرتی سے کیب میں دھکیلا اور پھر ہم راج کنور کو بھی لے آئے آخر میں بیتو نے اسلحے والا بیگ کیب کی ڈکی میں منتقل کیا اور ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سچی بات ہے کہ روانگی تک میرا دل مسلسل دھڑکتا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ بھارتی حکام اتنی جلدی میرا سراغ نہیں لگا سکیں گے لیکن یہ ایک مفروضہ ہوتا اور اگر کوئی تیز طرار شخص اس کیس پر کام کر رہا ہوتا اور وہ سارے چینلز استعمال کرتا تو یہ پتا چلانا مشکل نہیں ہوتا کہ ہم ایک طیارہ ہائر کر کے شملہ پہنچے ہیں اور اس کا بھی امکان تھا کہ پولیس یہاں ہماری منتظر ہوتی۔ یہ بات یقینی تھی کہ چار سیکورٹی والوں کا قتل بھارتی حکام کو تیزی سے حرکت میں آنے پر مجبور کرتا۔

جب ہم بہ حفاظت باہر آ گئے تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ کیب سڑک پر پھسلتی ہوئی تیزی سے شملہ کی طرف رواں دواں تھی۔ جہاں ائرکلب تھا وہاں بھی موسم سخت گرم تھا اور تپش کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ کیب اے سی تھی۔ اس لیے اس میں باہر کا موسم پتا نہیں چل رہا تھا مگر یہ یقینی تھا جیسے جیسے ہم اوپر جا رہے تھے موسم خنک ہو رہا ہو گا۔ آڈیسی نے ہمارے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ اس کا مطلب تھا وہ اپنا بندوبست خود کر لیتا ممکن ہے کسی ہوٹل کے بجائے وہ ائرکلب کی عمارت میں رک جاتا اور ہوٹل کا خرچ بچا لیتا۔ شملہ کے پاس آ کر ڈرائیور نے پوچھا۔ ”سر کہاں جانا ہے۔“

میں اس دوران میں گوگل میپ پر ایک اسپتال دیکھ چکا تھا میں نے اس کا نام لیا۔ ”پہلے ہم یہاں جائیں گے۔“

اسپتال اتفاق سے شملہ کے نچلے علاقے میں تھا۔ اس لیے دس منٹ بعد ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ لیکن میں نے کیب اسپتال کے اندر لے جانے کے بجائے باہر رکوائی اسے یہاں تک آنے کا کرایہ دیا جو نارمل ٹیکسی سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ”ہمارا انتظار کرنا ہم آتے ہیں۔“

راج کنور سمجھ رہا تھا کہ میں اسے ڈاکٹر کو دکھانے لایا ہوں اور یہ سچ بھی تھا۔ لیکن اسپتال کے اندر جانے کے بجائے میں ان کو باغ میں لے آیا کیونکہ موسم یہاں بھی گرم تھا اس لیے باغ اس وقت ویران تھا۔ میں نے بیتو کو اشارہ کیا اور اس نے پستول نکال لیا۔ راج کنور اور سنکاری پریشان ہو گئے تھے۔ راج کنور نے پوچھا۔ ”شہباز تم کیا چاہتے ہو؟“

”بتاتا ہوں۔“ میں نے لیپ ٹاپ والے بیگ سے انجکشن اور سرنجیں نکالیں۔ سنکاری چونکا۔

”یہ کیا ہے؟“

میں نے سرنج بھری اور راج کنور کا بازو پکڑ کر کھینچا۔ سختی سے اس کے بازو کی نس ابھر آئی اور میں نے اس میں سرنج کی نوک اتار دی۔ راج کنور نے مزاحمت کی کوشش کی تو بیتو نے پستول اس کی گدی سے لگا دیا۔ ”فکر مت کرو تم کو زہر لگانے کے لیے اتنی دور نہیں لایا ہے۔“

میں نے پوری دوا اس کی نس میں انجکٹ کر دی اور پھر اسے پھینک کر دوسری سرنج میں دوسرے انجکشن کی دوا بھری۔ ڈاکٹر امرتسر سنگھ کے مطابق یہ سب سے موثر دوا تھی اور اس کا اثر چوبیس گھنٹے برقرار رہتا تھا بہ شرط کہ اس کا توڑ نہ کر دیا جائے۔ انجکشن دینے کے پانچ سے دس منٹ کے اندر دوا اثر کرتی تھی اور اس کے بعد آدمی ایک خاص کیفیت میں چلا جاتا تھا اس کا ذہن مزاحمت کرنا چھوڑ دیتا تھا اور اسے جو کہا جاتا وہ اس پر عمل کرتا تھا۔ میں نے سنکاری سے کہا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

”یہ کیا ہے؟“

”فکر مت کرو یہ نقصان دہ نہیں ہے۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اسے دیکھو کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔“

راج کنور آنکھیں جھپکا رہا تھا اور اس کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن ایسی کوئی علامت نہیں تھی جس سے لگتا کہ دوا نے اس پر منفی اثر ڈالا ہے۔ جب بیتو نے پستول اس کی پشت سے لگایا تو سنکاری نے بادلِ ناخواستہ ہاتھ آگے کیا اور میں نے سرنج اس کی نس میں خالی کر دی۔ دوا کی شیشی اور استعمال شدہ سرنجیں نزدیک ہی ڈسٹ بن میں ڈال دیں۔ دس منٹ پورے ہو گئے تھے اور راج کنور بدستور پلکیں جھپکا رہا تھا میں نے آہستہ سے کہا۔ ”راج کنور تم میرے کیا ہو؟“

”میں تمہارا دشمن ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

”کس حد تک؟“

”اس حد تک کہ جب تک تمہارا وجود مٹا نہ دوں مجھے چین نہیں آئے گا۔“ وہ صاف گوئی سے کہہ رہا تھا۔

”میں نے تم سے بہت کچھ پوچھا تم نے بتایا اس میں کوئی جھوٹ بھی شامل تھا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ واپسی کے ریڈزون کا پاس ورڈ ہوتا ہے۔“

دوا اثر کر چکی تھی۔ ”کوئی ایسی بات جو تم نے آج تک مجھ سے چھپائی ہو۔“

”میں جانتا ہوں کہ سادھنا تم لوگوں کے پاس ہے۔“

میں دہل گیا تھا میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بات صرف بڑے کنور کے علم میں تھی۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”بڑے کنور کے آدمیوں میں میرے مخبر ہیں وہ مجھے بتاتے تھے۔“

”تب تم نے کیا سوچا؟“

”میں نے سادھنا کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔“ اس نے بلا جھجک انکشافات جاری رکھے۔ ”میں برداشت نہیں کر سکتا کہ میری بہن میرے دشمنوں اور مسلمانوں کے پاس رہے۔“

”تمہیں معلوم ہے اب سادھنا کہاں ہے؟“

”وہ تمہاری حویلی میں ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی معلومات اپ ڈیٹ نہیں تھیں۔

”تمہیں معلوم ہے میں یہاں واپس کیوں آیا ہوں؟“

”نہیں لیکن میں حیران ہوں۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”راج کنور میں تمہاری ٹانگ کے علاج کے لیے تمہیں یہاں چھوڑ کر جا رہا ہوں تم یہاں ایڈمٹ رہو گے اور سنکاری تمہارے ساتھ ہو گا، سنکاری تم سمجھ گئے ہو۔“

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔“

”جب تک میں واپس نہیں آؤں گا تم یہاں اسپتال میں رہو گے۔ راج تم آرام کرو گے اور کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے۔ تم دونوں زیادہ سے زیادہ سونے کی کوشش کرو گے۔“

ان دونوں نے یقین دلایا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ میں بیتو کو باہر چھوڑ کر سنکاری کے ساتھ اندر آیا۔ یہ چھوٹا اسپتال تھا لیکن یہاں فوری طبی امداد اور آرتھوپیڈک سرجن کی سہولت موجود تھی۔ میں نے انتظامیہ سے کہا کہ وہ راج کنور کو چوبیس گھنٹے کے لیے داخل کر لیں۔ سنکاری اس کی تیمارداری کے لیے اس کے ساتھ رہے گا۔ کیونکہ میں تمام اخراجات پیشگی ادا کر رہا تھا اس لیے اسپتال والوں نے بہ خوشی راج کو داخل کر لیا اور سنکاری کے ساتھ رہنے پر اعتراض بھی نہیں کیا۔ سنکاری جمپ سوٹ میں تھا لیکن اس نے اوپری شرٹ اتار دی تھی اور اندر ٹی شرٹ نما بنیان تھی۔ پتلون سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ پائلٹ ہے یا نہیں۔ اس کی شرٹ میں نے لے لی تھی۔ آدھے گھنٹے میں تمام مراحل نمٹ گئے اور ڈیوٹی پر موجود آرتھوپیڈک سرجن نے مجھے یقین دلایا کہ مریض کی بہترین دیکھ بھال کی جائے گی۔ میں نے خود کو ایک انسانی ہمدرد ظاہر کیا تھا اور راج کنور یا سنکاری سے کسی قسم کا تعلق تسلیم نہیں کیا تھا۔ سنکاری کی موجودگی کی وجہ سے اسپتال والے مطمئن تھے۔ ویسے بھی ان کو پیشگی رقم مل گئی تھی اس لیے مسئلہ نہیں تھا۔ میں باہر آیا بیتو باغ میں منتظر تھا ہم کیب کی طرف آئے بیتو نے توجہ دلائی۔

”شوبی ہم دونوں کا لباس خراب ہو رہا ہے اس کا کچھ کرو۔“

”تم نے اچھا یاد دلایا۔“ میں نے کہا اور کیب ڈرائیور سے کسی ایسے شاپنگ اسٹور چلنے کو کہا جو صبح نو بجے بھی کھلا ہو اور وہاں سے کپڑے مل سکیں۔

کیب والا ہمیں لوئر شملہ میں ایک شاپنگ سینٹر لے گیا۔ یہ بہت اچھا تو نہیں تھا مگر یہاں کپڑے دستیاب تھے۔ میں نے اور بیتو نے ایک ایک ذرا ہلکا جوڑا لیا اس میں سوتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

ٹراؤزر اور پوری آستین کی ہلکی شرٹ تھی اور ایک کسی قدر گرم جوڑا لیا، یہ بھی سوتی تھا مگر سردی کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے پیراشوٹ کے بنے ہوئے اپرز لیے یہ بارش سے بچا سکتے تھے۔ میرے پیروں میں جوتے تھے میں نے جوگرز لیے اور وہیں اسٹور کے ٹرائی روم میں چینج کر لیے۔ اسلحے کے لیے ایک چرمی بیگ لیا کیونکہ پیراشوٹ اور کپڑے سے بنے اس بیگ میں بعض اوقات اسلحہ نمایاں ہونے لگتا تھا۔ ٹرائی روم میں ہی اسلحہ چرمی بیگ میں منتقل کیا۔ بھوک لگی تھی لیکن ناشتے کا وقت نہیں تھا۔ بیتو نے شاپنگ کے دوران ایک بڑی ڈبل روٹی، ابلے ہوئے انڈے، مکھن کا پیک، پنیر اور اسی قسم کی کئی اشیا لے لیں جو راستے میں ہم آرام سے کھا پی سکتے تھے۔ بیتو نہ جانے کیا کیا خرید رہا تھا میں نے اسے رقم دے دی تھی کہ وہ الگ کاؤنٹر پر بل ادا کر دے تاکہ ہمیں تاخیر نہ ہو۔ باہر آکر میں نے کیب والے کو فارغ کیا۔ یہ بازار تھا اور مجھے امید تھی کہ یہاں کوئی اچھی فور وہیل ڈرائیو مل جائے گی۔ ایک جگہ کئی گاڑیاں کھڑی تھیں جن کے مالک ان کے آس پاس ہی ٹہل رہے تھے بیتو ان سے مذاکرات کرنے چلا گیا اور میں نے انٹرنیٹ کی مدد سے بڑے کنور کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

"تمہارے دیئے ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں سادی سے میری بات کراؤ۔"

"ابھی اس کی آمد میں کچھ تاخیر ہے اس کی پرکینیسی کی وجہ سے میرے آدمی آرام سے سفر پر مجبور ہیں۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ "تب میں کب کال کروں؟"

"تم انڈیا کے وقت کے مطابق شام چھ بجے تک کال کرنا۔" اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں انٹرنیٹ کی مدد سے کال کر رہا تھا کیونکہ اس میں انڈیا کا کوئی نمبر آرہا ہوگا یا پرائیویٹ نمبر لکھا آتا ہے۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

"وہ تمہاری بہن ہے لیکن اس کے معاملے میں، میں تم پر اعتبار کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ یاد رکھنا اسے ذرا بھی نقصان ہوا تو اس کا حساب تمہیں دینا ہوگا۔"

"تم فکر مت کرو اسے کچھ نہیں ہوگا۔" بڑے کنور نے سپاٹ لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ بیتو ایک چینی نقوش والے شخص سے مذاکرات کر رہا تھا بعد میں وہ تبتی ثابت ہوا اور وہ چین کا سخت دشمن تھا کیونکہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ چینی ہے تو اس کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا کہ اللہ نہ کرے میں چینی ہوں۔ اس کی ہندی واجبی تھی اور انگریزی بھی بس کام چلاؤ تھی لیکن اس کے پاس ایک بہترین فور وہیل ڈرائیو لینڈ کروزر تھی اور وہ ڈرائیور بھی ماہر تھا۔ میں نے اسے انٹرنیٹ پر نقشہ دکھایا اور کنور پیلس کی طرف مڑنے والی ذیلی سڑک کے مقام پر انگلی رکھی۔

"ہمیں اس جگہ پہنچنا ہے۔"

"میں پہنچا دوں گا۔" اس نے یقین دلایا۔ "چار ہزار روپے ہوں گے اور چار گھنٹے لگیں گے۔"

وہ شہر میں تھا اور یہاں آنے والے سیاحوں کی کمی نہیں تھی جو منہ مانگے دام دینے کو تیار تھے اس لیے اس کے ریٹ بھی اسی مناسبت سے تھے ورنہ ہم اس سے چوتھائی رقم میں یہاں آئے تھے۔ بہرحال میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ البتہ واضح کر دیا کہ اسے ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔ اس نے بھی واضح کیا۔ "اس رقم میں، میں چوبیس گھنٹے تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

میں نے بحث نہیں کی۔ کیونکہ واپسی کی بعد میں دیکھی جاتی، چوبیس گھنٹے بہت تھے۔ ہم فوری روانہ ہو گئے۔ ڈرائیور کا نام آئی کن کھوہونسا تھا۔ مجھے اتنا ہی یاد ہے ورنہ نام اس کے بعد بھی جاری تھا۔ گاڑی کے انجن کے ساتھ اس کی زبان بھی چل پڑی تھی کیونکہ اسی وقت میں نے اس سے چینی ہونے کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے اس بہتان کی تردید میں خاصی لمبی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ چینی نہیں تبتی ہے۔ اس کا باپ صرف سولہ سال کی عمر میں تبت سے دلائی لاما کے ساتھ بھاگ آیا تھا۔ واضح رہے کہ دلائی لاما تبت پر چینی قبضے کے بعد سے انڈیا میں پناہ گزین تھا۔ وہ آج بھی مغرب کی مدد سے آزاد تبت کی مہم چلا رہا تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس مہم میں جان ختم ہوگئی تھی۔ اب یہ ایک گھسا پٹا کیس تھا جو مغرب کی طاقتوں نے اس وقت کے لیے سنبھال رکھا ہے کہ کبھی چین کمزور ہو اور وہ اس سے اپنی بات منوانے کے لیے اسے استعمال کریں مگر فی الحال چین میں کمزوری کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ آئی کن سخت متعصب تبتی تھا جس کا کہنا تھا کہ تبت صرف تبتیوں کا ہے۔ اس کا باپ آزادی کے لیے لڑنے والوں میں شامل تھا۔ اس نے بتایا کہ گزشتہ ساٹھ سالوں میں چین نے تبت پر اپنا قبضہ اس حد تک مستحکم کر لیا ہے کہ اب وہاں جتنے مقامی تبتی ہیں اس سے دس گنا زیادہ تعداد میں چینی باشندے ہیں۔

یہ قابضین کی خاصیت ہوتی ہے۔ وہ کسی زمین یا ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اسے مستحکم رکھنے کے لیے وہاں اپنے لوگ بساتے ہیں۔ یہ پالیسی سوویت یونین نے وسط ایشیا پر قبضے کے دوران اختیار کی تھی اور جب ان ریاستوں نے روسی غلامی کا جوا اتار پھینکا تو بعض ملکوں میں چالیس فیصد آبادی روسیوں کی تھی۔ یہی پالیسی زیادہ سفاکی کے ساتھ گوروں نے امریکا اور آسٹریلیا میں اپنائی۔ جب انہوں نے بے بس اور لاچار مقامی آبادی کا بے دریغ قتلِ عام کیا اور انہیں ختم کر کے ان کی جگہ یورپ سے سفید فاموں کو لا کر ان ملکوں میں آباد کیا۔ اس سے پہلے اسپینش یہی پالیسی جنوبی امریکا میں آزما چکے تھے۔ مگر چین ذرا مختلف پالیسی پر عمل کر رہا ہے وہ مقامی آبادی کو ختم کیے یا انہیں نقصان پہنچائے بغیر اپنے لوگوں کو آباد کر رہا ہے اس نے اسی حکمتِ عملی کے تحت منچوریا، ترکستان اور تبت میں مقامی آبادی کو اقلیت میں بدلا ہے لیکن ساتھ ہی وہ مقامی آبادی ترقی کے دھارے میں شامل کر رہا ہے اس کا ثبوت یہ ہے اب زیادہ تر قیاتی کام مشرقی چین میں ہو رہے ہیں۔ تاکہ ان علاقوں سے غربت اور پسماندگی کو دور کیا جا سکے۔ چینی یہاں دنیا کے جدید ترین ذرائع مواصلات اور سہولتیں لے آئے ہیں جیسے انہوں نے تبت کے دارالحکومت لہاسا تک ٹرین چلا دی ہے جو دنیا کے بلند ترین ٹرین ٹریک سے گزرتی ہے۔ یہاں دنیا کے بلند ترین علاقوں میں نت نئے شہر آباد ہو رہے ہیں شاہراہیں بن رہی ہیں اور صنعتیں قائم کی جا رہی ہیں۔ جن سے مقامی لوگوں کو بھی روزگار اور فنی تعلیم کے مواقع مل رہے ہیں۔ جب آئی کن کی تقریر ختم ہوئی تو میں نے پوچھا۔

"جب تمہارا باپ تبت سے آیا تو وہاں لوگ کن چیزوں پر سفر کرتے تھے؟"

"جانوروں پر۔" اس نے جواب دیا۔ "لوگ گھوڑوں، یاکوں اور خچروں پر سفر کرتے تھے۔"

"کیسے مکانات میں رہتے تھے، کیا کھاتے پیتے تھے؟"

"ہم پتھروں اور مٹی کے بنے مکانوں میں رہتے تھے۔ ہماری خوراک گوشت، دودھ اور بعض سبزیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔"

مزید سوالات کے جواب میں اس نے بتایا کہ تبت میں صرف ایک درجن گاڑیاں تھیں اور وہ سب دلائی لاما کے محل میں تھیں وہ محل سے باہر نہیں چل سکتی تھیں کیونکہ پورے تبت کیا لہاسا کے شہر میں بھی کوئی سڑک ایسی نہیں تھی جس پر گاڑی چل سکتی ..... محل میں ایک جنریٹر تھا باقی پورا تبت بجلی سے نا آشنا تھا۔ عام لوگ جلانے کے لیے جانوروں کا گوبر استعمال کرتے تھے اور اوپری طبقہ (جو سارا مختلف قسم کے لاماؤں اور ان کے ساتھیوں پر مشتمل تھا) باہر سے آنے والی مہنگی لکڑی اور کوئلہ استعمال کرتا تھا۔ پھر اس نے خود بتایا کہ آج تبتی جدید سہولتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں وہ حکومت کی طرف سے بنائے ہوئے گھروں میں رہتے ہیں۔ پورے تبت میں سڑکوں اور اب ریل کا جال بچھ رہا ہے۔ نت نئے ائرپورٹ تعمیر ہو رہے ہیں۔ تبتی اب دنیا جہاں کی چیزیں کھاتے ہیں اور ہر کپڑے کا لباس پہنتے ہیں۔ بجلی کی سہولت ہر شہری کو میسر ہے اب تبت میں فصلیں کاشت ہونے لگی تھیں کیونکہ چین نے ہمالیہ سے نکلنے والے دریاؤں پر ڈیمز بنا کر بجلی پیدا کرنے کے ساتھ اس کے پانی کو کاشت کاری کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ تبت کے بنجر پلیٹو پر جابہ جا جنگل لگائے جا رہے تھے تاکہ ماحول اچھا رہے۔ سڑکیں اور ریل کی مدد سے دنیا کی ہر چیز اب آسانی سے تبت میں آرہی تھی۔ میں نے ملامت سے کہا۔

"اس کے باوجود تم لوگ چین کے خلاف مغربی دنیا کی زبان بول رہے ہو۔"

"چین نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہے۔"

"لیکن چین نے تمہارے ملک کو بنا بھی دیا ہے۔ ساٹھ سال پہلے تم لوگ کیا تھے اور آج تم لوگ کیا ہو؟ کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ اگر چین تبت پر قبضہ نہ کرتا تو برٹش گورنمنٹ کا جانشین انڈیا اس پر قبضے کی تیاری مکمل کر چکا تھا مگر چین نے پہل کر کے اس کے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔"

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

"یہ سچ ہے لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں اس کے بارے میں دستاویزات موجود ہیں۔ یہ اصل میں برطانیہ کا منصوبہ تھا، اگر دوسری جنگ عظیم نہ ہوتی تو برطانیہ تبت پر بھی چڑھائی کر چکا ہوتا۔"

"اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا؟"

"فرق یہ پڑتا کہ جو حال آج برصغیر کا ہے وہی تبت کا بھی ہوتا۔ انگریز جہاں جاتا تھا سب سے پہلے وہاں کے گھٹیا ترین لوگوں کو چن کر اوپر لاتا تھا اور انہیں اچھے لوگوں مسلط کر دیتا تھا۔"

آئی کن خاموش ہو گیا لیکن اس کے تاثرات بتا رہے

تھے کہ وہ متفق نہیں ہے۔ انڈیا اور مغربی میڈیا نے اس سلسلے میں بہت کام کیا ہے۔ تبت کے لوگ چینی قبضے کے بعد وہاں سے نکل کر ساری دنیا میں پھیل گئے اور یہ لوگ اب بھی اپنے رشتے داروں سے رابطے میں تھے۔ ان کے توسط سے چین کے خلاف خیالات تبت تک پہنچ رہے تھے اور وہاں بے چینی کا سبب بن رہے تھے تقریباً یہی صورتِ حال ترکستان میں رہنے والے ایغور نسل کے مسلمانوں میں تھی۔ وہ بھی چین سے مطمئن نہیں تھے اور وقفے وقفے سے وہاں فسادات ہوتے رہتے تھے جن کے بارے میں چین کا الزام تھا کہ ان میں شدت پسند مسلمانوں کے ساتھ مغربی استعمار کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ وہی پالیسی تھی جو سوویت یونین کے خلاف استعمال کی گئی تھی اور اب چین کے خلاف بروئے کار لائی جارہی تھی لیکن چین نہایت ہوشیاری سے اس پالیسی سے نمٹ رہا تھا۔ وہ سختی کے ساتھ بہتر ذرائع زندگی اور تعلیم کی مدد سے مقامی آبادی کو کنٹرول کررہا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد ہم اپر شملہ سے نکل چکے تھے۔ موسم اچھا ہوگیا تھا اور اب کھڑکی سے آنے والے ہوا کے جھونکے خنکی لیے ہوئے تھے۔ میں فرنٹ سیٹ پر تھا اور بیتو نے پچھلی سیٹ سنبھالتے ہی اونگھنا شروع کردیا تھا اس نے خود کو سیٹ بیلٹ سے باندھ لیا تھا اور کچھ دیر میں وہ سو چکا تھا۔ میں نے ڈبل روٹی، مکھن اور پنیر کی مدد سے ناشتا کیا۔ ابلے ہوئے انڈے بعد کے لیے رکھ چھوڑے تھے۔ میں نے بیتو کو سونے دیا کیونکہ میں صبح ایک گھنٹے سو لیا تھا مگر وہ مسلسل جاگ رہا تھا۔ میں موبائل فون دیکھ رہا تھا۔ ایک قصبے کے پاس سے گزرتے ہوئے اس پر سگنل نمودار ہوئے تو میں نے وہیں رک کر وسیم کو کال کی۔ میں گاڑی روکا کر نیچے اتر آیا تھا اور سڑک کے کنارے چھوٹی سی منڈیر پر ٹک گیا۔ وسیم نے کال ریسیو کی اور محتاط انداز میں بولا۔ ”ہیلو۔“

”میں بات کررہا ہوں۔“

”آپ۔“ اس نے سکون کا طویل سانس لیا اور فوراً شکوہ کیا۔ ”کہاں تھے ہم سب کی جان سولی پر لگی ہے۔“

”راستے میں ہیں تمہارے سسرال جارہے ہیں۔ میری بات ہوئی تھی۔ تمہاری بیگم شام میں کسی وقت پہنچ جائیں گی بھیا کے پاس اور ہاں ایک خبر اور ہے۔ چھوٹے بھیا بھی جانتے ہیں کہ بہنا کہاں ہیں۔“

”ان سالوں کی تو....“ وسیم نے بے ساختہ گالی دی۔ ”کاش آپ نے مجھے نہ روکا ہوتا تو میں اب تک آچکا ہوتا۔ میرے تعلقات ہیں۔“

”ان تعلقات کو ہماری واپسی کے لیے استعمال کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”میں زیادہ دیر بات نہیں کرسکتا تم جانتے ہو آج کل موبائل محفوظ نہیں ہے۔“

”میں سمجھ رہا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”سب کو بتا دینا میں بعد میں کال کروں گا۔“ میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل آف کردیا۔ یہ بھی احتیاطی تدبیر تھی۔ اگر موبائل ٹریس ہوجائے تو آف کرنے کی صورت میں اس کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا ہے لیکن آن کرنے پر اس کا سراغ مل جاتا ہے۔ میں واپس گاڑی میں آیا۔ اتنی دیر میں آئی کن نے گاڑی کا پانی چیک کرلیا تھا۔ اس گاڑی کا انجن اتنی جلدی گرم نہیں ہوتا تھا۔ ہم آگے روانہ ہوئے۔ تین گھنٹے بعد بیتو خود اٹھ گیا اسے بھوک لگی تھی۔ فرنٹ سیٹ پر کھانے پینے کا سامان اس کے حوالے کرکے میں پیچھے آگیا اور سیٹ بیلٹ باندھ کر آرام کرنے لگا۔ یہ آسان طریقہ تھا کیونکہ پہاڑی راستوں پر گاڑی اتنا گھوم رہی تھی کہ لیٹ کر آدمی بس کبھی آگے اور کبھی پیچھے ہی پھسلتا رہتا آرام خاک بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سیٹ بیلٹ پکڑ لیتی تھی اور آدمی سو جائے تو گرتا بھی نہیں تھا چاہے جھٹکا کیسا ہی شدید کیوں نہ ہو۔ چند منٹ بعد مجھے نیند آگئی تھی۔ مگر آدھے گھنٹے بعد ہی آنکھ کھل گئی۔ بیتو ہلا رہا تھا۔

”شوبی ادھر مسئلہ ہوگیا ہے۔“

مسئلہ آنکھ کھلتے ہی نظر آگیا تھا۔ سامنے ایک جگہ لینڈ سلائیڈنگ ہوئی تھی اور اس کے پیچھے گاڑیوں کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ آئی کن نے ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے لینڈ سلائیڈنگ دیکھتے ہی لینڈ کروزر کو گھما کر اس کا رخ دوسری طرف کرلیا تھا۔ پھر وہ اتر کر صورتِ حال معلوم کرنے گیا۔ بیتو نے مجھے آئی کن کے جانے کے بعد اٹھایا تھا۔ میں فکرمند ہوگیا۔ ”یہ تو مسئلہ ہوگیا ہے۔“

”یہ بھی غائب ہے آئے تو پوچھنا ہے اب کدھر سے جانا ہوگا۔“

اتفاق سے اس جگہ کے پاس ہی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا گاڑیاں رکتے ہی وہاں سے عورتیں اور بچے ہر وہ چیز لے کر اوپر آگئے تھے جو فروخت کی جاسکتی تھی۔ اس میں کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ ایک دس گیارہ سال کا لڑکا بڑی سی کیتلی لیے چائے بیچ رہا تھا۔ اس نے ایک اسٹینڈ پر چھ کپ لٹکا رکھے تھے اور اس کی ماں سڑک کے کنارے پانی لیے

بیٹھی تھی۔ وہ استعمال شدہ کپ اسے دیتا اور وہ اسے دھلا ہوا دوسرا کپ پکڑا دیتی تھی۔ صبح سے چائے نہیں پی تھی اور اس وقت نیند کی کمی کی وجہ سے شدت سے طلب ہورہی تھی۔ میں نے بچے کو آواز دے کر تین کپ دینے کو کہا۔ معیار کے بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں تھی مگر حیرت انگیز طور پر چائے بہترین نکلی۔ اس میں دودھ اور چینی مناسب تھی جو زیادہ لیتے تھے بچہ ان کے لیے الگ سے چینی اور دودھ بھی رکھے ہوئے تھا۔ وہ ہوشیار بچہ تھا۔ جانتا تھا کہ شہری لوگ کیسی چائے پسند کرتے ہیں بلکہ اس کی ماں ہوشیار تھی۔ چائے اسی نے بنائی تھی۔ بچہ تو صرف بیچ رہا تھا۔ تیز گرم سنہری مشروب پیتے ہوئے ہونٹ جلے تھے لیکن اس کا بھی اپنا الگ ہی مزہ تھا۔ آئی کن آیا تو چائے دیکھ کر خوش ہوگیا۔

”صبح سے نہیں ملی سر گھوم رہا ہے۔“

میں نے بچے سے دوسرے کپ کی فرمائش کری، بیتو نے بھی مانگی۔ میں نے آئی کن سے پوچھا۔ ”اس مصیبت سے کیسے نکلیں؟“

اس نے گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”ادھر چار پانچ میل پیچھے ایک راستہ نکلتا ہے جو اوپر جاکر دوبارہ اسی سڑک پر آجاتا ہے۔ اس میں دو گھنٹے کا وقت اور لگے گا۔“

”سلائیڈ کے بارے میں پتا کیا ہے یہ کب تک صاف ہوسکتی ہے؟“

آئی کن مسکرایا۔ ”صاف تو تب ہوگی جب صفائی کرنے والے آئیں گے۔ ابھی کوئی نہیں آیا ہے لوگ خود سے مٹی صاف کررہے ہیں مگر یہ بلڈوزر کا کام ہے۔“

”تب واپس چلو اور اسی راستے کی طرف جو اوپر سے گھوم کر واپس سڑک پر آتا ہے۔“ میں نے فوری فیصلہ کیا۔

آئی کن نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ”اس کا ہزار روپیہ اوپر ہوگا۔“

”لے لینا مگر ابھی تو چلو ایسا نہ ہو واپسی کا راستہ بھی بند ہوجائے۔“ میں نے گاڑیوں کے بڑھتے دباؤ کو دیکھ کر کہا۔ ہمارے پیچھے بھی کئی درجن گاڑیاں جمع ہوچکی تھیں اور اگر یہ وطن عزیز ہوتا تو اب تک سڑک بھی بند ہوچکی ہوتی لیکن ان لوگوں نے گاڑیاں ایک طرف رکھی تھیں واپسی کا راستہ برقرار تھا۔ ایک ایسے ہی موقع پر میں نے شمالی علاقے کی ایک معروف سڑک پر میلوں لمبا ٹریفک جام دیکھا تھا جس میں واپسی کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ آئی کن نے چائے ختم کی تو ہم روانہ ہوئے اس دوران میں بیتو نے موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ خریداری کرلی تھی اس نے بھیڑ کے بالوں سے بنا ایک کمبل لیا تھا۔ یہ زمین پر بچھانے کے لیے بہترین چیز تھی۔ اس کے علاوہ اس نے شہد اور آٹے سے بنی ٹکیاں بھی لی تھیں۔ اس نے مجھے آگاہ کیا۔

”شوبی بہت مزہ کا ہوتا ہے۔“

میں نے چکھ کر دیکھی واقعی ذائقہ اچھا تھا۔ یہ محفوظ خوراک تھی۔ ہم اسے بعد میں استعمال کرسکتے تھے۔ پندرہ منٹ بعد لینڈ کروزر بائیں طرف اوپر جانے والی ایک سڑک پر گھومی۔ درحقیقت یہ شملہ سے آنے کی صورت میں دائیں طرف پڑتی۔ سڑک پر آتے ہی عام سڑک اور ہائی وے کا فرق سامنے آگیا تھا۔ یہ عام سے بھی گئی گزری سڑک تھی جو اصل میں پہاڑوں کے اوپر کے کچھ گاؤں دیہات کو ہائی وے سے ملاتی تھی۔ اس میں جابہ جا کجی اور ناہمواری تھی۔ جیپ اچھلتی اور ساتھ ہی ہم بھی اچھلتے تھے۔ آغاز میں بیتو اس ورزش سے خوش تھا اسے مزہ آرہا تھا مگر جب یہ خود کار ورزش مستقل جاری رہی تو وہ بیزار ہوگیا میں پہلے ہی بیزار بیٹھا تھا۔ بیتو نے شکوہ کیا۔ ”شوبی یہ کس مصیبت میں پڑ گیا ہے۔“

میں نے آئی کن کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔ ”ایک گھنٹے کا راستہ ہے۔“

میں نے بیتو کو تسلی دی۔ ”بس ایک گھنٹا برداشت کرلو پھر ہم اسی سڑک پر ہوں گے۔“

”ہمارا دل چاہ رہا ہے پیدل چلا جائے۔“

سچی بات ہے خود میرا بھی یہی دل چاہ رہا تھا ایک تو جھٹکے، اوپر سے رفتار اتنی تھی کہ میں اتر کر اس سے زیادہ تیز چل سکتا تھا۔ آئی کن نے تسلی دی۔ ”بس یہ ٹکڑا خراب ہے آگے اچھی سڑک ملے گی۔“

دس منٹ بعد اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور سڑک اس حد تک بہتر ہوگئی کہ اب ہم اچھل نہیں رہے تھے لیکن وائبریٹ کے انداز میں ہل ضرور رہے تھے۔ اس ایکسرسائز نے بھوک جگا دی تھی مگر یہ کھانے کا وقت نہیں تھا۔ ہمیں پانی کا خیال نہیں رہا تھا مگر آئی کن کے پاس ایک بڑی بوتل تھی جس میں اس نے راستے میں آتے ہوئے ایک پہاڑی چشمے کا پانی بھر لیا تھا۔ ہم یہی نوش کررہے تھے۔ ایک بجے ہم دوبارہ ہائی وے پر تھے اور یہاں سے کنور پیلس اب ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ وہاں پہنچ کر کسی ایسی جگہ مورچہ جمانا ہے جہاں سے بیک وقت آس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاس اور سڑک پر نظر رکھی جاسکے۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ میرے پاس دوربین بھی ہونی چاہیے تھی جس سے میں دور سے نظر رکھ سکتا تھا لیکن یہ خیال مجھے یہاں آرہا تھا جہاں دوربین تو کیا کوئی عام چیز بھی ملنا مشکل تھی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے جہاں دکانیں اور چیزیں نایاب تھیں۔

بہر حال اب تو بھول ہوگئی تھی اور مجھے دوربین کے بغیر گزارا کرنا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ آئی کن کو کہاں روکا جائے جب وہ بہ وقت ضرورت فوری دستیاب ہو۔ اگر میں اسے ساتھ رکھتا اور مار دھاڑ ہوتی تو وہ بدک جاتا اور اس کے بعد اسے بھی گن پوائنٹ پر رکھنا پڑتا... اور مجھے ایسی باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی جب مجھے کسی عام فرد کو اپنے ساتھ زبردستی رکھنا پڑتا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ میری وجہ سے کسی غیر متعلقہ فرد کو تکلیف نہ ہو دوسری صورت میں مجھے خود خاصی کوشش اور خود پر جبر کرنا پڑتا تھا۔ سنکاری کا معاملہ ابھی تک انکا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ تفتیش کے رگڑے میں نہ آئے۔ وہ میرے بارے میں تو پھوٹ دیتا ساتھ ہی وہ خود میرا ساتھ دینے پر مارا جاتا۔ بھارتی ایجنسیوں سے کسی خیر کی توقع نہیں تھی، یہ اپنے لوگوں کے حق میں کتنے سفاک ہوتے ہیں میں دیکھ چکا تھا۔ اس کا پورا امکان تھا کہ سنکاری ہمیشہ کے لیے غائب ہوجاتا۔

مسئلے مسائل خاصے زیادہ تھے اور میرا ٹارگٹ سادی کو واپس لے کر جانا تھا۔ بلکہ پرائم ٹارگٹ سادی کو کنور پیلس میں جانے سے روکنا تھا۔ ایک بار وہ وہاں چلی جاتی تو اسے نکالنا تقریباً ناممکن ہوجاتا۔ کنور پیلس میں رہ کر مجھے وہاں کی سیکورٹی کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا۔ اس جگہ کی سیکورٹی شاید ملک کے صدر یا وزیراعظم کی رہائش گاہ جتنی تھی۔ دیکھا جائے تو صرف دو افراد کے ساتھ یہ کام مشکل سے بھی زیادہ مشکل تھا۔ مگر مجھے اللہ اور اپنے زورِ بازو پر بھروسا تھا۔ آئی کن پوری توجہ سے ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ بلاشبہ اچھا ڈرائیور تھا اور اس پہاڑی علاقے سے اچھی طرح واقف بھی تھا۔ کنور پیلس کے آس پاس کوئی ایسی آبادی یا جگہ نہیں تھی جہاں وہ رک سکتا۔ سڑک کے ساتھ رکے رہنا بھی مناسب نہیں تھا اور سڑک سے ہٹ کر گاڑی چھپانے کے لیے اسے قائل کرنا پڑتا اور میرے پاس اس کا وقت نہیں تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اسے بھی وہی انجکشن دینا ہوگا جو راج کنور اور سنکاری کو دیا تھا۔

پون گھنٹے بعد ہم اس جانی پہچانی سڑک پر تھے جو کنور پیلس کی طرف جاتی تھی۔ سڑک ایک پہاڑ کے ساتھ گزرتی تھی جو اصل میں کنور پیلس کے سامنے تھا اور اس تک جانے کے لیے اس سڑک کو ایک پل کی مدد سے اس ڈھلان سے ملایا گیا تھا جس پر کنور پیلس آباد تھا۔ یہ اس ہموار ڈھلان والے پہاڑ کا نچلا حصہ تھا جہاں کنور پیلس تھا اور وہ جگہ خاصی اوپر تھی جہاں کنور پیلس سے شروع ہونے والی خفیہ سرنگ جا کر نکلتی تھی۔ میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے سڑک پل سے کنور پیلس سے ملتی تھی۔ یہاں بلندی سے میں بیک وقت کنور پیلس اور ہائی وے سے مڑنے والی گاڑیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ اسی جگہ مورچہ لگا کر ہم سادی کو لانے والوں کو روک سکتے تھے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ اسی سڑک پر آگے سفر جاری رکھے۔ کنور پیلس کی طرف جانے والے پل کے پاس سے گزرنے کے بعد یہ سڑک اچانک ہی خستہ حال اور عام سی ہوگئی تھی۔ وجہ صاف ظاہر تھی پہلے سڑک کنور پیلس تک جارہی تھی اور اس کا معیار ہائی وے جیسا تھا۔ اس سڑک سے کئی کچے راستے دائیں بائیں نکل رہے تھے۔ مگر یہ خاصے دور تھے۔ ہم واپس آئے اور میں نے ایک کچے راستے کی طرف اشارہ کیا۔

"تم اس پر گاڑی لے جاسکتے ہو؟"

"کیوں لے جائے؟" اس نے اعتراض کیا تو میں نے گہرا سانس لیا اور لیپ ٹاپ والا بیگ کھولتے ہوئے اسے گاڑی روکنے کا حکم دیا اس بار اس نے تعمیل کی۔ میں نے سرنج میں انجکشن بھرنا شروع کیا تو اس نے اگلا سوال کیا۔ "یہ کس کے لیے ہے تم بیمار ہو؟"

"نہیں..... بیمار تم ہو، تمہیں سوالات کرنے کی بیماری ہے.... بیتو۔"

بیتو نے اسے عقب سے ہاتھ ڈال کر گردن سے جکڑ لیا اور میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر سیدھا کیا اس کا جسم مزاحمت کے لیے سخت ہوا تو نس خود بہ خود ابھر کر سامنے آگئی۔ میں نے اس میں سوئی داخل کی اور ساری دوا اس کے جسم میں انجکٹ کردی۔ چند منٹ بعد اس کا جسم خود ڈھیلا پڑ گیا۔ بیتو نے اسے چھوڑ دیا اور وہ آنکھیں جھپکانے لگا۔ میں نے دس منٹ پورے ہونے کا انتظار کیا اور پھر اس سے کہا۔ "تم اب وہی کرو گے جو میں کہوں گا۔"

"یس سر۔" اس نے سر ہلایا۔

"تم ایک بیتی بھگوڑے ہو۔"

"ہاں میں بھگوڑا ہوں۔"

"تم انڈین پٹھو ہو۔"

اس بار بھی اس نے اقرار کیا۔ میں نے کئی ایسی باتیں اس کی زبان سے کہلوائیں جو وہ نارمل حالت میں کسی صورت نہیں کہہ سکتا تھا۔ بیتو بہت انجوائے کررہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "شوبی کمال کا دوا ہے ہم کو دینا واپس جا کر ہم بھی انجوائے کرے گا۔"

"وہ کیسے؟"

"ایک سفید بھائی کو لگائے گا پھر وہ ہمارا ہر بات مانے گا اور ایک مانی کو لگائے گا وہ گیم میں بے مانی کرتا ہے۔ ہم اسے بے مانی نہیں کرنے دے گا۔"

بیتو نے اچھا استعمال سوچا تھا مگر یہ واپسی کے بعد کی بات تھی اور ممکن ہے مونا اور باقی خواتین بھی فرمائش کر دیتیں کہ انہیں بھی انجکشن فراہم کیے جائیں تاکہ شوہر کم سے کم چوبیس گھنٹے کے لیے ان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ فی الحال یہاں کے مسائل زیادہ اہم تھے۔ اس بار میں نے آئی کن کو لینڈ کروزر اس کچے راستے پر چڑھانے کا حکم دیا تو اس نے بلاچون وچرا حکم کی تعمیل کی تھی۔ راستہ گاڑیوں کے لیے نہیں تھا مگر اوپر تنگ ہونے سے پہلے ایک جگہ کسی قدر ہموار ہوا تھا اور یہاں گاڑی کو ہینڈ بریک لگا کر اور پھر اس کے پہیوں کے نیچے پتھر رکھ کر روک دیا گیا تھا۔ نیچے سے گزرنے والوں کی نظروں سے بچانے کے لیے جھاڑیاں کاٹ کر اس کے عقبی حصے پر پھیلا دی تھیں۔ ہم ان کاموں سے آدھے گھنٹے میں فارغ ہوگئے۔ میں نے آئی کن سے کہا کہ وہ گاڑی میں رکے اور ہوشیار رہے۔ میں اور بیتو اسلحے والا بیگ اٹھا کر روانہ ہوگئے۔ ہم نے سڑک پر آنے کے بجائے اوپر پہاڑ سے گزرنے کو ترجیح دی اور یہ آسان کام نہیں تھا۔

یہاں راستہ نہیں تھا۔ پتھروں، درختوں کی ابھری جڑوں اور سرکتی مٹی پر پاؤں رکھ کر آگے جانا پڑ رہا تھا۔ ایک جگہ گول پتھروں کا ڈھیر تھا اور بیتو نے اس پر پاؤں رکھا تھا کہ اسکیٹ کرتا ہوا نیچے جانے لگا۔ میں نے بروقت اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ یہ بیتو کی بے پروائی تھی ورنہ وہ خود پہاڑوں کا پلا ہوا تھا اسے معلوم تھا کہ یہاں کیسے سفر کیا جاتا ہے میں نے کسی قدر سخت لہجے میں کہا۔ "دیکھ کر، ابھی ہم کسی چوٹ کے چکر میں نہیں پڑ سکتے۔"

"سوری شوبی اب دیکھ کر چلے گا۔" اس نے ندامت سے کہا۔ "جب ہم چھوٹا تھا تو اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا گول پتھر پر چڑھ کر پھسلتا تھا، پھر گرتا اور چوٹ لگتا تو گھر

واصل بن عطا

نام واصل بن عطا، لقب الغزل، مدینہ میں 699ء-70ھ میں پیدا ہوئے۔ وہاں سے بصرہ چلے گئے اور حسن البصری کے اصحاب میں شامل ہوئے۔ ان کی زوجہ عمر بن عبید ابوعثمان کی بہن تھیں۔

آپ نے کہا کہ جو مسلمان گناہ کرتا ہے وہ مسلمان نہیں رہتا بلکہ کفر کے قریب تر چلا جاتا ہے۔ آپ کے خیال میں صحابی کا قتل بھی کفر ہوگا۔ آپ علم کلام کے عالم تھے۔ احکام شرعیہ کی بھی تقسیم کی اور کہا کہ حق برحق کے ثبوت کے چار طریقے ہیں۔ قرآن ناطق، حدیث متفق علیہ، اجماع امت اور قیاس۔ آپ نے کہا کہ نسخ صرف "اوامر ونواہی" میں ہی ہوسکتا ہے۔ اصول فقہ میں اسی لیے آپ اولیت کے مستحق ہیں۔

مرسلہ: شاہین عطاری، میرپور خاص

جا کر ماں سے مار کھاتا۔"

"اپنے گھر والے یاد آتے ہیں۔"

"پہلے کم آتا تھا شوبی آپ لوگ کے ساتھ رہ کر ہمارا دکھ کم ہوا تھا پر آج کل بہت یاد آتا ہے۔ سچ ہے ہم یہ جگہ دیکھنے کے واسطے بھی ادھر آیا ہے۔ ہم چھوٹا تھا تب ان پہاڑوں میں پھرتا تھا، ہمارا باپ جانور پالتا تھا وہ ہم کو چار سال کا عمر سے باہر لے جاتا ہم دو تین ہفتے باہر رہتا باپ کے ساتھ۔"

"بس تم دونوں ہوتے تھے؟"

"نہیں گاؤں کا بہت سارا لوگ ہوتا تھا۔ بہت سارا جانور لے کر چراتا تھا۔ جب سردی ختم ہوتی تو ہم یہاں نیچے آتا تھا پر جب کنوروں سے لڑائی ہوا تو ادھر آنا بند کردیا اس کا آدمی ہمارا لوگ مارتا یا جانور کے ساتھ اٹھا کر لے جاتا۔"

کنور پیلس میں تقریباً سارے ملازمین بیتو کے قبیلے کے لوگ تھے جنہیں زبردستی اغوا کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ اکثر کو بچپن میں اغوا کیا گیا تھا اور اب وہ کنوروں کے غلام بن گئے تھے۔ لڑکوں کو تربیت دے کر ملازم اور گارڈ بنایا جاتا تھا جب کہ عورتوں کو محل کے کاموں کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان میں جو خوب صورت ہوتیں وہ ان لوگوں کی ہوس کا نشانہ بھی بنتی تھیں۔

"یہ خاصا بڑا علاقہ ہے اور یہاں اچھی چراہ گاہ دکھائی دے رہی ہے۔ اس سے محروم ہونے کے بعد تم لوگوں نے کیا کیا؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہم پھر دوسرے علاقوں میں جانے لگا مگر وہ بہت دور تھا اور اتنا اچھا بھی نہیں تھا۔ اس پر کنوروں سے ہماری لڑائی ہوئی۔"

"اصل لڑائی تو ہیروں کی کان پر تھی۔"

"ہاں اصل لڑائی اسی پر تھا مگر ہم قبیلے کا عام لوگ سمجھتا تھا کہ کنور ہم کو مویشی چرانے نہیں دیتا ہے اس لیے لڑائی ہے۔"

"ہر جگہ حکمرانوں کا ایک ہی انداز ہے وہ پہلے اپنا مفاد دیکھتے ہیں اور پھر ملک وقوم کا۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"ان لوگوں کو کیا ملا؟" بیتو نے تلخی سے کہا۔ "خود بھی مرا اور ہم کو بھی مروا دیا۔ کیا تھا جو کان کنوروں کو دے دیتا.... اب بھی تو ان کا قبضے میں ہے۔"

"میں نے کہا نا حکمران ہر جگہ اپنے مفاد دیکھتے ہیں ان کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ساتھ اپنی قوم کا بھی بیڑا غرق کر رہے ہیں۔"

"شوبی اگر ہم قبیلے کا سردار ہوتا تو ہم کبھی ایسا نہیں کرتا۔"

"تب تم سردار نہیں ہوتے کیونکہ ایک مخصوص طبقہ سردار ہی اسے بناتا ہے جو اس کے اشاروں پر چلے اور اس کے مفاد کے لیے کام کرے۔"

بیتو نے حسرت سے کہا۔ "شوبی ہم آپ جیسا شخص حکومت کیوں نہیں کر سکتا ہے۔"

"کیونکہ ہم اس مخصوص طبقے کے لیے کام نہیں کریں گے اور وہ ہمیں آنے نہیں دیں گے اور اگر آ جائیں تو ہمارے خلاف سازشیں ہوں گی۔" میں نے کہا۔ سفر کے دوران میں کنور پیلس پر نظر رکھے ہوئے تھا مجھے اس کے وسیع پورچ والی جگہ پر نظر رکھنی تھی لیکن وہ ذرا مغرب کی طرف تھا اور اسے دیکھنے کے لیے ہمیں ذرا آگے جانا تھا۔ یہ اچھا ہی تھا کیونکہ آگے جا کر ہی ہم بیک وقت سڑک اور پیلس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ میں نے اسلحے والا بیگ اٹھا رکھا تھا جب کہ بیتو کے شانے پر وہ بیگ تھا جس میں پہلے اسلحہ تھا اور اب اس میں بیتو کی شاپنگ بھری ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا اس نے کھانے پینے کا سامان لیا ہوگا۔ بالآخر ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سڑک تقریباً سو فٹ نیچے تھی اور یہاں سے نہ صرف پیلس کا بڑا حصہ بلکہ ذیلی سڑک بھی ہائی وے تک دکھائی دے رہی تھی۔

یہاں سڑک ایک کلومیٹر طویل تھی اور اگر کوئی گاڑی اس پر مڑتی تو اسے یہاں تک آنے میں کم سے کم چار پانچ منٹ لگ جاتے کیونکہ یہ سڑک تنگ تھی اور کئی مقامات پر گھوم رہی تھی۔ میں نے ایک جگہ منتخب کی۔ یہ چٹان تھی جو اوپر سے ہموار ہو گئی تھی۔ اس کی جڑ میں سامان رکھا جا سکتا تھا۔ اس کے یہاں سے لڑھکنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ جب کہ چٹان سے نیچے کا نظارہ اچھی طرح کیا جا سکتا تھا سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہاں ڈھلان کم تھی اور اگر ہم نیچے جانا چاہتے تو دو منٹ میں پہنچ سکتے تھے۔ بیتو نے اپنا بیگ رکھا تو میں نے پہلی بار اسے دل چسپی سے دیکھا۔ "کیا بھر کر لائے ہو... برخوردار.... کیا کیا ہے اس میں؟"

"شوبی بہت سارا سامان ہے جو کام آئے گا۔" اس نے جواب دیا اور چٹان پر چڑھ گیا۔ "یہاں سے تو سب صاف نظر آ رہا ہے۔"

میں بھی اس کے برابر میں آیا۔ "تبھی اس جگہ کو منتخب کیا ہے۔"

اسی لمحے دو گاڑیاں ہائی سے سڑک پر مڑیں اور میں مضطرب ہو گیا۔ "کاش کہ دوربین ہوتی تو نگرانی میں آسانی ہو جاتی۔"

"کاش کیوں بولتا ہے، ہے نا۔" بیتو نے ہنس کر کہا اور نیچے جھک کر بیگ اٹھا لیا۔ اس نے اس میں سے دو عدد طاقتور دوربینیں نکالیں۔ "یہ لو شوبی۔"

"شاباش۔" میں نے بے اختیار اس کی پیٹھ تھپکی۔ "تم نے آج واقعی کام دکھا دیا۔"

میں نے کہتے ہوئے دوربین آنکھوں سے لگائی۔ یہ واقعی بہت طاقتور دوربین تھی۔ منظر یک دم سمٹ کر آنکھوں میں آ گیا اور تب میں نے دیکھا۔ اگلی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر رامن تھا اس کے ساتھ ڈرائیور کی وردی والا تھا اور گاڑی مرسیڈیز تھی۔ یہ کنور پیلس کی گاڑی تھی کیونکہ اس پر پیلس کا مخصوص نشان تھا۔ اس سے پیچھے والی گاڑی پولیس کی تھی۔ رامن کے سر پر پٹی بندھی تھی لیکن وہ جس طرح بیٹھا تھا لگ رہا تھا اسے کوئی ایسی چوٹ نہیں لگی تھی کہ وہ لیٹ جاتا۔ میرا اندازہ درست تھا اس جیسی ڈھیٹ چیز اتنی آسانی سے دنیا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ مرسیڈیز میں صرف وہی اور ڈرائیور تھا جب کہ پیچھے آنے والی پولیس جیپ میں بھی دو افراد تھے۔ ایک وردی کے نشانات سے انسپکٹر لگ رہا تھا دوسرا ڈرائیور تھا اور شاید کانسٹیبل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ رامن بچنے کے بعد کسی اسپتال تک پہنچا تھا اور وہاں سے اس نے کنور پیلس

رابطہ کیا تھا اسے لینے کے لیے گاڑی بھیجی گئی تھی اور پولیس شاید اسے بہ حفاظت پیلس تک چھوڑنے آ رہی تھی۔ بیتو بھی دوربین سے دیکھ رہا تھا اس نے کہا۔ "شوبی یہ ہم کو حیات لگتا ہے۔"

"وہی ہے لیکن اس کا اصل نام رامن ہے اور یہ را کا سابق ایجنٹ ہے۔ کئی بار مجھ سے ٹکراؤ ہوا لیکن ہر بار بچ گیا۔ آخری بار میں نے اسے ایک کھائی میں گرتے دیکھا تھا اور یہ اس سے بھی بچ کر نکل آیا۔"

"یہ آسانی سے مرنے والوں میں سے نہیں ہے۔" بیتو نے دانت نکالے۔ "شوبی موقع ہے اسے اُڑا نہ دے۔"

"نہیں ہم سادی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں کرنا جس سے اس کی واپسی مشکل ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے جیسا آپ کہے۔" بیتو نے سعادت مندی سے کہا۔ وہ میرے ساتھ خوش تھا اور کسی قدر شوخ ہو رہا تھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میں نے کچھ دیر پہلے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی۔ حالانکہ وہ میری ڈانٹ ڈپٹ کا بھی برا نہیں مناتا تھا بلکہ فوراً سرِ تسلیم خم کر لیتا تھا۔ پھر وہ کبھی اپنی ذمے داری سے غافل نہیں ہوتا تھا جیسے ابھی اس نے دوربین لی اور مجھے خیال نہیں آیا۔ میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیسے خیال آ گیا دوربین کا؟"

"ہم وسیم بھائی کے ساتھ رہا ہے۔ وہ ہم کو بتاتا رہا ہے کہ کس مشن کے لیے کیا کیا ہونا چاہیے۔ جب ہم نے سوچا تو ہمارے ذہن میں دوربین اور دوسرا چیزوں کا آیا تھا۔"

کیونکہ اس وقت ہم دوربین سے گاڑیوں کا جائزہ لے رہے تھے اس لیے مجھے دوسری چیزوں کا خیال نہیں آیا تھا۔ چند منٹ بعد گاڑیاں چھوٹا پل کراس کر کے کنور پیلس کے مین گیٹ تک پہنچیں اور انہیں وہاں پوری تلاشی کے بعد اندر جانے دیا گیا تھا۔ گیٹ پر جدید ترین سیکورٹی تھی۔ وہاں یقیناً کیمرے اور ہتھیاروں کی نشان دہی کرنے والے آلات بھی لگے ہوں گے۔ گاڑیاں اندر داخل ہوئیں اور پورچ میں رکیں۔ رامن مرسیڈیز سے اترا تو اسے لنگڑاتے دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پاؤں شاید سخت بینڈیج سے سیدھا باندھ دیا گیا تھا اور وہ اسے اٹھا کر چل رہا تھا۔ رامن اندر چلا گیا اس کے ساتھ انسپکٹر بھی تھا۔ البتہ کانسٹیبل اور مرسیڈیز کے ڈرائیور باہر رہے تھے۔ ان کا اندر کوئی کام نہیں تھا۔ دوربین سے تقریباً چھ سات سو گز دور کا منظر یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے بس دس بارہ فٹ دور ہو۔ میں نے دوربین سے باقی پیلس کا جائزہ لیا۔ مجھے اندر کے گارڈز پہلے سے زیادہ تعداد میں دکھائی دیئے تھے۔ اسی طرح وہاں روشنیوں کا اضافہ ہوا تھا۔ محل کے اندر بھی کئی حفاظتی دیواریں بنائی گئی تھیں اسی طرح خاردار تاروں کا بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔ بڑے کنور نے اپنی اور پیلس کی سیکورٹی میں اضافہ کر دیا تھا۔

بیتو نے چٹان پر کمبل بچھا لیا تھا اور اب اس پر بیٹھنا آسان تھا۔ اس نے بیگ سے منرل واٹر کی ڈیڑھ لیٹرز والی بوتل نکالی۔ اندر ایسی ایک بوتل اور بھی تھی۔ میٹھی ٹکیوں والا شاپر بھی اسی میں تھا۔ میں نے کچھ ٹکیاں نکالیں اور کھانے لگا۔ ڈھائی بج رہے تھے اور سورج اب مغرب کی طرف جھکنے لگا تھا۔ ہم خاصی بلندی پر تھے۔ کنور پیلس تقریباً چھ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ ہم اس سے بھی پانچ چھ سو فٹ اوپر تھے۔ ہوا ہلکی لیکن موسم گرم تھا کیونکہ آسمان بالکل صاف تھا اور دھوپ خاصی تیز تھی۔ آس پاس کی چٹانیں یقیناً گرم ہو رہی تھیں لیکن یہ چٹان جس پر ہم تھے آڑ میں تھی اس لیے یہ ٹھنڈی تھی۔ بیتو نے کہا۔ "آپ سو جاؤ ویسے بھی اتنا نہیں سویا ہم سو لیا تھا۔"

"ٹھیک ہے لیکن تم ہوشیار رہنا۔" میں نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"آپ فکر نہ کرو۔" بیتو نے اطمینان دلایا۔

"مجھے ساڑھے چار بجے لازمی جگا دینا۔" میں نے کہا۔

"ہم جگا دے گا۔"

میں لیٹا اور اعصابی کشیدگی کے باوجود چند منٹ میں سو گیا۔ اس کی وجہ تھکن اور بے آرامی تھی۔ گزشتہ صبح سے مسلسل حرکت میں تھا۔ اس دوران میں کئی سو میل کا فضائی اور زمینی سفر کیا تھا۔ دو ملکوں کی سرحد دو بار کراس کی تھی، ایک ہیلی کاپٹر کریش میں بچا اور ایک خونی معرکہ لڑا تھا اور پھر آرام کا موقع نہیں ملا تھا اس لیے بہت گہری اور بے خبری کی نیند آئی۔ اس کی ایک وجہ بیتو کی موجودگی بھی تھی اس کے ہوتے مجھے زیادہ فکر نہیں تھی اور میں گہری نیند سو گیا۔ دو گھنٹے بعد بیتو نے مجھے ہلایا۔ "شوبی اٹھ جاؤ، ساڑھے چار بجنے والا ہے۔"

میں نے انگڑائی لی اور اٹھ بیٹھا۔ "کچھ ہوا تو نہیں؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"نہیں بس پولیس کا جیپ واپس چلا گیا۔ شوبی یہاں سے کوئی گاڑی بھی نہیں گزر رہا ہے۔"

"شاید یہ سڑک کنوروں نے اپنے لیے مخصوص کی ہوئی ہے۔"

"تو شوبی اگر پلیس سے ہمارا گاڑی دیکھا ہوگا تو ان کو شک نہیں ہوگا؟"

بیتو کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ واقعی اتنی دیر میں یہاں سے کوئی گاڑی نہیں گزری سوائے ان تین گاڑیوں کے اور اگر انہوں نے پلیس سے سڑک کی نگرانی کا کوئی بندوبست کر رکھا ہو تو لازمی ہماری لینڈ کروزر ان کی نظروں میں آئی ہوگی یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کسی بھی ٹیلی لینس کیمرے سے بہ آسانی یہ کام کیا جا سکتا تھا۔ وہ سڑک سے گزرنے والوں کی تصویر بھی بنا سکتا تھا۔ اس طرح کہ گزرنے والوں کو خبر بھی نہ ہو۔ میں نے جلدی سے دوربین نکالی اور اس کی مدد سے پلیس کے ان حصوں کا جائزہ لینے لگا جہاں کیمرا لگایا جائے تو وہ باہر سڑک تک دکھا سکے۔ لیکن ایسے تمام حصوں کا جائزہ لینے کے بعد بھی مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جسے کیمرا قرار دیا جا سکے۔ میں نے دوربین رکھی اور بیتو سے کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ انہوں نے سڑک سے گزرنے والوں کی نگرانی کا بندوبست بھی کر رکھا ہوگا۔ دوسری صورت میں اب تک پلیس کے گارڈز کو حرکت میں آجانا چاہیے تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہا ہے بس ایسے ہی ہمارے ذہن میں خیال آگیا۔"

"یہ سڑک زیادہ بڑی نہیں ہے اور آگے سے بند ہے اس لیے بھی کوئی گاڑی یہاں نہیں آتی ہے بس وہی آتی ہیں جنہوں نے کنور پلیس جانا ہو۔ کنور پلیس کی سیکورٹی بہت زیادہ ہے اس لیے انہوں نے سڑک کی نگرانی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی۔"

"شوبی اب کیا کرنا ہے؟"

"میری بڑے کنور سے بات ہوئی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ سادی چھ بجے تک یہاں آئے گی۔"

"اس نے آپ کو بتا دیا؟" بیتو حیرت سے بولا۔

"ہاں کیونکہ اس کے خیال میں، میں پاکستان میں ہوں۔" میں نے بتایا۔ "پہلی بار میں نے اسے پاکستان سے کال کی تھی اس لیے وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی قید سے آزاد ہو کر پاکستان چلا گیا ہوں۔ اب اتنی جلدی میں واپس بھی آجاؤں گا یہ اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا۔"

"شوبی دشمن کے بارے میں ایسا مت سوچو وہ بھی سوچ سکتا ہے جو آپ سوچ سکتا ہے۔"

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "مُنّے تم تو بڑے سمجھدار ہو گئے ہو۔"

وہ ہنسا۔ "آپ بھی ہم کو مُنّا کہتا ہے سفیر بھائی کی طرح۔"

"دیکھا جائے تو تم ہم سب کے مُنّے ہی ہو۔" میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔

"تب سفیر بھائی ہم سے لڑتا کیوں ہے؟" بیتو نے شکوہ کیا۔

"وہ بس دل لگی کرتا ہے۔ تم یہیں رہو میں ذرا آئی کن کو دیکھ آؤں۔ ایسا نہ ہو جب اس کی ضرورت ہو تو وہ غائب ہو۔"

پانچ بجنے والے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ لینڈ کروزر سڑک پر آجائے تاکہ بہ وقت ضرورت ہم اس سے فوری استفادہ کر سکیں۔ میں اوپر سے ہوتا ہوا اس جگہ پہنچا جہاں جیپ موجود تھی اور آئی کن اس میں محو استراحت تھا میں نے اسے جگایا تو اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ "آپ ..... مجھے نیند آگئی تھی۔"

"اچھی بات ہے اب رات کو ڈرائیونگ کرنا پڑے گی تو تمہیں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔ تم جیپ نیچے لاؤ۔"

ہم نے پہلے جیپ کے ٹائروں تلے رکھے پتھر ہٹائے۔ پھر آئی کن نے انجن اسٹارٹ کیا اور آہستہ آہستہ بریک ریلیز کرتا ہوا لینڈ کروزر کو سڑک پر لے آیا۔ ایک خاص کیفیت میں ہونے کے باوجود اس کی ڈرائیونگ کی صلاحیت پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ میں اس کے برابر میں آکر بیٹھ گیا۔ "چلو اور جہاں میں کہوں وہاں رک جانا۔"

اس نے سر ہلایا اور جیپ آگے بڑھا دی۔ پونے چھ بجے میں نے جیپ ایک ایسی جگہ رکوائی جہاں سے کنور پلیس نظر آنے کا آغاز ہوتا تھا۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ "تم یہیں رکو گے اور جب پستول کے لگاتار تین فائر سنو گے تو تم آگے آؤ گے۔ کیا کہا ہے میں؟"

"میں پستول کے تین لگاتار فائر سنوں گا تو آگے آؤں گا۔" اس نے بغیر کسی خوف یا جذبے کے اظہار کے کہا جب کہ وہ عام آدمی تھا اسے ڈر جانا چاہیے تھا مگر دوا کے زیر اثر وہ سب بھولا ہوا تھا۔

"گڈ بس اس بات کو یاد رکھنا۔" میں نے کہا اور نیچے اتر آیا لیکن سڑک سے آگے بڑھنے کے بجائے میں ذرا اوپر چڑھا اور آگے بڑھنے لگا۔ اس طرح پلیس سے کسی کی نظروں میں آنے کا امکان کم ہو گیا تھا۔ ویسے بھی میں شمال کی طرف والی ڈھلان پر تھا اور سورج مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ اوپر جنگل میں کسی قدر روشنی تھی لیکن جو جگہیں سائے میں تھیں وہاں تاریکی سی آگئی تھی، اس کے مقابلے میں کنور پلیس روشنی میں تھا اور وہاں سے کسی کا دیکھ لینا ممکن نہیں تھا۔ یہاں سے وہ چٹان زیادہ دور نہیں تھی مشکل سے دو سو گز کے فاصلے پر تھی جہاں بیتو اور میں نے مورچہ لگایا تھا۔ آئی کن جس جگہ رکا تھا وہاں سڑک یوٹرن لے رہی تھی اس لیے پلیس کی طرف سے جیپ کا دیکھ لیا جانا ممکن نہیں تھا جب تک کوئی اس موڑ تک نہ آتا۔ ایکشن کا وقت آگیا تھا اس لیے خطرہ تو مول لینا تھا۔ میں اوپر چٹان تک آیا تو چھ بجنے میں دس منٹ تھے۔ میں نے بیتو سے کہا۔ "اسلحہ نکالو اور ہر گن لوڈ کر لو۔"

بیتو اپنے کام میں لگ گیا اور میں نے موبائل نکالا۔ اس پر سگنل تھے۔ کنور پلیس کی وجہ سے اس علاقے میں موبائل نیٹ ورک کوریج تھی۔ میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ کال ملتے ہی میں نے کہا۔ "میں بات کر رہا ہوں۔ تم اپنے موبائل سے بڑے کو کال کرو اور اس سے سادی کا پوچھو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ چھ بجے تک یہاں آجائے گی۔ کال ٹھیک چھ بجے کرنا۔"

"آپ کہاں ہیں؟"

"ایک محفوظ جگہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں چھ بج کر پانچ منٹ پر کال کروں گا۔"

کال کاٹ کر میں نے اسلحہ دیکھا۔ ہم نے بی ایس ایف کے لوگوں کا اسلحہ بھی سمیٹ لیا تھا۔ یہ جی ٹو رائفل تھی۔ اس جرمن ساختہ رائفل کے بے شمار ورژن نکلے تھے۔ ہماری فوج اس کا جی تھری ورژن استعمال کرتی ہے۔ یہ آج بھی دنیا کی چند موثر ترین اسالٹ رائفلوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہر گن کے ساتھ دو فاضل میگزین تھے۔ ان کے علاوہ دو عدد روسی ساختہ اے کے چوہتر رائفلیں بھی تھیں۔ ایک امریکی ساختہ ری پیٹر تھا اور ایک عدد سیون ایم ایم رائفل تھی۔ چار عدد پستول اس کے علاوہ تھے میں نے بیتو کی طرف دیکھا۔ "ہم تو پورا اسلحہ خانہ لیے گھوم رہے ہیں۔"

"صرف اسلحہ خانہ نہیں ہے اور بھی ہے۔" بیتو نے کہا اور دوسرے بیگ سے ایک واکی ٹاکی سیٹ نکالا۔ اب ایسی چیزیں عام ملنے لگی ہیں اور ان کا شمار بچوں کے کھلونوں میں ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں ان کا رکھنا بھی جرم شمار ہوتا تھا اور ہمارے ملک میں تو ریڈیو بھی بغیر لائسنس کے غیر قانونی ہوتا تھا۔ یہ چائنا کے بنے لیکن اچھی کوالٹی کے واکی ٹاکی سیٹ تھے جن کی رینج تقریباً تین سو میٹرز تک تھی اور کھلی فضا میں یہ رینج مزید بڑھ جاتی تھی۔ ان کا سائز ایک عام قسم کے موبائل سیٹ سے بڑا نہیں تھا اور یہ دو عدد پنسل سیل سے کام کرتے تھے۔ بیتو اضافی پنسل سیل بھی لے آیا تھا اور یہ بہت اچھی قسم کے تھے۔ اس نے ایک واکی ٹاکی سیٹ مجھے دیا۔

"اب ہم دور رہ کر بھی بات کر سکے گا۔"

"ان کے علاوہ کیا ہے۔"

اس نے بیگ سے جدید ترین ایل ای ڈی ٹارچ لائٹس نکالیں یہ کئی موڈ پر کام کرتی تھیں۔ یہ سرچ لائٹ بھی بن سکتی تھیں اور عام ٹارچ بھی۔ یہ بھی پنسل سیل سے کام کرتی تھیں۔ رات میں اشارے دینے والی لائٹس جو صرف مخصوص دائرے میں نظر آتی تھیں۔ رسیاں، چاقو، کلپس اور ہکس تھے جو کوہ پیمائی میں بھی کام آتے ہیں۔ ٹارچ بالشت بھر لمبی تھی اور آرام سے جیب میں آسکتی تھی۔ بیتو نے ایک اے کے چوہتر شانے پر ٹانگی اور ری پیٹر لیا۔ ایک پستول اس نے کمر کی بیلٹ میں لگا لیا تھا اور دوسرا سامنے لگایا۔ پھر وہ نیچے اتر گیا۔ اس نے کوئی پچاس فٹ دور جا کر واکی ٹاکی پر زور سے کہا۔

"شوبی ہمارا آواز آتا ہے۔"

"بالکل آتا ہے' واکی ٹاکی کے بغیر بھی آ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "بھائی اس میں سرگوشی میں بات کی جاتی ہے۔"

"اچھا اب ہم آہستہ بات کرے گا۔"

بیتو نے نیچے سڑک پر ایک جگہ مورچہ جما لیا تھا۔ یہ کنور پلیس کی طرف مڑنے والے حصے سے ذرا پہلے تھا۔ میں ہائی وے والے حصے کی طرف دیکھ رہا تھا اور وقفے وقفے سے گھڑی پر بھی نظر ڈال رہا تھا۔ چھ بج گئے تھے اور ابھی تک سڑک کی طرف سے کوئی گاڑی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ بڑے کنور نے چھ بجے کا کہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کے آدمی ٹھیک چھ بجے ہی سادی کو لے کر آتے۔ ان کو تاخیر بھی ہو سکتی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں سادی کو پہلے ہی تو نہیں لے آیا گیا تھا اور بڑا کنور ہم سے جھوٹ بول رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا کہ وہ چھ بجے تک آئے گی۔ یہ خیال خاصا پریشان کن تھا کیونکہ اگر ایسا ہی تھا تو میری ساری پلاننگ ناکام ہوگئی تھی اور اب سادی کو کنور پیلس سے نکالنا ناممکن حد تک دشوار کام تھا۔ سوچنے کے دوران میں وقت بھی دیکھتا جارہا تھا۔ چھ بج کر پانچ منٹ پر میں نے بیتو سے کہا۔ ''اب مجھے مخاطب مت کرنا میں عبداللہ کو کال کرنے جارہا ہوں۔''

''ٹھیک شوبی ہم خیال رکھے گا۔''

میں نے عبداللہ کا نمبر ملایا اور اس نے فوری کال ریسیو کی۔ ''میری اس سے بات ہوئی ہے۔''

''سادی سے.....؟'' میں نے بے ساختہ کہا۔

''نہیں جناب بڑے کنور سے۔'' عبداللہ نے تردید کی۔ ''اس کا کہنا ہے کہ سادی کو لانے میں تاخیر ہورہی ہے مگر وہ آج کے دن ہی کنور پیلس پہنچ جائے گی۔''

''وہ دھوکا دے رہا ہے۔''

''کیا کہہ سکتے ہیں اور وہ کہہ رہا تھا کہ آپ تیار رہیں اسی طرح آپ کو بھی چوبیس گھنٹے میں اس کے پاس پہنچایا جا سکتا ہے۔''

میں نے سامنے کنور پیلس کی طرف دیکھا۔ ''اسے نہیں معلوم کہ میں پہلے ہی یہاں موجود ہوں۔''

''جناب میرا مشورہ ہے ایک.....''

''کہو.....''

''جناب آپ کوئی بھی فیصلہ جلد بازی میں مت کریئے گا۔ بہت سوچ سمجھ کر کنور کے مطالبات ماننے کا فیصلہ کریئے گا۔''

''میں نے بھی یہی سوچا ہے۔ سادی بڑے کنور کی بہن ہے اور وہ بہرحال اس پر ایک حد سے زیادہ سختی نہیں کر سکتا..... خاص طور سے اس حالت میں۔''

''پہلے ہم تصدیق کریں گے کہ سادی اس کے پاس پہنچ گئی ہے اور پھر سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔ فی الحال ہمارے پاس ایک پتا ہے کہ آپ وہاں نہیں ہیں اور آپ کو بڑے کنور تک پہنچنے میں مشکلات کا سامنا ہے۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ وقت لے کر ہم کیا کریں گے؟''

''ہم سب مل کر سوچیں گے جناب۔'' عبداللہ نے جواب دیا۔ ''وسیم پوچھ رہا ہے کہ راج کنور آپ کے ہاتھ سے تو نہیں نکلا ہے؟''

''نہیں تقریباً ہاتھ میں ہے۔''

''اس کا کہنا ہے راج کنور بہت اہم ہے وہی ہمیں کامیابی دلائے گا اس کا ہاتھ میں رہنا ضروری ہے۔''

''میں نے اسے ایک جگہ جمع کرادیا ہے۔ امید ہے دو چوبیس گھنٹے سے پہلے وہاں سے نہیں نکل سکے گا اور اگر میں کامیاب رہا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہوگی لیکن خدانہ خواستہ میں ناکام رہا تو پھر میں اسے وہاں سے حاصل کرلوں گا۔''

''بڑے کنور نے کوئی وقت نہیں دیا ہے اس نے کہا ہے کہ اس نے میرا نمبر نوٹ کرلیا ہے اور وہ سادی کے آنے پر مجھ سے رابطہ کرے گا۔ میں نے اس سے وسیم بن کر بات کی تھی۔''

''تم نے ٹھیک کیا..... وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا؟''

''ہاں میں نے کہا کہ اس سفر کے دوران آپ زخمی ہوئے ہیں اور آپ کی صحت ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔'' عبداللہ بتاتے ہوئے ہنسا۔ ''اس کا تشویش سے برا حال ہو گیا تھا۔''

''ہاں اس وقت میرے ماں باپ سے زیادہ اسے میری صحت کی فکر ہے۔ میں اس کے لیے قربانی کا بکرا جو ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اوکے میں پھر کال کروں گا۔''

''اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں آپ کو کال کرلوں؟''

''ہاں لیکن کوشش کرنا صرف انتہائی ایمرجنسی میں کال کرو۔''

میں نے کال کاٹ کر موبائل کو وائبریٹ پر کرلیا تاکہ عبداللہ یا کوئی کال کرے تو کہیں کسی غلط موقع پر یہ بج کر معاملہ نہ خراب کردے۔ اس موبائل کی بیٹری بھی لانگ لائف تھی ایک بار چارج ہونے کے بعد یہ اب تک چل رہی تھی اور اس کے آدھے سیل ابھی باقی تھے۔ کال کے دوران میں سڑک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا اور اب تک کوئی گاڑی نہیں آئی تھی۔ بڑے کنور کے مطابق سادی کی آمد میں تاخیر ہورہی تھی۔ رات ہوجاتی تو ہمارے لیے مشکل ہوسکتی تھی کہ تاریکی میں شکل کیسے نظر آتی اور آنے والی گاڑی میں سادی کے ہونے یا نہ ہونے کا کیسے پتا چلتا۔ ساڑھے چھ بجے کے بعد یہاں تاریکی چھانا شروع ہوجاتی اور سات بجے تک باقاعدہ طور پر ماحول تاریک ہوجاتا۔ ابھی میں سوچ رہا تھا کہ واکی ٹاکی سے بیتو کی ہلکی سی آواز آئی۔

''شوبی.....''

میں نے چونک کر بٹن دبایا۔ ''ہاں.....''

''آپ کا بات ہوا؟''

''ہاں ہوئی ہے وہ ابھی تک نہیں آئی ہے۔'' میں نے سادی کا نام لیے بغیر کہے۔ ''اب اس پر نام مت لینا..... یہ عام فریکوئنسی پر کام کرتا ہے اور جس کے پاس ایف ایم ریڈیو ہو وہ ہماری بات سن سکتا ہے۔''

''اب نام نہیں لے گا۔''

''اس کا استعمال بھی کم سے کم کرو۔'' میں نے دوسرا مشورہ دیا۔ ''اوپر آؤ تم سے بات کرنی ہے۔''

بیتو چند منٹ بعد میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے عبداللہ سے ہونے والی گفتگو کا خلاصہ سنایا اور پھر کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے اگر کسی گاڑی میں سادی کو لایا گیا تو ہم اسے کیسے روکیں کہ اس سے نقصان نہ ہو میرا اشارہ سادی کی طرف ہے؟''

''ہم گاڑی کو ناکارہ کردے گا اور پھر سادی کے ساتھ آنے والوں کو اُڑا دے گا۔''

میرے ذہن میں بھی یہی تھا مگر پلان کی بات اور ہوتی ہے اور جب اس پر عمل کیا جاتا ہے تو بات اور ہوجاتی ہے۔ امکان یہی تھا کہ سادی کو ایک گاڑی میں دو تین افراد کے ساتھ لایا جائے گا کیونکہ بڑے کنور کے خیال میں پاکستان جا چکا تھا اور سادی کے لیے زیادہ سیکورٹی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن ہم سادی کو چھڑانے کی کوشش کریں گے تو یہ دو تین افراد بھی مسلح مزاحمت کریں گے۔ گولیاں چلیں گی اور اس میں نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسے گولی لگے گی اور کون بچ نکلے گا؟ سادی گاڑی میں ہوگی۔ ہماری کارروائی سے اسے نقصان ہو یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہم فول پروف پلان بنائیں اور گاڑی کو اس طرح روکیں کہ رکنے والوں کو شک نہ ہو۔ مجھے اچانک خیال آیا۔ میں نے بیتو سے کہا۔ ''جا کر آئی کن سے پوچھو کہ اس کے پاس کیلیں ہیں؟''

''اگر اس کے پاس کیل نہ ہوا تو؟'' بیتو نے متبادل حالت کا پوچھا۔

''تب تم اس کے ساتھ جا کر پیچھے والے قصبے سے کیلیں لے کر آؤ جن کے سرے چپٹے ہوئے ہیں اور یہ موٹے ریڈیل ٹائر بھی پنکچر کرسکیں۔ قصبہ یہاں سے آدھے گھنٹے کی مسافت پر ہے تم دونوں ایک گھنٹے میں آسکتے ہو۔''

''آئی کن کہاں ہے؟''

میں نے جگہ بتائی جہاں آئی کن تھا بیتو اپنا بڑا اسلحہ چھوڑ کر روانہ ہوگیا۔ دو منٹ بعد مخالف سمت سے جیپ نمودار ہوئی اور تیزی سے ہائی وے کی طرف چلی گئی۔ عبداللہ سے بات کرکے مجھے امید ہوئی تھی کہ بڑا کنور اگر دھوکا نہیں دے رہا تھا تو سادی کی جلدی آمد کی امید نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں نے نگرانی جاری رکھی۔ ہوسکتا تھا کہ میرا اندازہ غلط نکلتا اور سادی جلدی آجاتی۔ اس صورت میں میں نے سوچ لیا کہ میں اکیلا کارروائی کروں گا اور گاڑی کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ میرے پاس سائلنسر لگا پستول تھا اور اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ ساڑھے چھ بجے تک نیچے سڑک سائے میں آگئی تھی اور جنگل والا حصہ تو خاصا تاریک ہوگیا تھا۔ کچھ دیر جاتی تو مکمل تاریکی چھا جاتی۔ میرے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہی مناسب موقع تھا۔ اگر تاریکی چھا جاتی تو گاڑی میں سادی کی موجودگی کا پتا چلانا اسی وقت ممکن تھا جب گاڑی کے اندر روشنی ہو۔ دوسری صورت میں مجھے ہر گاڑی روکنا پڑتی اور میں اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ایک بار غلط گاڑی روکنے پر جنگ چھڑ جاتی جس کے بعد مجھے یہاں سے نکلنا پڑتا۔

اسی ادھیڑ بن میں وقت سرک گیا اور سورج پہاڑوں کے پیچھے چلا گیا، اس کے چند منٹ بعد اتنی تیزی سے تاریکی چھائی کہ جہاں میں تھا وہاں چند گز کے بعد کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ اب اوپر ٹکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے سامان سمیٹا اور اسے لے کر سنبھلتا ہوا نیچے اس جگہ آیا جہاں بیتو نے مورچہ بنا رکھا تھا۔ اب ہمیں ایسی جگہ مورچہ بنانا تھا جہاں سے براہِ راست ہائی وے سے آنے والی گاڑیوں پر نظر رکھ سکیں اور انہیں خاصا پہلے دیکھ لیں۔ یہ جگہ مجھے مناسب نہیں لگی تھی اس لیے میں ہائی وے کی طرف روانہ ہوگیا۔ سڑک بھی تاریکی میں آگئی تھی اور دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس لیے میں نے سڑک پر ہی سفر کیا اور بالآخر اس کے آخری حصے تک جا پہنچا جہاں ہائی وے کے بعد تقریباً دو سو گز تک سڑک سیدھی تھی اور ہائی سے گاڑی مڑتے ہی نظر میں آجاتی۔ میں دل میں دعا کررہا تھا کہ بیتو پہلے آجائے۔

میری دعا قبول ہوئی اور آئی کن کی گاڑی ساڑھے سات بجے واپس آئی اور جب وہ پاس پہنچی تو میں سڑک پر آگیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئے اور بیتو نیچے اتر آیا۔ ''شوبی آپ یہاں کیوں آیا؟''

''وہ جگہ رات میں بیکار ہے۔ اب ہمیں یہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

مور چہ لگانا ہوگا۔ تم کیلیں لائے؟"

"بالکل ویسا مل گیا جیسا آپ نے بولا تھا۔" اس نے ایک ڈبا نکالا۔ اس میں پچیس پیسے کے سکے کے برابر چپٹے سرے والی ڈیڑھ انچ لمبی کیلیں تھیں۔ سوائے غیر معمولی بڑے ٹائروں کے یہ ہر ٹائر کو پنکچر کر سکتی تھیں۔ میں نے آئی کن سے کہا۔ "تم واپس جاؤ اور ہائی وے پر دائیں طرف مڑ کر تقریباً سو گز کسی جگہ رک جاؤ۔" میں نے اسے واکی ٹاکی سیٹ دیا۔ "اسے آن رکھنا اور جب ہم کوئی بات کریں تو یہ بٹن دبا کر تم جواب دے سکتے ہو۔"

"میں سمجھ گیا۔" اس نے واکی ٹاکی لیا اور جیپ موڑ کر چلا گیا۔

"آپ نے ہائی وے پر کیوں بھیجا۔ وہ دور ہے اس کا ضرورت پڑا تو.....؟"

"پیلس کے سامنے سے بار بار گزرنا ٹھیک نہیں تھا اور ابھی ہم یہاں کیلیں بچھائیں گے ایسا نہ ہو کہ ہماری گاڑی ان کا شکار ہو جائے اس لیے اس کو ہائی وے پر رکھا ہے۔ دور نہیں ہے واکی ٹاکی سے ہم اسے فوراً بلا سکتے ہیں۔"

بیتو مطمئن ہو گیا۔ "کیل کدھر بچھانا ہے؟"

میں نے جگہ سوچ لی تھی یہ ہائی وے سے کوئی سو گز اندر تھی اگر یہاں سے گزرتے ہوئے گاڑی پنکچر ہوتی تو وہ رکتے رکتے بھی اس جگہ آ جاتی جہاں میں نے مور چہ لگانے کا سوچا تھا اور گاڑی کے رکتے ہی ہم دھاوا بول دیتے۔ میں اور بیتو سڑک کے اس حصے میں آئے یہاں سڑک تقریباً بائیس یا چوبیس فٹ چوڑی تھی۔ میں اور بیتو اس طرح کیلیں بچھانے لگے کہ گاڑی کا دایاں ٹائر ان سے بچ کر نہ گزر سکے بائیں ٹائر کی طرف اس لیے نہیں بچھائی کہ اس کے برسٹ ہونے کی صورت میں گاڑی بائیں طرف کی کھائی میں اتر سکتی تھی اور یہ کھائی خاصی گہری تھی۔ ڈبے میں کوئی دو سو کیلیں تھیں اور یہ بیتو کو قصبے کے ہارڈ ویئر کی دکان سے بہ آسانی مل گئی تھیں۔ آنے جانے میں پون گھنٹا لگا تھا اور بیتو نے ایک کام بھی کیا تھا کہ اس نے تھرماس لے کر وہاں ایک ہوٹل سے چائے بھروالی تھی۔ ساتھ ہی وہ پراٹھے اور آلو کی ترکاری بھی لے آیا تھا اس سے پیٹ بھر سکتا تھا۔

"اس وقت ہم یہ نہیں کھا سکتے ابھی چاق چوبند رہنے کی ضرورت ہے۔"

"شوبی ہم رہ سکتا ہے۔" اس نے یقین دلایا۔ "آج ہمارا بھوک کھل گیا ہے۔"

کیلیں بچھا کر ہم واپس آئے تو بیتو کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے ہاتھ روک کر کھایا حالانکہ پراٹھے گرم اور ترکاری بہت لذیذ اور ہلکی سی چٹ پٹی تھی۔ دونوں چیزیں سرسوں کے تیل میں پکی ہوئی تھیں۔ ڈنر کر کے ہم نے چائے پی۔ بیتو کاغذی کپ بھی لے آیا تھا۔ آٹھ بج رہے تھے اور تاریکی ہوتے ہی سردی میں اضافہ ہونے لگا تھا مگر یہ اضافہ ایسا نہیں تھا کہ ہم ٹھٹھرنے لگتے۔ بیتو نے کہا۔ "شوبی ہم گھاس جمع کرے یہ سردی سے بچاتا ہے۔"

ان پہاڑوں پر جا بہ جا گھاس کے سوکھے پودے کھڑے تھے۔ یہ گھاس بارش میں اگ آتی تھی اور جب چند دن بارش نہیں ہوتی تو پودے کھڑے کھڑے سوکھ جاتے تھے۔ بیتو ان کی بات کر رہا تھا کہ انہیں جمع کر لے۔ یہ بہت گرم ہوتے ہیں اور ان کا بستر بنا لیا جائے تو یہ سردی سے محفوظ رکھتا ہے۔ میں نے منع کیا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے ہمیں آرام نہیں کرنا ہے ہوشیار رہنا ہے۔ اس کے لیے یہ سردی اچھی ہے۔"

"ہم ہوشیار ہے۔ آپ کے آرام کا کہہ رہا ہے۔"

"نہیں یار واپس جا کر ایک ہی بار آرام کریں گے۔" میں نے کہا اور اپنی رائفل چیک کرنے لگا۔ اس کا میگزین اور دوسرے پارٹس ٹھیک حالت میں تھے۔ پھر میں نے سائلنسر والا پستول کھول کر صاف کیا کیونکہ یہ پانی میں بھیگا تھا۔ صفائی کے لیے اپنی شرٹ استعمال کی تھی۔ مجھے امید تھی کہ ضرورت کے وقت یہ ٹھیک کام کرے گا۔ بیتو سڑک پر تھا، اچانک ہائی وے کی طرف سے روشنی لہرائی اور ہم چوکنا ہو گئے۔ بیتو ذرا آگے جانے لگا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔ "بیتو واپس آؤ۔"

"شوبی اگر یہ کیل سے بچ گیا تو....." اس نے واپس آتے ہوئے کہا۔

ہائی وے سے مڑنے والی گاڑی کی رفتار خاصی تیز تھی۔ چند سیکنڈ میں وہ اس جگہ پہنچی جہاں کیلیں بچھی تھیں۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(محمد عقیل چٹھہ لاہور کا جواب)

صغیر حسن.....گوجرانوالہ

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں
خورشیدہ اختر.....کامونکی

اپنے نام کے پیمانے سے ناپ نہیں اپنے قد کو
لوگ تو اس میداں میں افضل ہوتے ہوتے ہوتے ہیں
منشی صفدر حسین گاذر.....لڈن وہاڑی

اتنی فرصت ہی کہاں سوچوں تیرے بارے میں
فکرِ روزی ہے کبھی فکرِ ہے گھرداری کا
ناصر حسین.....دینہ

اشک بھی روح کی تسکین کا باعث ہوتے
زخم دل وجہ بنائے چمنستاں ہوتا

(محمد عزیز مئے لڈن وہاڑی کا جواب)

سرور امتیاز.....شادی پور

حوالے بحر الفت کر چکے ہم اپنی کشتی کو
نہ طوفانوں کا ڈر ہے اور نہ ارماں ہم کو ساحل کا
نسرین قیصر.....کراچی

حیا وہ لطف جو بزمِ سخن میں ملتا ہے
سرور ایسا کسی اور انجمن میں نہیں
رئیس جعفری.....کراچی

حسیں محفل تھی لیکن بعد ان کے
ہر اک شے پہ اداسی چھا گئی ہے
انور کمال.....لاہور

حق ہم کو رکھے گا شاد آباد
ہم حق پہ رہیں گے ہمیشہ شاکر

(حسن خان کا جواب)

طالب حسین طلحہ.....سینٹرل جیل ملتان

ابر کرم وہ زلف مسلسل باعث رحمت رب تسلسل
ہر اک نصیحت رب کا قاسم صلی اللہ علیہ وسلم

(طالب حسین طلحہ ملتان کا جواب)

ابرار الحسن.....ملتان

یہ سال بھی بیتے گا صدیوں کی طلب بن کر
اس سال بھی آئے گی نہ تیری خبر جاناں

ضیا تسنیم ذولفی.....کراچی

یہ جو ڈوبی ہیں میری آنکھیں اشکوں کے دریا میں
یہ تیرے معصوم چہرے پہ بھروسے کی سزا ہے

ملکہ حیا.....حیدر آباد

یہ ایسا عہد ہے جس کی ہیں مختلف اقدار
ڈسا ہوا یہاں سانپوں کا خود سپیرا ہے

انوار حسن خان.....گوجرانوالہ

یہ ختم وصل کا لمحہ ہے رائگاں نہ سمجھ
کہ اس کے بعد وہی دوریوں کا صحرا ہے

(سلیم کا مریڈ کھاناں کا جواب)

اشرف میمن.....میر پور خاص

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

ناہید افروز.....فیصل آباد

اب کے برس بھی لکھا میں نے اس کے نام کا دیا چہ
جس نے میرے ذکر سے رکھے خالی اپنے باب تمام

خالد فرخ.....سیالکوٹ

ایک خوشبو کی طرح کوچہ روز و شب سے
جو دبے پاؤں گزر جائے وہ سال اچھا ہے

نثار احمد.....کراچی

آسماں بدلا ہے افسوس نہ بدلی ہے زمیں
ایک ہندسے کا بدلنا کوئی جدت تو نہیں

نوشین وٹو.....شیخوپورہ

ارادہ تھا جی لوں گا تجھ سے بچھڑ کر
گزرتا نہیں اک دسمبر اکیلے

(شاکر عطر خان ڈیرہ مراد جمالی کا جواب)

حیات محمد.....سکھر

یاد بھی اب کے آیا ہے اور جاگ اٹھی خواہش بھی ہے
تازہ دکھ اور سرد ہوا ہے سال کی پہلی بارش ہے

انیس فاطمہ.....کراچی

یہ باز آتا نہیں چارہ گری سے
کروں یا رب علاجِ چارہ گر کیا

رہبر منظر.....میر پور آزاد کشمیر

یہی مقام ہے حسرت کا اور امیدوں کا
اسی دوراہے پہ رو رو کے مسکرائیں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

احمد جاوید.........گھوٹکی

یاد ان کی مٹانے کو آئی غم تنہائی
خاموش فضاؤں میں بجنے لگی شہنائی

(اصغر ترمذی، ملتان کا جواب)

رانا حبیب الرحمٰن.........سینٹرل جیل لاہور

عمر صحراؤں میں بسر ہو یہ ضروری تو نہیں
ہر شب غم سحر ہو یہ ضروری تو نہیں

(افشاں سید، کراچی کا جواب)

ناہید اختر.........کراچی

اپنے بازو میں ہے قوت، بینک میں دولت بہت
جیت کے تم کو الیکشن، ایکے دکھلائیں گے ہم

(انتظار حسین، لاہور کا جواب)

ناعمہ تحریم.........ملیر کراچی

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا
کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

تسیم نیازی.........پنڈی بھٹیاں

جاؤں کس در پہ کروں کس سے شکایت اس کی
جو گلا کاٹ رہا ہے وہ میرا بھائی ہے

اشفاق احمد خان.........لاہور

جس نگری میں اپنا من ہے نہ اپنا تن ہے
اس نگری میں زندہ رہنا بھی اک فن ہے

حنا توقیر.........لاہور

جب بھی اک شاخ پہ دو پھول نظر آتے ہیں
دل کے مرجھائے ہوئے زخم ابھر آتے ہیں

(فرزانہ امام کراچی کا جواب)

سلیم کامریڈ.........کھاتاں

ایک دن ساقی یہی ٹوٹے ہوئے جام وسبو
میکدے ترتیب دیں گے تشنگی سے روٹھ کر

(رانا حبیب الرحمٰن لاہور کا جواب)

احمد خورشید.........لاہور

نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے

(ارم نیاز لاہور کا جواب)

فاروق تبسم.........شادی پور

تو نیا ہے تو دکھا صبح نئی شام نئی
ورنہ ان آنکھوں نے دیکھے ہیں نئے سال کئی

(توشین اکرام کلر سیداں کا جواب)

منشی محمد عزیز مئے.........لڈن وہاڑی

یوں تو ہر سمت ترے شہر میں ہنگامہ ہے
اور پھر بھی ہے ہر اک شخص اکیلا جیسے

(نعمان بشیر ٹیکسیلہ کا جواب)

کائنات حزیں.........کراچی

شفا ہو آپ کو غالب کو بند غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو ساز گار برس

(فہد فاروقی ساہیوال کا جواب)

نہال اختر.........کراچی

کون جانے کہ نئے سال میں تو کس کو پڑھے
تیرا معیار بدلتا ہے نصابوں کی طرح

(امجد انیس لاہور کا جواب)

زرین فاطمہ.........فیصل آباد

تیری یاد کی برفباری کا موسم
سلگتا رہا دل کے اندر اکیلے

(افتخار لاہور کا جواب)

محمد عقیل چٹھہ.........حافظ آباد

وصل میں تیرے خرابے بھی لگیں گھر کی طرح
اور تیرے ہجر میں بستی بھی ویرانہ ہمیں

(فرزانہ امام کا جواب)

محمد عمران جونانی.........کراچی

اس دور پر فریب میں پوچھے گا تجھ سے کون
ایماں کا خوں بہا کر صداقت شہید کر

ماجد عزیز.........خان پور

اس دل کی اداسی کا کیا حال سنائیں ہم
صحرا میں بھی تنہائی بستی میں بھی تنہائی

محمد اشفاق.........کراچی

انسانیت ہی زندہ جاوید ہے جہاں میں
خود مٹ چکے ہو پھر بھی انسانیت جلا لو

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

علمی آزمائش 99

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 فروری 2014ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

6 فروری 1893ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ساڑھے 14 سال کی عمر میں احمدی بن گئے۔ حکومت پاکستان کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ 76 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

علمی آزمائش 97 کا جواب

مولانا ابوالکلام آزاد 1305 ذوالحجہ کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ والد نے فیروز بخت نام رکھا تھا۔ کلکتہ میں پلے بڑھے۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں لسان الصدق کے نام سے رسالہ نکالا۔ 1902 میں جب عمر صرف پندرہ سال تھی برصغیر کی سب سے بڑی، مسلمانوں کی تنظیم حمایت الاسلام کے جلسہ میں تقریر کی۔ پھر تو گویا تقریر کے بادشاہ بن گئے۔ 1921 میں پہلی بار سیاسی معاملات پر گرفتار ہوئے۔ برصغیر کے بڑے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ علما کی صف میں بھی مقام تھا۔

انعام یافتگان

1-انعام اختر، لاہور 2-عارف خان، لاہور 3-نادرہ، لاہور
4-اشفاق احمد، کراچی 5- نعمان عزیز، ملتان

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سید عزیز الدین سید عباس رضا رضوی تنویر (کھوکھراپار) شاہد احمد خان، امیر السلام، جمیل عثمانی، اختر بلقیس کوکب، آفاق احمد، آفتاب منصور، اقبال احمد، زینب، نوشین ملک، شاہد احمد، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نعیم اختر، اقبال قریشی، فرقان حمیدی، نعمت مرزا، جاوید اقبال، منظر خان، فیضان انصاری، فیض چانڈیو، ثنا بوتکی، حمنا اختر، فرقان احمد۔ لاہور سے رانا حبیب الرحمن، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سلیم درانی، شاہینہ بتول، چوہدری نیاز، زینت انصاری، نادر خان، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر، ثنا بخاری، کوکب گرویزی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف خان، ابراہیم شاہ، محمد شعبان، نگار ملک، احمد بیگ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے طالب حسین طلحہ، محمد منیب چشتی، (نشیمن ولاز) عقیل احسن، حبیب الرحمن، شمروز، اصغر خان۔ پشاور سے شیر نواز گل (ڈیفنس کالونی) شیر خان، مولانا ریاض محسن، بشیر فاروقی، قاسم جان، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندا ممتاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان عقیل فیضان۔ ڈیرا غازی خان سے ارشاد حسین، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، فہیم الدین۔ ڈیرا اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، نعمان، عدنان، بکٹ گنج مردان۔ ملتان سے زینت خان، عتیق الرحمن، فیض الحسن، قیام خان، شیریں عدنان، زہیب سلطان، نور خان ترمذی، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جہلم سے نعمت اللہ، ابرار شیخ، جاوید محمد خن، تقی عثمان، نیاز حسن، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم، کاظم بیگم، فرحت اللہ، ارتضیٰ حسین، فہیم حسن، عباس۔ حیدرآباد سے زاہد قریشی، رابعہ شیخ، کائنات فاطمہ۔ بہاولنگر سے نوشین خٹک۔ ظفر اقبال اظہر مئے، منشی عزیز مئے لڈن، وہاڑی۔ بہاولپور سے وقار احمد، فراز احسن فاروقی۔ میانوالی سے سہاب خان، ملک انور۔ لیہ سے خاقان الحسن۔ مظفر گڑھ سے ارشد حیات، فیضان عثمانی، عقیل سید، عبادت حسن، قیصر خان، عطا خان، فیروز حسن، اصر محمود، امجد ملکانی، شبیر خان، فہیم وٹو، ماہم حسن۔ بھکر سے فقیر غلام حسین ضیا — اسلام آباد سے جاوید محسن ملک، ذیشان شاہ، سنجیدہ شاہ، انعم بٹ، شاہنواز، جاوید قیصر، ذوالقرنین، فصاحت مرزا، بلال مصطفی، سلام خان، شریف الحسن، نادر خان، صلاح الدین، مرید علی خاکوانی، اسلم خان، بیگم امتیاز علی دستوری، مہر خان، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے ظفر اسماعیل، فتح یاب خان، فتح الدین، قیصر خان، عدنان احمد، عدنان سعیدی، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، حق نواز، امام الدین، بشیر کمال، فیض خان، صالح الرحمن، سید عباس زیدی، عباس مہکری، قاسم جان۔ میر پور خاص سے مرزا طاہر الدین بیگ۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، نور الحسن زیدی نور، فرید خان، ارباب خان، محمد فیضیاب، مستقیم اللہ، متقی کاظمی، عائشہ بختاور، نور فاطمہ، ارباب چنگیزی، فرحت بابر، خاقان عباس، عنایت، اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین، انعام اللہ، مغنی فیض۔ منڈی بہاؤالدین سے زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفی۔ سیالکوٹ سے خورشید اختر، منظر خان، حسن عالم، ارشد حسین، ندا آفاق، جاوید مفطر۔ درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ثناء اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضال میو، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، فہیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔

ممالکِ غیر سے پیر ہدایت شاہ (کویت) عائشہ ممتاز (بریڈفورڈ) عابد علی (دبئی یو اے ای)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

نفسیاتی

محترم معراج رسول
السلام علیکم!
ہم جس معاشرے میں زندہ ہیں وہاں ہر قبیل کے، ہر طرح کے لوگ رہ رہے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ کہ ہم اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ اب غزالہ ہی کی مثال لے لیں کتنی عجیب کیسی انوکھی لڑکی تھی۔ یہ روداد دراصل اسی کی ہے۔ میں تو صرف ایک کردار ہوں۔
مظہر حسین
(کراچی)

وہ میرے سامنے ساکت بیٹھی تھی۔ ہلکے رنگ کے لان سوٹ میں اس کا سراپا ہمیشہ کی طرح دلکش لگ رہا تھا۔ گلابی رنگت اور کھنچی ہوئی ابرو تلے سیاہ چمکتی آنکھیں جن میں ذہانت کی تیزی جھلکتی تھی۔ نازک سی ناک تلے گداز لب تھے۔ وہ بلاشبہ بہت حسین تھی۔ مگر مجھے اس کے حسن نے کبھی متاثر نہیں کیا تھا۔ مجھے ہمیشہ اس کی آنکھوں سے جھانکتی ذہانت نے متاثر کیا تھا۔ میرے ساتھیوں بلکہ ساری یونیورسٹی کا خیال یہ تھا کہ وہ بہت الجھی ہوئی اور بے سمت سی لڑکی ہے۔ ہاں اس کے وجود میں بہت ساری دل چسپی کی چیزیں تھیں۔ لڑکے عام طور سے ان ہی چیزوں میں دل چسپی لیتے تھے۔ مگر اس وقت ہم یونیورسٹی میں نہیں تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا؟''
اس نے لاپرواہی سے شانے جھٹکے۔ ''تم مجھے جانتے تو ہو۔''

☆☆☆

جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تب ہی میں اسے جان گیا تھا۔ یہ سردیوں کے دن تھے اور بیشتر طلبا کلاس چھوڑ کر لان کی دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ تب شمشیر نے میری توجہ دلائی۔ ''جانِ جاناں ذرا دیکھنا اسے۔''

نام میرا مظہر حسین ہے لیکن شمشیر مجھے جانِ جاناں کہتا تھا۔ مشہور شاعر مظہر جانِ جاناں کی نسبت سے۔ ویسے میرا ان سے دور کا رشتہ بھی لگتا ہے۔ خود شمشیر خٹک قوم سے تھا اور خوشحال خان خٹک اس کے شجرہ نسب میں شامل تھے۔ میں نے اس کی بتائی سمت دیکھا۔ وہ بہت بکھرے حلیے میں تھی۔ اس موسم میں اس نے جینز پر ململ کا کرتا پہن رکھا تھا۔ جو اس کے وجود پر ڈھلک رہا تھا اور تناسب کو عیاں کر رہا تھا۔ لان پر موجود تقریباً ہر نوجوان کی نظر کرخت اس پر مرکوز تھی۔ مگر وہ ان نظروں سے لاپرواہ اپنے بکھرے بالوں کو ہاتھوں سے سمیٹنے کی کوشش کر رہی تھی اور جنید شاہ سے چپکی جا رہی تھی۔ جنید شاہ ایک وڈیرے کا بیٹا تھا اور یونیورسٹی میں بھی وڈیرے کا بیٹا ہی بنا رہتا تھا۔ وہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا اور اس کا موضوع صنف نازک تھی۔ وہ اپنے درسِ خاص کی کتاب آئے دن بدلتا رہتا تھا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔

''کون ہے یہ؟''
''نام تو شاید غزالہ ہے لیکن یہاں نفسیاتی کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سمسٹر میں آئی ہے۔''
''مجھے تو یہ نفسیاتی نہیں لگتی۔''
''پھر کیا لگ رہی ہے۔''

''بہت ذہین لگ رہی ہے۔''
میں نے کہا۔ وہ اس وقت جنید شاہ کی ٹولی میں گھری تھی اور کسی بات پر بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ مجھے اس کا یوں بکھرنا اور خود سے لاپرواہ ہونا اچھا نہیں لگا تھا۔ میں اٹھ گیا۔ ''چلو یار پروفیسر صدیقی کی کلاس لینی ہے۔ آج ان کا لیکچر ہے۔''
شمشیر کا موڈ نہیں تھا لیکن میری خاطر اٹھ گیا۔ ہم انگریزی ادب میں تھے۔ میرا فائنل سمسٹر تھا اور شمشیر کا بھی اس سال پاس ہونے کا ارادہ تھا۔ ویسے اسے تعلیم کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کا باپ اسلحے اور منشیات کا بہت بڑا بیوپاری تھا۔ یہ بات شمشیر نے خود بتائی تھی۔ وہ جب بھی اپنی حویلی جاتا تو اسے ڈراؤنے خواب آتے تھے۔ ان خوابوں میں اسے لاشیں اور ایسی زندہ لاشیں دکھائی دیتی تھیں جنہیں منشیات نے جیتے جی مار دیا تھا۔ یہ خواب بچپن سے نظر آتے تھے۔ وہ راتوں کو چیخیں مار کر اٹھتا تو اس کے باپ کو شرمندگی ہوتی تھی۔ اس لیے اس نے شمشیر کو بورڈنگ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کی ساری تعلیم گھر سے دور ہوئی تھی۔ یہاں یونیورسٹی میں بھی وہ ہاسٹل میں رہتا تھا اور چھٹیوں میں بھی گھر نہیں جاتا تھا۔ شمشیر نے کلاس کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے تم ٹھیک کہہ رہے ہو بہت ذہین ہے اس نے پہلی ہی کلاس میں متاثر کر دیا تھا۔''
شمشیر موڈی تھا کبھی دل چاہتا تو پریوس کی کلاسز بھی لے لیتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ماسٹرز کے بعد خوشحال خان خٹک کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ کرے گا۔ ویسے وہ ڈھائی سال سے ماسٹر کر رہا تھا اور اب بھی کہیں اس کا ارادہ فائنل کا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''میں واپس نہیں جانا چاہتا۔ اگر میں نے انگریزی ادب میں ماسٹرز کر لیا تو پھر کسی اور شعبے میں داخلہ لے لوں گا۔''
''ویسے تم چاہو تو داخلہ لینے کے بجائے پڑھا بھی تو سکتے ہو۔''
یہ حقیقت تھی وہ ماسٹرز کر رہا تھا لیکن انگریزی ادب میں اس کی دسترس ماسٹرز لیول سے زیادہ ہی ہو چکی تھی۔ شمشیر مسکرایا۔ ''یہ خیال اچھا ہے نئے بیچ میں آنے والی لڑکیاں بہتر ہیں۔ پرانی تو کسی کام کی نہیں ہیں۔''
''لگتا ہے تم اس سے متاثر ہو؟''
''تو کیا نہیں ہونا چاہیے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''وہ متاثر کرنے کے قابل نہیں ہے؟''
''ہاں ہے تو۔'' میں نے اعتراف کیا۔ میں نے شمشیر سے کہا نہیں کہ مجھے اس نے اوپر سے ہی متاثر نہیں کیا تھا۔ اگر میں یہ بات کہتا تو وہ کبھی یقین نہ کرتا۔ وہ ان ننانوے فیصد مردوں میں سے تھا جو عورت کی ظاہری خوب صورتی سے ہی متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں عورت میں متاثر کرنے کے لیے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ ابھی ہم کلاس میں بیٹھے تھے کہ وہ بھی وہاں آ گئی۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے بال سنوار لیے تھے اور ململ کے کُرتے پر ایک چھوٹا بیگی سوئیٹر بھی لے لیا تھا۔ جینز کی طرح یہ بھی گھسا ہوا تھا۔ لیکچر کے دوران وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ وہ نوٹس نہیں لے رہی تھی جب کہ باقی لڑکیاں تندہی سے نوٹ بک پر قلم چلا رہی تھیں۔ وہ اس کے بجائے کلاس روم کی کھڑکی کے باہر چھجے تلے چھوٹے سے خلا میں چڑیا اور چڑے کو گھونسلا بناتے دیکھ رہی تھی۔ اچانک اس نے ایک چھوٹا سا کاغذ میری طرف پھینکا اور یہ کام اتنی مہارت سے کیا کہ کوئی نوٹ نہیں کر سکا تھا۔ حالانکہ کئی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ میں نے غیر محسوس انداز میں کاغذ اٹھالیا۔ اس پر پنسل سے لکھا تھا۔

"کیا گھونسلا بنانا ضروری ہے؟"

میں نے اس کے نیچے لکھا۔ "افزائشِ نسل کے لیے ضروری ہے۔"

اس نے میرا جواب پڑھا اور بے ساختہ زور سے ہنسی۔ پروفیسر صدیقی کی بھویں تن گئیں۔ وہ اپنی کلاس میں کسی قسم کا شور پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے عینک کے اوپر سے پوچھا۔ "اینی پرابلم بے بی؟"

"نوسر۔" وہ کھڑی ہوگئی۔ "میں غلطی سے یہاں آگئی تھی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

اب ہر نظر اس پر مرکوز تھی۔ اس کے کلاس سے جاتے ہی سب کچھ معمول پر آگیا۔ اس پہلی ملاقات میں، میں نے جان لیا وہ دوسروں کو ڈسٹرب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی تھی۔ میری سیٹ کھڑکی کے قریب تھی کچھ دیر بعد وہ مجھے کلاس کے باہر دکھائی دی۔ وہ چڑیا اور چڑے کی جدوجہد دیکھ رہی تھی۔ اتفاق کی بات تھی اسے صرف میں دیکھ سکتا تھا اور کسی کو نہیں پتا چلا کہ اب وہ کلاس کے باہر کیا کر رہی ہے۔

اس روز جب ہم کلاس سے نکل رہے تھے تو موضوعِ سخن وہی تھی۔ لڑکیوں کا انداز ناپسندیدہ تھا اور لڑکے خوش تھے۔ اگلے روز جب میں اس کلاس میں آیا تو مجھے دھچکا لگا تھا۔ جہاں کل چڑیا اور چڑے نے گھونسلا تقریباً مکمل کر لیا تھا اب وہاں کچھ نہیں تھا اور چڑیا چڑے کو دوبارہ کوشش سے باز رکھنے کے لیے اس خلا میں کاغذ کا گولا بنا کر ٹھونس دیا گیا تھا۔ اسی دن لائبریری میں وہ مجھے دکھائی دی۔ پہلے تو میں اسے نظر انداز کرنا چاہتا تھا مگر پھر نہ جانے کیوں میں اس کی طرف بڑھا اور کرسی کھینچ کر عین اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ آج وہ سادہ نیلے کاٹن کے شلوار سوٹ میں تھی۔ بال سلیقے سے باندھ رکھے تھے اور چہرے پر بھی متانت تھی۔ غصے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن مجھے پھر بھی غصہ آنے لگا تھا۔

"تم نے گھونسلا کیوں اجاڑا؟"

"اگر گھونسلا بن جاتا تو وہ انڈے دیتے۔" اس نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ "پھر وہ فیملی بن جاتے۔"

"تمہیں کیا کہ وہ فیملی بنتے؟"

اس بار اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور سرد لہجے میں بولی۔ "فیملی بننا کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔ اس میں بہت سارے دکھ بھی ہوتے ہیں۔"

اس سے پہلے میں کچھ کہتا وہ اٹھ گئی تھی۔ وہ کلاس لیتی تھی اور لائبریری میں بھی نظر آتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ کینٹین یا لان کے کسی گوشے میں لڑکوں کے ساتھ بے تحاشا ہنستی اور ان سے گھلی ملی بھی نظر آتی۔ جنید شاہ کے بارے میں سب جانتے تھے کہ وہ اوباش آدمی ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عورت ہے اور وہ اسی لیے یونیورسٹی میں آتا تھا۔ لڑکیاں اس کے سائے سے بھی بچتی تھیں اور صرف وہی اس کے قریب پائی جاتی تھیں جو خود کردار کی خراب ہوں۔ غزالہ جنید شاہ کے ساتھ تھی اس لیے اس کا شروع سے تاثر بن گیا۔ لڑکیاں اس سے گریز کرتی تھیں اور لڑکے اس کی قربت کے لیے مرے جا رہے تھے لیکن سب جنید شاہ سے ڈرتے تھے۔ اس نے آس پاس غنڈا فطرت لڑکے جمع کر رکھے تھے۔ وہ اس کی دولت پر عیش کرتے تھے اور اس کے لیے مصاحبوں کا کردار ادا کرتے تھے۔

سارے ڈپارٹمنٹ کا تاثر غزالہ کے بارے میں خراب تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ وہ بہ ظاہر ایسی نہیں تھی جیسی دکھائی دیتی تھی۔ ہمارے پاس معیار انسان کا ظاہری کردار ہے اور یہ کسوٹی بڑی حد تک درست بھی ہوتی ہے۔ انسان جیسا بہ ظاہر دکھائی دیتا ہے تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے لیکن بعض اوقات یہ کسوٹی انسان کو ٹھیک سے پرکھ نہیں پاتی ہے۔ میرا تعلق ایک پڑھے لکھے گھرانے سے تھا۔ ڈیڈی ایک بڑے اخبار میں مینجنگ ایڈیٹر تھے۔ ماما ایک کیمبرج اسکول میں پرنسپل تھیں۔ بڑے بھائی ہاورڈ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور مجھ سے بڑی بہن ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کرنے کے بعد ایک ٹی وی چینل پر ڈائریکٹر تھیں اس لیے مجھ پر بھی لازم تھا کہ کوئی اعلیٰ تعلیمی ڈگری لوں۔ ڈیڈی اور ماما چاہتے تھے کہ میں ایم بی اے کروں لیکن میرا رجحان اس طرف نہیں تھا اس لیے میں نے انگریزی ادب

میں ماسٹرز کرنے کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد میرا ارادہ جرنلزم کو بہ طور مضمون لینے کا تھا۔

ایک ہفتے بعد میں پروفیسر صدیقی کی کلاس میں گیا تو کھڑکی کے باہر موجود خلا سے کاغذ غائب تھا اور وہاں چڑیا چڑے نے گھونسلا بنا لیا تھا۔ یہ یقیناً غزالہ کا کام تھا ورنہ یونیورسٹی اسٹاف کو سرے سے خلا ... کا ہی علم نہیں تھا وہ بھلا کاغذ کہاں سے نکالتے۔ میں کلاس سے نکلا اور غزالہ کو تلاش کرنے لگا۔ وہ کینٹین میں جنید شاہ اور اس کے دو آوارہ گرگوں کے ساتھ موجود تھی۔ وہ حسب معمول کسی بات پر ہنس رہی تھی لیکن مجھے دیکھتے ہی اس کی ہنسی پھیکی پڑ گئی۔ میں میز کے پاس رکا اور آہستہ سے کہا۔ "تھینک یو؟"

"کس بات کا شکریہ ادا کیا جا رہا ہے؟" جنید شاہ کا ایک گرگا معنی خیز انداز میں بولا۔

"ویلکم۔" وہ جلدی سے بولی جیسے چاہ رہی ہو کہ میں وہاں سے چلا جاؤں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کس چیز کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ جنید شاہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ میں آگے بڑھ گیا۔ اس کے کچھ دن بعد ڈپارٹمنٹ والوں نے دیکھا غزالہ جنید شاہ کے بجائے اکیلی تھی اور اس کے چہرے پر مٹتے نیل کا نشان تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ حیدر ممتاز کے ساتھ نظر آنے لگی تھی۔ حیدر ممتاز ایک مخصوص نظریے کا حامی اور اس کا پرچار کرنے والا تھا لیکن لوگ اس کی باتوں پر توجہ کم دیتے تھے۔ اتفاق سے اس کا تعلق بھی اندرون سندھ کے ایک دولت مند سیاسی گھرانے سے تھا۔ شراب اور شباب اس کی زندگی میں بہ طور عیاشی نہیں بلکہ بہ طور نظریے کے موجود تھے۔ اس کے ساتھ رہنے سے غزالہ کی زندگی میں بس اتنا فرق آیا کہ گھسی جینز کے ساتھ کرتہ ململ کے بجائے کھدر کا ہو گیا تھا۔ شمشیر نے کہا۔

"یہ لڑکی ہمیشہ لمبا ہاتھ مارتی ہے لیکن اس کوے کی طرح جو ہمیشہ گندر پر گرتا ہے۔"

میرا خیال برعکس تھا لیکن ایک بار پھر میں نے اسے خود تک محدود رکھا تھا۔ غزالہ وہ نہیں تھی جو بہ ظاہر نظر آتی تھی۔ جب وہ حیدر ممتاز کے ساتھ ہوئی تو اس کے چند دن بعد حیدر ممتاز اور جنید شاہ کا جھگڑا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے عینی شاہدین صرف چند تھے اور ان سب کی کہانیاں الگ الگ تھیں۔ بعض کا بیان تھا کہ جنید شاہ اور اس کے گرگوں نے حیدر ممتاز کو بری طرح مارا تھا اور بعض کا کہنا تھا کہ اکیلے حیدر ممتاز نے ان سب کا جلوس نکال دیا تھا۔ بہرحال اس واقعے کے بعد سوائے غزالہ کے سب غائب تھے اور کئی دن تک وہ یونیورسٹی نہیں آئے تھے۔ جنید شاہ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ اپنے علاقے چلا گیا تھا۔ حیدر ممتاز بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر اطلاع آئی کہ جنید شاہ قاتلانہ حملے میں شدید زخمی ہوا تھا۔ وہ بچ گیا تھا مگر ریڑھ کی ہڈی میں گولی لگنے سے عمر بھر کے لیے مفلوج ہو گیا تھا جب کہ حیدر ممتاز کے خلاف حملے کی ایف آئی آر تھی اور وہ مفرور تھا۔ شمشیر نے یہ خبر سن کر کہا۔ "دو کُتے ہڈی کے پیچھے لڑ مرے۔"

مگر مجھے معاملہ اتنا سیدھا نہیں لگ رہا تھا۔ جنید شاہ اور حیدر ممتاز دونوں پرانے کھلاڑی تھے۔ وہ ایک لڑکی کی خاطر اس حد تک نہیں جا سکتے تھے۔ مگر غزالہ صرف ایک خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ یونیورسٹی میں وہ عجیب حرکتیں کرتی تھی۔ الٹے سیدھے لباس پہن کر آتی تھی۔ ایک بار تو وہ منی اسکرٹ پہن کر آگئی تھی اگرچہ نیچے اس نے چست لیکن پہنا ہوا تھا پھر بھی پروفیسر ثناء اللہ نے اسے کلاس سے نکال دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی کلاس میں کوئی لڑکی اس قسم کا واہیات لباس نہیں پہن سکتی تھی۔ لیکن جہاں تک تعلیم کا تعلق تھا وہ پوری توجہ سے پڑھتی تھی۔ اس نے پہلے سمسٹر میں اول پوزیشن حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا تھا۔ جب جنید شاہ یا حیدر ممتاز کے ساتھ ہوتی تو لگتا ہی نہیں تھا کہ اسے پڑھنے سے کوئی دل چسپی ہے۔ ان کے ساتھ وہ ایک آوارہ مزاج لڑکی کا روپ دھار لیتی تھی۔ اس کے ہنسنے بولنے کا انداز اور باڈی لینگویج بدل جاتی تھی۔ اس وقت اسے دیکھ کر لڑکیاں تو کیا بعض شریف لڑکے بھی لاحول پڑھے بغیر نہیں رہتے تھے۔ جن لڑکوں کے دوسری لڑکیوں کے ساتھ افیئر چل رہے تھے وہ غزالہ کو دیکھ کر للچاتے ضرور تھے لیکن اس کے قریب سے گزرنے سے بھی گریز کرتے تھے ورنہ ان کی اپنی گرل فرینڈز کے ہاتھوں شامت آجاتی اور کئی کی شامت آچکی تھی۔

جنید شاہ اور حیدر ممتاز کے واقعے کے بعد کچھ عرصے وہ اکیلی رہی تھی۔ یونیورسٹی آتی، کلاسز لیتی، لائبریری میں پائی جاتی اور پھر گھر چلی جاتی۔ اس کی کسی سے بات چیت بھی نہیں تھی۔ ایک دن میں کلاس سے باہر نکل رہا تھا کہ وہ راہداری میں نظر آئی۔ لان کے ساتھ لگنے والی دیوار پر پاؤں پھیلائے بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ پوز بھی بہت نظر نواز تھا اس لیے لڑکے بار بار وہاں سے گزر رہے تھے۔ میرا اس سے بات کرنے کا ارادہ نہیں تھا لیکن لڑکوں کی پریڈ دیکھ کر مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

غصہ آگیا اور میں اس کے پاس آیا۔

”بیٹھنے کے لیے اس یونیورسٹی میں بہت سی جگہیں ہیں۔“

”تو؟“ وہ بے نیازی سے بولی۔

میں نے دانت پیسے۔ ”تب وہاں جا کر بیٹھو یہاں کیوں تماشا بنی ہوئی ہو۔“

اس نے تمسخرانہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ ”تماشا میں بن رہی ہوں، تمہیں کیا اعتراض ہے؟“

”مجھے اعتراض ہے تم اسی ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتی ہو اور اس طرح میری کولیگ ہو۔“

میرے سخت لہجے کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا لیکن وہ اپنا پوز ترک کر کے نیچے اتر آئی۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ”سنا ہے اب تم ایم فل کر رہے ہو؟“

میں ذرا پیچھے ہوا۔ ”ظاہر ہے تبھی میں یہاں ہوں ورنہ میرا تو فائنل تھا۔“

”مجھے بائرن کے بعض اشعار سمجھ نہیں آ رہے ہیں کیا تم سمجھا دو گے؟“ وہ مزید قریب آگئی۔

”یہاں نہیں لائبریری میں۔“

کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے بیٹھی تھی اور ایک گھنٹے تک پوری سنجیدگی سے مجھ سے پڑھتی رہی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی کوئی غیر متعلقہ لفظ نہیں کہا اور نہ ہی کوئی حرکت کی۔ حرکت سے مراد اس کی جسمانی حرکات تھیں۔ میں واضح نہیں کر سکتا لیکن یوں سمجھ لیں کہ وہ جسم کی زبان پر بھی قادر تھی، معمولی سی جنبش سے کوئی ایسی بات کہہ جاتی جو سامنے والا بہ خوبی سمجھ لیتا تھا اور اپنی ان فتنہ حرکتوں کی وجہ سے بھی وہ واہیات مشہور تھی۔ جب اس کی تشفی ہو گئی تو اس نے کتاب بند کر دی۔ ”میں تمہاری شکر گزار ہوں۔“

”نو پرابلم۔“ میں نے سگریٹ نکالی۔ ”کیا میں اسموکنگ کر سکتا ہوں؟“

اس نے شانے اچکائے۔ ”میرا کیا جاتا ہے کینسر تو تمہیں ہوگا۔“

لائبریری میں سگریٹ نوشی منع تھی لیکن فی الحال یہاں کوئی اور نہیں تھا جو شکایت کرتا اس لیے میں نے سگریٹ سلگا لی اور دھواں چھوڑتے ہوئے سوال کیا۔ ”تم یہ سب کیوں کرتی ہو؟“

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ”تمام لڑکے یہ سوال ضرور کرتے ہیں۔“

”میں ان لڑکوں میں سے نہیں ہوں۔“ میں نے خفگی سے کہا۔ ”تم جانتی ہو مجھے تم میں دل چسپی نہیں ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ تو میں نے دس سال کی عمر میں سیکھ لیا تھا کہ کون سا مرد مجھ میں کس طرح کی دل چسپی لے رہا ہے۔ ویسے آج تک کوئی ایسا مرد نہیں ملا جو مجھے نظر انداز کر سکے۔ تم بھی نہیں کر سکتے۔“

”یہ تو ہے۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن میری دل چسپی کی نوعیت دوسری ہے۔“

وہ ذرا آگے جھکی۔ ”سنو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں ایسی کیوں ہوں لیکن یہ طے ہے کہ اب میں ساری عمر ایسی ہی رہوں گی۔“

”تم نے جنید شاہ اور حیدر ممتاز کے ساتھ کیا کیا تھا؟“

اس کی سیاہ آنکھوں میں شرارت آئی تھی۔ ”تم جاننا چاہتے ہو؟“

”بہت زیادہ نہیں کیونکہ مجھے اندازہ ہے لیکن تجسس تو ہے۔“

”تب مجھ سے دوستی کر لو میں بتا دوں گی۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں تم سے دوستی نہیں کر سکتا اس کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔“

”تب اندازے لگاتے رہو۔“ اس نے اپنا خستہ حال بیگ اٹھا کر شانے پر لٹکایا۔ ”مدد کا شکریہ۔“

میرا خیال تھا یہ اس کا اصل روپ تھا جو میرے سامنے آیا تھا ورنہ باقی وقت وہ خود پر ایک خول چڑھائے رہتی تھی۔ وہ بہت اچھی اداکارہ تھی ورنہ مسلسل اداکاری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اب تک میں نے اسے جتنا دیکھا تھا وہ مجھے بہت غریب طبقے کی دکھائی دی تھی۔ عام طور سے لنڈے کی جینز اور اس کے ساتھ کوئی غیر روایتی لباس زیب تن ہوتا تھا۔ اس کا بیگ ہمیشہ پرانا اور خستہ حال نظر آتا تھا۔ جب تک جنید شاہ یا حیدر ممتاز کے ساتھ تھی اکثر کینٹین میں پائی جاتی تھی اور ڈٹ کر کھاتی پیتی نظر آتی لیکن ان کے بعد میں نے ایک بار بھی اسے کینٹین میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ یونیورسٹی پوائنٹ سے آتی جاتی تھی۔ ویسے میں نے یا کسی نے اسے کبھی جنید شاہ یا حیدر ممتاز کی گاڑیوں میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ شمشیر نے ایک انفارمیشن گروپ بنا رکھا تھا جس کا انفارمیشن ٹیکنالوجی سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ یہ شمشیر کو ساری

یونیورسٹی کی اہم اور تازہ خبریں پہنچاتے تھے۔ جیسے ہی کسی کے علم میں کوئی بات آتی وہ ایس ایم ایس کر کے دوسروں کو پہنچا دیتا یوں سب اپ ڈیٹ رہتے تھے۔ غزالہ کے بارے میں خبروں کو اولیت دی جاتی تھی۔ میں اس گروپ کا حصہ نہیں تھا لیکن شمشیر کے توسط سے مجھے بھی ساری خبریں ملتی رہتی تھیں۔

غزالہ نے دوسرا سمسٹر اکیلے گزارہ لیکن تیسرے سمسٹر میں وہ وقار حسن کے ساتھ نظر آنے لگی تھی۔ وقار ایک بڑے کاروباری گھرانے کا چشم و چراغ تھا جسے اس کے باپ نے ایم بی اے کرنے کے لیے بھیجا تھا مگر غزالہ سے دوستی کے بعد وہ زیادہ تر انگریزی کے ڈپارٹمنٹ میں پایا جاتا تھا۔ وقار کو جنید شاہ کی طرح بدمعاش پالنے اور حیدر ممتاز کی طرح اکڑ دکھانے کا شوق نہیں تھا لیکن باقی امیر زادوں والے شوق اس نے سارے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ غزالہ میں خاصی تبدیلیاں آئی تھیں اس کے جسم پر نت نئے فیشن کے قیمتی لباس نظر آنے لگے تھے۔ شاید اس نے تحفے بھی قبول کرنا شروع کر دیے تھے ورنہ جنید شاہ اور حیدر ممتاز بھی کنجوس نہیں تھے وہ بھی اسے ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی تحفہ دے سکتے تھے۔ غزالہ نے بال شولڈر کٹ کروا کر انہیں لائٹ گولڈن براؤن کلر میں ڈائی کروا لیا تھا اور یہ اس پر اور بھی اچھا لگنے لگا تھا۔

ایم فل کرنے کے بعد میں نے جرنلزم میں داخلہ لیا۔ شعبۂ انگریزی ادب سے رابطہ کم ہو گیا تھا مگر شمشیر کی وجہ سے آنا جانا رہتا تھا۔ اس سے کبھی کبھی غزالہ کے بارے میں اطلاع بھی ملتی رہتی تھی۔ اس کی حرکتیں جاری تھیں۔ وہ فائنل میں تھی اور تینوں بار اس نے ٹاپ کیا تھا۔ شعبے کے پروفیسرز بھی حیران تھے کہ اس قدر غیر ذمے داری کا مظاہرہ کرنے والی لڑکی ٹاپ کیسے کر رہی تھی۔ یہ صرف چند لوگ جانتے تھے کہ وہ اصل میں کیا تھی اور کتنی ذہین تھی۔ فائنل سمسٹر میں اس نے وقار کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ حالانکہ وہ اس کے لیے دیوانہ تھا۔ اس کے آگے پیچھے پھرتا تھا لیکن جب غزالہ نے ایک بار قطع تعلق کیا تو پھر دوبارہ اس کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سوگ میں وقار کتنے دن یونیورسٹی نہیں آیا تھا۔ آخری اطلاع یہ تھی کہ وہ سمیر ریحان میں دل چسپی لینے لگی تھی۔ مجھ سمیت سب حیران تھے کیونکہ سمیر چھوٹے قد کا کسی قدر گول مٹول اور سانولے رنگ کا شخص تھا۔ اس کی شیو ہمہ وقت بڑھی رہتی تھی۔ سیاہ موٹے فریم کی عینک کی وجہ سے وہ اچھا خاصا بھالو دکھائی دیتا تھا۔ یہ میری نہیں اس کے بارے میں اکثریت کی رائے تھی۔ لڑکیاں اسے لفٹ نہیں کراتی تھیں اور وہ خود لڑکیوں سے دور رہتا تھا۔ اس لیے غزالہ کا اس کی طرف متوجہ ہونا حیرت انگیز ہی تھا۔

ایک بار میں نے دونوں کو لان میں دیکھا اور وہ بہت گھلے ملے لگ رہے تھے۔ غزالہ کا حلیہ کسی قدر سدھرا ہوا تھا اور وہ دیوانہ وار قہقہے بھی نہیں لگا رہی تھی۔ سمیر سے بات کرتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک دھیمی اور کسی قدر شرمیلی سی مسکان تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ وہ اس طرح بھی مسکرا سکتی ہے۔ یقیناً اس میں یہ تبدیلی سمیر سے ملنے کے بعد آئی تھی۔ شمشیر نے تصدیق کی کہ اب غزالہ نے واہیات ڈریسنگ اور حرکتیں چھوڑ دی ہیں۔ یونیورسٹی میں پہلی بار وہ دوپٹے میں بھی دکھائی دی تھی۔ ”لگتا ہے صیاد خود جال میں آگیا ہے۔“

”ایسا ممکن ہے کیونکہ بہرحال وہ عورت ہے اور محبت عورت کے خمیر میں شامل ہوتی ہے۔ وہ کتنی ہی دور نکل جائے اپنی اصل کی طرف ضرور پلٹتی ہے لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ شمشیر نے پوچھا۔

”نہ جانے کیوں غزالہ مجھے ایسی عورت لگتی ہے جس کا دماغ اس کے دل پر حاوی ہو۔“

شمشیر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے آج تک ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی۔ یہ اس کی سرشت میں ہی نہیں ہے کہ وہ دماغ کو دل پر ترجیح دے۔“

”مگر مجھے غزالہ ایسی ہی عورت لگتی ہے۔“

”روایتی معنوں میں وہ لڑکی ہے کیونکہ بہ ظاہر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔“ شمشیر کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

”اس بہ ظاہر کے پیچھے جو ہے ہمیں اس کی فکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔“ میں نے ملائمت سے کہا تو شمشیر جھینپ گیا تھا۔ فائنل کے بعد غزالہ یونیورسٹی چھوڑ کر چلی گئی اور صرف اس کی باتیں رہ گئیں، کچھ عرصے بعد وہ باتیں بھی لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئی تھیں۔ میں اپنے ماسٹرز میں لگ گیا تھا۔ شمشیر کے باپ کا اچانک قتل ہو گیا اور اسے واپس جانا پڑا تھا۔ ویسے اس کا ماسٹرز مکمل نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس بار بھی فائنل کلیئر نہیں کیا تھا۔ میرا جرنلزم کا ماسٹرز مکمل ہوا تو میں عملی میدان میں آگیا۔ پہلے ایک اخبار میں ملازمت کی۔ پھر ایک بڑے اخبار کے میگزین میں آگیا۔ یہاں میں سوشل رپورٹس کرتا تھا۔ میرا کام دفتری نوعیت کا تھا اس لیے چھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

سات بجے تک گھر آجاتا تھا۔ اس دن بھی میں سات بجے گھر آگیا۔ کچھ عرصے سے ماما شادی پر زور دے رہی تھیں لیکن میں تیار نہیں تھا۔

"ماما ابھی میرے کیریئر کا آغاز ہے اور میں اپنے بل بوتے پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔ فی الحال میری تنخواہ اتنی نہیں ہے کہ بیوی کا خرچ اٹھا سکوں اس لیے دو تین سال رک جائیں۔"

مجھ سے بڑے بھائی نے باہر شادی کر لی تھی۔ بڑی بہن بھی رخصت ہو کر اپنے گھر جا چکی تھی۔ اب میں تھا اور مجھ سے چھوٹے دو بہن بھائی تھے۔ ان کا نمبر میرے بعد ہی آتا۔ میں لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی پر نیوز چینل رول کر رہا تھا کہ اچانک ایک چینل پر میرا ہاتھ رک گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ غزالہ تھی اور وہ مین پولیس اسٹیشن میں تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ پریس رپورٹر اسے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور وہ بے نیازی سے اپنے بالوں میں بندھے ہاتھوں سے کنگھی کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کی ہنسی اتنی تیز اور ہذیانی تھی کہ رپورٹرز بھی جھجک کر پیچھے ہو گئے لیکن میرے لیے یہ ہنسی اجنبی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا وہ جب چاہے اس طرح ہنس سکتی ہے۔ کسی لائیو شو میں بھی اور کسی میت کے سرہانے بھی۔ جب اس کے قہقہے بلند ہونے لگے تو پولیس والیاں اسے کھینچ کر لے گئی تھیں۔ مقتول کا نام سمیر ریحان تھا۔ میں نے اسی وقت اپنے میگزین انچارج کو کال کی اور غزالہ کے بارے میں بتایا۔

"میں اسے رپورٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیس تو انٹرسٹنگ ہے۔ ٹھیک ہے تمہاری پرانی جان پہچان ہے، تم مل لو ہو سکتا ہے کوئی اچھی رپورٹ بن جائے۔"

"لیکن اوپر سے جیک لگوانا ہوگا حقیقت اگلوانے کے لیے مجھے اکیلے میں ملنا ہوگا۔"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" انچارج نے کہا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے مجھے کال بیک کی۔ "میں نے سیٹنگ کر لی ہے تم ٹھیک دس بجے وہاں پہنچ جاؤ ایک گھنٹے کی اجازت ملی ہے۔"

"کافی ہوگا۔"

میں تیار ہوا اور وومین پولیس اسٹیشن روانہ ہو گیا۔ اوپر سے جیک لگنے کی وجہ سے میرا استقبال روایتی انداز میں نہیں ہوا اور ایک صورت سے خطرناک نظر آنے والی اے ایس آئی خاتون نے مجھے تھانے کے عقبی حصے میں واقع اس کمرے تک پہنچایا جہاں صرف ایک دروازہ تھا اور اندر دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک کرسی میرے لیے تھی کیونکہ دوسری پر غزالہ بیٹھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر چونکی۔ "تم.....؟ میں تو کچھ اور سمجھی تھی۔"

"کیا سمجھی تھیں؟"

"یہی کہ اب یہاں مجھ سے تفتیش ہوگی اور ممکن ہے مرد حضرات بھی اس تفتیش میں شامل ہوں۔ اگر ایسا ہوتا تو میں کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ میں کنواری نہیں ہوں۔"

اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر میں جھینپ گیا تھا۔ وہ آج بھی اتنی ہی بے باک تھی۔ چہرے اور جسامت پر بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ویسا ہی صاف اور کھلا ہوا چہرہ اور متناسب جسامت تھی۔ بس چہرے سے بے آرامی اور وہ کیفیت جھلک رہی تھی جو کسی انسان کو قتل کرنے سے آسکتی ہے۔ "میں بڑی مشکل سے کچھ وقت کی اجازت لے کر آیا ہوں۔"

"آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"ایک اخبار کے میگزین میں کام کرتا ہوں لیکن رپورٹر نہیں ہوں، سوشل آرٹیکل لکھتا ہوں۔"

"میں بھی تو ایک معاشرتی مسئلہ ہوں۔" وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ "چلو اچھا ہے تمہیں ایک رپورٹ مل جائے گی۔"

"پلیز میں ایک پرانے واقف کار کی حیثیت سے آیا ہوں اور تمہیں رپورٹ بنانے کا ارادہ اپنے انچارج کے سامنے ظاہر کیا تھا جس کے نتیجے میں یہاں ہوں لیکن اللہ گواہ ہے میرا ایک لمحے کو بھی یہ ارادہ نہیں تھا۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر سر ہلایا۔ "میں جتنا تمہیں جانتی ہوں تمہاری ریپوٹیشن پر یہ دعویٰ قبول کرتی ہوں۔"

"تھینک یو۔" میں نے گہری سانس لی۔ "تم مجھے کھل کر بتا سکتی ہو اس اطمینان کے ساتھ کہ تمہارا راز میرے سینے میں محفوظ رہے گا۔"

"اس میں راز کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "جو سچ ہے وہ میں نے پولیس کو بتا دیا ہے۔ سمیر ریحان مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ ہم تین سال سے ساتھ رہ رہے تھے۔ وہ ناول نگار بننا چاہتا تھا۔ ایسا ناول لکھنا چاہتا تھا جو اسے عالمی سطح پر معروف کر دے۔ لیکن اس میں..... میں معروف ہونے کی اہلیت بھی نہیں تھی۔ مجھے پتا چلا کہ وہ مجھے دھوکا دے رہا ہے اس لیے میں نے اسے شوٹ کر دیا۔ یہ سب تمہیں پولیس کی رپورٹ سے بھی مل جائے گا۔"

"مجھے اس قتل اور پولیس رپورٹ سے کوئی دلچسپی

نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے میں تمہارے بارے میں سب جانتا ہوں سوائے ایک بات کے کہ تم ایسی کیوں ہو؟"

"تم کیوں جاننا چاہتے ہو؟"

"سچی بات ہے، یہ بات میں خود نہیں جانتا۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ "ٹھیک ہے میں تمہیں بتاؤں گی۔ یہ سب میں نے آج تک کسی کو نہیں بتایا۔ ان لوگوں کو بھی نہیں جو سمجھتے تھے کہ وہ میرے بہت قریب ہیں۔ سمیر کو بھی نہیں معلوم تھا۔ تم پہلے شخص ہو جس کے سامنے میں اپنا ماضی کھولنے جا رہی ہو۔"

☆☆☆

بھوک مجھے اندر سے کھرچ رہی تھی۔ آخری بار کھانا کھائے شاید چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔ ایک دس گیارہ سال کی لڑکی کو جب وہ بڑھ رہی ہو زیادہ ہی بھوک لگتی ہے۔ مجھے بھی لگتی تھی مگر کھانے کو اتنا نہیں ملتا تھا۔ میرا باپ کباڑ کا ٹھیلا لگاتا تھا اور اس کی آمدنی میں سے جو حصہ چرس کے دھویں میں تبدیل ہونے سے بچ جاتا تھا وہ روٹی بن کر ہمارے پیٹ کا جہنم ٹھنڈا کرتا تھا۔ ماں ہمیشہ سے صابر شاکر تھی۔ اس نے کبھی شوہر سے جھگڑا نہیں کیا کہ وہ اس کا اور بچوں کا حق نشے کی نذر کیوں کر دیتا ہے۔ دو دن سے ابا بیمار تھا۔ نشے نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا ذرا سی بیماری بھی اسے لٹا دیتی تھی اور جب وہ لیٹ جاتا تو ہمارے گھر میں اسی طرح فاقے ہوتے تھے۔ ایک دن تو بچا کھچا چلتا رہا پھر گھر میں کھانے کو کچھ نہ رہا تھا۔ میں بھوک سے بیتاب ہو کر گھر سے نکل آئی۔ یہ علاقہ اور محلہ غریبوں کا تھا۔ آس پاس سارے ہمارے جیسے آباد تھے۔ کچھ بہتر تھے جہاں ساری آمدنی روٹی میں لگتی تھی اور جہاں روٹی کے علاوہ کسی اور جگہ خرچ ہوتی تو وہاں ہماری طرح فاقے ہوتے تھے۔

رشید چاچا اپنی دکان میں بیٹھا ہوا تھا اس کی دکان گلی کے کونے پر تھی وہاں سے روزمرہ کی چیزیں مل جاتی تھیں۔ رشید چاچا تقریباً چالیس بیالیس برس کا سیاہ رُو اور چیچک زدہ شخص تھا اس کی پیلی آنکھوں میں عجیب سی گندگی بھری تھی۔ میں جب اسے دیکھتی مجھے گھن آتی تھی لیکن اس دن میں اس کے بجائے اس کی دکان میں موجود کھانے کی چیزوں کو للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے میری بھوک جان لی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک اور طرح کی بھوک آگئی تھی۔ اس نے کیک رس کے مرتبان کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ "کھائے گی؟"

"ہاں۔" میں نے سوچے بغیر جواب دیا کیونکہ اس وقت میں کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھی۔ دماغ کے بجائے پیٹ سے سوچ رہی تھی۔ اس نے کیک رس کا مرتبان اٹھایا اور مجھے دکان کے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے پیچھے لے گیا تھا۔ اس دن میرا پیٹ ایک وقت کے لیے بھر گیا تھا لیکن میری روح خالی ہو گئی۔ میں گھر آئی تو رو رہی تھی اور شاید ہنس بھی رہی تھی۔ مجھ سے بڑی دو بہنیں چھپ کر ابلے آلو کھا رہی تھیں پتا نہیں وہ کہاں سے یہ آلو لائی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر باقی آلو چھپا لیے تھے۔ اگر اس دن وہ مجھے اپنے ساتھ شامل کر لیتیں تو شاید میں نصف درجن کیک رس کی خاطر اپنا آپ فروخت نہ کرتی۔ اس خرید فروخت میں میرے لیے بس ایک ہی اچھی بات ہوئی تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سچی بات ہے پیٹ بھر جانے کے بعد مجھے پروا نہیں رہی تھی کہ میں نے کیا کھویا تھا؟

جب ابا زیادہ وقت گھر میں گزارنے لگا اور فاقے مسلسل ہونے لگے تو ماں نے کمر ہمت کسی اور نزدیکی پوش آبادی میں گھروں میں کام کرنے لگی۔ ایک بنگلے میں صبح سے شام تک کام کے عوض اسے چند سو روپے کی تنخواہ اور بچا کھچا کھانا اور اترا ہوا پہننے کو مل جاتا تھا۔ مگر یہ بچا کھچا اور اترا ہوا بھی ہمارے لیے عیاشی سے کم نہیں تھا۔ میں چھوٹی تھی کپڑوں پر بہنیں قابض ہو جاتی تھیں۔ ماں نے ان سے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں اور اس کا ہاتھ بٹائیں۔ کچھ پیسے ان کو مل جائیں گے اور بوجھ بھی ہلکا ہوگا۔ مگر کام ان کی ہڈیوں میں نہیں تھا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ میں نے ماں سے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔"

ماں خوش ہو گئی وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانے لگی۔ بنگلا ایک بڑے صاحب کا تھا۔ کل دو افراد تھے صاحب اور بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ بیمار تھیں ان کو دل کے دورے پڑتے تھے اور جب دورہ پڑتا تو صاحب انہیں لے کر اسپتال بھاگتے۔ ایک دن میں ماں کے ساتھ بڑے سے ڈرائنگ روم کی صفائی کر رہی تھی کہ صاحب وہاں آگئے۔ وہ تقریباً پچاس برس کے کچھ سفید اور سیاہ بالوں والے مہربان اور نرم مزاج شخص تھے۔ مجھے دیکھ کر ماں سے پوچھا۔ "سکینہ یہ کون ہے؟"

"میری بیٹی غزالہ ہے صاحب، اسے ہاتھ بٹانے کے لیے ساتھ لائی ہوں۔"

اس نے دلچسپی سے مجھے دیکھا۔ "تم نے بتایا نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کی بھی تنخواہ لگاتا۔ یہ پڑھتی ہے؟''

''صاحب ادھر پیٹ کا پورا نہیں ہوتا ہے پڑھائیں کہاں سے؟''

''نہیں پڑھانا تو چاہیے تمہارے علاقے میں اسکول ہے وہاں کوئی فیس نہیں لیتے ہیں۔ کتابیں کاپیاں اور یونیفارم بھی دیتے ہیں۔ تم اسے وہاں داخل کرادو۔''

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میری تعلیم میں کیوں دل چسپی لے رہے تھے کیونکہ خود مجھے کبھی پڑھنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ ان کے حکم پر ماں نے مجھے اس اسکول میں داخل کرا دیا۔ صبح وہاں لڑکے پڑھتے تھے اور شام کو لڑکیاں۔ ماں کے ساتھ صبح جاتی اور وہیں سے تیار ہو کر اسکول چلی جاتی۔ جب میں نے پہلی بار کتابیں کاپیاں دیکھیں تو مجھے اچھی لگیں۔ میرا خیال تھا کہ تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل کام ہے۔ میری بہنیں شکر ادا کرتی تھیں کہ انہیں پڑھنا نہیں پڑا۔ ان کے خیال میں پڑھنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا اور یہی بات میرے ذہن میں تھی۔ لیکن اسکول میں پڑھا تو مجھے یہ کام بہت اچھا اور آسان لگا تھا۔ شاید مجھ میں فطری ذہانت تھی۔ صاحب کو پتا چلا کہ میں اسکول جاتی ہوں تو وہ خوش ہوئے تھے انہوں نے میری تنخواہ مقرر کر دی تھی اور جب سامنا ہوتا تو کچھ نہ کچھ رقم بھی دیتے تھے۔

میں بڑی ہو رہی تھی اور مجھ میں وہ ساری تبدیلیاں آ رہی تھیں جو جوان ہوتی لڑکیوں میں آتی ہیں۔ بہنوں کے توسط سے مجھے بہت ساری ایسی باتوں کا علم بھی ہو گیا تھا جو عام طور سے شادی کے بعد ہوتا ہے۔ میں یہ سب نہیں جانتی تھی کہ وہ کنواری ہو کر یہ سب کیسے جان گئی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ماں مجھے بنگلے میں اکیلا نہیں چھوڑتی تھی کام کے دوران اپنے ساتھ ساتھ لگائے رکھتی تھی۔ اگر میں اس سے کچھ دیر کے لیے الگ بھی ہو جاتی تو وہ بے قرار ہو کر مجھے تلاش کرتی آ جاتی۔ وہ بے چاری جانتی ہی نہیں تھی کہ جس چیز کی حفاظت کے لیے وہ پریشان ہے وہ میں کب کی گنوا چکی تھی۔ اچھے کھانے پینے سے میرا جسم بھر گیا تھا۔ ماں مجھے ٹوکتی کہ میں چلنے پھرنے اور پہننے اوڑھنے میں احتیاط کیا کروں۔ مگر میں اس کی باتوں کی پروا کم کرتی تھی۔ اب بیگم صاحبہ کے جو پرانے کپڑے ملتے تھے میں ان پر قابض ہو جاتی تھی اور خود انہیں ٹھیک کر کے اپنے ناپ کا بنا لیتی تھی۔ بہنیں بعد میں ہنگامہ کرتی تھیں لیکن ماں میرا ساتھ دیتی کہ جب کام میں کرتی ہوں تو چیزیں بھی مجھے ہی ملیں گی۔

اسکول میں میں نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ میں بارہ سال کی عمر میں داخل ہوئی تھی اور سترہ سال کی عمر میں میں نے میٹرک کر لیا۔ صاحب کو پتا چلا تو بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے ماں سے کہا کہ مجھے کالج میں داخل کرائیں۔ ماں ہچکچائی لیکن جب صاحب نے تمام اخراجات کا ذمہ لیا اور میں نے بھی اصرار کیا تو ماں مان گئی۔ شادی کا ابھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ مجھ سے بڑی بہنیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں ایک اچھے کالج میں آ گئی۔ صبح سویرے تیار ہو کر کالج جاتی اور وہاں سے بنگلے پہنچ جاتی۔ ماں کے ساتھ کچھ کام نمٹاتی اور اسی کے ساتھ گھر آ جاتی۔ ماں نے مجھے کہہ رکھا تھا کہ اگر وہ چھٹی کرے گی تو میں بھی سیدھی گھر آیا کروں بنگلے نہ جایا کروں۔ ایک دن میں نے کہا۔ ''تم اتنی پریشان کیوں ہوتی ہو۔ صاحب اچھے آدمی ہیں۔''

''ہاں پر وہ مرد ہے اور مرد سے ہمیشہ ہوشیار رہو۔''

مگر میں ہوشیار نہیں رہی تھی۔ اس دن میں بنگلے پہنچی تو ماں وہاں نہیں تھی۔ پتا چلا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور وہ چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔ صاحب نے مجھ سے کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئی ہو کچھ کام ہیں وہ کر جاؤ۔''

''کیا کام ہیں صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا بیڈ روم صاف کرنا ہے۔''

عجیب بات تھی کہ صاحب اور بیگم صاحبہ کا بیڈ روم الگ الگ تھا۔ میں صاحب کے بیڈ روم میں آئی تھی کہ پیچھے سے وہ بھی آ گئے اور جب خاصی دیر بعد میں وہاں سے نکلی تو ان کی تمام مہربانیوں کا صلہ مع سود ادا کر چکی تھی۔ جب پہلی بار لٹی تھی تو اتنا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اس بار مجھے لگا کہ میں بہت سستی بکی ہوں۔ عزت بے عزتی کا مجھے احساس نہیں تھا لیکن سناٹے میں پر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آیا تھا۔ مجھے روتے دیکھ کر بے قرار ہو گیا یا پھر ڈر گیا تھا۔ میری دل جوئی کرتے ہوئے اس نے ہزار کا ایک نوٹ میرے کالج بیگ کی جیب میں ڈال دیا۔ میں نے تنک کر یہ نوٹ نکال پھینکا اور بولی۔ ''مجھے دس ہزار دو۔''

میرے لہجے سے ڈر کر اس نے دس ہزار دیئے اور التجا آمیز انداز میں بولا۔ ''تم کسی کو بتانا مت۔''

''نہیں بتاؤں گی۔ تم جب چاہو مجھے بتا دینا میں آ جاؤں گی لیکن دس ہزار بھی تیار رکھنا۔''

اسے اس پیشکش کی توقع نہیں تھی۔ وہ دنگ رہ گیا تھا

اور میں اس کی پروا کیے بغیر وہاں سے نکل آئی۔ ماں سے میں نے یہی کہا کہ آج میں بنگلے گئی ہی نہیں کالج میں ہی دیر ہو گئی تھی۔ ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ میری ان پڑھ جاہل ماں کو دنیا اور مردوں کا کتنا پتا تھا۔ صاحب ہر دوسرے تیسرے مہینے مجھے چپکے سے بلا لیتا تھا اور ہر بار دس ہزار روپے دیتا تھا۔ ویسے بھی موقع پا کر مجھے کچھ نہ کچھ رقم دیتا رہتا تھا۔ جلد مجھے اس کی مظلومیت کا احساس ہوا۔ وہ اپنی بیوی کا قیدی تھا۔ کیونکہ یہ بنگلا اور اس کی ساری دولت بیوی کے پاس تھی اس کے پاس کچھ نہیں تھا سوائے اس کے جو اسے بیوی دیتی تھی۔ وہ مریضہ تھی اس کے حقوق بھی ادا نہیں کر سکتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ میری طرف متوجہ ہوا۔ شریف آدمی تھا کھل کر آوارگی نہیں کر سکتا تھا۔ بس میں ہی اسے دسترس میں نظر آئی تھی۔ اس لیے مجھ پر ہاتھ صاف کر لیا۔ رشید چچا سے مجھے نفرت تھی لیکن اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

یہ سلسلہ کالج کی حد تک چلا۔ ماں سے چھپ کر میں نے اتنی رقم جمع کر لی تھی کہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکتی تھی۔ ماں کو یہی بتایا کہ میرے اتنے اچھے نمبر آئے تھے کہ میری فیس معاف ہو گئی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ بس میں تعلیم سے غرض رکھوں گی۔ اب کسی مرد کے چکر میں نہیں آؤں گی۔ لیکن نہ جانے کیسے جنید شاہ کو میرے بارے میں علم ہو گیا۔ یعنی وہ میرا پس منظر جان گیا۔ اس نے مجھے دھمکایا کہ اگر میں نے اس سے دوستی نہ کی تو میرے بارے میں ساری یونیورسٹی کو بتا دے گا اور اس کے بعد میں یہاں سر اٹھا کر نہیں چل سکوں گی۔ یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا اس لیے اس کی بات مان لی۔ جب تک اس کے بعد میں حیدر ممتاز کے ساتھ رہتی تو میری شخصیت کچھ اور ہوتی۔ یونیورسٹی والے مجھے آوارہ اور بگڑی ہوئی لڑکی سمجھتے تھے۔ اکثر کا یہ خیال تھا کہ میں اپر کلاس سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اپنی ذہنی کج روی کی بنا پر ایسا حلیہ بنا کر رکھتی ہوں۔

جنید شاہ اور حیدر ممتاز میں لگتی تھی۔ اصل میں ان دونوں کا خاندان بھی آپس میں سیاسی حریف تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ حیدر مجھ میں دل چسپی لے رہا ہے۔ اگر میں جنید شاہ کو چھوڑ کر اس کی طرف جاتی تو جنید شاہ اپنی دھمکی پر عمل کر سکتا تھا اس لیے میں نے کچھ ایسی حرکتیں کیں کہ جنید شاہ سمجھا کہ میں زیادہ ہی نفسیاتی مریضہ ہوتی جا رہی ہوں۔ اس کے ساتھ میں خود کو نفسیاتی مریضہ ہی ظاہر کرتی تھی۔ دو تین مواقعوں پر اس کی بے عزتی کا سبب بنی تو وہ جھنجلا گیا اور مجھ پر ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھ سے تعلق ختم کر دیا۔ میں کچھ عرصے خاموش رہی اور حیدر ممتاز کی طرف سے ردعمل کا انتظار کرتی رہی جب وہ آگے نہیں بڑھا تو میں خود اس کی طرف بڑھی۔ میں نہیں جانتی کہ حیدر ممتاز کی طرف بڑھنے کی کیا وجہ تھی۔ بس میرے اندر سے کسی نے کہا تھا۔ وہ جنید شاہ کی نسبت اچھا آدمی تھا اور جب میں نے اسے جنید شاہ کی بلیک میلنگ کے بارے میں بتایا تو وہ بھڑک اٹھا تھا۔ وہ اسی وقت جنید شاہ سے نمٹنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ البتہ کچھ عرصے بعد جب جنید شاہ نے خود پہل کی اور میرے حوالے سے حیدر ممتاز پر طنز کیا تو حیدر برداشت نہ کر سکا.... وہ اکیلا تھا اور جنید شاہ کے ساتھ اس کے دو گرگے بھی تھے۔ اس کے باوجود اس نے برابر کا مقابلہ کیا خاص طور سے جنید شاہ کا جبڑا توڑ دیا تھا۔ اسے بھی چوٹیں آئی تھیں لیکن اصل میں وہ یونیورسٹی حکام کی کارروائی

سسپنس، سرگزشت، پاکیزہ، جاسوسی
سول ایجنٹ برائے یو۔اے۔ای
WELCOME BOOK SHOP
ویلکم بک شاپ
پی او بکس: 27869 کرامہ، دبئی
فون: 04-3961016 فیکس: 04-3961015
موبائل: 050-6245817 ای میل: welbooks@emirates.net.ae
معیاری کتابوں کا اعلیٰ مرکز
WELCOME BOOK PORT
ویلکم بک پورٹ
ریٹیل، ہول سیل، ڈسٹری بیوٹر، پبلشر، ایکسپورٹر
مین اردو بازار۔ کراچی
فون: (92-21) 32633151, 32639581 فیکس: (92-21) 32638086
ای میل: welbooks@hotmail.com
ویب سائٹ: www.welbooks.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے خوف سے چلا گیا تھا۔

حیدر ممتاز کے جانے کے بعد میں نے خود کو آزاد محسوس کیا تھا۔ شاید میں اسے بھی پسند نہیں کرتی تھی کیونکہ میرے لیے تھا تو وہ بھی مرد۔ اب میں اپنی ساری توجہ تعلیم پر دینا چاہتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اچھی جاب مل جائے گی اور میں اپنی ماں بہنوں سے الگ رہ سکوں گی۔ باپ کا انتقال ہوگیا تھا اور کچھ عرصے بعد ایک بہن کی شادی ہوئی تھی اس کا شوہر بھی ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اس شخص کو اپنی دوسری بہن کے ساتھ دیکھ لیا اور تب مجھے پتا چلا کہ میری شادی شدہ بہن شوہر کے اس حد تک دباؤ میں ہے کہ وہ آنکھوں دیکھی مکھی نگل رہی ہے اور اس میں اس کی رضامندی بھی شامل ہے تو مجھے ان تینوں سے نفرت ہوگئی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میرے پاس رقم تھی، جنید شاہ اور حیدر ممتاز سے بھی بہت کچھ نقد حاصل کیا تھا۔ میں نے ایک وومین ہوسٹل میں رہائش اختیار کرلی۔

پھر میری ملاقات سمیر سے ہوئی۔ مجھے فائنل میں مدد کی ضرورت تھی اور سمیر بہت ذہین تھا۔ اس نے میری مدد کی اور رفتہ رفتہ میں اس کے قریب آگئی۔ سمیر مجھے لڑکی کے بجائے یونیورسٹی فیلو ہی سمجھتا تھا۔ مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی۔ رفتہ رفتہ اس نے میرے اندر جگہ بنالی اور میں اس کی پسند میں ڈھلتی چلی گئی۔ جب میرا فائنل امتحان تھا تو اس نے مجھے پیشکش کی کہ میں اس کے ساتھ رہوں۔ وہ ایک پوش علاقے میں چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔ میرے پاس رقم کم ہورہی تھی اس لیے میں نے اس کی پیشکش مان لی۔ ہم ایک جگہ رہنے لگے اور جب مرد عورت ایک جگہ ہوں تو ان کے درمیان جلد شیطان آجاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے درمیان ہوا۔ میں کون سی پاکباز تھی اس لیے جب سمیر نے پیش قدمی کی تو میں اعتراض بھی نہ کرسکی تھی۔ فائنل کے بعد میں نے جاب کی تلاش شروع کردی۔ جلد مجھے ایک ٹی وی چینل میں جاب مل گئی۔ تعجب کی بات تھی انٹرویو کرنے والوں نے صرف میری انگریزی دیکھی اور مجھے جاب دے دی۔ کام بھی خاص نہیں تھا۔ زیادہ تر وقت فارغ گزرتا تھا۔ سمیر ناول لکھ رہا تھا اس لیے جاب کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس کی کفالت بھی میں ہی کررہی تھی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اس سے مطالبہ کیا کہ وہ مجھ سے شادی کرے۔ میرے لیے یہی کافی تھا کہ وہ بس میرا ہے۔

لیکن میری خوش فہمی جلد دور ہوگئی جب ایک دن اتفاق سے دفتر سے جلد آنے کے بعد میں نے فلیٹ میں ایک اور عورت کو موجود پایا اور ان دونوں کا حلیہ بتارہا تھا کہ ان کی مصروفیات کیا تھیں۔ میں نے سمیر سے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اس نے اطمینان سے اعتراف کیا کہ وہ اس کی گرل فرینڈ ہے۔ میں نے ہنگامہ کیا تو سمیر نے کہا۔ ”یہ میرا گھر ہے اگر تمہیں اعتراض ہے تو تم جاسکتی ہو۔“

میں اسی وقت سامان سمیٹ کر وہاں سے نکل گئی۔ وومین ہوسٹل میں پہلے بھی رہ چکی تھی۔ اس بار بھی مجھے آسانی سے جگہ مل گئی۔ اب مجھے سمیر پر لعنت بھیج کر اپنی زندگی آپ جینا چاہیے تھی۔ لیکن کچھ دن بعد اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے لیے مری جارہی ہوں۔ وہ مجھ سے رابطہ کرے گا ذرا بہلائے پھسلائے گا اور میں دوڑی آؤں گی۔ میں نے اسے فراموش کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس نے خود اپنی شامت کو آواز دی۔ اس نے مجھ سے معافی مانگی اور واپس بلایا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی اسے میری ضرورت نہیں تھی میں اس کی کفالت کرتی تھی۔ خود وہ کچھ کرتا نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں آرہی ہوں۔ میں فلیٹ پر آئی۔ سمیر خوش ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا لیکن جب میں نے الماری دیکھی تو مجھے یاد آیا اس میں ایک پستول رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پستول نکالا تو سمیر گھگیانے لگا تھا کہ میں اسے نہ ماروں۔ میں اس کے ساتھ کھیلتی رہی کبھی پستول اس پر تان لیتی اور ایسا ظاہر کرتی کہ بس اسے شوٹ کرنے والی ہوں۔ جب وہ خوف سے ادھ موا ہوجاتا دونوں ہاتھ سامنے کرکے خود کو بچانے کی کوشش کرتا اور التجائیں کرتا کہ میں گولی نہ چلاؤں۔ تو پستول ہٹا لیتی اور ہنستی کہ میں اسے ڈرا رہی تھی۔ وہ جھینپتا اور پھر اسے یقین آجاتا کہ میں اب اسے کچھ نہیں کہوں گی تو اس کی بیوفائی کا ذکر کرتے ہوئے دوبارہ پستول تان لیتی تھی۔ جب اس کے ساتھ کھیلتے کھیلتے میرا دل بھر گیا تو میں نے اسے شوٹ کردیا۔

☆☆☆

میں دم بہ خود سن رہا تھا۔ اس نے جس طرح سمیر کو شوٹ کرنے کی بات کی تھی۔ اس سے اس کے بارے میں مجھے اپنے تمام اندازے غلط لگنے لگے تھے۔ وہ چالاک تو تھی ہی ساتھ میں سچ مچ نفسیاتی مریضہ بھی تھی۔ مگر یہ نفسیاتی پن اس کے اپنے اختیار میں تھا۔ ورنہ کون اپنی اچھی بھلی زندگی کو یوں داؤ پر لگاتا ہے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا تھا کہ اس نے احمقانہ انتقام کی خاطر ایک آدمی کو مار دیا اور اب خود حوالات میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر مقدمہ چلتا اور اسے سزا یقینی تھی۔ کم سے کم سات سال کے لیے جیل ضرور جاتی اور جب وہ جیل سے باہر آتی تو نارمل دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہتی۔ اس کا رنگ و روپ ڈھل چکا ہوتا۔ میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

”غزالہ تم نے بہت برا کیا۔ سمیر اور تمہارا رشتہ ویسے ہی ناجائز، غیر قانونی اور غیر اخلاقی تھا۔ تم دونوں میں کوئی معاہدہ نہیں تھا جسے توڑنے پر تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا۔“

”یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے اصل غصہ اس بات پر آیا تھا کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کررہا ہے۔ ورنہ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اور دوسری عورت والی بات پر بھی وقتی غصہ آیا تھا۔ بس جب اس نے دوبارہ مجھے بے وقوف بنانا چاہا....“

لیکن اب مجھے اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں آرہا تھا۔ اس نے یقیناً جنید شاہ اور حیدر ممتاز کے ساتھ بھی کوئی کھیل کھیلا تھا جس کا انجام یہ نکلا کہ ایک عمر بھر کے لیے معذور ہوگیا اور دوسرا پولیس اور جنید کے خاندان والوں سے بچتا پھر رہا تھا۔ لیکن میں نے یہ بات اس پر ظاہر ہونے نہیں دی تھی کہ میں اس پر شک کررہا ہوں۔ میں نے سرسری سے انداز میں اس سے اس بڑے آدمی کا نام اگلوالیا جس نے اسے تعلیم دلوائی تھی اور قیمت اس سے وصول کی تھی۔ اسی طرح اس کے محلے کے بارے میں معلوم کیا جہاں وہ رہتی آئی تھی۔ میں وہاں سے روانہ ہوا تو میں نے سوچ لیا تھا کہ غزالہ کی اصلیت جان کر رہوں گا۔

دوسرے دن سے میں نے کھوج شروع کی۔ سب سے پہلے اس دولت مند آدمی کا پتا چلانا چاہا۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ ایک ہی نام کے لاتعداد آدمی ہوسکتے تھے۔ علاقے کے لحاظ سے کھوج کی اور اپنے اخبار کے رپورٹرز کو استعمال کیا تو چند دن بعد پتا لگ گیا۔ ملک ابراہیم نامی یہ بزنس مین اپنی بیمار بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ مجھے صرف نام اور پتا ملا تھا کوئی کونٹیکٹ نمبر نہیں تھا۔ دو دن میں مصروف رہا اس لیے اس طرف جانا نہیں ہوا۔ اس دوران میں بھی غزالہ کے کیس کی اطلاعات ملتی رہی تھیں۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا اس نے میڈیا کی توجہ حاصل کرلی تھی اور کئی دن گزرنے کے باوجود اس کی اسٹوری سب سے اوپر تھی۔ چونکا دینے والی خبر یہ تھی کہ ایک انسانی حقوق کے علم بردار وکیل نے اس کا کیس مفت میں لڑنے کا اعلان کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ غزالہ کے ساتھ نفسیاتی مسئلہ تھا اور وہ کوئی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے میڈیا سے بات کرتے ہوئے یقین سے کہا تھا۔

”مجھے یقین ہے عدالت غزالہ کی دماغی حالت دیکھتے ہوئے اسے بری کردے گی۔“

میں اس وکیل کی اصلیت اچھی طرح جانتا تھا۔ اس نے ایک این جی او بھی بنا رکھی تھی اور باہر سے اسے بھاری فنڈ ملتے تھے جو سب اس کی جیب میں جاتے تھے اور بدلے میں وہ امداد دینے والوں کی ہدایت کے مطابق کام کرتا تھا۔ وہ عام طور سے ایسے کیس لیتا تھا جس سے ملک، معاشرے اور مذہب کی اساس پر دنیا کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملے۔ اپنی پریکٹس سے اس نے بہت کما لیا تھا اب اس کے دفتر میں درجن بھر وکیل اس کے ماتحت کام کرتے تھے اور وہ ان کی کمائی میں حصہ بٹا کر عیاشی سے زندگی بسر کرتا تھا۔ خود وہ صرف اسی قسم کے کیس لیتا تھا جس میں اسے فیس کے بجائے شہرت ملے۔ پھر یہ بھی سنا تھا کہ حسن پرست ہے۔ ماضی میں بھی اس نے زیادہ تر عورتوں کے کیس لیے تھے۔ دو دن بعد میں ملک ابراہیم کے بنگلے پہنچا تو وہاں تالا لگا تھا اور گیٹ سے اندر نظر آنے والے حصے کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہتا ہو۔ میں نے برابر والے بنگلے کی کال بیل بجائی۔ اتفاق سے اہلِ خانہ خود نکل آئے۔ میں نے ملک ابراہیم کے بارے میں پوچھا۔ ”یہ کہاں چلے گئے ہیں؟“

”آپ کون ہیں؟“

میں نے بات بنائی۔ ”میں ان کے ایک پرانے دوست کا بیٹا ہوں۔ ہم باہر چلے گئے تھے اب یہاں آگئے ہیں تو پاپا نے ان سے ملنے کو کہا تھا مگر ان کا بنگلا تو خالی پڑا ہے۔“

”بنگلا تو خالی ہوگا۔“ انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”اس کے مکین قبرستان شفٹ ہوگئے ہیں۔“

میں چونکا۔ ”کیا ابراہیم صاحب اور ان کی بیگم کا انتقال ہوگیا۔ میرا خیال ہے بچہ تو ان کا کوئی تھا نہیں۔“

”درست ہے، ان کے ساتھ بڑا عجیب سا واقعہ رونما ہوا تھا۔“ ان صاحب نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”ان کے گھر بس ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ کام کرنے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

لیے ماسی اور باورچی آتے تھے۔ ایک دن چوکیدار نماز پڑھنے گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا اسے شک ہوا تو وہ اندر گیا اور اس نے ملک ابراہیم کو اپنے بیڈروم کے فرش پر مردہ حالت میں پڑے دیکھا۔ اس کا سر کپڑے دھونے والے گول ڈنڈے سے مار مار کر بالکل ختم کر دیا گیا تھا۔ مسز ابراہیم بستر پر مردہ حالت میں تھی لیکن اس کا ہارٹ فیل ہوا تھا۔ قاتل نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ پولیس نے اسے ڈاکوؤں کی کارروائی قرار دیا لیکن چوکیدار کا کہنا تھا کہ گھر سے کچھ چوری نہیں ہوا۔ پولیس اسے ہی پکڑ کر لے گئی بعد میں وہ چھوٹ گیا۔ قاتل کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ "اس بات کو کتنا عرصہ گزرا ہے؟"

"تین سال پہلے کی بات ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ تین سال پہلے غزالہ نے ماسٹرز مکمل کیا تھا۔ اس کے بارے میں میرے شکوک بڑھ رہے تھے۔ اسی شام کو اطلاع ملی کہ عدالت نے غزالہ کا چودہ دن کا ریمانڈ دے دیا تھا۔ وہ جیل میں تھی اور اب اس سے ملنا ممکن نہیں تھا ورنہ میں اس سے اس کی ماں کے گھر کا پتا معلوم کرتا۔ اس غریب بستی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ بہت بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کسی مخصوص گھر کو پتے کے بغیر تلاش کرنا بہت مشکل کام تھا۔ میں نے وہاں اخبار کے لیے کام کرنے والے ایک نامہ نگار سے بات کی اور اسے ذمے داری دی کہ وہ غزالہ کے گھر کو تلاش کرے۔ غزالہ نے پولیس کو اپنے گھر یا ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس نے اپنا بیان ان چند سالوں تک محدود رکھا تھا جب وہ سمیر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے خود کو سمیر کی بیوی قرار دیا تھا اور پولیس کو جائے وقوع سے کوئی نکاح نامہ یا ایسی چیز نہیں ملی جس سے غزالہ کی بات کی تصدیق ہوتی۔ اگر وہ کہتی کہ وہ بغیر شادی کے سمیر کے ساتھ رہ رہی تھی تو اس پر حدود کا مقدمہ بھی بن جاتا۔

میں نے اس کے پولیس بیان کی نقل حاصل کی اور اسے پڑھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے چالاکی اور ہوشیاری سے جیسے ایک ایک لفظ سوچ کر بیان دیا تھا اور بے شمار ایسے ابہام چھوڑ دیئے تھے جو عدالت میں اس کے کام آتے۔ ایف آئی آر اور بیان کی نقل پڑھ کر میں نے سوچا کہ اس نے وکیل کا کام آدھا کر دیا تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ وکیل چاہتا تو اس کی ضمانت کرا سکتا تھا کیونکہ ایف آئی آر سے لگ رہا تھا کہ پولیس کو بھی اس سے ہمدردی تھی یا اوپر والوں کی ہدایت کے مطابق اسے چھوٹ دی جا رہی تھی۔ میڈیا بھی اسے مظلوم سمجھ رہا تھا جس کے شوہر نے اسے دھوکا دیا اور اس نے جذباتی ہو کر اسے قتل کر دیا۔ لیکن وکیل اس کیس میں انصاف کے تقاضے پورے ہوتے دکھانا چاہتا تھا اس لیے اس نے چودہ دن کے ریمانڈ پر اصرار نہیں کیا۔ وہ یقیناً اگلی پیشی پر اس کی ضمانت منظور کرا لیتا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

اسی شام میں نے اس وکیل سے رابطہ کیا۔ "نثار صاحب میں غزالہ کا ایک سابق یونیورسٹی فیلو مظہر حسین بات کر رہا ہوں۔ میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

"سوری مسٹر مظہر، غزالہ اس وقت ایک سائکاٹرسٹ کلینک میں ایڈمٹ ہے اور ابھی وہ کسی سے نہیں مل سکتی۔ اس کی کنڈیشن پہلے بھی اچھی نہیں تھی لیکن جیل میں گزرے دو ہفتوں نے اسے بہت ڈپریس کیا ہے۔ جب وہ بہتر ہو گی تو میں اس سے پوچھ کر آپ کو کال کر دوں گا۔"

یقیناً اس کا کال کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا وہ مجھے ٹال رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ کال کاٹتا میں نے جلدی سے کہا۔ "مسٹر ایڈووکیٹ یہ بہت ضروری ہے۔ میں صرف غزالہ سے ہی نہیں آپ سے بھی ملنا چاہتا ہوں۔ غزالہ وہ نہیں ہے جو بہ ظاہر دکھائی دیتی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہ ایک مظلوم عورت ہے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا اور کال کاٹ دی۔ میں نے دوبارہ ملائی تو اس نے ریسیو نہیں کی اور تیسری کوشش میں مجھے خوشخبری ملی کہ میرا نمبر دوسری طرف سے بلاک کر دیا گیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ غزالہ کا جادو اس کے بھی سر چڑھ گیا تھا اور وہ اس کے خلاف ایک لفظ سننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی کہ جب وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں ہے تو خود ہی بھگتے گا۔ مگر غزالہ کی حقیقت جاننے کا خیال میرے دل سے نکلا نہیں تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن نامہ نگار سے رابطہ کرتا اور اس سے مذکورہ خاندان کے بارے میں پوچھتا۔

میں نے اسے بھی نہیں بتایا تھا کہ میں اصل میں کس کے خاندان کو تلاش کر رہا تھا۔ ممکن تھا اسے بتا دیتا تو وہ اس کا ڈھنڈورا پیٹ دیتا۔ خبر بنا کر اخبار کو پہنچا دیتا۔ آخر وہ بھی نامہ نگار تھا اور خبروں سے روزی کماتا تھا۔ اس لیے میں نے صرف بیک گراؤنڈ بتایا تھا۔

غزالہ کی رہائی کے کوئی ایک مہینے بعد میں نے اس سے رابطہ کیا تو اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا کہ اس نے ایک

ایسا خاندان تلاش تو کیا ہے لیکن اسے یقین نہیں ہے کہ یہ وہی خاندان ہے۔ اسے وقت نہیں ملا تھا کہ وہ اس کی تصدیق کرتا۔ میں نے اس سے پتا لیا اور اسے مزید تفتیش سے روک دیا۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں وہ ان سے ملے اور اسے معلوم ہو جائے کہ اصل میں یہ غزالہ کا خاندان تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ غزالہ کی شہرت سے ناواقف ہوتا۔ میں خود تصدیق کر سکتا تھا۔ آنے والے اتوار کو میں نکلا اور اس کچی پکی بستی پہنچا جہاں اس فتنہ ساماں کا بچپن اور جوانی گزری تھی۔ مذکورہ پتا ایک نہایت خستہ حال چھوٹے سے مکان کا تھا۔ اندر دو یا تین کمرے تھے جن پر ٹین کی شیٹ پڑی ہوئی تھیں۔ دروازہ جھول رہا تھا اس لیے میں نے احتیاط سے دستک دی۔ اندر سے ایک ادھیڑ عمر اور پریشان حال آدمی نکلا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ غزالہ نے اپنی ماں، بہنوں اور بہنوئی کا نام نہیں بتایا تھا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آپ غزالہ کے بہنوئی ہیں؟"

وہ چونکا اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر اس نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "آپ غزالہ کو کیسے جانتے ہیں؟"

اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ وہی غزالہ کا بہنوئی تھا اور یہ اسی کا گھر تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "یہ سب میں یہاں گلی میں کھڑے ہو کر نہیں بتا سکتا۔ کوئی سنے گا تو آپ لوگوں کی بدنامی ہو گی اور ہو سکتا ہے کہ معاملہ پولیس تک چلا جائے۔"

شاید اسے بدنامی کی پروا نہ ہوتی لیکن پولیس کا نام سن کر اس کا رنگ بدلا تھا اس نے سر ہلایا اور اندر گیا۔ ایک منٹ بعد آ کر اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جو بیک وقت سونے اور مہمانوں کے بٹھانے کے کام آتا تھا۔ وہاں ایک خستہ حال صوفہ سیٹ پڑا ہوا تھا۔ گھر کی حالت عسرت زدہ تھی اور دوسرے کمرے سے دھیمی نسوانی آوازیں بتا رہی تھیں کہ عورتیں یعنی غزالہ کی ماں اور بہنیں گھر میں تھیں۔ اس کے بہنوئی کا نام سہیل تھا۔ اس نے مجھ سے پھر پوچھا۔ "آپ غزالہ کو کیسے جانتے ہیں؟"

"بتاتا ہوں لیکن پہلے آپ بتائیں کہ کیا آپ کو معلوم ہے غزالہ کہاں ہے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "وہ قتل کے الزام میں پولیس کے پاس ہے لیکن اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں نہیں بتایا ورنہ پولیس اب تک یہاں آ چکی ہوتی۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ میں اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور میں اسے چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پر یہاں کیوں آئے ہیں، ہم بہت غریب لوگ ہیں آپ کی مدد نہیں کر سکتے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں میں کچھ مانگنے نہیں آیا ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "مجھے صرف کچھ باتوں کی تصدیق کرنی ہے۔"

اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی لیکن وہ جانتا تھا اور مجبور تھا اگر وہ مجھ سے تعاون نہیں کرے گا تو میں اس کے بارے میں پولیس کو بتا سکتا تھا اور اس کے بعد پولیس انہیں پریشان کرتی۔ "کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"غزالہ یہاں سے کب گئی؟"

اس نے سوچا اور پھر جو وقت بتایا وہ ملک ابراہیم کے قتل کے وقت سے میچ کرتا تھا۔ میں نے تصدیق چاہی۔ "یہ ملک ابراہیم کے قتل کے فوراً بعد کی بات ہے نا؟"

وہ چونکا۔ "آپ جانتے ہیں تو مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں نے کہا نا میں کچھ باتوں کی تصدیق کے لیے آیا ہوں۔ کیا غزالہ نے اس کے بعد دوبارہ رابطہ کیا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کے بعد وہ دوبارہ یہاں نہیں آئی اور نہ اس نے رابطہ کیا۔ تین سال بعد ہم نے ٹی وی پر اسے دیکھا ہے۔"

"محلے والوں کو پتا ہے کہ یہ اسی گھر سے تعلق رکھتی ہے؟"

"ایک دو کو پتا ہے لیکن کسی نے پولیس کو نہیں بتایا۔ پولیس تو سب کو رگڑ دے گی۔"

"میں غزالہ کی ماں اور بہنوں سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے ٹہلانے کی کوشش کی لیکن جب میں نے پولیس کا کہا تو وہ سیدھا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد میلے اور عام سے کپڑوں میں تین عام سی عورتیں میرے سامنے بیٹھی تھیں۔ بوڑھی عورت غزالہ کی ماں تھی اور ادھیڑ عمر اس کی بہنیں تھیں۔ شکل صورت میں وہ غزالہ سے نہیں مل رہی تھیں اس کا مطلب تھا کہ وہ ان سب سے مختلف تھی۔ صحیح معنوں میں گدڑی کا لعل تھی۔ میں نے غزالہ کے بارے میں پوچھا اور اس کی بہنوں نے جو جوابات دیئے ان سے ایک نئی تصویر سامنے آئی۔ غزالہ نے یہاں بھی جھوٹ بولا تھا۔ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچپن سے نفسیاتی مریضہ تھی۔ ہر ایک سے لڑنا اور الجھنا اس کی فطرت میں شامل تھا، ساتھ ہی وہ بلا کی شاطر تھی اور اسے معلوم تھا کہ اپنا کام کیسے نکلواتے ہیں۔ چھوٹی تھی تو محلے کے دکانداروں کی چیزیں چرا کر لے آتی تھی۔ جب اس کی شکایت آتی تو معصوم بن جاتی۔ پھر ماں اسے کام پر لے جانے لگی۔ تعلیم والی بات درست تھی۔ لیکن اس کی ماں کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کی بیٹی اور ملک ابراہیم کے درمیان کیا چکر چل رہا ہے؟ اگر وہ باخبر تھی تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔ اس کے خیال میں ملک ابراہیم کے قتل اور غزالہ کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا جب کہ مجھے یقین تھا کہ ایسا ہی تھا۔ غزالہ بچپن سے شدید حاسد اور منفی سوچ رکھنے والی لڑکی تھی۔ اپنی بہنوں سے جلتی تھی۔ جب ان کے لیے کوئی رشتہ آتا تو جان بوجھ کر بن سنور کر رشتہ لانے والوں کے سامنے آتی تھی۔ وہ اس کی بہنوں کو چھوڑ کر اسے پسند کر جاتے تھے لیکن ماں انکار کر دیتی تھی۔ وہ اس پر ماں سے جھگڑتی تھی۔

ایک سوال جو میں ان عورتوں کے سامنے نہیں کر سکتا تھا وہ میں نے سہیل سے باہر گلی میں آ کر کیا۔ ''ایک بار غزالہ نے اپنے حالاتِ زندگی سنائے تھے اور اس نے الزام لگایا کہ آپ اور آپ کی سالی کے غلط تعلقات تھے۔''

سہیل کا چہرہ سرخ ہو گیا اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ خدا گواہ ہے میں نے نائلہ کو ہمیشہ اپنی چھوٹی بہن سمجھا ہے۔ ہاں جب میری شائلہ سے شادی ہوئی تو غزالہ کا رویہ مجھ سے بہت عجیب تھا۔ ایسا لگتا تھا وہ مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں میں عام صورت آدمی ہوں۔ میں نے غزالہ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن جب وہ نہیں سمجھی تو میں نے ماں جی اور شائلہ سے بات کی اور ان سے کہا کہ اب میں شائلہ کو لے کر الگ ہو رہا ہوں۔ مگر اس سے پہلے میں اس پر عمل کرتا غزالہ خود گھر چھوڑ کر چلی گئی۔ یوں میری جان چھوٹی، مگر اس نے یہ نئی کہانی چلائی ہے۔ میں غریب آدمی ہوں اور اس گھر کا واحد کفیل میں ہی ہوں۔ میں کسی مصیبت میں پڑ گیا تو یہ عورتیں کیا کریں گی؟''

''آپ فکر نہ کریں آپ کو کوئی تنگ نہیں کرے گا اور اگر پولیس آ جائے اور آپ کو تنگ کرے تو مجھے ایک فون کر دیجیے گا۔'' میں نے اسے اپنا نمبر دیا۔ ''ویسے مجھے یقین ہے غزالہ پولیس کو نہیں بتائے گی۔ ورنہ اس کے اور بھی جھوٹ پکڑے جائیں گے۔''

''آپ کا شکریہ صاحب ورنہ ہم تو پریشان ہیں کہ اس کے کرتوتوں کا پھل ہمیں بھی نہ چکھنا پڑے۔''

''امید تو ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے آپ کا کیا خیال ہے جب غزالہ ایک شخص کو قتل کر سکتی ہے تو کیا وہ ملک ابراہیم کو قتل نہیں کر سکتی؟''

وہ چونک گیا پھر اس نے جوش سے کہا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے وہ اسی دن تو غائب ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کے بعد گھر آئی اور جلدی میں اپنا سامان لیا اور چلی گئی۔ اس وقت صرف نائلہ گھر میں تھی۔ اگلے دن اماں کام کرنے گئی تو پتا چلا کہ ملک ابراہیم کا قتل ہو چکا ہے۔ اس کی بیوی صدمے سے مر گئی تھی۔''

اچانک مجھے خیال آیا۔ ''سہیل صاحب اس محلے میں ایک رشید چاچا نامی دکاندار رہتا تھا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں لیکن ایک دن اس کی دکان میں آگ لگ گئی، وہ خود بھی دکان کا سامان بچانے کے چکر میں جل مرا۔''

سہیل نے میرے شبہے کی تصدیق کر دی تھی۔ غزالہ میری توقع سے زیادہ خطرناک نکلی تھی۔ اس نے صرف سمیر کی جان نہیں لی تھی بلکہ ملک ابراہیم اور رشید کو بھی مارا تھا۔ یہ اس کے مجرم تھے۔ اسی کی وجہ سے جنید اور حیدر آپس میں لڑ پڑے۔ شاید وہ ہر اس مرد کی جانی دشمن بن جاتی تھی جو اس کی خوب صورتی اور جسمانی دلکشی کے چکر میں اس کے پاس آتا تھا یا اس سے کوئی فائدہ اٹھاتا تھا۔ اب مجھے وکیل کی عافیت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ وہ بھی یقیناً غزالہ کی خوب صورتی کی وجہ سے آگے آیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے غزالہ کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا تھا وہ اس کے پاس تھی۔ وہ اسے رہا کرائے گا اور بالآخر خود اس کے ہاتھوں یا اس کی سازش سے موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ غزالہ کے اندر ایک نفسیاتی قاتل چھپا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں نے کبھی اسے اس نظر سے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس میں دل چسپی لی تھی۔ میں نے واپس آ کر اپنے اخبار کے ایک کورٹ رپورٹر سے ثنار ... کے دیگر نمبر مانگے۔ اس نے مجھے چار نمبر دے دیئے۔ ان میں ثنار ... کے دو گھروں کے نمبر بھی تھے۔ اس نے کہا۔

''یہ فکسڈ فون نمبر اس کی ایک خفیہ کوٹھی کا ہے یہاں وہ من پسند خواتین سے ملاقات کرتا ہے۔ نمبر کسی کو دیتا نہیں ہے۔ مجھے کسی طرح معلوم ہو گیا لیکن تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''میں غزالہ پر فیچر لکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے ثنار ... کا دوسرا موبائل نمبر ملایا۔ ایک پر تو اس نے مجھے بلاک کر دیا تھا۔ مجھے اس کا نمبر ملاتے ہوئے خیال آیا کہ میں اسے کسی دوسرے نمبر سے بھی تو کال کر سکتا تھا لیکن جب میں نے نمبر ملایا تو اسے بند پایا۔ اچھا ہوا میں نے کورٹ رپورٹر سے بات کر لی اور اس نے مجھے سارے نمبر دے دیئے۔ اس بار میں نے اس کے گھر کا نمبر ملایا۔ فون اس کے کسی ملازم نے اٹھایا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس نے شادی نہیں کی ہے اور اکیلا رہتا ہے۔ اکیلا ہونے کی وجہ سے کھل کر عیاشی کر سکتا تھا۔ کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے ثنار ... سے بات کرانے کو کہا تو وہ بولا۔ ''صاحب تو گھر پر نہیں ہیں۔ آپ نام بتا دیں جب وہ آئیں گے تو آپ کو کال کر لیں گے۔''

''اچھا نکل گئے ہیں۔'' میں نے یوں کہا جیسے اس کے پروگرام سے واقف ہوں۔ ''اپنی دوسری کوٹھی کی طرف گئے ہیں غزالہ بی بی کو لے کر؟''

''جی جی۔'' اس نے جلدی سے تصدیق کی۔

میں نے پھر تکا مارا۔ ''گھٹنا ہو گیا ہے نا نکلے ہوئے؟''

''نہیں جی ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ کر ثنار ... کی اس کوٹھی کا نمبر ملایا جو اس نے اپنی عیش و عشرت کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ وہاں بیل جا رہی تھی لیکن کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ ایک بار لائن کٹ گئی تو میں نے دوبارہ ملائی لیکن اس بار بھی کسی نے ریسیو نہیں کیا۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی کیونکہ یہ فکسڈ فون تھا اس لیے میں نے ہیلپ لائن پر کال کر کے جگہ کا پتا لے لیا۔ پتا گلشن کی ایک پوش آبادی کا تھا۔ میرے پاس ون ٹو فائیو بائک تھی جو اسپیڈ کے معاملے میں مشہور ہے لیکن آج تک میں نے اسے ہمیشہ محتاط رفتار سے چلایا تھا۔ پہلی بار میں نے اس کی رفتار آزمائی اور اس نے مجھے مایوس نہیں کیا تھا۔ آدھے گھنٹے میں، میں اس چھوٹی سی کوٹھی کے سامنے تھا۔ یہاں سناٹا تھا کیونکہ آس پاس بھی کوٹھیاں تھیں۔ میں نے پتا چیک کیا اور پھر گیٹ سے اندر جھانکا۔ پورچ میں کار کھڑی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ اندر ہی تھے۔

میں نے گیٹ کے بغلی دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کھل گیا۔ میرے اندر پھر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ ان حالات میں دروازہ اس طرح بے پروائی سے کھلا چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دبے قدموں اندر آیا۔ حسبِ توقع کوٹھی کا داخلی دروازہ بھی کھلا ہوا تھا۔ میں اندر آیا۔ یہ بڑی سی نشست گاہ تھی۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں پہلے میں نے نیچے دیکھا لیکن نیچے کوئی نہیں تھا۔ پھر میں اوپر آیا۔ کوٹھی کے اندر مکمل سناٹا تھا جیسے کوئی ذی روح باقی نہ رہا ہو۔ اوپر صرف دو بیڈ روم تھے ایک لاک تھا لیکن دوسرا کھلا ہوا تھا اور ثنار ... قالین پر اوندھے منہ پڑا تھا اس کا سر خون خون ہو رہا تھا اور یہ خون قالین پر بھی پھیلا ہوا تھا۔ اس کے سر پر جس عریاں عورت کی پیتل کی مورتی سے ضرب لگائی گئی تھی وہ اس کے پاس ہی پڑی تھی۔ پہلے تو مجھے لگا کہ وہ مر چکا ہے۔ لیکن جب میں نے اس کی گردن پر نبض چیک کی تو وہ سست روی سے چل رہی تھی۔ میں نے فوری طور پر ایک ایمبولینس سروس کو اس کے گھر کے فون سے کال کی اور پتا بتاتے ہوئے یہاں ایمبولینس بھیجنے کو کہا۔ کال کر کے کمرے کا جائزہ لیا۔ میری توجہ بستر پر پڑے ایک خالی بریف کیس کی طرف گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس میں موجود چیزیں نکال کر اسے یہاں پھینک دیا گیا تھا۔

میں نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا اور میں اس معاملے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا اس لیے ایمبولینس آنے سے پہلے وہاں سے نکل آیا۔ میں نے جان بوجھ کر تمام دروازے کھلے چھوڑ دیئے تھے۔ تاکہ ایمبولینس والے بے دھڑک اندر چلے جائیں۔ میں کچھ دور بائک سمیت موجود رہا ایمبولینس والے آئے اور دیر تک کال بیل بجاتے رہے۔ جب ان کو جواب نہیں ملا تو انہوں نے آس پاس کے لوگوں کو بلایا اور پھر ان کے ساتھ اندر گئے۔ کچھ دیر بعد ثنار کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمبولینس میں منتقل کیا گیا تو میں بھی وہاں سے روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی جان بچ جائے گی اور وہ غزالہ کے بارے میں بتا سکے گا۔ مجھے ایک فیصد بھی شبہ نہیں تھا کہ یہ غزالہ حرکت نہیں تھی۔ اس نے وہی کیا تھا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ ثنار نے غزالہ کو نہیں اپنی شامت کو آزاد کرایا تھا۔ وہ غائب ہو گئی تھی اور میں اس معاملے میں دخل دیتا تو بلاوجہ تفتیش میں شامل کر لیا جاتا۔ اب سارا انحصار ثنار ... پر تھا۔ اگلے روز پتا چلا کہ وہ بچ گیا تھا اور ہوش میں بھی آ گیا تھا لیکن اس کا دماغی توازن متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ضرب سے اس کا دماغ متاثر ہوا تھا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ کب تک ری کور کر سکتا تھا۔

مزے کی بات ہے پولیس یا کسی نے ثنار ... پر حملے کو غزالہ سے منسوب نہیں کیا تھا۔ پولیس کا خیال تھا کہ یہ کسی چور

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا کام تھا۔ وہ نثار کے پیچھے کوٹھی میں داخل ہوا اور بیڈ روم میں اس پر حملہ کر کے بریف کیس میں موجود رقم یا کوئی اور قیمتی چیز لے کر فرار ہو گیا۔ چند دن بعد غزالہ کا ایشو اٹھا بھی کہ وہ کہاں تھی تب بھی کسی کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔ جب غزالہ منظر سے غائب رہی تو اس کے فرار کی خبریں گردش کرنے لگیں۔ عدالت میں اس کے خلاف چلنے والا کیس بھی التوا میں پڑ گیا کیونکہ نثار... پیروی کے قابل نہیں تھا۔ چند مہینے بعد کیس اور نثار و غزالہ دونوں کی خبریں پرانی ہو گئیں۔ غزالہ کو مفرور قرار دے دیا گیا۔ نثار بدستور غیر متوازن ذہن کے ساتھ اپنی کوٹھی میں موجود تھا۔ میرے پاس اپنی اسٹوری کو ثابت کرنے کے لیے کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اگر میں اسے اسٹوری بناتا تو غزالہ کا سراغ نہ ملتا لیکن اس کے بے گناہ گھر والے ضرور مشکل میں پڑ جاتے اس لیے میں نے اس معاملے کو خود تک رکھنے کا فیصلہ کیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ فیچر کی صورت میں نہ سہی میں اسے سچ بیانی کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر سکتا ہوں۔

میں نے تمام واقعات اسی طرح لکھے جیسے یہ پیش آئے تھے لیکن اس کا انجام نہیں تھا اور میں تذبذب میں تھا کہ کیا کروں اسے شائع ہونے کے لیے بھیجوں یا نہ بھیجوں۔ مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا میں کوئی فکشن رائٹر نہیں ہوں جو اس میں اپنی مرضی کا انجام ڈال دیتا۔ تنگ آ کر میں نے اسے اسی صورت میں بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن جس صبح میں اسے پوسٹ کرنے والا تھا اسی رات کو کال آئی۔ نمبر مڈل ایسٹ کے ایک ملک کا تھا۔ یہاں میرے کئی واقف کار اور رشتے دار تھے اور میں سمجھا کہ ان میں سے ہی کسی کی کال آئی ہے۔ لیکن جب میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی نسوانی آواز نے کہا۔ ''مظہر پہچانا مجھے.....؟''

میں نے پہچان لیا تھا اسی لیے بڑی مشکل سے میرے حلق سے آواز نکلی۔ ''غزالہ تم.....''

وہ ہنسی۔ ''اس کا مطلب ہے تم مجھے بھولے نہیں ہو۔''

''تم بھولنے والی چیز بھی نہیں ہو۔'' میں نے سنبھل کر تلخ لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ سچ مچ نفسیاتی ہو چکی ہو میں سمجھتا تھا کہ تم صرف اداکاری کرتی ہو۔''

''میں بھی یہی سمجھتی تھی۔'' اس نے تردید نہیں کی۔ ''جب میں نے رشید چچا اور ملک ابراہیم کو قتل کیا تھا تب میں سمجھی تھی کہ شاید میں نے اندرونی غم و غصے سے مجبور ہو کر یہ کام کیے ہیں۔ لیکن سمیر کو مارتے وقت مجھے جو لذت اور سکون ملا اس سے مجھے بھی یقین ہو گیا کہ میں پاگل ہوں۔ ایسی پاگل جو بہ ظاہر پاگل نہیں لگتی ہے۔''

''پھر تم نے نثار کو قتل کرنا چاہا۔''

''درست ہے، ویسے تم اپنے ایمان سے کہو میں نے جن لوگوں کو قتل کیا کیا وہ اس قابل نہیں تھے۔ سب سے گھناؤنا شخص تو یہ نثار نکلا۔ مجھے اس کے بچنے کا افسوس ساری عمر رہے گا۔''

''وہ دماغی توازن کھو چکا ہے اور اب تک صحت یابی کے کوئی آثار نہیں ہیں۔'' میں نے کہا پھر مجھے خیال آیا۔ ''تم باہر کیسے نکلیں؟''

''اسی نے سارا انتظام کیا تھا۔ میرے لیے جعلی پاسپورٹ اور دوسرے کاغذات بنوائے اور پھر ایک لاکھ ڈالرز میں نے نکلوا لیے۔ یہ اسے اسی دن ملے تھے۔ اس رقم سے میرا کام آسان ہو گیا۔ اب میں مزے سے یہاں رہ رہی ہوں۔ کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رقم انویسٹ کر دی ہے اس کا ماہانہ منافع میرے لیے کافی ہے پھر جاب یا اپنا کوئی کام بھی کر سکتی ہوں۔'' اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں بتایا۔

''ایک چیز تم بھول رہی ہو جو آنے والے دنوں میں بھی تمہیں سکون سے رہنے نہیں دے گی۔''

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔ ''اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے اب مردوں سے دور رہوں گی۔''

''میرا نہیں خیال کہ تم اپنے فیصلے پر قائم رہو گی' بہر حال فون کیوں کیا؟''

''مجھے اندازہ تھا کہ تم بے چین ہو گے اور پھر اس دنیا میں تم ہی ایک شخص ہو جو مجھ سے سب سے زیادہ واقف ہو' میں نے سوچا کہ جو تم نہیں جانتے وہ بھی تمہیں بتا دوں لیکن خیال رہے تم مجھے تلاش نہیں کر سکتے۔'' اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

''مجھے ضرورت بھی نہیں ہے اور معلومات فراہم کرنے کا شکریہ۔''

وہ ہنسی۔ ''ممکن ہے کبھی تم یہاں آؤ تو مجھ سے ملاقات ہو جائے۔''

''اللہ نہ کرے ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

وہ زور سے ہنسی اور کال کاٹ دی۔ میری کہانی مکمل ہو گئی تھی۔

تلافی

محترمہ عذرا رسول۔
سلامِ تہنیت!
میری زندگی کاغذ کی کشتی بنا پتوار کی بن گئی تھی اور ایسا کیا تھا میرے شوہر نے جو خود میں عجیب تھا۔ اس نے کس طرح میری زندگی کو جہنم زار بنایا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

نوشابہ
(لاہور)

کالج سے گھر واپس آئی تو خالہ زیتون کو امی کے پاس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی اور مجھے لگا کہ خطرہ سر پر آن پہنچا ہے۔ خالہ زیتون، محلے کیا پورے علاقے کے نوجوانوں کے لیے دہشت کی علامت تھیں۔ ان کی نظر جس لڑکے یا لڑکی پر ٹھہر جاتی پھر اس کی خیر نہیں اور وہ اس کی شادی کروا کر ہی دم لیتیں۔ اسی لیے محلے کے تمام لڑکے لڑکیاں ان کے سامنے آنے سے کتراتے تاکہ ان کی عقابی نظروں سے محفوظ رہ سکیں۔ خالہ زیتون کو رشتے کروانے میں کمال

حاصل تھا۔ اس لیے جوان لڑکیوں کی مائیں ان کی بڑی آؤ بھگت کرتیں۔ خالہ نے بے شمار لڑکیوں کی شادیاں کروائی تھیں۔ ان میں ہر طرح کی لڑکیاں شامل تھیں۔ خوبصورت، تعلیم یافتہ، سلیقہ مند، بدصورت، جاہل یا پھوہڑ، خالہ کے لیے یہ سب باتیں غیر اہم تھیں۔ انہیں جو ٹاسک دیا گیا وہ اس میں کبھی ناکام نہیں ہوئیں اور لڑکی کے معیار کے مطابق رشتہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتیں۔ غرضیکہ وہ چلتا پھرتا میرج بیورو تھیں لیکن ان میں لالچ نام کو نہیں تھا۔ انہیں پیسوں کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ دونوں بیٹے برسرِروزگار تھے اور شادی شدہ ہونے کے باوجود ماں کی ضروریات کا پوری طرح خیال رکھتے تھے۔ اسی لیے خالہ نہ تو کوئی ایڈوانس لیتی تھیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی فیس مقرر کر رکھی تھی۔ لڑکے یا لڑکی والے اپنی خوشی سے جو دیتے وہ اسے قبول کرلیتیں۔

میں نے انہیں سلام کیا اور ان کے پاس رکے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں دیکھ کر میرا موڈ آف ہوگیا تھا۔ ان کا ہمارے گھر آنا خالی از علت نہیں تھا۔ ضرور وہ میرے لیے کوئی رشتہ لے کر آئی ہوں گی۔ حالانکہ امی نے اس سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی تھی پھر نہ جانے میں کیسے ان کی نظروں میں آگئی۔ یقیناً کسی نے ان سے لڑکی ڈھونڈنے کے لیے کہا ہوگا اور وہ اِدھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد ہمارے گھر چلی آئی تھیں۔

میرا اندیشہ درست ثابت ہوا۔ ان کے جانے کے بعد امی میرے پاس آئیں اور ایک تصویر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولیں ”تمہارے لیے ایک بہت اچھا رشتہ آیا ہے۔ تم یہ تصویر دیکھ لو۔ اگر پسند ہو تو بات آگے بڑھائی جائے۔“

میں نے تصویر دیکھے بغیر ایک طرف رکھ دی اور بولی ”ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔ کم از کم میری تعلیم تو مکمل ہونے دیں۔“

”یہ تمہارا آخری سیمسٹر ہے۔ چند ماہ بعد فارغ ہوجاؤ گی۔ اس لیے پڑھائی کا بہانہ نہیں چلے گا۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بات ہے تو بتاؤ۔“

”میں جاب کروں گی۔ گھر بیٹھ کر سولہ سال کی محنت ضائع نہیں کرسکتی۔“

”یہ شوق شادی کے بعد پورا کرلینا۔ ہم تمہیں ساری عمر گھر تو نہیں بٹھا سکتے۔ شادی کی ایک عمر ہوتی ہے اگر وہ نکل جائے تو رشتے آنا بند ہوجاتے ہیں۔“

امی کی دلیل کو رد کرنا میرے لیے آسان نہ تھا۔ میں نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا۔ ”مجھے سوچنے کے لیے وقت چاہیے۔“

”اچھی طرح سوچ لو۔ ایک دن، دو دن، ایک ہفتہ یا ایک مہینا، کوئی جلدی نہیں ہے لیکن یہ سمجھ لو کہ تمہاری شادی کا وقت آن پہنچا ہے۔ یہ پہلا پتھر ہے۔ اس کے بعد مزید پتھر آئیں گے۔ اس لیے تمہیں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوجانا چاہیے۔ میرے خیال میں تو یہ انتہائی مناسب رشتہ ہے۔ اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہوگا۔“

امی نے جو تفصیلات بتائیں، اس لحاظ سے یہ واقعی ایک مناسب رشتہ تھا۔ اشرف نے ایم بی اے کرنے کے بعد اسی مضمون میں انگلینڈ سے اسپیشلائز کیا تھا اور واپس آنے کے بعد ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدہ پر فائز ہوگئے تھے۔ وہ ایک پُرآسائش زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی کی ہر سہولت انہیں میسر تھی۔ ماں کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ بڑی بہن انگلینڈ میں مقیم تھی۔ وہ ماں کے مرنے پر پاکستان آئی تھی اور چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے بھائی کی شادی کردے۔ کسی میلاد کی محفل میں اس کی ملاقات خالہ زیتون سے ہوئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ رشتے کرانے کی ماہر ہیں تو اس نے ان سے بھائی کے لیے لڑکی دیکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ بظاہر یہ ایک مناسب رشتہ تھا اور میرے پاس اسے رد کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی لیکن اس دل کا کیا کرتی جس پر پہلے ہی کوئی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔

دوسرے دن میں نے فری پیریڈ میں جلیل کو اس صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی فکرمند ہوجائے گا۔ ہم اس وقت کیفے ٹیریا میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اس نے یہ خبر سننے کے بعد کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا بلکہ چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں یہ پروپوزل قبول کرلینا چاہیے۔“

میرا دل چاہا کہ چائے کی پیالی اس کے سر پر دے ماروں۔ یہاں میری جان پر بن رہی تھی اور اسے مذاق سوجھ رہا تھا۔ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم کہہ رہے ہو جبکہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہارے سوا کسی اور سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”میرا خیال دل سے نکال دو شبانہ“ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے حالات اور ذمے داریوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکو گی۔“

”حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے۔ تم سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کرو۔ سرکاری افسر بن گئے تو میرے گھر والوں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“

میں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔ اول تو سرکاری نوکری میرے مزاج کے خلاف ہے اور ویسے بھی سفارش یا رشوت کے بغیر اس کا حصول ممکن نہیں۔ بالفرض اگر سرکاری افسر لگ گیا تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں چھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ ابو کام کرنے کے قابل نہیں رہے۔ ہمارا دو کمروں کا مکان ہے جس کی چھت برسات میں ٹپکتی ہے۔ میں تمہیں کہاں رکھوں گا۔ کیا کھلاؤں گا کیا پہناؤں گا۔ نہیں شبانہ نہیں۔ ایسے خواب مت دیکھو جن کی کوئی تعبیر نہ ہو۔“

”جلیل، مجھ پر بھروسا کرو۔ میں ہر حال میں تمہارا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ سب جذباتی باتیں ہیں، میں تمہارا مسیحا اور دوست ہوں۔ ایک اچھی زندگی گزارنا تمہارا حق ہے اور میں محض اپنی خواہشات کی خاطر تمہیں اس حق سے محروم نہیں کرسکتا۔ تم گھر جاکر تنہائی میں اچھی طرح سوچو۔ تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ میری باتوں میں کتنی حقیقت ہے۔“

اس نے مجھے بری طرح مایوس کیا تھا لیکن اس سے مزید بحث کرنا بے کار تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھنے ہی والی تھی کہ راشد اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ وہاں آگیا۔ وہ بھی میری کلاس کا تھا لیکن اس کی خراب شہرت کی وجہ سے لڑکیاں اس سے دور رہا کرتی تھیں۔ وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں میرے پاس آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ”شبانہ! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“

میں نے نفرت سے اسے دیکھا اور کوئی جواب دیے بغیر اٹھ کر جانے لگی۔ وہ اچانک ہی میرے سامنے آگیا اور راستہ روکتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھ سے بات کیے بغیر نہیں جاسکتیں۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے غصّے سے کہا ”چھوڑو میرا راستہ۔ میں تم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔“

”کیوں؟ اس مچھندر کے ساتھ تو گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرتی ہو۔ مجھ میں کیا خرابی ہے؟“

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟“ میں نے تنک کر کہا۔

”بہت جلد پتا چل جائے گا کہ میں تمہارا کون ہوں۔ کان کھول کر سن لو۔ اگر تم مجھ سے بات نہیں کرو گی تو میں کسی اور سے بھی تمہیں بات نہیں کرنے دوں گا۔ خاص طور پر اس مچھندر سے تو بالکل نہیں۔“

جلیل فطرتاً صلح جو واقع ہوا تھا۔ اس لیے خاموش بیٹھا رہا لیکن جب پانی سر سے گزرنے لگا تو اس سے برداشت نہ ہوسکا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ہم دونوں کے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ”اے مسٹر! بہت ہوگیا۔ اب یہاں سے چلتے پھرتے نظر آؤ۔ اور ہاں اگر آئندہ تم نے نوشابہ کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

”کیوں؟ تو اس کا ماما لگتا ہے کیا؟“ راشد ایک دم ہی تو تڑاخ پر اتر آیا۔

جلیل سے ضبط نہ ہوسکا۔ اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور اس نے ایک زوردار تھپڑ راشد کو جڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ بات آگے بڑھتی دو تین لڑکے اپنی میزوں سے اٹھ کر آگئے اور انہوں نے بیچ بچاؤ کروادیا۔ راشد اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا، تجھے یہ تھپڑ بہت مہنگا پڑے گا۔“

اس کے جانے کے بعد میں جلیل سے الجھ پڑی۔ ”کیا ضرورت تھی اس کے منہ لگنے کی۔ جانتے نہیں کہ کتنا خطرناک شخص ہے اور وہ تمہیں دھمکی بھی دے کر گیا ہے۔“

”میں ان گیدڑ بھبکیوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اگر اس نے آئندہ تمہیں تنگ کیا تو اپنی ٹانگوں پر چل کر گھر نہیں جاسکے گا۔“

”اب غصہ تھوک دو۔“ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ وہ تمہارا دشمن بن جائے۔“

”میں ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔“

اس دن کے بعد سے وہ میرا سایہ بن کر رہ گیا۔ یونیورسٹی میں پورے وقت وہ میرے ساتھ رہتا۔ ہم اکٹھے لائبریری اور کیفے ٹیریا جاتے اور چھٹی ہونے پر وہ مجھے بس اسٹاپ تک چھوڑنے آتا۔ راشد نے اس دوران کئی مرتبہ میرے قریب آنے کی کوشش کی لیکن جلیل کی وجہ سے اسے موقع نہ مل سکا۔

تین چار دن بعد امی نے پھر مجھ سے جواب مانگا۔ میں نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی تو وہ ڈانٹ ڈپٹ پر اتر آئیں اور انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر میں کسی اور کو پسند کرتی ہوں تو بتادوں اگر لڑکا ان کے معیار کا ہوا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بصورت دیگر وہ اشرف کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھ میری شادی طے کردیں گی۔ میں نے ان سے دو دن کی مہلت مانگی تاکہ ایک بار پھر جلیل سے بات کرسکوں۔

اگلے روز جلیل یونیورسٹی نہیں آیا اور راشد کو مجھ سے بات کرنے کا موقع مل گیا۔ میں لائبریری میں بیٹھی ہوئی تھی کہ وہ شیطان کی طرح نازل ہوگیا اور میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آج تمہارا باڈی گارڈ نظر نہیں آرہا؟“

میں نے اسے گھور کر دیکھا اور کتاب پر نظریں جمادیں۔

وہ ڈھیٹ کی طرح ہنستے ہوئے بولا۔ ”جانتا ہوں کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں لیکن میں اتنا برا نہیں جتنا تم سمجھ رہی ہو اور نہ ہی میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ جی چاہا کہ کتاب اس کے منہ پر دے ماروں۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور غصے سے بولی۔ ”تم جیسے شخص سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔“

وہ بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم جلیل سے شادی کرنے کا خواب دیکھ رہی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے اگر اس سے شادی کی تو میں تم دونوں کی زندگی جہنم بنادوں گا۔ ہوسکتا ہے کہ تم شادی سے پہلے ہی بیوہ ہوجاؤ۔“

میں لرز کر رہ گئی۔ راشد جیسے شخص سے کچھ بعید نہیں تھا۔ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو جلیل کی زندگی خطرے میں پڑسکتی تھی اور اگر اس کی بات مان لیتی تو خود میری زندگی جہنم بن جاتی۔ اب میرے پاس ایک ہی آپشن رہ گیا تھا کہ اشرف کا رشتہ قبول کرلوں۔ اسی صورت میں ہم دونوں کی زندگیاں محفوظ رہ سکتی تھیں لیکن اس سے پہلے میں ایک مرتبہ جلیل سے کھل کر بات کرنا چاہ رہی تھی۔

اگلے روز وہ یونیورسٹی آیا تو میں کینٹین یا جانے کے بجائے ایک دوسرے اسپاٹ پر لے گئی جہاں نسبتاً کم رش ہوتا تھا اور جب میں نے اسے بتایا کہ امی نے مجھ سے فائنل جواب مانگا ہے تو وہ بولا۔ ”میرا تو یہی مشورہ ہے کہ یہ رشتہ قبول کرلو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہر لڑکی ایک محفوظ مستقبل چاہتی ہے اور جو کچھ تم نے اشرف صاحب کے بارے میں بتایا ہے اس لحاظ سے وہ ایک آئیڈیل شوہر ثابت ہوسکتے ہیں۔“

”کتنی آسانی سے تم نے یہ سب کہہ دیا۔ تمہیں میرے جذبات کی بالکل بھی پروا نہیں ہے۔“

”زندگی جذبات کے سہارے نہیں گزاری جاتی۔ ذرا سوچو اگر میں تمہاری بات مان لوں یا دل کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنے والدین کو تمہارے گھر رشتہ مانگنے بھیج دوں تو کیا ہوگا۔ جب تمہارے والدین کو ہماری حیثیت اور گھریلو حالات کا علم ہوگا تو وہ انکار کرنے میں ایک منٹ کی بھی دیر نہیں لگائیں گے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں دھکیلنا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں جب تک میرے بہن بھائیوں کی تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی اور میں خود کسی قابل نہیں ہوجاتا۔

جلیل نے مجھے مکمل طور پر مایوس کردیا تھا۔ اب اس کے بارے میں مزید سوچنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ گھر آنے کے بعد میں نے اس کی باتوں پر سنجیدگی سے غور کیا تو مجھے ان میں حقیقت نظر آئی۔ اگر یونیورسٹی کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد اسے فوراً ملازمت مل جاتی جس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا تب بھی وہ شادی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ پہلے ہی ذمے داریوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا میرے ناز نخرے کیسے اٹھاتا۔ اس کی تو اتنی حیثیت بھی نہ تھی کہ مجھے ایک وقت کا کھانا باہر لے جاکر کھلادے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جس گھر میں رہتا تھا وہاں میرے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی اور جلیل علیحدہ مکان افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ اس سے شادی ہونے کی صرف ایک ہی صورت تھی کہ وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کرکے سرکاری افسر بن جائے اور تین چار سال بعد اس قابل ہوجائے کہ میرا رشتہ مانگ سکے لیکن یہ محض ایک مفروضہ تھا جس کے قابلِ عمل ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔

دوسری طرف راشد کی خواہش نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ اگر واقعی وہ میرے لیے سنجیدہ ہوجاتا تو میری زندگی عذاب بن جاتی۔ شادی کرنا تو دور کی بات میں اس کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا اور ہوسکتا ہے کہ کسی دن وہ اپنے والدین کو لے کر میرا رشتہ مانگنے آجاتا۔ جلیل سے تو مایوس ہوچکی تھی۔ اب راشد کے عزائم ناکام بنانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ میں اشرف کا رشتہ قبول کرلوں۔

☆☆☆

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ میں نے جلیل کے علاوہ اپنے کچھ قریبی کلاس فیلوز کو بھی مدعو کیا۔ فراز کا ذکر کرنا تو میں بھول ہی گئی حالانکہ وہ بھی اس کہانی کا اہم کردار ہے۔

وہ ایک بڑے مل اونر کا بیٹا تھا لیکن اس میں غرور نام کو نہیں تھا۔ وہ مجھے بہنوں کی طرح سمجھتا اور میں بھی اس سے بہت سی باتیں شیئر کرلیتی تھی۔ اسے میری اور جلیل کی محبت کا علم تھا اور اس نے آخر وقت تک کوشش کی کہ جلیل مجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہوجائے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ جلیل کو ملازمت کے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے اپنے پپا کی مل میں اچھی جاب دلوادے گا لیکن جلیل نے اس کی پیشکش یہ کہہ کر ٹھکرادی کہ اسے کسی کا احسان لینا پسند نہیں۔ میں نے راشد کو بھی بلایا تھا تاکہ وہ اپنے خوابوں کے محل کو زمیں بوس ہوتا دیکھ سکے۔ میں نے اپنے تمام کلاس فیلوز سے اشرف کا تعارف کروایا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ فراز سے بہت متاثر ہوئے شاید اس لیے کہ وہ انہی کی کیٹگری کا تھا۔ جلیل سے انہوں نے سرسری انداز میں دو چار باتیں کیں جبکہ راشد کو بالکل منہ نہیں لگایا حالانکہ وہ ان سے بے تکلف ہونے کی کوشش کررہا تھا۔

اشرف میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو انہیں عام شوہروں سے مختلف یا منفرد بناتی۔ اس لیے میری نظر میں وہ ایک عام شوہر ہی تھے۔ ان میں کچھ خوبیاں تھیں تو کچھ خامیاں۔ مثلاً وہ نظم وضبط کے پابند اور نفاست پسند تھے۔ باقاعدگی سے دفتر جاتے اور وقت پر گھر آجاتے۔ اگر موڈ ہوتا تو مجھے کھانا کھلانے یا آئس کریم پارلر لے جاتے۔ روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ انہوں نے شادی کے فوراً بعد میرے نام سے بینک اکاؤنٹ کھول دیا جس میں ہر ماہ ایک معقول رقم میرے اخراجات کے لیے جمع ہوجاتی۔ اسی طرح میکے جانے پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ گھر میں کام کرنے کے لیے ملازمین تھے لیکن کھانا میں خود بناتی تھی..... جہاں تک ان کی خامیوں کا تعلق ہے تو ان میں سے کچھ ایسی تھیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ان میں احساسِ برتری بہت تھا۔ اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ انتہائی غیر رومانی واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے کبھی میرے سامنے کوئی رومانی ڈائیلاگ نہیں بولا۔ اگر میں کسی تقریب میں جانے کے لیے بنتی سنورتی تو کبھی یہ نہیں کہا کہ بہت اچھی لگ رہی ہو۔ نہ ہی کبھی میرے لیے کوئی تحفہ لائے لیکن ان کی ایک خامی جس نے میری زندگی برباد کردی وہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔

ان کی بڑی بہن ثمینہ آپا شادی کے بعد ایک ماہ تک ہمارے ساتھ رہیں پھر ان کے واپس جانے کا پروگرام بن گیا۔ انگلینڈ جانے سے ایک دن پہلے وہ میرے کمرے میں آئیں اور بڑے رازدارانہ انداز میں بولیں ”نوشابہ! شادی سے پہلے تمہارا کسی کے ساتھ کوئی افیئر تو نہیں تھا؟“

ان کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں حیران رہ گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انہیں ایسی بات کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میں نے بھی ان سے کوئی رعایت نہیں برتی اور تڑخ کر بولی۔ ”اگر کوئی افیئر ہوتا تو اشرف سے شادی نہ کرتی۔“

”تم تو برا مان گئیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل لڑکیاں نوجوانی میں کسی سے دل لگا لیتی ہیں لیکن کسی وجہ سے وہ تعلق قائم نہ رہ سکے تو ماں باپ کے کہنے پر شادی کرلیتی ہیں۔ کہیں تمہارے ساتھ تو ایسا نہیں ہوا؟“

”جی نہیں۔“ میں نے بے رحمی سے جواب دیا۔ میں بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہ رہی تھی۔

”اشرف نے تو تم سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی؟“

”جی نہیں۔“ میں نے ایک بار پھر وہی جواب دہرادیا۔

”دراصل یہ میں نے تم سے اس لیے پوچھا کہ اشرف کانوں کا کچا اور انتہائی شکی مزاج ہے۔ اس لیے میں چاہ رہی تھی کہ اگر کوئی ایسی بات ہے تو تم خود ہی اسے بتادو۔ اسے کہیں اور سے پتا چل گیا تو بہت ہنگامہ ہوگا اور تمہارے لیے ایک بڑی پریشانی کھڑی ہوجائے گی۔“

”آپ مجھ پر شک کررہی ہیں۔ کیا آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا؟“ میرے لہجے میں تیزی آگئی تھی۔

”میرے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ اشرف کا ہے میں اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ اگر اسے ذرا سا بھی شک ہوگیا تو تمہاری زندگی اجیرن ہوجائے گی۔“

”معاف کیجیے، شک کی بھی کوئی وجہ ہوتی ہے لیکن میرا ماضی بالکل بے داغ ہے۔“

”ایک بات اور سمجھادوں۔“ وہ بزرگانہ انداز میں بولیں ”کبھی اس سے جھوٹ مت بولنا اور نہ ہی اس سے کچھ چھپانا ورنہ بات کھل گئی تو تمہاری مصیبت آجائے گی۔“

”آپ بے فکر رہیں۔ ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔ وہ حاکمانہ ذہنیت کے مالک ہیں اور مجھے ان کے ساتھ رہ کر کنیز کی طرح زندگی گزارنا ہوگی۔“

”تم کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوگئیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ وہ تمہارا بہت خیال رکھتا ہے۔“

وہ بہن تھیں اس کی طرف داری کیوں نہ کرتیں۔ اس لیے میں نے بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہوگئی۔

شادی کے بعد یونیورسٹی کے دوستوں سے میرا رابطہ تقریباً ختم ہوگیا تھا۔ صرف نورین سے کبھی کبھار فون پر بات ہوجایا کرتی تھی۔ وہ فراز کی دوست تھی۔ اسی کی زبانی معلوم ہوا کہ جلیل ابھی تک بے روزگار ہے اور ٹیوشنز وغیرہ کرکے اپنا گزارہ کررہا ہے جبکہ فراز نے اپنے والد کی مل میں بیٹھنا شروع کردیا تھا۔ فراز نے ایک بار پھر جلیل کو اپنی مل میں جاب کرنے کی آفر دی لیکن وہ نہیں مانا۔ تب فراز نے اس کی مدد کرنے کا ایک اور طریقہ نکالا اور اسے اس بات پر قائل کرلیا کہ وہ اپنا شعری مجموعہ شائع کرے۔ میں یہ بتانا بھول ہی گئی کہ جلیل بہت اچھا شاعر اور افسانہ نگار تھا۔ اس کی غزلیں اور کہانیاں مختلف جرائد میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ فراز نے اس کی اشاعت کے اخراجات برداشت کرنے کی ذمے داری قبول کرلی اور کہا کہ جلیل یہ رقم قرض سمجھ کر قبول کرے۔ فراز کا خیال تھا کہ وہ اس کتاب کی تقریب رونمائی کے موقع پر ایک سوونیئر بھی شائع کرے گا جس کے اشتہارات سے کتاب کا خرچ پورا ہوجائے گا۔

کچھ ہی دن بعد نورین تقریبِ رونمائی کا دعوت نامہ لے کر میرے گھر آئی۔ اتفاق سے اس وقت اشرف گھر پر ہی تھے۔ نورین نے خاص طور پر انہیں تقریب میں آنے کے لیے کہا تو وہ بولے۔ ”مس نورین، مجھے شعر وشاعری سے کوئی دلچسپی نہیں اور اشعار میرے سر پر سے گزر جاتے ہیں۔ اس لیے میں وہاں آکر کیا کروں گا۔ نوشابہ چاہیں تو جاسکتی ہیں۔“

”یہ تو ایک بہانہ ہے نہ آنے کا اور میں بہانے سننے کی عادی نہیں ہوں۔“ نورین شوخ لہجے میں بولی۔ ”دو چار مرتبہ اس طرح کی تقریبات میں جائیں گے تو دلچسپی خود بخود پیدا ہوجائے گی اور آپ بھی بات بات پر شعر پڑھا کریں گے۔“

اشرف کے پاس انکار کی گنجائش نہ تھی لہٰذا انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور تقریب میں آنے کا وعدہ کرلیا۔ اس روز میں نے خاص طور پر اہتمام کیا۔ اپنی پسندیدہ ساڑی زیب تن کی۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور پوری سج دھج کے ساتھ تقریب میں جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ اس موقع پر بھی اشرف نے میری تعریف میں ایک لفظ نہیں کہا بس ایک نظر مجھے دیکھا اور گاڑی کی چابی انگلی میں گھماتے ہوئے پورچ کی طرف چل دیے۔

فراز نے تقریب کا اہتمام بڑے اچھے پیمانے پر کیا تھا۔ ہوٹل کے بنکوئٹ ہال میں کم از کم پانچ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ہال کی دیواروں اور سامنے اسکرین پر مختلف کمپنیوں کے بینر لگے ہوئے تھے۔ تقریب کی کوریج کے لیے اخباری نمائندوں اور ٹی وی کیمرامینوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ فراز نے مجھے اور اشرف کو سب سے آگے والی صف میں بٹھایا۔ جلیل سامنے اسٹیج پر بیٹھا ہوا تھا اور میں پوری طرح اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔

تقریب کا آغاز روایتی انداز میں ہوا۔ کچھ تقریریں ہوئیں پھر جلیل سے اس کا کلام سننے کی فرمائش کی گئی۔ وہ ڈائس پر آیا اور والہانہ انداز میں ایک غزل کے کچھ اشعار سنائے۔ اس دوران وہ بار بار میری طرف دیکھتا رہا۔ خدا جانے یہ حرکت غیر ارادی تھی یا وہ جان بوجھ کر ایسا کررہا تھا لیکن اشرف کی تیز نظروں نے اسے بھانپ لیا۔ تقریب کے بعد چائے کا دور چلا۔ نورین، فراز، جلیل، اشرف اور میں، ایک ہی میز پر تھے۔ جلیل نے ایک کتاب پر اپنے دستخط کیے اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری رائے کا انتظار رہے گا کیونکہ تم جھوٹی تعریف کے بجائے سچی تنقید کرتی ہو اور مجھے یہی بات پسند ہے۔“

جلیل سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے اشرف کے بجائے مجھے کتاب تھمادی۔ اوپر سے ایسے جملے کہہ دیے جو اشرف کے لیے ناپسندیدگی کا سبب بن سکتے تھے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ راشد کی حرکت نے سارا مزہ ہی کرکرا کردیا۔ شاید اسے معلوم ہوگیا ہوگا کہ جلیل نے مجھے اور اشرف کو بھی مدعو کیا ہے۔ وہ سیدھا چلتا ہوا ہماری میز پر آیا اور جلیل.... بولا۔ ”تم نے تو نہیں بلایا لیکن میں خود ہی چلا آیا۔ سوچا اسی بہانے کچھ دوسرے لوگوں سے ملاقات بھی ہوجائے گی جنہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں نگاہیں میری۔“

وہ میری طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں بولا تو میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہاں موجود سب لوگ سمجھ گئے کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے لیکن کسی نے اسے لفٹ نہیں کروائی۔ وہ بھی ایک نمبر کا ڈھیٹ تھا۔ اس نے ایک بار پھر جلیل کو مخاطب کیا اور بولا ”تمہاری شاعری میں بڑا درد ہے واقعی جب دل ٹوٹ جائے تو انسان کی یہی کیفیت ہوتی ہے اور اندر کا دکھ شعروں میں ڈھل کر باہر آتا ہے۔“

جلیل نے کچھ کہنا چاہا لیکن فراز نے اس کا ہاتھ دبادیا۔ وہ جانتا تھا کہ راشد شرارت پر آمادہ ہے اور جلیل

کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اشرف کی نظروں میں ذلیل کرنے کا پروگرام بنا کر آیا ہے۔ اس کے باوجود راشد باز نہیں آیا اور اشرف کو مخاطب کرکے بولا۔ ”آپ یہ کتاب ضرور پڑھیں تاکہ اس درد سے آشنا ہوسکیں جس نے شاعر کو اس حال تک پہنچادیا ہے۔“

اشرف نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”آپ بڑے دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی ہماری طرف آئیں پھر اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے کارڈ نکال کر اسے دیا جس پر گھر اور دفتر کا فون نمبر درج تھا۔ میرا ماتھا اسی وقت ٹھنکا اور میں سوچنے لگی کہ اشرف نے صرف راشد کو ہی اپنا کارڈ کیوں دیا۔ انہیں چاہیے تھا کہ وہ جلیل اور فراز کو بھی رسماً گھر آنے کی دعوت دیتے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں کچھ شک ہوگیا ہو اور وہ راشد سے تفصیل جاننا چاہ رہے ہوں۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ گھر پہنچتے ہی اشرف نے پہلا سوال جلیل کے بارے میں ہی کیا۔ ”یونیورسٹی میں جلیل کے ساتھ تمہارے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟“

”میں سمجھی نہیں۔ یہ آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟“

”میں نے فارسی نہیں بولی شبانہ بیگم! ایک عام سا سوال پوچھا ہے۔“

”میں یہی جاننا چاہ رہی ہوں کہ یہ فضول سا سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟“

”جلیل جس انداز میں تمہیں دیکھ کر شعر پڑھ رہا تھا اسے صرف میں نے ہی بلکہ وہاں موجود ہر شخص نے نوٹ کیا ہوگا۔ پھر تقریب کے اختتام پر اس نے صرف تمہیں ہی کتاب کیوں دی، وہاں اور لوگ بھی تھے۔ یہ کیوں کہا کہ اس پر رائے ضرور دینا۔ اس کے بعد راشد کی باتوں نے بھی مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا ہے لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“

”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو میں کبھی اس تقریب میں نہ جاتی۔ اگر آپ راشد کی بات کرتے ہیں تو وہ ایک چھچھورا اور بدنیت شخص ہے۔ میں نے ایک مرتبہ اس کی بے عزتی کردی تھی۔ وہ اسی کا بدلہ لے رہا ہے۔ جہاں تک جلیل کے ساتھ میرے تعلق کی بات ہے تو اس کے اور میرے درمیان صرف کلاس فیلو کا رشتہ تھا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔“

”فراز بھی تمہارا کلاس فیلو ہے لیکن مجھے اس کے

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کردیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

انداز میں تمہارے لیے وہ والہانہ پن نظر نہیں آیا جو جلیل میں تھا۔"

"شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ میں کس کھیت کی مولی ہوں۔" میں نے زچ ہوکر کہا۔ "آخری بار کہہ رہی ہوں کہ میرا جلیل کے ساتھ کوئی افیئر نہیں تھا۔ آپ کی مرضی کہ میری بات کا یقین کریں یا نہیں لیکن آج کے بعد اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔"

میرے لہجے کی مضبوطی نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کردیا۔ اور وہ منہ پھیر کر لیٹ گئے۔ اگلے روز ان کے دفتر جانے کے بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے راشد بول رہا تھا۔ "تم نے مجھے دھوکا دیا اور اشرف سے شادی کرلی لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ میں تمہارا جینا دوبھر کردوں گا۔ کل تو میں نے ٹریلر چلایا تھا۔ پوری فلم ابھی باقی ہے۔"

میں نے غصے میں آکر فون بند کردیا۔ ایک منٹ بعد فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ راشد کہہ رہا تھا۔ "اس طرح فون بند کرکے آسانی سے جان نہیں چھڑا سکتیں۔ میرے پاس بہت وقت ہے۔ سارا دن فون کرکے تمہیں تنگ کرتا رہوں گا اور اگر تم نے میری بات نہ سنی تو اشرف کی موجودگی میں بھی فون کرسکتا ہوں۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"اب آئی ہو سیدھے راستے پر۔ اگر تم چاہتی ہو کہ اشرف کو تمہارے اور جلیل کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں تو تمہیں میری زبان بند رکھنے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔"

"اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔" میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"زیادہ نہیں صرف پانچ ہزار۔ ہر مہینے میرے اکاؤنٹ میں جمع کرتی رہو۔ میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں تمہارا مطالبہ پورا نہیں کرسکتی۔"

"تو پھر اس کا نتیجہ بھگتنے کے لیے تیار ہوجاؤ۔"

"تمہارا جو دل چاہے کرو۔ مجھے کسی بات کی پروا نہیں۔" میں نے بے خوف لہجے میں کہا اور فون بند کردیا۔

صورتِ حال اچانک ہی سنگین ہوگئی تھی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ راشد اس حد تک گر سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ اگر جلیل کی کتاب کی تقریب میں نہ جاتی تو یہ سب نہ ہوتا۔ بہرحال تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب مجھے اس مشکل سچویشن سے نکلنا تھا۔ میں نے نورین کو فون کرکے اسے فوراً آنے کے لیے کہا۔ وہ میرا فون سنتے ہی دوڑی چلی آئی۔ میں نے اسے پوری صورتِ حال سے آگاہ کیا تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور بولی۔

"غلطی تمہاری ہے۔ تمہیں اشرف بھائی کو اپنے اور جلیل کے تعلق کے بارے میں بتادینا چاہیے تھا۔ ایک دوسرے کو پسند کرنا کوئی گناہ نہیں۔ یہ بات اور ہے کہ اسٹیٹس کے فرق کی وجہ سے یہ شادی نہ ہوسکی۔"

اس وقت مجھے ثمینہ آپا کی بات یاد آئی۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر میرا ماضی میں کسی کے ساتھ افیئر رہا ہے تو اشرف کو بتادوں اگر انہیں کسی اور ذریعہ سے پتا چل گیا تو بہت برا ہوگا لیکن میں اشرف کو کیا بتاتی۔ میرے اور جلیل کے درمیان جو تعلق تھا اسے افیئر کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ ہم کبھی ڈیٹ پر نہیں گئے۔ ہمارے درمیان محبت کے عہد و پیمان نہیں ہوئے۔ ساتھ مرنے اور ساتھ جینے کی قسمیں نہیں کھائی گئیں۔ جلیل نے کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر آئی لو یو، نہیں کہا اور نہ ہی میں نے اپنی کسی سہیلی کو شرماتے لجاتے ہوئے یہ بتایا کہ میری زندگی میں کوئی آگیا ہے۔

"اشرف کو تو میں سنبھال لوں گی۔ یہ بتاؤ کہ راشد سے کیسے نمٹا جائے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اپنے اور جلیل کے تعلق کے ساتھ ساتھ راشد کے کرتوتوں کے بارے میں بھی اشرف کو بتادو تاکہ انہیں بھی معلوم ہوجائے کہ راشد اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے یہ سب کچھ کررہا ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ مجھے اشرف کو سب کچھ بتادینا چاہیے۔"

اس روز شام کو میں نے ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ اشرف کا استقبال کیا لیکن ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ راشد نے اپنا کام دکھادیا ہے۔ اب مجھے اس کا توڑ کرنا تھا۔ میں اشرف کے پیچھے پیچھے کمرے میں آئی اور بولی۔ "کیا بات ہے، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"ہاں۔" وہ منہ پھیرتے ہوئے بولے۔ "مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔"

"چائے لاؤں۔" میں نے ایک ادا سے کہا۔

"نہیں، میرا موڈ نہیں ہے۔"

"کیا بات ہے، مجھ سے ناراض ہیں؟"

اشرف سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "راشد میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے تمہارے اور جلیل کے بارے میں سب کچھ بتادیا ہے۔"

"آپ نے راشد کی بات تو سن لی۔ کچھ میری بھی سن لیں۔ عدالت بھی سزا سنانے سے پہلے ملزم کو صفائی کا موقع دیتی ہے۔"

وہ کچھ نرم پڑتے ہوئے بولے۔ "کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"راشد کی باتوں پر دھیان دینے سے پہلے یہ جان لیں کہ وہ ایک بلیک میلر ہے آج صبح اس نے مجھے فون کرکے کہا کہ اگر میں نے اس کا مطالبہ پورا نہ کیا تو وہ آپ کو میرے اور جلیل کے تعلق کے بارے میں سب کچھ بتادے گا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر میں اسے ہر مہینے پانچ ہزار دیتی رہوں تو وہ اپنی زبان بند رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ میرے دل میں چور نہیں تھا اس لیے میں نے بلیک میل ہونے سے انکار کردیا۔ اور اس نے جھلاہٹ میں آکر آپ کے کان بھردیے۔"

"حیرت ہے۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ ایسی گری ہوئی حرکت کرسکتا ہے۔"

"ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی۔ جب میں راشد کا کچا چٹھا کھولوں گی تو آپ کو اندازہ ہوجائے گا کہ وہ کس قماش کا شخص ہے۔ وہ یونیورسٹی میں بھی مجھے تنگ کیا کرتا تھا۔ جس پر ایک دن جلیل نے اس کی پٹائی کردی۔ اسی روز سے وہ ہم دونوں کا دشمن بن گیا۔ اس نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا جس پر میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ہاں مجھے اعتراف ہے کہ میں جلیل کو پسند کرتی تھی لیکن وہ اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے مجھ سے شادی نہیں کرسکتا تھا۔ چنانچہ جب آپ کا رشتہ آیا تو اس نے ایک سچے اور مخلص دوست کی حیثیت سے مشورہ دیا کہ میں اس پروپوزل کو قبول کرلوں اگر وہ خودغرض ہوتا تو مجھ سے شادی کرکے عیش و آرام کی زندگی گزار سکتا تھا لیکن وہ خوددار شخص ہے اور اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتا ہے۔ اگر کسی کو پسند کرنا جرم ہے تو میں اس جرم کا اعتراف کرتی ہوں۔"

"اگر تم یہ بات پہلے بتادیتیں تو میں راشد کو جوتے مار کر دفتر سے نکال دیتا۔"

"آپ یہ شوق بعد میں بھی پورا کرسکتے ہیں کیونکہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں اور آئندہ بھی وہ آپ کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا رہے گا۔"

"اب میں اس کی کسی بات پر یقین نہیں کروں گا کیونکہ تم نے مجھے اس کی اصلیت بتادی ہے۔"

چند روز خیریت سے گزر گئے۔ راشد کا کوئی فون نہیں آیا اور نہ ہی اس نے اشرف سے دوبارہ ملنے کی کوئی کوشش کی۔ میں مطمئن ہوگئی اور یہی سمجھی کہ اس نے مایوس ہوکر شکست تسلیم کرلی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ میرے گھر کو بھسم کردے گی اور اشرف مجھے گھر سے نکال دیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تو اس نے اپنی کوششیں ترک کردیں لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ راشد جیسے لوگ اتنی جلدی ہار نہیں مانتے۔

ایک روز مجھے ڈاک سے ایک لفافہ موصول ہوا۔ میں نے کھول کر دیکھا تو اس میں میری اور جلیل کی کئی تصویریں تھیں جن میں ہم دونوں یونیورسٹی کے مختلف مقامات پر ایک ساتھ نظر آرہے تھے۔ زیادہ تر تصویریں کیفے ٹیریا، اسپاٹ، لائبریری اور بس اسٹاپ کی تھیں۔ یہ سب وہ مقامات تھے جہاں میری جلیل سے ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں ان تصویروں کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ تصویریں راشد یا اس کے کسی دوست نے چھپ کر اتاری ہوں گی تاکہ انہیں کسی مناسب وقت اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

ان تصویروں کو دیکھ کر میرا ذہن ماؤف ہوگیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ راشد نے یہ تصویریں مجھے کیوں بھیجیں لیکن جب تھوڑی دیر بعد اس کا فون آیا تو مجھے وجہ معلوم ہوگئی، وہ اپنی مکروہ آواز میں کہہ رہا تھا "تصویریں پسند آئیں؟"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس گھٹیا حرکت کا مقصد کیا ہے؟"

"ویسے تو تم بڑی عقل مند بنتی ہو لیکن اتنی معمولی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"سچ سچ بتاؤ کہ تم نے یہ تصویریں مجھے کیوں بھیجی ہیں؟" میں نے غصے سے کہا۔

"میں چاہتا تو یہ تصویریں براہِ راست اشرف کو دے سکتا تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ پہلے تمہیں ایک موقع دے دوں۔"

"کیسا موقع؟"

"شبانہ بیگم! میرے پاس ان تصویروں کے نیگیٹو محفوظ ہیں اور اگر تم چاہتی ہو کہ یہ تصویریں اشرف تک نہ پہنچنے پائیں تو مجھے پانچ لاکھ دے کر وہ نیگیٹو حاصل کرسکتی ہو۔"

"تم اس سے پہلے ایک گھٹیا حرکت کرچکے ہو جس

میں تمہیں ناکامی ہوئی۔ یہ کوشش بھی کرلو۔ اس بار بھی تمہیں منہ کی کھانا پڑے گی۔"

"یہ تمہارا خیال ہے۔ پہلے تو تم نے رو دھو کر اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا دیا ہوگا لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوگا۔ اشرف ان تصویروں کو دیکھ کر غصے سے پاگل ہو جائے گا اور اس کے بعد تم گھر کی رہو گی نہ گھاٹ کی۔"

"میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والی نہیں ہوں۔ تم جو چاہے کرو لیکن میں تمہیں ایک پیسا بھی نہیں دوں گی۔"

یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا اور سوچنے لگی کہ اس مصیبت سے کیسے جان چھڑائی جائے پھر مجھے نورین کا خیال آیا۔ وہی مجھے کوئی مشورہ دے سکتی تھی۔ میں نے اسے فون کر کے تصویروں کے بارے میں بتایا تو وہ بولی۔ "اس سے پہلے کہ راشد کوئی قدم اٹھائے۔ تم آج ہی یہ تصویریں اشرف کو دکھا دو اور راشد نے جو ڈیمانڈ کی ہے وہ بھی انہیں بتا دو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے نورین۔ کہیں انہیں دیکھ کر اشرف کو غصہ نہ آجائے۔ کیونکہ ان میں سے کچھ تصویریں ایسی ہیں جن میں ہم دونوں کافی کلوز نظر آرہے ہیں۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تم انہیں بتاؤ گی کہ راشد نے یہ تصویریں چوری چھپے اتاری تھیں اور اب وہ تمہیں ان کے ذریعے بلیک میل کر رہا ہے تو ان کا ردِعمل مختلف ہوگا۔"

نورین نے بتایا کہ اس نے فراز اور جلیل کو راشد کی گزشتہ حرکت کے بارے میں بتایا تھا۔ جلیل تو یہ سنتے ہی مشتعل ہوگیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر راشد سے اس کا سامنا ہوگیا تو وہ اسے اس حرکت کا مزہ چکھا دے گا۔"

"خدا کے واسطے اسے سمجھاؤ نورین۔" میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ "میں نے بڑی مشکل سے اشرف کا شک دور کیا ہے لیکن اگر انہیں یہ معلوم ہوگیا کہ جلیل اب بھی میرے معاملات میں دلچسپی لے رہا ہے تو ان کے دل میں شک کا پودا جڑ پکڑ جائے گا۔ تم جلیل کو اچھی طرح سمجھا دو کہ وہ مجھ سے ملنے یا فون کرنے کی کوشش نہ کرے اور نہ ہی میری خاطر راشد سے جھگڑا کرے۔"

"سمجھا دوں گی ویسے وہ خود بھی محتاط بندہ ہے اور ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے تمہیں نقصان پہنچے۔ ارے ہاں... میں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ جلیل کو ایک میگزین میں ملازمت مل گئی ہے۔ وہاں راشد کا ایک دوست جابر بھی کام کرتا ہے جو پہلے روز سے ہی اس سے جیلس ہوگیا ہے۔"

"کیوں، اسے کیا تکلیف ہے؟"

"بات یہ ہے کہ جلیل غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اس نے چند ہی دنوں میں اپنی دھاک بٹھا دی ہے۔ ایڈیٹر سے لے کر مالکان تک سبھی اس کے کام سے خوش ہیں جبکہ جابر ایک کام چور اور سازشی شخص ہے۔ اس لیے اس کا جلیل سے حسد کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ اس کے علاوہ وہ راشد کا بھی دوست ہے اور جلیل کے بیک گراؤنڈ کے بارے میں بھی جانتا ہوگا۔"

"اوہ، یہ تو تشویش کی بات ہے۔" میں نے فکرمندی سے کہا۔ "جلیل سے کہنا کہ اس شخص سے محتاط رہے اور اپنا خیال رکھے۔"

اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ اشرف نے فون پر آبزرویشن لگا رکھی ہے... اور میری ساری گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ شام کو جب وہ گھر آئے تو میں نے انہیں وہ تصویریں دکھائیں اور ساتھ ہی انہیں راشد کی ڈیمانڈ کے بارے میں بتا دیا لیکن اس بار ان کا ردِعمل پہلے کے مقابلے میں مختلف تھا۔ انہوں نے ایک ایک تصویر غور سے دیکھی اور بولے۔

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارے اور جلیل کے درمیان صرف کلاس فیلو کا رشتہ تھا لیکن ان تصویروں میں تو تم دونوں لو برڈز نظر آرہے ہو۔"

"میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ ہم ایک دوسرے میں انٹرسٹڈ تھے لیکن جلیل کا کہنا تھا کہ وہ کم از کم دس سال تک شادی نہیں کرے گا جب تک کہ اس کے بہن بھائی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ ظاہر ہے کہ میرے گھر والے اتنا عرصہ انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے مجھے اپنا راستہ الگ کرنا پڑا۔"

"بہتر ہوتا کہ تم جلیل سے ہی شادی کر لیتیں۔ اس طرح کم از کم مجھے اس اذیت سے دوچار تو نہ ہونا پڑتا۔"

"اذیت..... کیسی اذیت..... میں سمجھی نہیں۔"

"یہ اذیت نہیں تو اور کیا ہے۔ ایک غیر شخص میری بیوی کو بلیک میل کر رہا ہے۔ آئے دن میرے کان بھرتا رہتا ہے۔ اس نے تو یہ تک کہہ دیا ہے کہ تم اب بھی جلیل سے رابطے میں ہو۔"

"اور آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا؟"

"نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ بہت جلد وہ اس کا ثبوت بھی

پیش کر دے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ اسے منہ ہی کیوں لگاتے ہیں جبکہ میں آپ کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا چکی ہوں۔ وہ محض اپنی ناکامی کا بدلہ لینے کے لیے میری زندگی برباد کرنے پر تلا ہوا ہے۔"

"شاید میں اسے دھتکار دیتا لیکن اب یہ تصویروں والا مسئلہ سامنے آگیا ہے۔ اگر میں اس سے سختی کے ساتھ پیش آؤں گا تو وہ مجھے بھی بلیک میل کر سکتا ہے۔ اگر اس نے یہ تصویریں میرے دفتر کے کسی ساتھی کو دکھا دیں تو بتاؤ میری کیا عزت رہ جائے گی۔"

"آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے صرف مجھے بلیک میل کرنے کے لیے یہ تصویروں والا ڈراما رچایا ہے۔ یہ میرا معاملہ ہے۔ میں اس سے خود ہی نمٹ لوں گی۔ اس کے باوجود اگر وہ آپ کے پاس تصویریں لے کر آئے تو شکریہ ادا کر کے لے لیجیے۔"

دوسرے روز راشد نے مجھے پھر فون کیا۔ میں ذہنی طور پر اس فون کو سننے کے لیے تیار تھی چنانچہ اس کی آواز سنتے ہی میں پھٹ پڑی اور میں نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ ان تصویروں کے ذریعے مجھے بلیک میل کر سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ کیونکہ میں نے وہ تصویریں اشرف کو دکھا دی ہیں اور انہیں تمہاری بلیک میلنگ کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ اس لیے تمہارے حق میں بہتر ہے کہ ان اوچھی حرکتوں سے باز آجاؤ ورنہ ہمیشہ اسی طرح ناکامی کا منہ دیکھنا ہوگا۔"

"شبانہ، اس بار تو تم کامیاب ہوگئیں لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوگا۔ میں بھی اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ اس مرتبہ ایسا چکر چلاؤں گا کہ اشرف صاحب تمہیں دھکے دے کر گھر سے نکال دیں گے۔"

"تمہارا جو جی چاہے کرو لیکن آئندہ مجھے فون مت کرنا ورنہ میں پولیس میں رپورٹ کر دوں گی۔"

کچھ دن سکون سے گزر گئے۔ اس کے بعد راشد نے فون نہیں کیا اور نہ ہی وہ اشرف سے ملنے آیا۔ میں یہی سمجھی کہ وہ اپنی ناکامی سے دلبرداشتہ ہو کر خاموش ہوگیا ہے۔ انہی دنوں ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی خبر سنائی۔ اشرف کو معلوم ہوا تو وہ بھی بہت خوش ہوئے اور پہلے سے زیادہ میرا خیال رکھنے لگے۔ میری زچگی میں دو مہینے باقی تھے کہ نورین نے مجھے ٹیلی فون پر ایک اندوہناک خبر سنائی۔ اس نے بتایا کہ جلیل کسی کام کے سلسلے میں فراز کے گھر گیا تھا جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے گیٹ سے باہر آیا تو موٹر سائیکل پر سوار دو نامعلوم حملہ آوروں نے اس پر فائرنگ کر دی لیکن ان کا نشانہ خطا ہوگیا اور گولی جلیل کے کان کے قریب سے ہوتی ہوئی فراز کے بنگلے کی دیوار میں پیوست ہوگئی۔ فراز کے گارڈ نے جوابی فائر کرنا چاہا لیکن اتنی دیر میں حملہ آور فرار ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس واقعہ کے بعد فراز بہت خوفزدہ اور جلیل کے بارے میں فکرمند ہے اور اس کا خیال ہے کہ جلیل کو کچھ عرصے کے لیے شہر چھوڑ دینا چاہیے۔ فراز نے اس کے لیے لاہور میں رہائش اور ملازمت کا بھی بندوبست کر لیا ہے لیکن جلیل اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہیں۔ ہم سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک چکے ہیں لیکن اس کی ایک ہی رٹ ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات مان جائے گا۔"

میں جلیل کو فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے نورین سے کہا۔ "تم میری پوزیشن جانتی ہو۔ اگر اشرف کو معلوم ہوگیا کہ میں نے جلیل کو فون کیا ہے تو میری شامت آجائے گی۔"

"انہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ یہ جلیل کی زندگی کا سوال ہے۔ اس پر کسی بھی وقت دوبارہ حملہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ہم سب چاہتے ہیں کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلا جائے۔ صرف تم ہی اسے یہاں سے جانے پر آمادہ کر سکتی ہو۔"

"جلیل کے گھر میں فون نہیں ہے۔ میں اس سے کیسے رابطہ کر سکتی ہوں۔"

"میں اس کے دفتر کا نمبر دے رہی ہوں۔ اس پر بات کی جا سکتی ہے۔"

نورین کی باتیں سن کر میں بھی ڈر گئی تھی۔ واقعی جلیل کو کچھ عرصہ کے لیے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ یہی سوچ کر میں نے جلیل کے دفتر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب سے کسی اجنبی آواز نے ہیلو کہا۔

"مجھے جلیل صاحب سے بات کرنا ہے۔"

"اپنا نام بتانا پسند کریں گی۔"

"جی، میں شبانہ بول رہی ہوں۔"

"ایک منٹ ہولڈ کریں۔"

چند سیکنڈ بعد جلیل کی آواز آئی۔ "ہاں بولو، شبانہ کیا بات ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہم سب تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ تم فراز کی بات کیوں نہیں مان لیتے۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔"

"تمہیں یہاں فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کے لہجے سے ناراضی جھلک رہی تھی۔ مجھے تمہارے حالات کا علم ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مشکل میں پھنس جاؤ۔ بہرحال تمہارے مشورے کا شکریہ۔ تم جانتی ہو کہ میں اپنے فیصلے خود کیا کرتا ہوں اور میرا جواب اب بھی یہی ہے کہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔"

میں نے مایوس ہو کر فون بند کر دیا۔ اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک چھوٹی سی غلطی کسی بڑے ہنگامے کا سبب بن جائے گی۔ دو دن بعد ہی اس کا نتیجہ سامنے آ گیا۔ اس روز اشرف گھر آئے تو ان کا منہ بری طرح سوجا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی ایک کیسٹ میری جانب اچھالی اور بولے۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ شادی کے بعد تمہارا جلیل سے کوئی واسطہ نہیں رہا لیکن وہ میری بھول تھی۔ تم ابھی تک جلیل کی محبت کو دل میں بسائے بیٹھی ہو اور اس سے فون پر باتیں کرتی رہتی ہو۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اشرف کو اس فون کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ یقیناً انہوں نے فون پر آبزرویشن لگا رکھی ہے اور وہ میری تمام باتیں سنتے ہیں۔ میں نے ہمت کر کے کہا۔

"میں آپ کو پوری بات بتا چکی ہوں۔ اس کے باوجود آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اب آپ نے ٹیلی فون بھی ٹیپ کرنا شروع کر دیے ہیں۔"

"میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ تحفہ تو مجھے تمہارے ایک پرانے دوست نے دیا ہے۔"

میرا دھیان فوراً ہی راشد کی طرف چلا گیا لیکن وہ میری اور جلیل کی گفتگو کیسے ٹیپ کر سکتا ہے پھر مجھے نورین کی بات یاد آئی۔ اس نے بتایا تھا کہ راشد کا کوئی دوست جابر بھی جلیل کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ یقیناً یہ اسی کی کارستانی ہے اور اسے راشد نے اس کام کے لیے کہا ہوگا۔

"مجھے لگتا ہے کہ راشد نے آپ کے کہنے پر میری اور جلیل کی گفتگو ریکارڈ کر لی ہوگی۔"

"میں نے اس سے کچھ نہیں کہا بلکہ وہ خود ہی مجھے تمہارے خلاف بھڑکاتا رہتا ہے۔ جب اس نے یہ کہا کہ تم اب بھی جلیل سے رابطے میں ہو تو میں نے اس سے ثبوت مانگا۔ اس کا کوئی دوست جلیل کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ راشد نے اس کے ذمے یہ کام لگایا تھا کہ وہ جلیل کی ہر کال ریکارڈ کرے۔ جب تم نے جلیل سے فون پر بات کی تو اس نے خاص طور سے یہ کال ریکارڈ کی اور پھر یہ کیسٹ راشد کے ذریعے مجھ تک پہنچ گیا۔"

میرا اندازہ درست نکلا۔ راشد ضرورت سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا۔ جلیل سے ہونے والی میری گفتگو اتنی اہم نہیں تھی لیکن اس کے پاس اور لوگوں کے فون بھی آتے ہوں گے اور راشد کو ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک ایک بات معلوم ہو رہی ہوگی۔ میں نے اشرف سے کہا۔ "اگر آپ نے یہ کیسٹ سن لی ہے تو یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ میں نے اس سے کس موضوع پر بات کی تھی۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے جلیل سے کیا گفتگو کی۔ اعتراض اس بات پر ہے کہ تم نے جلیل کو فون کیوں کیا۔ اس سے تمہارا کیا رشتہ ہے۔"

"آپ بھی کمال کرتے ہیں۔" میں نے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ جلیل کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس پر قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ اس لیے فراز چاہتا ہے کہ وہ لاہور چلا جائے لیکن جلیل اس کے لیے تیار نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ میں نے بھی اسی لیے فون کیا تھا لیکن اس نے میری بات بھی نہیں مانی۔"

"گھر والوں کا تو ایک بہانہ ہے دراصل وہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔" اشرف طنز کرتے ہوئے بولے۔

"اوہ میرے خدا۔" میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "کتنی بار بتا چکی ہوں کہ جلیل سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔ میں اس سے ملتی ہوں اور نہ ہی فون پر بات کرتی ہوں۔ اس کے باوجود آپ مجھ پر شک کر رہے ہیں۔ اس کیسٹ کے بارے میں تو یہی کہوں گی کہ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ اگر میں ٹیلی فون پر جلیل سے عشقیہ گفتگو کرتی، رومانی مکالمے بولتی، اس کے فراق میں ٹھنڈی آہیں بھرتی یا اس سے ملنے کا پروگرام بناتی تب تو آپ کی ناراضی سمجھ میں آ سکتی تھی۔ ایک دو منٹ کی بے ضرر گفتگو پر آپ اتنا واویلا کیوں مچا رہے ہیں۔"

"میں یہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ تم جلیل سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھو۔ سچ پوچھو تو میں اسے اپنا رقیب سمجھنے لگا ہوں اور مجھے ہر وقت یہی ڈر رہتا ہے کہ کہیں وہ تمہیں مجھ سے چھین کر نہ لے جائے۔"

"مجھے آپ کی باتیں سن کر شرم آ رہی ہے۔ انتہائی گھٹیا سوچ ہے آپ کی۔ لیکن اس میں آپ کا بھی کوئی قصور نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سارا گند آپ کے دماغ میں راشد نے بھرا ہے۔"

"تم جو چاہو سمجھو لیکن اب تمہیں ایک فیصلہ کرنا ہوگا۔"

"فیصلہ" میں چونکتے ہوئے بولی۔ "کیسا فیصلہ؟"

"تمہیں ہم دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو تو جلیل کو بھول جاؤ۔ آئندہ تمہاری زبان پر اس کا نام بھی نہیں آنا چاہیے اور اگر ایسا نہیں کر سکتیں تو میری طرف سے تم آزاد ہو۔ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔ جب کہو گی، تمہیں طلاق کے کاغذات بھیج دوں گا۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنی بڑی بات کہہ سکتے ہیں۔ میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے اور چلاتے ہوئے بولی۔ "خدا کے واسطے خاموش ہو جائیں۔ میں آپ کی بیوی ہوں۔ بازار میں بکنے والی کوئی جنس نہیں کہ جب چاہا خرید لیا اور جب چاہا بیچ دیا۔ مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ آپ نے اتنی بڑی بات کیسے کہہ دی۔"

"معاف کرنا۔ اس کی ذمے دار بھی تم ہی ہو اور تم نے ہی مجھے یہ الفاظ بولنے پر مجبور کیا۔"

"ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی کہ جلیل سے کوئی رابطہ نہ رکھوں لیکن اگر وہ اتفاقاً میرے راستے میں آ گیا تو اس کا ذمہ نہیں لے سکتی۔"

"مجھے اتفاق اور ارادہ کا فرق معلوم ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں بولے۔

"آپ کو بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟"

"یہی کہ آپ راشد سے کوئی واسطہ نہیں رکھیں گے اور نہ ہی اس کی کسی بات پر یقین کریں گے۔ اتنا اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ وہ ایک بلیک میلر ہے۔ آج مجھے بلیک میل کر رہا ہے۔ کل آپ کی باری بھی آ جائے گی۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اب میں اس کی کوئی بات نہیں سنوں گا بلکہ اسے دفتر آنے سے بھی منع کر دوں گا اور اگر وہ نہ مانا تو گارڈ سے کہہ دوں گا کہ اسے دفتر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔"

میں وقتی طور پر مطمئن ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد میں نے

کیلیڈواسکوپ
(Kaleidoscope)

منظر نما ایک چھوٹی سی نالی میں لمبائی کے رخ دو لمبوترے ٹکڑے ایک دوسرے پر زاویہ بناتے ہوئے لگائے جاتے ہیں۔ ان کی ایک جانب شیشے کا ڈھکنا لگا کر اور رنگ برنگ کے شیشوں کے ٹکڑے بھر کر منہ بند کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے سرے پر بھی ایک ننھا سا گول شیشہ لگا دیا جاتا ہے۔ جب اس شیشے میں سے نظارہ کرتے ہیں تو مختلف قسم کے رنگ برنگ پھولوں اور ڈیزائنوں کے گچھے سے نظر پڑتے ہیں اور نلکی کے گھمانے سے یہ ڈیزائن ہر لحظہ کوئی نئی اور دلفریب صورت اختیار کرتے رہتے ہیں۔ یہ شکلیں شیشے کے ٹکڑوں پر انعکاس در انعکاس کے باعث بنتی ہیں۔

مرسلہ: نوشین مصطفیٰ، حیات آباد

ایک خوبصورت گول مٹول بچے کو جنم دیا۔ اشرف کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ سب کچھ بھول کر میری ناز برداری اور بچے کے لاڈ پیار میں لگ گئے۔ انہوں نے بچے کا نام کاشف رکھا۔ کچھ دنوں بعد ہم نے بچے کی پیدائش کی خوشی میں ایک پارٹی کا اہتمام کیا۔ اشرف نے مجھ سے کہا کہ میں اپنے یونیورسٹی کے دوستوں کو بھی اس پارٹی میں انوائٹ کروں چنانچہ میں نے نورین کے ذریعے فراز اور جلیل کو بھی بلاوا بھیج دیا لیکن جلیل نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ وہ خوشی کے موقع پر رنگ میں بھنگ نہیں ڈالنا چاہتا۔ البتہ اس نے فراز کے ہاتھ بچے کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ضرور بھیجا۔

اشرف کو جب معلوم ہوا کہ جلیل نے پارٹی میں آنے سے معذرت کر لی ہے تو اُن کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی جس سے مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ انہوں نے جلیل کو بحالت مجبوری بلایا تھا۔ وہ دل سے نہیں چاہتے تھے کہ جلیل اس پارٹی میں شریک ہو، البتہ راشد بن بلایا مہمان بن کر نازل ہو گیا تھا۔ اس نے اشرف سے دو چار باتیں کیں اور میرے اردگرد منڈلانے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن میں اسے موقع نہیں دے رہی تھی۔ بالآخر اسے یہ موقع مل ہی گیا۔ اس نے جیسے ہی مجھے تنہا دیکھا۔ وہ لپک کر میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں بولا۔ "خدا کی قسم! ایک بچے کی ماں بننے کے بعد بھی غضب

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈھارہی ہو۔ اگر چاہو تو اشرف سے طلاق لے کر میرے پاس آجاؤ۔ میں اب بھی تمہیں قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

اس وقت میں جوس پی رہی تھی۔ جی چاہا کہ وہی گلاس اس کے منہ پر دے ماروں لیکن میں اپنی پارٹی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے ضبط کر گئی۔

اسی پارٹی میں اشرف نے مجھے اپنے باس خالد چغتائی سے بھی ملوایا۔ وہ چالیس پینتالیس سال کے انتہائی خوش شکل اور اسمارٹ شخص تھے۔ قیمتی سیاہ سوٹ میں ان کی شخصیت اور بھی نکھر آئی تھی۔ وہ صنفِ نازک کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ وہ انتہائی شستہ لہجے میں بولے۔

"اشرف بہت لکی ہے کہ اسے آپ جیسی خوبصورت بیوی ملی۔ اشرف آپ کی تعریفیں کرتا رہتا ہے لیکن آپ کو دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام لیا ہے۔"

میری جگہ کوئی سیدھی سادی بے وقوف سی عورت ہوتی تو اس کی باتوں پر شرما جاتی لیکن میں مردوں کی فطرت سے بخوبی واقف تھی۔ انہیں اپنی بیوی کے سوا ہر دوسری عورت اچھی لگتی ہے اور وہ اس کی جھوٹی سچی تعریف کر کے اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے خالد کی نظروں میں وہ پیغام پڑھ لیا تھا جو دل پھینک مرد دوسری عورتوں کو دیا کرتے ہیں چنانچہ اس کی حوصلہ شکنی کی خاطر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ کی مسز نظر نہیں آرہیں۔ انہیں لے کر کیوں نہیں آئے؟"

"مسز ہوتی تو لے کر آتا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "میں ابھی تک اس بندھن سے آزاد ہوں۔"

"حیرت ہے کہ ابھی تک شادی نہیں کی حالانکہ آپ کی اچھی خاصی عمر ہوگئی ہے۔"

"آپ کو دیکھنے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ یہ نیک کام بھی کر ہی ڈالوں بشرطیکہ آپ جیسی کوئی لڑکی مل جائے۔"

مجھ میں اس کی فضول باتیں سننے کی تاب نہیں تھی۔ اس لیے معذرت کر کے وہاں سے ہٹ گئی۔

پارٹی ختم ہونے کے بعد اشرف نے شکوہ کیا کہ مجھے خالد کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا کیونکہ وہ ان کا باس ہے اور اسے خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔

مجھے ان کی بات سن کر غصہ آگیا اور تڑخ کر بولی۔ "آپ کیسے شوہر ہیں کہ ایک غیر مرد آپ کی موجودگی میں میرے حسن کے قصیدے پڑھ رہا تھا اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ شکر کریں کہ میں نے اس کا منہ نہیں توڑا۔ یہی سوچ کر کہ وہ آپ کا باس ہے۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو نوشابہ۔" وہ تیز لہجے میں بولے۔ "دودھ دینے والی گائے کی دولاتیں بھی سہنا پڑتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میری پروموشن کا وقت قریب ہے اور خالد صاحب کی رپورٹ پر ہی مجھے ترقی مل سکے گی۔ اس مرحلے پر میں کسی بھی صورت انہیں ناراض نہیں کر سکتا۔"

"آپ بے شک ان کی خوشامد کرتے رہیں لیکن مجھے بیچ میں نہ لائیں۔"

"فی الحال تو یہ ممکن نہیں کیونکہ خالد صاحب تم سے اتنے متاثر ہوئے ہیں کہ انہوں نے ہمیں اگلے ہفتے کھانے پر بلایا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" میں نے ڈھیٹ بنتے ہوئے کہا۔

"تمہیں چلنا ہوگا۔" اشرف غراتے ہوئے بولے۔ "ورنہ میری پوزیشن بہت خراب ہو جائے گی۔"

مجبوراً مجھے ان کا حکم ماننا پڑا۔ اشرف اس دعوت کو اپنے لیے ایک اعزاز سمجھ رہے تھے اور اتنے پُرجوش تھے کہ میرے لیے ایک نئی ساڑی خرید کر لائے۔ پروموشن کے چکر میں ان کی عقل ماؤف ہوگئی تھی اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ اگر کوئی باس اپنے ماتحت کو کھانے پر بلائے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔

خالد نے اس دعوت کے لیے شہر کے مہنگے ترین ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا تھا۔ وہ خود بھی بن ٹھن کر آیا تھا اور کھانے کے دوران وہ مسلسل مجھ سے ہی باتیں کرتا رہا۔ اس نے اشرف کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہ ہوں۔ اس کے باوجود وہ فدویانہ انداز میں اس کی باتوں پر مسکراتے اور سر ہلاتے رہے۔ اس وقت اشرف کی شخصیت کا تضاد کھل کر سامنے آگیا۔ ایک طرف تو ان کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ انہیں جلیل سے میرا فون پر بات کرنا بھی گوارا نہ تھا اور انہوں نے مجھے طلاق دینے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ دوسری جانب وہ اس درجہ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا لیکن میں خالد کو کمپنی دینے پر مجبور تھی۔ کیونکہ اشرف کا حکم تھا کہ اسے ناراض نہ کیا جائے۔

میرا اندیشہ درست نکلا۔ چند روز بعد اشرف کو کسی کام سے اسلام آباد جانا پڑ گیا۔ میں گھر میں اکیلی تھی اس لیے کام والی ماسی کو اپنے پاس روک لیا تھا۔ اس دن موسم بہت خراب تھا۔ شام سے ہی بارش ہو رہی تھی اور بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ کوئی آٹھ بجے کے قریب دروازے کی گھنٹی بجی۔ ماسی اوپر والی منزل پر سونے چلی گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے خالد کھڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی۔ وہ بے دھڑک اندر چلا آیا اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے گزر رہا تھا، سوچا کہ تمہاری خیریت معلوم کر لوں۔ یقیناً اشرف کے نہ ہونے سے تم تنہائی محسوس کر رہی ہوگی۔"

"آپ نے خوامخواہ زحمت کی۔ کیونکہ میں تنہائی میں غیر مردوں سے ملنا پسند نہیں کرتی۔"

"تعجب ہے۔ تم مجھے ابھی تک غیر سمجھ رہی ہو حالانکہ میں تو پہلی ہی نظر میں تمہارا گرویدہ ہو گیا تھا۔"

"آپ کو ایک شادی شدہ عورت سے ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ بہتر ہوگا کہ آپ فوراً یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور میں بھول جاؤں گی کہ آپ اشرف کے باس ہیں۔"

"میں جانے کے لیے نہیں آیا۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔ "اشرف کو اسی لیے اسلام آباد بھیجا ہے کہ تم سے تنہائی میں ملنے کا موقع مل جائے۔"

"آپ نے مجھے کوئی آوارہ اور بدچلن عورت سمجھ رکھا ہے۔ میں جان دے دوں گی لیکن اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ شاید اس نے پی رکھی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "سیدھی طرح میری بانہوں میں آجاؤ۔ ورنہ اشرف کی پروموشن کبھی نہیں ہو سکے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسے نوکری سے ہاتھ دھونا پڑ جائیں۔"

میں نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور پوری قوت سے اسے دھکا دیتے ہوئے بولی۔ "لعنت بھیجتی ہوں ایسی پروموشن پر۔"

یہ کہہ کر میں تیزی سے پلٹی اور ڈرائنگ روم سے باہر آکر دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد میں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اوپر گئی۔ ماسی کو جگایا اور اس سے کہا کہ وہ میرے کمرے میں آکر سو جائے۔ اس کے بعد میں نے

میرا خیال تھا کہ اس دعوت کے بعد میرا خالد سے سامنا نہیں ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اشرف نے باس کی خوشنودی کے لیے اسے اپنے گھر کھانے پر بلا لیا۔ میں نے اس کی شدید مخالفت کی اور صاف کہہ دیا کہ میں خالد کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔ اس پر اشرف آپے سے باہر ہو گئے کہ مجھے ان کا ہر حکم ماننا ہوگا اور جب تک ان کی پروموشن نہیں ہو جاتی، وہ اس کی خوشامد کرنے پر مجبور ہیں۔ مجھے بھی اس معاملے میں ان کا ساتھ دینا ہوگا ورنہ اس گھر میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں۔

مجبوراً مجھے اشرف کے حکم کی تعمیل کرنا پڑی۔ میں نے بے دلی سے دعوت کا اہتمام کیا۔ خالد حسبِ معمول بن سنور کر آیا۔ اس روز تو اس نے دیدہ دلیری کی حد ہی کر دی۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی اور پھل کے علاوہ میرے لیے ایک قیمتی تحفہ بھی لایا۔ اس پر بھی اشرف کی غیرت نہ جاگی اور وہ اسے اپنی عزت افزائی سمجھ کر مسکراتا رہا۔ اس روز بھی خالد نے میری تعریف میں زمین آسمان ایک کر دیے۔ میرے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانوں کی دل کھول کر تعریف کی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بولا۔ "یقین کیجیے مسز اشرف! میں نے اپنی پوری زندگی میں اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا۔ میرا بس چلے تو روزانہ آپ کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں۔"

اشرف کھی کھی کرتے ہوئے بولے۔ "ضرور ضرور، آپ جب چاہیں ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں۔"

اس کے جانے کے بعد میں اشرف سے خوب لڑی اور صاف کہہ دیا کہ اب خالد کو اپنے گھر بلانے کی ضرورت نہیں اور اگر وہ آیا تو میں اس کے سامنے نہیں آؤں گی۔"

اشرف نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بولے۔ "خالد صاحب میرے باس ہیں اور اگر وہ ہمارے گھر آنا چاہیں گے تو میں انہیں منع نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی ان کی اچھی طرح خاطر مدارات کرنا ہوگی۔"

"اشرف، آپ سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ میں ایک عورت ہوں اور مرد کی نظریں اچھی طرح پہچان سکتی ہوں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہوس کی چمک دیکھی ہے۔"

"تم ایک شریف آدمی پر بہتان لگا رہی ہو۔ آئندہ میں ان کے بارے میں ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

نورین کو فون کر کے ساری بات بتائی تو اس نے مشورہ دیا کہ وہ فراز سے بات کر کے مجھے فون کرے گی۔ تھوڑی دیر بعد فراز کا فون آیا اور اس نے کہا کہ مجھے فوراً اپنے میکے چلے جانا چاہیے، وہ مجھے لینے آرہا ہے۔

میں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اس وقت امی کے کے گھر چلی جاؤں اور اشرف کے واپس آنے تک وہیں رہوں کیونکہ خالد اپنی ناکامی پر زخمی سانپ کی طرح پھنکار رہا ہوگا اور وہ پلٹ کر ضرور حملہ کرے گا۔ امی مجھے دیکھ کر حیران رہ گئیں لیکن میں نے انہیں پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور صرف اتنا بتایا کہ اشرف اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ میرا اکیلے میں دل گھبرایا۔ اس لیے چلی آئی۔

چار دن بعد اشرف کی واپسی ہوئی تو خالد نے اس کے اچھی طرح کان بھرے اور کہا کہ وہ تو یہ سوچ کر میرے پاس آیا تھا کہ تنہائی میں میرا دل گھبرا رہا ہوگا لیکن میں نے اس کی بہت بے عزتی کی اور اپنے کسی دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئی۔

اشرف کا ذہن فوراً جلیل کی طرف گیا کہ میں نے ان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جلیل کو بلایا ہوگا۔ ثمینہ آپا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ کانوں کے کچے اور حد درجہ شکی مزاج واقع ہوئے تھے۔ جلیل کی طرف سے ان کا دل کبھی بھی صاف نہ رہا اور انہیں مجھ پر الزام لگانے کا موقع مل گیا۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے لینے آئیں گے۔ ماسی نے انہیں پوری بات بتادی ہوگی۔ وہ خود تو نہیں آئے البتہ فون کر کے پوری چارج شیٹ سنادی۔ میرا پہلا جرم یہ تھا کہ جلیل کو کیوں بلایا۔ میں جلیل کا نام سن کر حیران رہ گئی۔ اس غریب کے تو فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن اشرف نے اس کا موقع ہی نہیں دیا اور بولے۔ ”تم نے باس کی بے عزتی کر کے میری پروموشن کا کیس خراب کردیا۔ اس کے بعد جلیل کے ساتھ اپنے میکے چلی گئیں اگر تم اپنے آپ کو اتنا ہی غیر محفوظ سمجھ رہی تھیں تو اپنے گھر سے کسی کو بلا سکتی تھیں یا ٹیکسی کر کے چلی جاتیں لیکن تمہیں اس وقت بھی جلیل ہی یاد آیا۔“

”وہ جلیل نہیں تھا۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

”اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ ماسی نے مجھے سب کچھ بتادیا ہے۔ جانتا ہوں کہ تم ابھی تک جلیل کی محبت کو دل میں بسائے ہوئے ہو۔ اس لیے اب میرے گھر میں تمہارے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تم میکے میں رہ کر جلیل سے پیار کی پینگیں بڑھاؤ۔ میں تمہارے راستے کی رکاوٹ نہیں بننا چاہتا۔ اس لیے تمہیں طلاق دے رہا ہوں۔“

اس کے بعد مجھ سے کچھ نہیں سنا گیا۔ میں تیورا کر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ سب لوگوں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ نورین اور فراز خود ان کے دفتر گئے اور انہیں اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا لیکن ان کی آنکھوں پر شک کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس لیے انہوں نے نورین اور فراز کی بات کا بھی اعتبار نہیں کیا اور صاف کہہ دیا کہ تم لوگ بھی نوشابہ اور جلیل سے ملے ہوئے ہو۔

میں خود بھی ایسے شکی مزاج شخص کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اس لیے طلاق کو تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر قبول کرلیا۔ اشرف نے بیٹے کو بھی میرے حوالے کردیا تھا۔ عدت گزرنے کے بعد جلیل میرے پاس آیا اور بولا۔ ”میں تمہارا مجرم ہوں۔ اگر پہلے ہی تمہارا ہاتھ تھام لیتا تو تمہیں اس عذاب سے نہ گزرنا پڑتا۔“

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”میری قسمت میں یہی لکھا تھا اور میں تقدیر کے فیصلے پر شاکر ہوں۔“

”یہ سب کتابی باتیں ہیں۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ اتنا لمبا سفر تنہا کیسے طے کروگی؟“

”تمہی بتاؤ، میں کیا کروں۔“

”مجھ سے جو غلطی ہوئی تھی، اس کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میری ہم سفر بننا پسند کروگی۔“

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگی پھر میں نے کہا۔ ”شاید تم بھول رہے ہو۔ اب میں پہلے والی نوشابہ نہیں بلکہ طلاق یافتہ اور ایک بچے کی ماں ہوں۔ کیا تمہارے گھر والے مجھے قبول کرلیں گے۔“

”ان سے مشورہ کرنے کے بعد ہی تمہارے پاس آیا ہوں۔ امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کروگی۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ہر عورت کو ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور جب وہ میرا سہارا بن رہا تھا تو میں انکار کر کے کیوں کفرانِ نعمت کرتی چنانچہ میں نے اقرار میں گردن ہلادی۔ مگر شرط رکھ دی کہ اسے میرے بیٹے کو اپنا نام دینا ہوگا جسے اس نے ہنستے ہوئے قبول کرلیا۔

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم!

انسان کی قسمت بھی کیا ہے، کبھی یہ عروج بخشتی ہے اور کبھی دھول چٹادیتی ہے۔ یوسف کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ان باتوں پر غور کرتی ہوں تو اللہ رب العزت کا رحیم ہونا ثابت ہوجاتا ہے۔ امید ہے یہ جگ بیتی آپ کو بھی پسند آئے گی۔

زبیدہ حیات

(راولپنڈی)

قسمت

میرا نام زبیدہ ہے۔ ایک متوسط طبقے کے گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ والد ایک سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر ملازم تھے۔ مجھ سے تقریباً چھ سال بعد میرا چھوٹا بھائی شوکت مرزا پیدا ہوا اور وہ اس کے بعد سے ہی بیمار رہنے لگے۔ میں نے بی اے پاس کرلیا تو میری شادی کردی گئی مگر بدقسمتی سے شوہر شادی کے دوسرے ہفتے ایک کار ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوگئے اور مجھے سسرال سے منحوس اور سبز قدم کا خطاب دے کر واپس کردیا گیا۔ اس دوسرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

حادثے نے ابو کی صحت کو بہت زیادہ متاثر کیا۔ طویل بیماری نے انہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے پر مجبور کر دیا۔ گھر چونکہ اپنا تھا اور پھر افراد بھی مختصر تھے اس لیے ان کی پنشن اور فنڈ کے سہارے دن گزرتے رہے یہاں تک کہ شوکت کو ایم اے، بی ایڈ کرنے کے بعد ایک کالج میں لیکچرر شپ کی ملازمت مل گئی اور اس کے دوسرے سال ابو بھی ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

میں جس زمانے کے واقعات بیان کرنے لگی ہوں تب شوکت کو کالج میں سروس کرتے ہوئے چھ سال ہو چکے تھے۔ بنیادی طور پر اس کہانی کا تعلق ایک غریب نوجوان یوسف اور ایک ستم رسیدہ لڑکی نوری سے ہے لیکن چونکہ ان کی داستان سے ہمارا براہِ راست تعلق رہا ہے اس لیے ایک حد تک میں اسے اپنی آپ بیتی بھی کہہ سکتی ہوں۔

یوسف ایک قریبی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کے والد خاصے متمول زمیندار تھے۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد جن سے ان کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی انہوں نے یوسف کی والدہ سے دوسری شادی کر لی مگر ان کے گھر اور خاندان والوں نے اس شادی کو کبھی کھلے دل سے قبول نہیں کیا۔ یوسف کی پیدائش کے سات سال بعد اس کی ماں کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اچانک اس اعتبار سے کہ وہ جسمانی اعتبار سے بالکل صحت مند تھیں۔ ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد اچانک ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ قے اور دست آنے لگے۔ گاؤں میں جو ایک نیم حکیم موجود تھا اس کو دکھایا گیا۔ اس نے دوا بھی دی لیکن شام ہونے تک یوسف کی والدہ موت کی آغوش میں جا سوئیں۔ یوسف کے والد اور کچھ دوسرے افراد کو شبہ تھا کہ ان کے سوتیلے بیٹوں نے زہر دے کر انہیں ہلاک کر دیا مگر یہ بات ہمیشہ ایک افواہ اور ایک شک ہی رہی۔ یوسف کے والد نے خاموشی سے دوسری بیوی کو بھی دفنا دیا۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کا مطلب خود اپنے خاندان کی ذلت و رسوائی تھی۔ اس لیے اس سے قصداً پرہیز کیا گیا۔

ماں کی وفات کے بعد یوسف سوتیلے بھائیوں کی ہر زیادتی، ہر ظلم خاموشی سے برداشت کرتا رہا۔ اسے پڑھنے کا شوق تھا مگر بھائیوں نے اسے پانچویں جماعت سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ دن کسی نہ کسی طرح گزرتے رہے یہاں تک کہ جب یوسف کی عمر بیس سال کی ہوئی تو اس کے ہمدرد اور غمگسار والد بھی انتقال کر گئے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے یوسف کے بڑے بھائی کو تنہائی میں خاص طور پر تاکید کی تھی کہ وہ جائداد میں سے کچھ نہ کچھ یوسف کو بھی دے دے لیکن دونوں بھائیوں نے باپ کا چالیسواں بھی نہیں ہونے دیا اس سے پہلے ہی یوسف کو مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا اور اسے دھمکی دی کہ وہ آئندہ اس گاؤں میں کہیں نظر آیا تو اسے جان سے مار دیں گے۔ یوسف کے والد کبھی کبھی اسے بڑے بھائیوں سے چھپا کر دس پانچ روپے دے دیا کرتے تھے۔ یوسف نے ان ہی میں سے بچا بچا کر تقریباً ڈیڑھ سو روپے جمع کر لیے تھے۔ بھائیوں نے گھر سے نکل جانے کا حکم دیا تو وہ ایک چادر میں اپنے تین جوڑے کپڑے اور روپیا باندھ کر اللہ کے سہارے شہر کی جانب چل دیا۔ راستے میں بس مل گئی جس نے اسے شہر لا کر بسوں کے اڈے پر اتار دیا۔

یوسف اس سے پہلے تین چار مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ شہر آ چکا تھا۔ بسوں کے اڈے، غلہ منڈی، چارپائی سرائے، کھانے کے ایک دو ہوٹل اور ایسے ہی دو چار مقامات سے واقف تھا۔ اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ نہیں تھا کہ وہ شہر جا کر کیا کرے گا مگر اس نے یہ ضرور سوچ رکھا تھا کہ اگر کہیں نوکری نہ بھی ملی تو وہ محنت مزدوری یا اسٹیشن پر قلی گیری تو کر ہی سکتا ہے۔ سر دست وہ چارپائی سرائے میں اپنے رہنے کا ٹھکانا کرنا چاہتا تھا۔ اپنے والد کے ساتھ وہ جب بھی فصل فروخت کرنے غلہ منڈی آتا تھا تو شہر میں ایک دو روز ٹھہرنا پڑ جاتا تھا۔ اس طرح وہ چارپائی سرائے سے واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ وہاں ایک دو روپے کے عوض ایک رات سونے کے لیے چارپائی مل جاتی ہے۔

وہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا کہ اس نے تقریباً دس قدم آگے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جو ایک چھڑی سے راستہ ٹٹولتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک بڑے کپڑے میں غالباً کوئی ٹوکری بندھی تھی اور جس انداز سے اس نے اسے پکڑ رکھا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ٹوکری خالی ہے۔ دفعتاً ایک چوراہے کے قریب لڑکی فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آ گئی۔ شاید وہ روڈ کراس کر کے دوسری جانب جانا چاہتی تھی۔ یوسف نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار ٹرک تیزی سے چوراہے کی طرف آ رہا ہے۔ سگنل کی روشنی سبز تھی اور شاید اسی لیے ٹرک ڈرائیور نے رفتار اور تیز کر دی تھی کہ وہ روشنی کے زرد یا سرخ ہونے سے پہلے چوراہا پار کر لے۔

لڑکی چند قدم بھی بڑھتی تو ٹرک کی زد میں آ کر کچلی جاتی۔ یوسف یہ اندازہ کرتے ہی بے تحاشا بھاگتے ہوئے لڑکی کے پاس پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہ ٹرک سے ٹکرائے

اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ایک لمحے کے لیے لڑکی جیسے اس کی آغوش میں آ گئی مگر تیز رفتار ٹرک کے قریب سے گزرنے کی آہٹ اس نے بھی سن لی تھی اور ممکنہ حادثے کے خیال نے اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ یوسف اسے سہارا دیتے ہوئے دوبارہ فٹ پاتھ پر لے آیا۔

"جب تمہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا....." وہ کچھ تیزی سے بولا۔ "تو اکیلی گھر سے کیوں نکل آئی ہو۔ ابھی ٹرک کے نیچے آ جاتیں تو کیا ہوتا۔"

"کیا ہوتا بابو صاحب۔" لڑکی نے خود کو سنبھالتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ میں مر جاتی۔ تو کیا ہوتا، اس مصیبت بھری زندگی سے نجات تو مل جاتی۔"

"یہ شاید تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ خدا نے تمہیں آنکھوں کی روشنی نہیں دی۔"

"دی تھی بابو صاحب مگر پھر چھین لی اور اس سے پہلے میرے ماں باپ چھین لیے، میں جنم کی اندھی نہیں ہوں۔"

"تم مجھے بابو صاحب کیوں کہہ رہی ہو؟" یوسف مسکرایا۔ "میں تو ایک دیہاتی ہوں آج ہی گاؤں سے شہر آیا ہوں۔"

"آپ جو کوئی بھی ہوں آپ نے میری جان بچائی ہے اس کے لیے شکریہ۔"

"اس طرف کا سگنل کھل گیا ہے آؤ تمہیں سڑک پار کروا دوں۔" یوسف نے اس لڑکی کی چھڑی پکڑتے ہوئے کہا۔ "ویسے تمہارا نام کیا ہے، مجھے تو یوسف کہتے ہیں۔"

"اور میرا نام نوری ہے۔" لڑکی بولی۔ "ہے نا ہنسنے والی بات۔ جس کے پاس آنکھوں کا نور نہ ہو اس کا نام نوری رکھ دیا جائے۔"

دونوں سڑک پار کرنے کے بعد بھی ساتھ چلتے رہے۔ نوری نے بتایا کہ جب وہ گیارہ، بارہ سال کی تھی تب اس کے ماں باپ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ تین برس کے بعد خدا جانے کیا ہوا کہ رفتہ رفتہ اس کی بینائی جاتی رہی۔ اب وہ اپنے دور کے رشتے کی ایک خالہ کے گھر میں رہتی ہے۔ خالہ کا بھی اس دنیا میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ ایک پھول والا روز صبح کو انہیں بہت سارے مختلف پھول دے جاتا ہے جس سے وہ ہار بناتی ہے اور روزانہ سہ پہر کو پھول والے کی دکان پر جا کر دے آتی ہے۔ اس طرح کبھی دس اور کبھی دو چار روپے زیادہ مل جاتے ہیں جو اُن دونوں کی گزر اوقات کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ آج بھی وہ پھول والے کو ہار دے کر ہی آ رہی تھی۔ روزانہ آنے جانے کی وجہ سے اسے راستہ بہت اچھی طرح یاد ہو گیا ہے۔ عام طور پر وہ ٹریفک کی آوازوں سے پہچان لیتی ہے کہ کس طرف کا سگنل کھلا ہے اور کس طرف کا بند ہے۔ آج وہ کچھ بے خیالی میں فٹ پاتھ سے سڑک پر آ گئی تھی۔

جواب میں یوسف نے اسے اپنی داستان سنائی کہ کس طرح سوتیلے بھائیوں نے اس کا اور اس کی ماں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد کس طرح ان کے ظلم و ستم میں مزید اضافہ ہو گیا اور اب کس طرح باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی انہوں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ اب وہ شہر میں کچھ کام کرنے آیا ہے۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کا بھی اس دنیا میں کوئی نہیں ہے؟" نوری نے کہا۔

"کہنے کی حد تک تو ہیں مگر ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے۔"

"پھر آپ ٹھہریں گے کہاں؟"

"چارپائی سرائے میں۔ جہاں ایک دو روپے میں رات کو سونے کے لیے چارپائی مل جاتی ہے۔" یوسف دفعتاً چونکا۔ "مگر یہ باتوں ہی باتوں میں ہم کہاں چلے جا رہے ہیں؟"

"یہ راستہ میرے گھر کی طرف جاتا ہے۔" نوری نے جواب دیا۔ "آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو جب تک آپ کو کوئی کام نہ مل جائے اور آپ کوئی اچھا سا ٹھکانا نہ تلاش کر لیں آپ ہمارے ساتھ ہی رہ سکتے ہیں۔"

"مگر میں تمہارے لیے بالکل انجان ہوں، ایک غیر آدمی پر تم اور تمہاری خالہ اتنا بھروسا کر لیں گی کہ اسے اپنے گھر میں ٹھہرا لیں۔"

"آپ بھی حالات کے ستائے ہوئے ہیں اور میں بھی۔" نوری نے جواب دیا۔ "مصیبت زدہ انسان ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دیتے۔ اس کے علاوہ جب سے میری بینائی گئی ہے میں صرف آواز اور لب و لہجے سے آدمی کو پہچان لیتی ہوں اور مجھے آپ بے حد شریف اور نیک دل آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"تمہاری خالہ کو کوئی اعتراض نہ ہو؟"

"بالکل نہیں بلکہ وہ خوش ہوں گی کہ گھر میں دو اکیلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

عورتوں کی حفاظت کے لیے ایک شریف مرد بھی آ گیا پھر ہمارے گھر میں کوئی ایسی قیمتی شے نہیں جس کے لیے کوئی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کرے۔"

یوسف نے پہلی مرتبہ نظر بھر کر نوری کو دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی تھی جس کی عمر سترہ، اٹھارہ سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ معمولی لباس اور سادگی نے اگرچہ اس کی خوب صورتی کو چھپا لیا تھا مگر پھر بھی آوارہ نظریں اس کے لیے آزمائش بن سکتی تھیں۔ یوسف نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اس سیدھی سادی معصوم لڑکی کی ہر طرح سے حفاظت کرے گا۔ نوری کا اندازہ درست تھا۔ اس کی خالہ بھی یوسف سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور اس نے بھی نوری کے اس خیال کی تائید کی کہ جب تک کوئی معقول رہائش کی جگہ نہ ملے یوسف ان کے گھر میں رہ سکتا ہے۔

☆☆☆

یہ وہ داستان تھی جو یوسف نے اس دن مجھے سنائی جب وہ ملازمت کی تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آیا تھا۔ تب اسے نوری کے گھر رہتے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ دن گزر گئے تھے۔ اس مدت میں اس نے ہر قسم کی محنت مزدوری کرنے کی کوشش کی لیکن کبھی کام مل جاتا تھا کبھی نہیں ملتا تھا۔ تب نوری نے اسے مشورہ دیا کہ وہ یومیہ اجرت کے بجائے کسی گھر میں اوپر کا کام کرنے کی ملازمت تلاش کرے۔ اس طرح اسے ایک لگی بندھی آمدنی کے علاوہ رہنے کی جگہ بھی مل سکتی ہے اگرچہ ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتی تھی کہ اب وہ اور اس کی خالہ یوسف کی موجودگی کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ نہیں چاہتے کہ یوسف گھر چھوڑ کر جائے۔ اتنا ہی نہیں نوری اسے کسی اور اعتبار سے بھی پسند کرنے لگی تھی اور یہی کیفیت سادہ دل یوسف کی بھی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کوئی مستقل ملازمت مل جائے گی تو نوری سے کہہ دے گا کہ وہ اب کام کرنا چھوڑ دے۔ وہ اس کی اور اس کی خالہ کی ذمے داری اپنے اوپر لینا چاہتا ہے۔

ہمارا گھر خاصا بڑا تھا۔ صفائی ستھرائی اور باہر کے دوسرے ضروری کاموں کے لیے ایک ملازم کی ضرورت تو تھی مگر شوکت کوئی ملازم یا ملازمہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ جس کی بڑی وجہ اس کی اپنی ایک کمزوری تھی۔ میں نے ابھی تک اپنے پڑھنے والوں کو یہ نہیں بتایا کہ زندگی کے دوسرے المیوں کے علاوہ شوکت ذاتی طور پر ایک انتہائی رنجیدہ حادثے کا شکار بھی ہو چکا تھا۔ اس نے ابو کی زندگی میں ہی ایک غریب گھر کی لڑکی نازیہ سے اپنی پسند کی شادی کر لی تھی۔ نازیہ کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کی ماں ایک اسکول ٹیچر تھیں۔ اس کا کوئی بھائی بھی نہیں تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اس کی اور اس کی تین بہنوں کی پرورش کی چونکہ وہ ملازمت کی وجہ سے آدھا دن گھر سے غیر حاضر رہتی تھیں اس لیے گھر اور باہر کے بیشتر کام لڑکیوں کو ہی کرنا پڑتے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی آزاد اور پُراعتماد بن چکی تھیں۔ نازیہ اور شوکت کی ملاقات بھی اسی آزادی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

نازیہ کی والدہ بیمار تھیں۔ نازیہ گھر سے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے نکلی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ شوکت اپنے کسی دوست سے مل کر گھر واپس آ رہا تھا کہ نازیہ نے لفٹ مانگنے کے معروف اشارے کے ذریعے اسے روکا۔

"معاف کیجیے گا۔" اس نے کار کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "میری امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے جا رہی ہوں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی ہے۔ کیا آپ مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلینک تک لفٹ دے دیں گے؟"

شوکت از راہِ ہمدردی نازیہ کو ڈاکٹر کے کلینک ہی لے کر نہیں گیا بلکہ اس نے اپنی کار میں ڈاکٹر کو نازیہ کے گھر تک بھی پہنچا دیا اور پھر واپسی میں انہیں کلینک چھوڑ کر نازیہ کو بازار سے دوائیں بھی خرید کر دیں اور اسے پھر گھر تک چھوڑنے گیا۔ یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی جو جلد ہی دوسری اور بے شمار ملاقاتوں کی تمہید بن گئی۔ یہاں تک کہ شوکت نے ابو سے اپنی پسند کا ذکر کیا۔ ابو اس معاملے میں کافی روشن خیال واقع ہوئے تھے۔ اگرچہ انہیں نازیہ کے گھر کا آزادانہ ماحول کچھ پسند نہیں آیا مگر انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مجھے باقاعدہ رشتہ دینے کے لیے بھیجا۔ نازیہ اور اس کی ماں ایسا اچھا رشتہ کیسے مسترد کر سکتی تھیں چند ماہ کے اندر ہی شادی ہو گئی۔

شادی کے بعد بھی نازیہ کی آزاد مزاجی بدستور جاری رہی۔ شوکت کے دوستوں کے ساتھ وہ بڑی بے تکلفی سے پیش آتی تھی۔ شادی کے ایک سال کے اندر ابو کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے برس نازیہ ایک بیٹے کی ماں بھی بن گئی جس کا نام عارف رکھا گیا تھا مگر ماں بن جانے کے بعد بھی نازیہ کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ شوکت نے بارہا اسے

سمجھانے کی کوشش کی مگر نازیہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتی تھی۔ اس اختلاف نے دونوں کے درمیان لڑائی جھگڑوں کا آغاز کر دیا۔ کبھی کبھی یہ جھگڑا اتنا طول پکڑ لیتا تھا کہ دونوں میں دنوں نہیں ہفتوں بات چیت کی نوبت نہیں آتی تھی لیکن باہمی فساد کے باوجود نازیہ کا باہر گھومنا پھرنا جاری رہتا۔ چار پانچ برس اس کیفیت میں گزر گئے۔ اگر میں درمیان میں پڑ کر ان دونوں کو نہ سمجھاتی رہتی تو شاید ایک دو سال بعد ہی طلاق کی نوبت آ جاتی۔

اور اب میں سوچتی ہوں کہ میں نے نازیہ کو سمجھنے میں بڑی بھول کی۔ اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ کس اقدام کے بارے میں سوچ رہی ہے تو میں ہرگز اس کے اور شوکت کے درمیان صلح کروانے کی کوشش نہ کرتی۔ وہ دونوں جائز طور پر الگ ہو جاتے تو یہ اس انجام سے بہرحال بہتر ہوتا جو بعد میں ہمیں دیکھنا پڑا۔ شوکت، نازیہ کی آزاد روش پر اکثر اسے ٹوکتا رہتا۔ خاص طور اس بے تکلفی پر جو نازیہ اس کے دو تین دوستوں کے ساتھ روا رکھتی تھی۔ ایسے ہی ایک مسئلے پر ان دونوں میں شدید جھڑپ ہوئی۔ نازیہ منع کرنے کے باوجود کسی دوست کے ساتھ سی ویو چلی گئی تھی اور رات کو دس بجے کے بعد گھر واپس آئی تھی۔ شوکت اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے گھر میں رہتے ہوئے نازیہ کو اس کھلی بے راہ روی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر اسے یہ آوارگی اتنی ہی پیاری ہے تو اپنی ماں کے گھر چلی جائے۔

نازیہ تیسرے دن سچ مچ چلی گئی اور ساتھ عارف کو بھی لے گئی۔ اپنے میکے نہیں بلکہ کسی نامعلوم مقام پر۔ اس نے جاتے ہوئے ایک خط بھی چھوڑا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر اسے معلوم ہوتا کہ شوکت اس قدر شکی مزاج اور تنگ دل کا مالک ہے تو وہ اس سے شادی ہی نہیں کرتی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ شروع میں اس کے ذہن میں بے وفائی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ تصور شوکت نے اسے ٹوک ٹوک کر خود اس کے ذہن میں پیدا کیا اور اب نتیجے میں اس نے ایک ایسا ساتھی تلاش کر لیا ہے جو شوکت کی طرح تنگ نظر نہیں ہے۔ وہ اس کے ساتھ جا رہی ہے۔ کپڑے، تمام زیور اور جو پیسے اس کی تحویل میں ہیں اس لیے لے جا رہی ہے کہ اس پر اس کا حق ہے۔ نیز وہ چاہتی تو عارف کو چھوڑ کر جا سکتی تھی مگر وہ اسے اس لیے ساتھ لے جا رہی ہے کہ اگر شوکت نے یہ معاملہ پولیس اور عدالت تک لے جانا چاہا تو وہ عارف کو کسی

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

سکتی تھی۔ اگلی صبح میں نے نرمی اور پیار سے بہت کچھ سمجھایا۔ شوکت نے وعدہ کیا کہ وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرے گا مگر یہ کہ اسے ایک ہی مرتبہ کے پینے سے یہ تجربہ ہوا کہ شراب کا نشہ آدمی کے تمام غم بھلا دیتا ہے۔ خواہ عارضی طور پر ہی سہی۔ اس لیے وہ شراب نوشی چھوڑنے کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ اس پر میں نے اس سے کہا کہ تم ایک کالج میں پڑھاتے ہو اور استاد طالب علموں کے لیے اخلاق کا معمار ہوتے ہیں۔ تمہاری شراب نوشی عام ہوئی تو تمہارے شاگرد کیا سوچیں گے۔ ملازمت تو یقینی ختم ہوجائے گی اس کے علاوہ دنیا بھر کی نظروں میں بھی خود کو ذلیل اور رسوا کرلو گے۔ مزید یہ کہ آدمی کی کوئی بری عادت سامنے آتی ہے تو لوگ اس کی وجہ کے بارے میں بھی قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ ابھی تو ہم نے یہ کہہ دیا ہے کہ نازیہ اپنی ماں کے گھر چلی گئی ہے لیکن تمہیں شراب کے نشے میں دیکھ کر لوگ یقیناً چہ میگوئیاں کریں گے اور پھر شاید یہ ذلت بھی راز نہ رہ سکے۔ اس لیے اگر تم کسی طرح شراب چھوڑ نہیں سکتے تو کم سے کم یہ وعدہ کرو کہ جب بھی پیو گے گھر کی تنہائی میں پیو گے۔

بات شوکت کی سمجھ میں آگئی۔ تب سے وہ گاہے گاہے ہی جب بھی اسے عارف کی یاد زیادہ ستاتی کالج سے آنے کے بعد ایک دو گلاس وہسکی پی لیتا تھا۔ شراب کی سپلائی کا انتظام اس نے کیسے کیا تھا یہ مجھے نہیں معلوم مگر اس میں بھی اس نے اتنی رازداری برتی تھی کہ نازیہ کو گئے سات آٹھ مہینے ہوگئے تھے مگر شوکت کی شراب نوشی اس کے قریبی دوستوں سے بھی پوشیدہ رہی۔ پہلے ہمارے یہاں ایک ملازمہ ہوا کرتی تھی لیکن شوکت نے اسے برطرف کردیا۔ محض اس اندیشے سے کہ اگر کبھی اس نے شوکت کو شراب کے نشے میں دیکھ لیا تو بات گھر سے باہر نکل سکتی ہے اور تب سے ہمارے گھر کوئی ملازم نہیں رکھا گیا تھا۔

لیکن جب ایک دن شوکت کے کالج جانے کے بعد یوسف نے کام کی تلاش میں ہمارے گھر پر دستک دی اور مجھے اپنی پوری روداد سنائی تو میں اس سے انکار نہیں کرسکی۔ اگلے دن اتفاق سے کالج کی چھٹی تھی۔ میں نے یوسف سے کہا کہ تم کل آجاؤ۔ تمہیں رکھنے نہ رکھنے کا اختیار پروفیسر صاحب کو ہے۔ میں ان سے تمہاری سفارش ضرور کردوں گی لیکن انہیں آمادہ کرنا تمہارا کام ہے۔ یوسف ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ دیہاتی ہونے کے باوجود بڑے اچھے انداز میں بات کرتا تھا اور اس کے مجموعی طرزِ عمل میں کوئی ایسی بات تھی جو آدمی کو خود بخود اس سے ہمدردی کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں شوکت سے کہوں گی تو ممکن ہے وہ صاف انکار کردے لیکن یوسف کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کی زبان سے اس کی کہانی سن کر وہ کبھی انکار نہیں کرسکے گا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ شام کو میں نے بات چھیڑی تو شوکت نے صاف منع کردیا تھا۔

"آپ جانتی ہیں باجی کہ ایک سال گزرنے کے باوجود بھی میں عارف کو نہیں بھول سکا ہوں۔" اس نے کہا۔ "اور نہ ہی شراب چھوٹ سکی ہے، کم پیتا ہوں مگر اب بھی جب کبھی دل قابو سے باہر ہونے لگتا ہے تو وہسکی کا نشہ ہی سہارا دیتا ہے۔ غنیمت ہے کہ یہ عادت ابھی تک راز بنی ہوئی ہے۔ کوئی تیسرا فرد گھر میں آجائے تو پھر یہ بات عام ہونے میں کتنی دیر لگے گی۔"

"یوسف بہت ضرورت مند ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اس سے ایک بار مل تو لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔"

دوسرے دن یوسف صبح ہی آگیا اور جیسا کہ میرا اندازہ تھا شوکت اس سے مل کر بہت متاثر ہوا۔ وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "تمہیں صرف ایک شرط پر ملازمت مل سکتی ہے۔"

"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے۔" یوسف نے فوراً جواب دیا۔

"تو پھر سنو کہ اس گھر کے اندر جو بات یا جو کام بھی تم ہوتے ہوئے دیکھو اس کا ذکر کبھی بھولے سے بھی کسی اور سے مت کرنا۔"

یوسف کو اس انوکھی شرط سے حیرت تو ضرور ہوئی ہوگی مگر وہ ضرورت مند تھا، اس نے قسم کھا کر وعدہ کرلیا کہ اس گھر کے بارے میں کبھی کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا اور یوں یوسف ہمارے یہاں کام کرنے لگا۔

☆☆☆

یوسف صبح آٹھ بجے تک آجاتا تھا اور رات کو نو دس بجے تک رہتا تھا۔ ویسے میں نے اسے گھر کا ایک کمرا بھی دے دیا تھا کہ وہ چاہے تو یہیں رہ بھی سکتا ہے مگر یوسف نے نوری اور اس کی خالہ کی تنہائی کے خیال سے کبھی اس رعایت سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق پہلے محلے کے ایک دو بدمعاش قسم کے نوجوان نوری کو اکیلا اور بے سہارا خیال کرتے ہوئے راستے میں آتے جاتے اس سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے لیکن جب سے وہ اس کے گھر

میں رہنے لگا تھا یہ چھیڑ چھاڑ ختم ہوگئی تھی۔ نوری کی خالہ نے اسے اپنے ایک رشتے کے بھائی کا بیٹا گویا اپنا بھتیجا مشہور کردیا تھا اس لیے کسی کو اس کے نوری کے گھر میں رہنے پر بھی کوئی اعتراض کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

یوسف کبھی کبھی چھٹی لے کر دوپہر کو دو تین گھنٹے کے لیے گھر چلا جاتا تھا۔ شروع میں اس لیے کہ نوری جو ہار بنا کر دیتی تھی وہ پھول والے کو دے آئے مگر پھر بعد میں پہلی تنخواہ ملتے ہی اس نے نوری کو منع کردیا کہ اب وہ ہار بنانے کا کام نہ کرے۔ تب وہ دوپہر کو گھر جا کر ضرورت کی چیزیں بازار سے لا دیا کرتا تھا۔ ایک دن اسے خلافِ معمول لوٹنے میں تقریباً شام ہوگئی۔ وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ محلے کا کوئی بچہ سڑک پر کھیلتے کھیلتے ایک سائیکل کی زد میں آگیا۔ اس کے سر میں چوٹ لگی تھی۔ یوسف اسے ایک قریبی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

"میں اس کی مرہم پٹی تو کردوں گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "لیکن بہتر ہوتا کہ تم اسے کسی اسپتال لے جاتے۔ سر کی چوٹ ایسی ہے کہ ایک دو ٹانکے لگ جاتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔"

"تو کیا آپ ڈاکٹر نہیں ہیں؟" یوسف نے پوچھا۔

"ڈاکٹر تو ہوں مگر صرف آنکھوں کا ڈاکٹر ہوں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ آنکھوں کا ڈاکٹر' یہ سنتے ہی یوسف کو نوری کا خیال آگیا۔

"اگر آپ آنکھوں کے ڈاکٹر ہیں تو کیا کسی کے اندھے پن کا علاج بھی کرسکتے ہیں؟"

"کرسکتا ہوں مگر اس کی بینائی واپس آسکتی ہے یا نہیں یہ بات مریض کی آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہی بتا سکتا ہوں۔"

"ڈاکٹر صاحب ایک لڑکی ہے جس کا نام نوری ہے۔" یوسف نے بتایا۔ "وہ پیدائشی اندھی نہیں ہے چودہ، پندرہ برس کی عمر میں نہ معلوم کیوں رفتہ رفتہ اس کی بینائی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اب وہ بالکل نہیں دیکھ سکتی۔ اب اس بات کو تقریباً تین برس گزر چکے ہیں۔ کیا آپ اس کا علاج بھی کرسکتے ہیں؟"

"میں نے کہا نا کہ علاج تو کرسکتا ہوں مگر کامیابی ہوگی یا نہیں یہ بات نوری کی آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد ہی کہی جاسکتی ہے۔ میں قریب ہی ایک آنکھوں کے اسپتال میں کام کرتا ہوں۔ تم اس لڑکی کو کسی بھی دن میرے پاس

"ن"

ایک حرفِ مقطعات، یہ سورہ القلم کی ابتدا میں آیا ہے۔ مفسرین اس کی مختلف تشریحات بتاتے ہیں مثلاً سیاہی کا دھبا، مچھلی، نور کا مخفف وغیرہ حتمی معنی انسان سے مخفی ہیں۔

مرسلہ: نورعین، حاصل پور

لاسکتے ہو۔"

یوسف کے لیے اتنا دلاسا ہی بہت تھا۔ اس نے بچے کی مرہم پٹی کروا کر اسے اس کے گھر چھوڑا اور نوری کو لے کر اسپتال پہنچ گیا مگر تب تک ڈاکٹر صاحب گھر سے واپس نہیں آئے تھے۔ ایک نرس نے اسے بتایا کہ اگر وہ نوری کی آنکھیں دکھانا چاہتا ہے تو اس کے لیے وقت مقرر کرکے آنا ہوگا کیونکہ معائنہ کرنے میں کافی دیر لگتی ہے۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ اس نے نرس سے وقت دینے کے لیے کہا تو اس نے تین دن کے بعد کی تاریخ دی ہے۔

"آپ اس دن مجھے صبح میں صرف آدھا گھنٹے کی چھٹی دے دیں۔" اس نے مجھ سے کہا۔ "میں نوری کو دکھانے کے بعد فوراً آجاؤں گا۔"

"ضرور چلے جانا۔" میں نے جواب دیا۔ "خدا کرے کہ نوری کو آنکھوں کی روشنی واپس مل جائے۔"

☆☆☆

اس کے بعد جو واقعات پیش آئے ان میں سے اکثر کا علم مجھے بعد میں ہوا تھا مگر میں کہانی کے تسلسل اور ترتیب کو قائم کرنے کے لیے اسی طرح تحریر کرنے کی کوشش کروں گی جس طرح وہ پیش آئے تھے۔

یوسف اتفاقاً جن ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا' ان کا نام ڈاکٹر اشفاق تھا۔ شہر کے معروف ماہر امراض چشم میں شمار کیے جاتے تھے اور ایک پرائیوٹ اسپتال میں کام کرتے تھے۔ تین دن کے بعد یوسف مقررہ وقت پر نوری کو ساتھ لے کر اسپتال پہنچ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی توجہ سے آنکھوں کا معائنہ کیا اور پھر بعد میں یوسف کو بتایا کہ کوئی خطرناک بات نہیں۔ آپریشن کی ضرورت ہے جس کے بعد خدا نے چاہا تو پھر سے نوری سب کچھ دیکھ سکے گی۔

"تو پھر آپریشن کر دیجیے ڈاکٹر صاحب۔" یوسف نے جلدی سے کہا۔

"یہ اتنا آسان کام نہیں۔" ڈاکٹر اشفاق نے ہمدردی سے کہا۔ "اس کے لیے نوری کو آپریشن سے ایک دو دن قبل اسپتال میں داخل کرنا ہوگا اور پھر آپریشن کے بعد کم سے کم ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا ہوگا اور آپریشن سمیت تمام دوا، علاج اور اسپتال میں رہنے کا خرچ اندازاً پندرہ بیس ہزار ہوگا۔ تم اتنی رقم کا انتظام کر سکتے ہو۔"

"پندرہ بیس ہزار۔" یوسف نے کچھ حیرت کچھ مایوسی سے دہرایا۔

"ہاں، کم سے کم اتنا خرچ تو ہوگا ہی۔"

"اچھی بات ہے ڈاکٹر صاحب، میں کہیں نہ کہیں سے کسی نہ کسی طرح پندرہ بیس ہزار روپے حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔"

نوری دوسرے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اسے ڈاکٹر اشفاق اور یوسف کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کا کوئی علم نہیں تھا۔ یوسف کو احساس تھا کہ بیس ہزار اس کے اور نوری کے لیے ایک بہت بڑی رقم ہے مگر وہ نوری کو جسے علاج کے بارے میں سن کر یہ بڑی آس بندھ گئی تھی، مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"آؤ گھر چلیں نوری۔" ڈاکٹر اشفاق کے کمرے سے نکل کر نوری کے پاس آتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے کہ تمہاری آنکھیں آپریشن کے بعد بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"آپریشن....." نوری یوسف سے زیادہ باخبر معلوم ہوتی تھی۔ "اس میں تو بڑا پیسا خرچ ہوتا ہوگا۔"

"نہیں کچھ ایسا زیادہ بھی نہیں ہے۔" یوسف نے اطمینان دلایا۔ "میرے ہوتے ہوئے تم فکر کیوں کرتی ہو۔"

"فکر کی تو بات ہی ہے۔ آخر تم بھی کہاں سے لاؤ گے؟"

"میں جہاں کام کرتا ہوں وہ پروفیسر صاحب بہت ہمدرد اور مخلص آدمی ہیں۔" یوسف نے جواب دیا۔ "میں ان سے قرض مانگ لوں گا اور ہر مہینے اپنی تنخواہ سے کٹواتا رہوں گا۔"

"کتنا قرض لو گے، ڈاکٹر صاحب نے تو ہزاروں کا خرچ بتایا ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب نے ابھی کوئی خاص رقم نہیں بتائی۔" یوسف نے جھوٹ بولا۔ "اور ظاہر ہے علاج سے پہلے کوئی کیا بتا سکتا ہے کہ کتنا خرچ ہوگا۔ ویسے انہوں نے اندازاً کہا ہے کہ پانچ چھ ہزار روپے خرچ ہوں گے۔"

"پانچ چھ ہزار روپے۔" نوری نے چونکتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ پروفیسر صاحب تمہیں اتنا قرض دے دیں گے۔"

"بڑے آدمیوں کے لیے پانچ چھ ہزار روپے کیا ہوتے ہیں۔" یوسف نے جیسے خود کو تسلی دلائی۔ "مجھے پورا یقین ہے کہ پروفیسر صاحب یہ سن کر مجھے تمہارے علاج کے لیے ضرورت ہے کبھی انکار نہیں کریں گے۔"

"انہیں میرے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"انہیں نہیں میں نے ان کی بڑی بہن کو بتایا تھا۔" یوسف نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "اب جلدی سے اٹھو تمہیں گھر پہنچا کر مجھے کام پر بھی جانا ہے۔ صرف دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔"

☆☆☆

مجھے اس وقت یوسف نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اگرچہ میں نے پوچھا بھی تھا کہ ڈاکٹر نے نوری کی آنکھیں دیکھ کر کیا کہا۔ اس نے جواب میں صرف اتنا ہی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نے آپریشن کرنے کو کہا ہے اور امید ہے کہ آپریشن کے بعد نوری کی بینائی لوٹ آئے گی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں پندرہ بیس ہزار خرچ ہوگا لیکن غالباً اسے مجھ سے قرض کے بارے میں بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ دو تین دن تک میں نے گاہے گاہے نوٹ کیا کہ جیسے یوسف مجھ سے یا شوکت سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں پاتا۔ مجھے نوری کی مالی حیثیت کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ ہار بنانے کا کام کرنے کے باوجود یہ ممکن تھا کہ اس کے پاس یا اس کی خالہ کے پاس کچھ زیور موجود ہوں۔ جنہیں فروخت کر کے آپریشن کروایا جا سکتا ہو پھر بھی ایک دو مرتبہ مجھے خیال آیا تھا کہ شاید یوسف مجھ سے یا شوکت سے روپے دینے کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ نیا نیا ملازم ہوا ہے اس لیے مانگنے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا ہے۔ میں ابھی اسی سوچ میں تھی کہ کسی دن خود اس سے پوچھوں گی کہ اس نے آپریشن کے خرچ کا کیا انتظام کیا کہ ایک افسوس ناک واقعہ پیش آ گیا۔

ایک شام شوکت نے پھر شراب کا سہارا لیا۔ ایسی

صورت میں وہ عموماً اپنے کمرے میں گھس کر بیٹھ جاتا اور رات کا کھانا بھی اگر کھانے کا ہوش باقی رہتا میں اس کے کمرے میں ہی رکھ دیا کرتی تھی۔ اب چونکہ یوسف آ گیا تھا اس لیے میرے بجائے یہ ڈیوٹی اس کے ذمے آ گئی تھی۔ اس دن بھی میں نے یوسف سے کہہ دیا تھا کہ وہ رات کا کھانا شوکت کے کمرے میں رکھ کر چلا جائے۔ کافی رات کو جب میں عشا کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو میں نے دیکھا کہ یوسف جا چکا ہے اور شوکت اپنے پلنگ پر بے خبر سو رہا ہے۔ میں نے گھر کا بیرونی دروازہ بند کیا اور خود بھی اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔

اگلے دن یوسف خلاف معمول کام پر نہیں آیا۔ دیر ہوتے دیکھ کر میں نے خود ہی ناشتا بنایا اور شوکت کو بلانے گئی تو دیکھا کہ وہ اپنی الماری کا لاک کھولے کچھ پریشان سا کھڑا ہے۔

"باجی میرے لاکر سے بیس ہزار روپے غائب ہیں۔" اس نے بتایا۔ "آپ نے تو نہیں نکالے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں اگر نکالتی تو تمہیں پہلے بتا دیتی۔"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ رقم یوسف نے چوری کی ہے۔" شوکت نے کچھ غصے سے کہا۔

"وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے تم ہی کہیں رکھ کر یا خرچ کر کے بھول گئے ہو۔"

مگر شوکت کا اصرار تھا کہ کہیں رکھ کر بھولنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور خرچ کرنے کا امکان اس لیے کم ہے کیونکہ بیس ہزار معمولی رقم نہیں ہے اگر میں نے کہیں خرچ کیے ہوتے تو معلوم نہ ہوتا۔ وہ اسی پر اڑا ہوا تھا کہ یہ پیسے یوسف نے چوری کیے ہیں اور اسی لیے وہ آج کام پر بھی نہیں آیا ہے۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے ایک دوست پولیس انسپکٹر مجید کو فون کر دیا۔ انسپکٹر مجید اس کا بہت اچھا دوست تھا وہ فوراً ایک کانسٹیبل لے کر گھر آ گیا۔

☆☆☆

دوسری جانب یوسف صبح ہوتے ہی اسپتال جا پہنچا اور جیسے ہی ڈاکٹر اشفاق اسپتال آئے انہیں راستے میں ہی روک لیا۔

"ڈاکٹر صاحب میں نے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔" وہ بولا۔ "آپ کہیں تو نوری کو لے آؤں؟"

ڈاکٹر اشفاق نے راستے میں رک کر بات کرنا مناسب نہیں سمجھا اور یوسف کو اپنے ساتھ آفس میں لے گئے۔ آفس میں داخل ہوتے ہی یوسف نے بیس ہزار روپے جیب سے نکال کر ڈاکٹر صاحب کے سامنے رکھ دیے۔

"اتنی جلدی تم نے انتظام کیسے کر لیا؟" ڈاکٹر صاحب نے کچھ حیرت سے پوچھا۔ "تمہاری باتوں سے تو اندازہ ہوتا تھا کہ تم اور نوری دونوں بہت غریب ہو۔"

"آپ کا کہنا درست ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہمارے پاس اتنی رقم ہوتی تو میں اسی دن نوری کو اسپتال میں داخل کر دیتا۔"

"پھر تم نے یہ رقم کہاں سے حاصل کی؟"

"میں ایک پروفیسر صاحب کے گھر ملازم ہوں۔" یوسف نے جواب دیا۔ "وہ بہت شریف، ہمدرد اور غریبوں کا خیال رکھنے والے انسان ہیں۔ انہیں تو نوری کے اندھے پن کے بارے میں معلوم تھا۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ آپریشن کے لیے بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے، اگر وہ مجھے اتنی رقم قرض دے دیں اور تھوڑی تھوڑی کر کے میری تنخواہ سے کاٹتے رہیں تو میں یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ وہ فوراً مان گئے اور اسی وقت الماری سے روپے نکال کر مجھے دے دیے۔"

"تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟" ڈاکٹر اشفاق نے اس کی لگن سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی تو ہزار روپے ہے مگر صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ دو تین مہینے بعد میرا کام دیکھ کر بڑھا دیں گے۔"

"ہزار روپے۔" ڈاکٹر اشفاق نے دہرایا۔ "تمہاری گزر اوقات کے لیے یہ کم پڑتے ہوں گے۔ اگر تم نے ایک سو روپے ماہوار بھی کٹوایا تو گزارہ کیسے کرو گے اور پھر کتنے برسوں میں جا کر یہ قرض اترے گا۔"

"گزر بسر کا کیا ہے جی چنے کھا کر بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے۔ میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ نوری کو اس کی آنکھوں کی روشنی پھر سے واپس مل جائے۔"

"ایک ایسی لڑکی کے لیے جو تمہاری رشتے دار بھی نہیں تمہارا یہ جذبہ قابلِ تحسین ہے۔" ڈاکٹر اشفاق نے کہا۔ "مجھے تمہارے خلوص نے بہت متاثر کیا ہے۔ میرے آپریشن کی فیس دو ہزار ہوتی ہے۔ میں تم سے فیس نہیں لوں گا۔ اسپتال کے اخراجات کے سلسلے میں بھی رعایت دلوانے کی کوشش کروں گا۔ سردست تم دس ہزار تو اپنے مالک کو واپس کر ہی سکتے ہو۔" یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق نے خود

WWW.PAKSOCIETY.COM

دس ہزار روپے گن کر یوسف کو دے دیے۔

"بس اب تم جلدی سے گھر جا کر نوری کو لے آؤ۔" انہوں نے مزید کہا۔ "اگر وہ آج ہی اسپتال میں ایڈمٹ ہوگئی تو میں پرسوں یا اس کے ایک دن بعد آپریشن کردوں گا۔"

"آپریشن کامیاب تو ہوجائے گا۔"

"انشاءاللہ ضرور۔" ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "جہاں تک میرا اندازہ ہے اسے موتیابند کے علاوہ کوئی اور بیماری نہیں اور یہ آپریشن تو آج کل بڑی کامیابی سے کیا جارہا ہے۔"

یوسف، نوری کو رات ہی خوش خبری سنا چکا تھا۔ ڈاکٹر اشفاق کی اجازت پا کر وہ اسی وقت گھر واپس آگیا اور نوری کو اسپتال میں داخل کروادیا۔ اس سے وعدہ بھی کیا کہ وہ روزانہ صبح دوپہر اور شام کو اس کی مزاج پرسی کے لیے آتا رہے گا۔

☆☆☆

نوری کو اسپتال چھوڑ کر یوسف ہمارے گھر پہنچا تو اس وقت تک انسپکٹر مجید بھی پہنچ چکے تھے۔ یوسف کو دیکھتے ہی شوکت بول اٹھا۔ "مجید صاحب یہی چور ہے اسے گرفتار کرلیں۔"

یوسف اس اچانک واقعے پر بڑا حیران نظر آرہا تھا۔ انسپکٹر مجید نے اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی جیبوں کی تلاشی لی تو دس ہزار روپے بھی برآمد ہوگئے۔

"اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا کہ چوری تم نے ہی کی تھی۔" انسپکٹر مجید نے تیزی سے کہا۔ "بتاؤ دس ہزار کہاں ہیں؟"

"میں چور نہیں ہوں انسپکٹر صاحب۔" یوسف گھبرا کر بولا۔

"پھر یہ روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟"

"یہ تو مجھے پروفیسر صاحب نے قرض دیے تھے۔"

"دس ہزار؟"

"جی نہیں بیس ہزار۔" یوسف نے جواب دیا۔ "مگر میرا کام دس ہزار سے ہی بن گیا اس لیے میں یہ باقی دس ہزار واپس کرنے لایا تھا۔"

"یہ بکواس کررہا ہے مجید صاحب۔" شوکت نے غصے سے کہا۔ "میں نے ہرگز اسے کوئی رقم قرض نہیں دی۔ سوچنے کی بات ہے۔ ابھی اسے ہمارے گھر کام کرتے ہوئے دو مہینے بھی نہیں ہوئے اور اس کی تنخواہ بھی صرف ہزار روپے ہے۔ ایک تقریباً انجان اور ناواقف ملازم کو میں قرض اور وہ بھی بیس ہزار کیسے دے سکتا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ضرور اس نے چوری کی ہے۔" انسپکٹر مجید نے جواب دیا۔ "پولیس بہت جلد اس سے اعتراف کروالے گی۔"

"اور چوری کرنے کے بعد....." میں نے درمیان میں دخل دیا۔ "یہ دس ہزار اپنی جیبوں میں بھر کر واپس بھی لے آیا تاکہ اگر تلاشی لی جائے تو اس کے مجرم ہونے کا کوئی شبہ نہ رہے۔"

"اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ چوری اتنی جلدی کھل جائے گی؟" انسپکٹر مجید نے جواب دیا۔

"آپ نے ٹھیک کہا۔" شوکت نے بھی تائید کی۔ "میں عموماً اپنا لاکر روزانہ نہیں کھولتا۔ آج اتفاق سے مجھے کچھ روپے کی ضرورت تھی اس لیے کھولا تھا اور کھولا تو مجھے رقم کچھ کم معلوم ہوئی۔ ہم پروفیسر لوگ زیادہ امیر نہیں ہوتے۔ لاکر میں پچاس ساٹھ ہزار سے زیادہ نہیں تھے اور اس میں سے نصف نکل جائیں تو فوراً احساس ہونا ہی چاہیے۔"

"آپ بھول رہے ہیں صاحب۔" یوسف نے بڑے التجا آمیز لہجے میں شوکت کو مخاطب کیا۔ "آپ نے خود اپنے ہاتھوں سے روپے مجھے دیے تھے اور اس وقت آپ....." وہ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہوگیا۔

"ہاں ہاں بولو رک کیوں گئے۔" انسپکٹر مجید نے کہا۔

"میں اس کے علاوہ اور کچھ کہنا نہیں چاہتا انسپکٹر صاحب۔" یوسف نے بڑی بے بسی سے جواب دیا۔ "کہ مجھے صاحب نے خود بیس ہزار روپے قرض دیے تھے۔"

"اچھا.....اور تمہیں ایسی کیا ضرورت پیش آگئی تھی جس کے لیے بیس ہزار کی رقم درکار تھی؟" انسپکٹر مجید نے سوال کیا۔

یوسف کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔ "یہ میں آپ کو نہیں بتاسکتا۔"

میں اس کی بے بسی کا کچھ کچھ اندازہ لگا سکتی تھی۔ وہ یہ انکشاف کرکے کہ اس وقت شوکت شراب پی رہا تھا اپنا عہد توڑنا نہیں چاہتا تھا اور نوری کے بارے میں خاموشی کا مطلب بھی ظاہر تھا۔ اگر وہ انسپکٹر مجید کو بتادیتا کہ اس نے رقم کس مقصد سے لی تھی تو کم سے کم اسے پورا یقین ہوگا کہ مجید

اسپتال جا کر وہ رقم بھی واپس لے لے گا اور پھر نوری کا آپریشن نہیں ہوسکے گا چونکہ اس وقت تک مجھے تمام صورتِ حال کا علم نہیں تھا اس لیے یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آرہی تھی کہ اس نے آپریشن کا خرچ تو بیس ہزار بتایا تھا پھر دس ہزار واپس کرنے کیوں لایا تھا البتہ مجھے یہ شک ضرور ہوگیا کہ یوسف غالباً سچ بول رہا ہے۔ اس نے شوکت کو شراب کے نشے میں دیکھ کر قرض مانگنے کی ہمت کر ہی ڈالی اور شوکت نے نشے کی موج میں رقم نکال کر دے بھی دی اور چونکہ نشے کے عالم میں دی تھی اس لیے اسے یاد نہیں رہا اور وہ سچ مچ یوسف کو چور خیال کررہا ہے لیکن ظاہر تھا کہ میں ان خیالات کا اظہار انسپکٹر مجید کے سامنے نہیں کرسکتی تھی اس لیے خاموش رہنا پڑا۔

انسپکٹر مجید یوسف سے مزید کچھ جرح کرنے کے بعد اسے گرفتار کرکے پولیس اسٹیشن لے گیا۔ شوکت کو کالج جانے میں کافی دیر ہوچکی تھی اس لیے وہ بھی انسپکٹر مجید کے ساتھ ہی باہر نکل گیا اور کالج چلا گیا۔ یوں مجھے اس سے بات کرنے کا موقع شام سے پہلے میسر نہیں آسکا۔ جب وہ کالج سے واپس آکر چائے پی رہا تھا تب میں نے شوکت سے کہا۔

"ذرا ذہن پر زور دے کر سوچو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ یوسف نے تم سے اس وقت رقم مانگی ہو جب تم شراب کے نشے میں مدہوش ہورہے تھے اور تم نے نشے کی سرخوشی میں بلاتردد اسے رقم دے دی ہو اور چونکہ نشے میں دی تھی اس لیے اب یہ بات تمہیں یاد نہ ہو۔"

شوکت نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں اور پیشانی پر سوچ کے تاثرات نمودار ہوئے۔ وہ کافی دیر تک خاموش رہا پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"باجی شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ اب ذہن پر زور دیا تو مجھے جیسے کچھ دھندلا سا خیال آرہا ہے کہ یوسف کسی غریب لڑکی کی آنکھوں کے آپریشن کی بات کررہا تھا۔ ممکن ہے میں نے ہی اسے پیسے دیے ہوں۔"

"ممکن نہیں بلکہ ایسا ہی ہوا تھا۔" میں نے کچھ تیزی سے کہا۔ "تم نے اپنی جلد بازی اور جھنجلاہٹ میں ایک بے گناہ کو قانون کے حوالے کردیا ہے اور اس کی وفاداری دیکھو کہ وہ یہ کہتے کہتے رک گیا کہ تم اس وقت شراب پی رہے تھے۔ صرف اس لیے اپنے خلاف جرم کا شبہ اور بڑھالیا کہ اس نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ گھر میں ہونے والی کوئی بات کسی سے نہیں کہے گا۔"

"بے شک مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔" شوکت نے شرمندگی سے کہا۔ "مگر مشکل یہ ہے کہ اب اس غلطی کا کوئی تدارک بھی نہیں کیا جاسکتا۔ آخر میں انسپکٹر مجید سے کیا کہوں گا۔ حقیقت بیان نہیں کرسکتا کہ اس میں خود اپنی رسوائی ہے اور رسوائی بھی دہری ایک تو شراب پینے کی وجہ سے دوسرے ایک بے گناہ پر چوری کا الزام لگانے کی اور اگر یہ کہوں کہ رقم چوری نہیں ہوئی خود میں ہی لاکر کے بجائے میز کی دراز میں رکھ کر بھول گیا تھا تو پھر یوسف کے پاس سے جو رقم برآمد ہوئی ہے اس کا کیا جواز بنے گا۔ مزید یہ کہ یوسف کہہ چکا ہے کہ میں نے خود اسے پیسے دیے تھے۔"

میں نے خود بھی سوچا واقعی یہ ایک عجیب الجھن پیدا ہوگئی تھی۔ خاموش رہنے میں ایک بے گناہ اور وفادار شخص کو سزا ملنے کا اندیشہ تھا اور سچ کہنے میں نہ صرف شوکت کی رسوائی تھی بلکہ بات کھلنے پر اس کی ملازمت بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجید صاحب سے کہہ دو کہ تم اس چوری کے لیے یوسف کو معاف کرتے ہو اس لیے وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں۔" میں نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"معلوم نہیں ہوسکتا ہے یا نہیں۔" شوکت نے جواب دیا۔ "لیکن مجید پلٹ کر یہ ضرور پوچھے گا کہ جب تمہیں معاف ہی کرنا تھا تو اس کے خلاف رپورٹ کیوں کی تھی۔"

"تم کہہ سکتے ہو کہ تب تمہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ کس مجبوری نے یوسف کو چوری پر آمادہ کیا تھا۔"

"اور اب کیسے معلوم ہوگیا؟"

"اس لیے کہ میں نے تمہیں بتایا اور مجھے اس لیے معلوم تھا کہ یوسف مجھ سے پہلے ہی اپنی ضرورت کا اظہار کرچکا تھا۔"

"وہ اعتراض کرسکتا ہے کہ آپ نے یہ بات صبح ہی کیوں نہیں بتائی؟" شوکت نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ بات یہاں تک پہنچی تو مجید کو شبہ ہوسکتا ہے کہ یوسف کا بیان ہی درست ہے اور ہم نے اپنی کوئی کمزوری یا غلطی چھپانے کے لیے اس پر چوری کا الزام لگایا تھا۔"

"شبہ ہوسکتا ہے تو ہوتا رہے وہ تمہارا دوست ہے تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ بات مزید نہ الجھ جائے پھر بھی آپ کہتی ہیں تو کل مجید سے پوچھوں گا کہ اب کچھ کیا جاسکتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے یا نہیں؟"

مگر اگلے دن تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ انسپکٹر مجید کسی دوسرے بڑے کیس میں الجھا ہوا تھا۔ وہ شوکت سے دوستی کی خاطر آ تو گیا تھا مگر ایک معمولی چوری کو دردِ سر بنانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک کیس بالکل صاف تھا۔ یوسف نے الماری کے لاک سے جس کی چابیاں عام طور پر میز کی دراز میں رکھی رہتی تھیں رقم چرائی' چوری فوراً معلوم ہوگئی۔ جس کی یوسف کو امید نہیں تھی۔ وہ حسبِ معمول کام پر آیا کہ نہ آنے سے اس کے خلاف شبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ چوری شدہ رقم کا نصف حصہ اس کے پاس سے برآمد کر لیا گیا۔ گویا چوری ثابت ہوگئی۔ رہا اس کا یہ بیان کہ شوکت نے خود اسے قرض دیا تھا۔ چوری کے الزام سے بچنے کے لیے ایک ناکام بہانے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ کیس اپنی جگہ بالکل صاف تھا۔ مزید تحقیقات میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اس لیے انسپکٹر مجید نے اپنے ایک ماتحت کے ذریعے یوسف کا کیس فوری طور پر متعلقہ عدالت میں پیش کر دیا۔

شوکت انسپکٹر کے گھر گیا تو ملاقات نہ ہو سکی۔ اس نے کالج سے فون کیا تو انسپکٹر مجید نے پوری صورتِ حال بیان کر دی اور کہا اب چونکہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے اس لیے وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یوسف خود جا کر سرکاری وکیل سے بات کرے تب ممکن ہے کہ شاید کوئی صورت نکل آئے یا یہ کہ وکیل پہلا جرم ہونے کی بنیاد پر عدالت سے کم سے کم سزا دینے کی درخواست کرے مگر اس کے ساتھ مجید نے یہ بھی کہا کہ گھریلو ملازموں کے ذریعے چوری کے واقعات خاصے بڑھتے جا رہے ہیں۔ وہ حیران ہے کہ شوکت ایک مجرم سے اتنی ہمدردی کیوں کر رہا ہے جبکہ یہ عین ممکن ہے کہ یوسف آئندہ زیادہ بڑا ہاتھ مارنے کی کوشش کرے اور اگر اسے ملازمت سے نکال دیا جائے تو کسی اور گھر میں جا کر یہی حرکت پھر کرے گا۔ یہ تو سراسر جرم پھیلانے کی کوشش کرنے والی بات ہوگی۔

شوکت اس گفتگو سے خاصا خوف زدہ ہو گیا کہ مزید زور دینے سے کہیں وہ خود کسی بڑی مشکل میں نہ پھنس جائے پھر بھی میرے کہنے اور اصرار کرنے سے اس نے یوسف کی صفائی پیش کرنے کے لیے ایک وکیل مقرر کر دیا۔ اس نے موثر طور پر مقدمے کی پیروی کی۔ نتیجے میں عدالت نے رحم سے کام لیتے ہوئے یوسف کو صرف تین ماہ کی قید کا حکم سنایا۔

☆☆☆

میرے ضمیر پر یوسف کے بے گناہ سزا پانے اور ہمیشہ کے لیے ایک سزا یافتہ مجرم کا داغ لگ جانے کا بہت بوجھ تھا۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ اس کی عدم موجودگی میں نوری کی خیر و عافیت سے آگاہی رکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس کی مدد کروں مگر اس سے بھی پہلے میں یوسف سے مل کر اپنے اور شوکت کے لیے معافی مانگنا چاہتی تھی چنانچہ میں اس سے ملنے جیل گئی اور تمام باتیں اسے بتا کر درخواست کی کہ وہ شوکت کو اور مجھے معاف کر دے۔

اور یوسف کے جواب نے مجھے اس کی شرافت کا اور زیادہ قائل کر دیا۔ اس نے کہا کہ خود اس کا بھی یہی خیال تھا کہ پروفیسر صاحب شراب کے نشے میں ہونے کی وجہ سے اسے رقم دے کر بھول گئے ہیں۔ اسے ایسی حالت میں قرض مانگنا ہی نہیں چاہیے تھا مگر کیا کرتا اس کی ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی۔ اس لیے کچھ نہ کچھ غلطی اس کی بھی تھی۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ جلد یا بدیر پروفیسر صاحب کو جب خود ہی رقم قرض دینا یاد آ جائے گا تو خواہ عدالت اسے سزا ہی کیوں نہ دے دے وہ کم سے کم ان کی اور میری نظروں میں مجرم تو نہیں رہے گا۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا ہی کافی تھا اور جہاں تک اس کی خاموشی کا تعلق ہے تو وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کیسے کر سکتا تھا۔ وہ ایک عام اور معمولی آدمی ہے بدنام ہو یا نیک نام اس سے کیا فرق پڑتا ہے لیکن پروفیسر صاحب کی تو سوسائٹی میں بہت عزت ہے مرتبہ ہے۔ اب اگر کسی مجبوری سے وہ کبھی کبھی پی لیتے ہیں تو وہ انہیں بدنام کرنے کا ذریعہ کیوں بنتا۔ خدا نے چاہا تو کبھی خود ہی انہیں احساس ہوگا اور وہ اس حرام چیز سے نجات حاصل کر لیں گے۔ اس نے مجھ سے بھی کہا کہ میں نوری کی خیریت معلوم کرتی رہوں اور نوری کو اس کے جیل جانے کے بارے میں نہ بتاؤں۔

یوسف نہ بھی کہتا تب بھی میں نوری کو اس کی سزایابی کے متعلق بتانے کا حوصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ اس میں خود اپنی زیادتی کا ذکر آنا بھی ضروری تھا۔ یوسف کی گرفتاری، سزایابی اور میرے اس سے ملنے تک ایک ماہ کا وقت گزر چکا تھا چنانچہ اس دوران نہ صرف نوری کا آپریشن ہو گیا تھا بلکہ اسے اپنی بینائی بھی واپس مل چکی تھی۔ وہ یوسف کے اچانک غائب ہونے سے شروع میں بہت پریشان رہی مگر پھر رفتہ رفتہ اس نے خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا کوئی فرشتۂ رحمت تھا جو صرف اس کی آنکھوں کی روشنی واپس کرنے آیا تھا۔

آپریشن کے بعد وہ اسپتال سے اپنے گھر واپس چلی گئی تھی۔ یوسف نے اسپتال میں دس ہزار روپے جمع کروائے تھے۔ ڈاکٹر اشفاق کی مہربانی سے علاج و قیام کا پورا بل اس سے کم بنتا تھا اور اسے ہزار کے لگ بھگ واپس مل گئے تھے جن سے وہ اب تک گزارہ کر رہی تھی۔

اسپتال سے پتا معلوم کر کے میں اس کے گھر تک پہنچ گئی۔ نوری سے ملی اسے یوسف کے بارے میں بتایا کہ وہ ہمارے گھر کام کرتا ہے۔ میرے بھائی شوکت کو ایک بہت ضروری کام سے کراچی جانا پڑا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ مجھے پہلے نوری کے بارے میں نہیں معلوم تھا (ظاہر ہے کہ یہ بھی جھوٹ ہی تھا) مگر کراچی سے یوسف نے خط میں لکھوا کر بھیجا تب میں اسے تلاش کرنے نکلی ہوں اور یہ کہ یوسف بھی زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ہفتے میں واپس آ جائے گا۔

ظاہر تھا کہ نوری کو میری زبانی یوسف کی خیریت معلوم کر کے اور یہ جان کر کہ وہ اسے بھولا نہیں ہے بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ اس کی خواہش تو یہ تھی کہ آپریشن کے بعد پٹی کھلنے پر وہ سب سے پہلے اپنے محسن کو دیکھے مگر جب ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ اسے اسپتال میں داخل کروانے کے بعد پھر نہیں آیا تو اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ پہلے وہ کافی پریشان رہی کہ کہیں کوئی حادثہ نہ پیش آ گیا ہو مگر پھر خود ہی دل کو تسلی دے لی کہ خدا اپنے نیک بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے۔ یوسف خدا کے فضل سے جہاں بھی ہوگا بالکل خیریت سے ہوگا اور شاید خود ہی دانستہ اس لیے نہ آ رہا ہو کہ وہ نوری کی زبان سے اپنے احسان کا ذکر سننا نہیں چاہتا تھا۔ رحمت کے فرشتے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ وہ یونہی اچانک کہیں سے ہماری مدد کے لیے نمودار ہوتے ہیں اور پھر اپنا کام پورا کر کے جس طرح آتے ہیں اسی طرح خاموشی سے غائب ہو جاتے ہیں۔

"مگر تمہارا فرشتہ غائب نہیں ہوا وہ تم سے زیادہ تمہیں دیکھنے کے لیے بے تاب ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ آپ کیسے جانتی ہیں؟" نوری نے کچھ شرماتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ یوسف نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ میں اس کی تنخواہ تمہیں دیتی رہا کروں تاکہ تمہیں اور خالہ کو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔"

"پوری تنخواہ؟" نوری نے کچھ حیرت سے کہا۔

"ہاں، وہ تمہیں پسند کرتا ہے اس لیے نہیں چاہتا کہ تمہیں اور خالہ کو ذرا بھی تکلیف ہو۔" میں نے جواب دیا۔ "جہاں تک خود اس کے گزارے کا تعلق ہے تو چونکہ میرے بھائی اسے اپنے ساتھ لے کر گئے ہیں اس لیے تمام اخراجات بھی وہی دیں گے۔"

نوری لینا نہیں چاہتی تھی مگر اسے تقریباً زبردستی ہزار روپے دے آئی۔ وہ خود مجھے بھی بہت پسند آئی تھی۔ اس کے بعد جب تک یوسف رہا ہو کر نہیں آ گیا میں تقریباً ہر ہفتہ نوری کے گھر جاتی رہی۔ جیل میں یوسف سے مل کر اسے بھی نوری کی خیریت سے آگاہ کرتی رہی۔

☆☆☆

آخر کار تین ماہ بیت ہی گئے۔ میں خود یوسف کو اپنے ساتھ لے کر آئی۔ شوکت نے اس سے اپنے طرزِ عمل کی معافی مانگی اور پھر دیر تک اس سے اس کے والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اس قدر تفصیل سے یوسف کے حالات جاننے کی اسے کیا ضرورت ہے لیکن شوکت اپنے طور پر اس زیادتی بلکہ ظلم کا کفارہ ادا کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا جو اس نے اپنی ذلت و رسوائی کے خوف سے خاموش رہ کر یوسف کو ایک جھوٹے الزام میں جیل بھیج کر کیا تھا۔

شام کے وقت یوسف نوری سے ملنے گیا۔ جی تو چاہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ جاؤں اور دیکھوں کہ وہ ایک دوسرے سے کس طرح ملتے ہیں مگر یہ ایک ایسی نجی اور ذاتی نوعیت کی بات تھی کہ میں نے اس میں دخل انداز نہ ہونا ہی بہتر خیال کیا۔ یوسف تین چار گھنٹے کے بعد واپس آیا تو بہت خوش تھا۔

"باجی آپ ایک احسان مجھ پر اور کریں۔" وہ بھی شوکت کی طرح مجھے باجی کہنے لگا تھا۔

"احسان تو تم نے ہم پر کیا ہے۔" میں بولی۔ "خیر بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"آپ ایک دو دن میں نوری کی خالہ کے پاس میرا رشتہ طے کر آئیں۔" یوسف نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

"اور پوری کوشش کریں کہ وہ مان جائیں۔"

"ضرور جاؤں گی۔" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اور کوشش کرنے کی تم نے خوب کہی۔ ارے انہیں ایسا

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچھا رشتہ اور کہاں مل سکتا ہے۔"

"یہ نہ کہیں' نوری دس جماعت پاس مجھ سے کہیں زیادہ اچھی اور قابل لڑکی ہے۔ جب سے اس کی آنکھیں ٹھیک ہوئی ہیں کئی رشتے آچکے ہیں۔"

"کتنے ہی رشتے کیوں نہ آجائیں تمہاری طرح کون ہوگا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے تو اس وقت اسے پسند کیا اور چاہا جب وہ آنکھوں سے معذور تھی اور پھر تم نے....."

"بس اور آگے کچھ نہ کہیں۔" یوسف نے میری بات کاٹ دی۔ "میں ہرگز نہیں چاہتا... کہ نوری احسان مندی کے جذبے کے تحت مجھے قبول کرے اسی لیے آج اس سے کھل کر بات کی ہے اور جب یہ یقین ہوگیا کہ وہ سچ مچ میرے ساتھ خوش رہے گی تب میں نے آپ سے رشتے کے لیے کہا ہے۔"

میں حیرت سے یوسف کو دیکھتی رہ گئی۔ یہ گاؤں کا رہنے والا سیدھا سادا نوجوان اتنے نازک اور لطیف جذبات واحساسات کا مالک ہے' میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ کاش حالات نے اسے تحصیلِ علم کا موقع دیا ہوتا تو آج ترقی کی ہر منزل اس کے قدموں میں ہوتی۔

میں نوری کی خالہ سے ملنے گئی ظاہر ہے کہ انہیں کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ یوسف ان کے گھر رہ چکا تھا۔ انہوں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تھا اور بہت پہلے دل ہی دل میں یہ طے کر چکی تھیں کہ اگر یوسف نے نوری کا ہاتھ مانگا تو وہ انکار نہیں کریں گی۔

ایک طرف یہ ہو رہا تھا دوسری طرف شوکت نے خدا جانے کس طرح اور کیا کچھ کہہ سن کر انسپکٹر مجید کو اپنی بلکہ صحیح معنوں میں یوسف کی مدد کے لیے آمادہ کرلیا کہ ایک دن انسپکٹر مجید اپنے ساتھ دو کانسٹیبل لے کر شوکت اور یوسف کے ہمراہ اس کے گاؤں پہنچ گیا۔ یوسف کے سوتیلے بھائیوں سے ملا اور انہیں دھمکی دی کہ اگر انہوں نے جائداد اور زمین میں سے یوسف کو اس کا حصہ نہیں دیا تو وہ خود یوسف کی طرف سے قانونی چارہ جوئی کرے گا اور جب تک یوسف کا اسے جائز حصہ نہیں مل جائے چین سے نہیں بیٹھے گا۔

دھمکی اور وہ بھی ایک پولیس انسپکٹر کی زبان سے۔ یوسف کے سوتیلے بھائی خوفزدہ ہوگئے۔ انہوں نے عدالت سے باہر ہی تصفیہ کی پیشکش کی۔ شوکت اور انسپکٹر مجید بخوبی جانتے تھے کہ دیوانی ... مقدمات کس طرح طویل مدت جاری رکھے جاسکتے ہیں۔ دھمکی دینے سے ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ یوسف کے سوتیلے بھائی ڈر کر عدالت میں جائے بغیر کوئی فیصلہ کرلیں چنانچہ بظاہر انہوں نے گویا ہمدردی کرتے ہوئے بات چیت پر آمادگی کا اظہار کردیا اور طول طویل گفتگو کے بعد آخر یہ طے ہوا کہ یوسف کے بھائی زمین اور جائداد میں اس کے حصے کے طور پر دو لاکھ روپے نقد ادا کردیں اور یوسف انہیں یہ تحریر دے دے کہ یہ رقم پانے کے بعد وہ باپ کی وراثت سے دستبردار ہوتا ہے۔ رقم دینے کے لیے بھائیوں نے ایک ہفتے کی مہلت مانگی جو انہیں دے دی گئی اور یوں اگلے ہفتے یوسف کو دو لاکھ کی رقم مل گئی۔

یوسف نے اس رقم سے ایک جنرل اسٹور کھول لیا اور چند ماہ کے اندر ہی اپنی محنت اور لگن سے دکان سے بڑی معقول ماہانہ آمدنی کمانے لگا۔ اس نے نوری کی خالہ کے گھر کی ازسرِنو مرمت اور تعمیر کروا کے ایک خوب صورت مکان بنالیا اور پھر ایک مبارک دن اس کی اور نوری کی شادی بھی ہوگئی۔

پھر شاید قدرت نے بھی شوکت کا یہ کفارہ قبول کرلیا کہ ایک دن نازیہ ہم سے پوشیدہ طور پر عارف کو ہمارے مکان کے دروازے پر چھوڑ گئی۔ عارف کی جیب میں ایک لفافہ بھی رکھا تھا جس میں نازیہ کا لکھا ہوا خط تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ گھر سے بھاگ کر اس نے اپنی زندگی کا سب سے بدترین فیصلہ کیا تھا جس نے اسے گناہ کے ایک ایسے راستے پر لا کر چھوڑ دیا ہے جہاں سے وہ واپس بھی نہیں لوٹ سکتی مگر وہ عارف کو اپنی بدنام زندگی کی پرچھائیوں سے دور رکھنا چاہتی ہے اس لیے اسے شوکت کے سپرد کر رہی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ ہر چند کہ اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے پھر بھی اگر شوکت اسے معاف کرسکے تو یہ اس کی خوش نصیبی ہوگی۔

عارف' شوکت کو واپس مل گیا تو گویا جیسے اس کے سارے ہی زخم مندمل ہونے لگے۔ اس نے اسی دن سے شراب نوشی ترک کردی اور پھر کچھ مدت کے بعد ایک غریب مگر شریف خدمت گزار لڑکی سے شادی کرلی جس نے کبھی عارف کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ اس کی سوتیلی ماں ہے۔ دوسری طرف یوسف اور نوری بھی بہت مطمئن اور مسرور زندگی گزار رہے تھے اور یوں یہ کہانی ایک خوشگوار انجام کے ساتھ اپنے اختتام کو پہنچی۔

کامیاب

جناب ایڈیٹر صاحب
آداب!
میں ایک گناہ گار بندہ ہوں مگر میرے مولا نے مجھے دوسروں کی دادرسی کے لیے بنایا ہے۔ اب جب اپنے دروازے پر جمع لوگوں کو دیکھتا ہوں، جو اپنے مسائل کے حل کے لیے آئے ہوئے ہوتے ہیں تو میرا دل رو اٹھتا ہے کہ مجھ جیسے گناہ گار کو اللہ نے کس کام کے لیے منتخب کرلیا۔

ف الف
(لاہور)

مجھے حکم دیا گیا کہ میں اپنے بارے میں ضرور لکھوں۔ ورنہ میرا کام ہی کیا تھا۔ کبھی گناہ بے لذت اور کبھی بالذت۔ ایک ایسا لاابالی انسان جس نے اس امید پر غلطیاں کیں کہ جب وقت آئے گا توبہ بھی کرلیں گے۔

میری اس آوارگی کی ابتدا ایک کبوتر والے سے ہوتی ہے۔ وہ میری ناسمجھی کا عہد تھا۔ زندگی کا حسن چاروں طرف بکھرا ہوا تھا لیکن اس حسن کو پانے یا چھونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ زمانہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ انسان زندگی کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ نوجوان خطروں سے نہیں گھبراتے اس آگ میں کود جاتے ہیں جبکہ بوڑھے اپنا دامن بچا جاتے ہیں۔

یہ مکمل ان کی احتیاط پسندی کا نہیں ہوتا بلکہ موت کا خوف ہوتا ہے۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے کہ جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے وہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ محبت کرنے لگتا ہے۔ اس کے دامن سے لپٹا رہنا چاہتا ہے۔

اس کبوتر والے نے پہلے عشق کے سلسلے میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔

اسے کبوتر والا اس لیے کہا جاتا تھا کہ اس نے بہت سے کبوتر پال رکھے تھے۔ اس کی ایک بیٹی تھی، نوشابہ۔ تیرہ چودہ برس کی ہوگی۔ بہت شوخ و چنچل اور خوبصورت بھی تھی۔

محلے کا ہر لڑکا اس پر عاشق ہوگیا تھا۔ اس کی ادائیں ہی ایسی تھیں۔ کبھی کسی کو زبان نکال کر دکھا دی۔ کبھی کسی کو انگوٹھا دکھا دیا۔ کبھی کسی کے اوپر پانی پھینک دیا۔

ہم سب اس کے دیوانے ہو کر رہ گئے تھے لیکن اس سے دوستی کا شرف مجھے حاصل ہوا تھا۔

میرے ایک دوست ہوا کرتے تھے، افلاطون۔ نام تو ان کا قیصر تھا، لیکن وہ ہر فن مولا قسم کے آدمی تھے۔ دوستوں کو ہر قسم کے مشورے دیا کرتے۔ ہر فیلڈ میں ان کی معلومات زبردست تھیں۔

میں نے اپنا یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا۔

''قیصر بھائی، میں ہر حال میں نوشابہ کی دوستی چاہتا ہوں۔ اسی لیے آپ سے ترکیب پوچھنے آیا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ دوسرے کامیاب ہو جائیں کیونکہ ایک درجن عاشق اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔''

''یہ تم کس قسم کے پرابلم میرے پاس لاتے ہو۔'' قیصر بھائی نے کہا۔

''یہ بہت بنیادی پرابلم ہے قیصر بھائی۔ عشق کے بغیر انسان دو کوڑی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔''

''اچھا، اس لڑکی کا خاندانی پس منظر بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل ہی آئے۔''

''خاندانی پس منظر کیا ہے۔ اس کا سب سے قریبی خاندان وہ دس درجن کبوتر ہیں جو اس کے باپ نے جمع کر رکھے ہیں۔''

''یہ بات ہوئی نا۔'' قیصر بھائی اچھل پڑے۔ ''میاں، پرابلم کا حل تو خود تم نے ہی بتا دیا ہے۔ اس کے باپ کے اس شوق سے فائدہ اٹھا کر اس لڑکی کے قریب ہو جاؤ۔''

''کیسے فائدہ اٹھاؤں۔ کیا خود کبوتر بن کر اس کی منڈیر پر جا بیٹھوں۔''

''ارے نہیں یار، کبوتروں کے بہانے اس کے باپ سے دوستی کر لو۔''

''بھائی جان۔ میں کبوتروں کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ کبوتر صرف کبوتر ہوتے ہیں۔ کچھ اور نہیں ہو سکتے۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہارا یہ بھائی کس لیے ہے۔ میں تمہیں کبوتروں پر جو لیکچر دوں، اسے یاد کر لو۔ اس کے بعد اس لڑکی کا باپ بھی تمہیں اپنا استاد مان لے گا۔''

اور ہوا بھی یہی۔ قیصر صاحب نے کبوتروں کے بارے میں ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں دنگ رہ گیا۔ پہلی دفعہ پتا چلا کہ کبوتروں کی اتنی قسمیں ہوا کرتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ان ہی معلومات نے مجھے نوشابہ کے باپ تک پہنچا دیا جس کا نام شمشاد تھا۔ میں نے کبوتروں کے بارے میں اپنی معلومات سے اسے ڈھیر کر دیا تھا۔

ہم دونوں میں اچھی خاصی بے تکلفی سی ہوگئی۔ میں نے اپنی زندگی میں اس جیسا بے دھڑک انسان نہیں دیکھا ہوگا۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔ ''پیارے میاں! میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آتے ہو۔''

''شمشاد صاحب! ظاہر ہے آپ کے کبوتروں کی کشش کھینچ لاتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''رہنے دے بھائی، کبوتروں کی نہیں نوشابہ کی کشش کھینچ لاتی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''ورنہ تم کو میرے کبوتروں سے کیا دلچسپی؟''

اس نے ایسی بات کہہ دی تھی کہ میں اس کے بعد کچھ بول ہی نہیں سکا۔

''کوئی بات نہیں میاں۔'' وہ پھر بولا۔ ''دوستی کرنی ہے تو کر لو، میں بھی منع نہیں کرتا لیکن یہ صرف دوستی ہی ہو۔ اس سے آگے نکلے تو جان سے مار دوں گا۔''

اب بتائیں، کس نے ایسا بے دھڑک باپ دیکھا ہوگا۔

تو نوشابہ میری زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی جو اس کے باپ کی مہربانی سے میرے پاس آئی تھی۔ شمشاد بھی کمال کا آدمی تھا۔ اس نے مجھے بہت سی باتیں سکھائیں عشق کرنے کے طریقے بتائے۔ اس نے بتایا کہ پرانی کتابوں میں عورتوں کی کتنی اقسام بتائی گئی ہیں۔ اور یہ کہ ہر قسم کی عورت کو اس کے انداز سے ڈیل کرنا پڑتا ہے۔ اس میدان میں اس شخص کا تجربہ بہت وسیع تھا۔

اس کم بخت نے مجھے ایک ایسی راہ پر لگا دیا تھا جو لذت اور ہوس کی راہ تھی۔ وہ لوگ تو کچھ دنوں کے بعد اس محلے سے چلے گئے لیکن میں ان ہی راستوں پر چلتا رہا اور اس کا انجام یہ ہوا کہ میری فطرت میں ہرجائی پن شامل ہوتا چلا گیا۔ میں بھونرے کی طرح پھولوں پر بیٹھتا اور اُڑ جایا کرتا۔ ''یہ اعجاز ہے حسن آوارگی کا، جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے۔''

میرے جاننے والے مجھ سے کہا کرتے۔ ''یار، آخر تم کسی ایک پر قناعت کیوں نہیں کر لیتے۔''

''بھائی میرے، یہ میری فطرت میں نہیں ہے۔'' میں جواب دیا کرتا۔ ''میں شاید کسی ایک کا ہو کر رہ بھی نہیں سکتا۔''

لیکن جس وقت میں یہ کہہ رہا ہوں شاید اس وقت قسمت کے ہونٹوں پر میرے لیے مسکراہٹ ہوا کرتی ہوگی۔ کچھ دنوں کے بعد ہی میں کسی کے عشق میں مبتلا ہوگیا۔

میں نے مبتلا کا لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ میں اس کیفیت کو کوئی اور نام دے ہی نہیں سکتا۔ نام تو اس کا حسنہ تھا لیکن وہ حسنہ کسی طور بھی نہیں تھی۔

وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ عام سے خدوخال والی۔ اس کا رنگ بھی گہرا سانولا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں ایسی تھیں جو باندھ لیا کرتیں۔

ان آنکھوں نے مجھے باندھ کر رکھ لیا تھا۔ اس لڑکی کی آنکھیں ایسی تھیں کہ اس کا پورا وجود خوبصورت ہو کر رہ گیا تھا۔

کچھ بولتی، کچھ سمجھاتی، کچھ کھوئی کھوئی سی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کتنے بھید پوشیدہ تھے۔ وہ آنکھیں دیکھ کر ہم ساری دنیا بھول جاتے ہیں۔

ان آنکھوں والی حسنہ سے میری ملاقات ایک شاپنگ سینٹر میں ہوئی۔ کاؤنٹر پر پنیر کا ایک پیکٹ پڑا ہوا تھا۔ پنیر ہمیشہ سے میری پسندیدہ چیز رہا ہے۔ میں نے اپنی باسکٹ میں ڈالنے کے لیے اس پیکٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسی وقت ایک دوسرا ہاتھ بھی اس کی طرف آگیا۔

میں نے ہاتھ بڑھانے والی کی طرف دیکھا۔ وہ بے پناہ طاقت ور آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں اور میں ان آنکھوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ کیا بلا تھی نگاہِ ہوش رُبا ساقی کی۔ اٹھ گئی آنکھ تو کسوں کوئی ہوشیار نہ تھا۔

''جناب۔'' حسنہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ پیکٹ میں لے رہی تھی لیکن اب آپ لے لیں۔''

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ پیکٹ آپ کا ہوا۔''

کاؤنٹر پر موجود شخص نے مداخلت کی۔ ''آپ دونوں میں سے کسی ایک کو قربانی دینی ہوگی کیونکہ اتفاق سے ہمارے پاس اسٹاک ختم ہو چکا ہے اور یہی ایک پیکٹ ہے ہمارے پاس۔''

میں نے وہ پیکٹ اس کے لیے چھوڑ دیا۔ ان آنکھوں کے لیے تو بہت کچھ چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس پیکٹ کی کیا حقیقت تھی۔ یہ تھی حسنہ سے میری پہلی ملاقات۔

میں اس ملاقات کا سُرور اور ان گناہوں کو اپنے ذہن اور تصور میں بٹھائے واپس آگیا۔ میرے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔

مجھ جیسا ہرجائی مزاج رکھنے والا شخص کسی کی نگاہوں کا اسیر ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ کوئی انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ بلند بانگ دعوے کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ سو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

وہ میرے دھیان میں بس کر رہ گئی تھی۔ اور جس کی جستجو ہو وہ تو مل ہی جاتا ہے۔ یہ بات بھی مجھے اس کبوتر والے شمشاد نے بتائی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''میاں کسی کی آرزو کو اپنے دل میں اتنا مضبوط رکھو کہ وہ تمہیں اپنے سامنے کھڑی ہوئی دکھائی دے۔ پھر دیکھنا کام کیسے نہیں بنتا ہے۔''

اور میں نے اس لڑکی کو اپنے دھیان میں بسا لیا۔ پاگل بن گیا اس کے لیے۔ میں نے اپنی یہ کیفیت اپنے دوستوں سے چھپا کر رکھی تھی ورنہ سب میرا مذاق اڑاتے کہ میرے دعوے کہاں گئے۔ اور اس لڑکی کو دیکھ کر تو وہ اور بھی حیران ہو جاتے کیونکہ حسنہ میں تو سوائے اس کی خوبصورت

WWW.PAKSOCIETY.COM

آنکھوں کے اور کچھ بھی نہ تھا۔
کہتے ہیں کہ طلب اگر سچی ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔ حسنہ مجھے ایک بار پھر مل گئی۔ وہ مجھے اپنے ہی علاقے میں دکھائی دی تھی۔
وہ تیز تیز ایک طرف چلی جارہی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ میں اپنی فطرت کے برخلاف اس کا تعاقب کرنے لگا۔
میں خود کہتا ہوں کہ میرے لیے یہ انہونی بات تھی کہ میں کسی کا پیچھا کررہا ہوں۔ لیکن دل کی لگی کا تو کوئی علاج نہیں ہوا کرتا۔
وہ محلے کے ایک مکان میں داخل ہوگئی اور مجھے پتا چل گیا کہ وہ اپنے ہی محلے میں رہتی ہے۔
یہ بھی ایک نیچرل سی بات ہے کہ ہم کسی سے دوستی کے لیے آس پاس ہی دیکھا کرتے ہیں، کہیں دور نہیں جاتے۔ ہوسکتا ہے کہ مس یونیورس واقعی بہت خوبصورت ہو لیکن میرا اس سے واسطہ ہی کیا ہے۔
میرا واسطہ تو اپنے اردگرد ہی ہوسکتا تھا۔ حسنہ، خالدہ، انعم، ماہ جبیں وغیرہ وغیرہ۔ وہ لڑکیاں جو آس پاس ہی آباد تھیں، میرا تعلق تو ان ہی سے بنتا تھا۔
تو حسنہ کو میں نے اپنے محلے میں دیکھ لیا۔ اس کے بعد اس سے میری ملاقات محلے کے ایک چھوٹے سے ریستوران میں ہوگئی۔
اس ریستوران میں فیملی جایا کرتی تھی۔ بہت صاف ستھرا ماحول تھا اس کا۔ میں اس دن برگر وغیرہ کھانے وہاں بیٹھ گیا تھا۔
ابھی میں نے اپنے برگر کا آرڈر ہی دیا تھا کہ حسنہ بھی وہاں آگئی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ دو چھوٹی بہنیں، ایک بھائی اور ماں، ہم دونوں نے ہی ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔
وہ گرچہ اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھی تھی لیکن نظریں بچا کر میری طرف... دیکھ لیا کرتی۔ اس کی خوبصورت جھیل جیسی آنکھیں مجھے اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ دعوت دے رہی تھیں کہ میں اس کے پاس چلا جاؤں اور اس کا ہاتھ تھام کر اس سے کہوں کہ دیکھو شاید تمہیں یہ اندازہ نہیں کہ میں تمہارے لیے پاگل ہو چکا ہوں۔
یہ اس سے میری دوسری ملاقات تھی۔ ملاقات کیا تھی بس اس کو دیکھ کر رہ گیا تھا اور تیسری بار باقاعدہ ملاقات ہوگئی۔ ہم ایک ریستوران میں بیٹھ کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔
میں یہ تفصیل بتا کر آپ کو بے زار نہیں کرنا چاہتا۔ بس اس سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہم بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔
وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ اسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ میری طرح اس کے بھی خواب تھے۔ اس کی کھوئی کھوئی آنکھوں میں زندگی اپنے عروج پر تھی۔
اس نے اپنے حالات بھی بتائے۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔ وہ مشکل حالات میں پیدا ہوئی اور مشکل ہی حالات میں زندگی گزار رہی تھی۔
وہ خواب دیکھنا جانتی تھی۔ اس کی جمالیاتی حس بھی بہت مضبوط تھی۔ اڑتے پرندے، خوش نما پھول اور اڑتے بادل اس کی کمزوری تھے۔ وہ ان کے درمیان رہنا چاہتی تھی۔
ہم اکثر ملتے رہے۔ جن دوستوں کو میرے اس عشق کے بارے میں معلوم ہوتا وہ میرا مذاق اُڑانے لگتے۔ ''ارے بھائی، اس لڑکی میں کیا دکھائی دے گیا۔ وہ تو بہت عام سی لڑکی ہے۔''
''ہے تو بہت عام سی۔ لیکن میں نے اسے بہت خاص نظروں سے دیکھا ہے۔ افسوس کہ میں تم لوگوں کو اپنی آنکھیں نہیں دے سکتا ورنہ تم کو بھی اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوجاتا۔''
میں اس کی محبت میں اتنا آگے بڑھ چکا تھا کہ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں ہوتی تھی کہ نگاہیں میری جانب نگراں ہیں، لوگ کیا سوچتے ہوں گے کیا کہتے ہوں گے۔
مجھے تو اس وقت بھی ہوش نہیں آیا تھا جب اس نے یہ بتایا کہ اس کا منگیتر واپس آچکا ہے۔
''منگیتر؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا کوئی منگیتر بھی ہے۔''
''ہاں، وہ میری پھوپی کا لڑکا ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''دو سال پہلے اس سے منگنی ہوئی تھی۔ پھر وہ بیرونِ ملک چلا گیا۔ وہاں جا کر اس کے ساتھ نہ جانے کیا ہوا کہ اس کی خبر ہی نہیں مل سکی۔ ہم سب اس کی وجہ سے پریشان تھے۔ پھر میں نے یہ سوچ لیا کہ اب وہ کہاں واپس آئے گا۔ اور اصولی طور پر یہ منگنی ختم ہوچکی ہے لیکن وہ اچانک ہی واپس آگیا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا۔ "اس قسم کی خبریں میرے جنون کو کم نہیں کرسکتیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ منگنی ختم بھی ہوسکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم اگر ذرا سی ہمت کرجاؤ۔"

"بہت مشکل ہے۔ یہ خاندانی معاملہ ہے۔"

"لیکن میں ایسی باتوں کو نہیں مانتا۔ یہاں تو شادیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور تم منگنی کو لے کر بیٹھی ہو۔ اپنے گھر والوں سے بات کرکے دیکھو۔ وہ کیا کہتے ہیں۔"

"میں اپنی امی سے بات کرکے دیکھتی ہوں۔" اس نے کہا۔

اس نے اپنی امی سے بات کی اور وہی جواب آیا جو آنا چاہیے تھا۔ اس کی امی نے منگنی توڑنے سے نہ صرف انکار کردیا تھا بلکہ حسنہ کو بھی گھر بٹھادیا گیا۔

اس کے باہر آنے جانے پر پابندی لگادی گئی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں بھی خاموش ہوکر بیٹھ جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میں یہ سب سن کر اور بھڑک اٹھا۔ میرے سینے کے شعلے اور تیز ہوگئے تھے۔ مجھے اپنے عشق میں ناکام نہیں ہونا تھا۔

مجھے ہر حال میں حسنہ کو حاصل کرنا تھا ورنہ خود مرجانا تھا۔ اب میں اس مرحلے میں تھا کہ اس کے بغیر مجھے اپنی زندگی ادھوری دکھائی دے رہی تھی۔

حسنہ نے یہ بتادیا تھا کہ اس کے منگیتر کا ایک شوروم ہے۔ وہ شوروم پہلے اس کے باپ کے پاس تھا لیکن اب وہ خود اسے سنبھالتا ہے۔

میری جنونی کیفیت کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ میں خود اس شخص کے پاس پہنچ گیا جس کا نام افضل تھا۔

اس کے سامنے اس طرح جاکر کھڑا ہوگیا جیسے فرہاد خسرو پرویز کے سامنے جاکر کھڑا ہوگیا تھا۔ "تمہارا نام افضل ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن تم کون ہو؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے حسنہ نام کی کسی لڑکی سے منگنی کررکھی ہے؟" یہ میرا دوسرا سوال تھا۔

"ہاں۔ لیکن تم کون ہو۔ تمہیں میری منگیتر سے کیا لینا دینا۔" اس نے غصے سے پوچھا۔

"افضل صاحب۔ آپ اس سے منگنی ختم کردیں۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے پلیز، یہ بہتر ہوگا کہ آپ میرے اور اس کے درمیان سے ہٹ جائیں۔"

"ابے تو پاگل تو نہیں ہوگیا۔" وہ غصے سے دہاڑا۔

"ایسا ہی سمجھ لو دوست۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "محبت نے مجھے پاگل بنادیا ہے۔"

اس پر اس نے مجھے اور میری محبت کو لمبی چوڑی گالیاں دینی شروع کردیں... اور اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ مجھے مارتے ہوئے شوروم سے باہر پھینک دیں۔

ان کم بختوں نے ایسا ہی کیا اور میں پٹ پٹا کر واپس آگیا۔ یہ سب ہونے کے بعد بھی میری محبت کم نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی شدت اور بڑھ گئی تھی۔

میں اپنے آپ کو سمجھانے لگا کہ اس طرح تو ہوا ہی کرتا ہے۔ نہ جانے کتنے لوگوں نے محبت کے لیے اور کیسی کیسی قربانیاں دی ہوں گی۔ مجھے تو صرف مار پڑی تھی۔

یہ غصہ گہرا ہوتا جارہا تھا کہ ایک دن حسنہ خود میرے پاس آگئی۔ "یہ تم نے کیا کیا۔" وہ بہت ناراض ہورہی تھی۔ "تم افضل کے پاس کیوں پہنچ گئے۔"

"اس لیے کہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں یہ چاہتا تھا کہ تمہاری اس سے منگنی ختم ہوجائے اور تم ہمیشہ کے لیے میری ہوجاؤ۔"

"بے وقوف انسان! جانتے ہو تمہاری اس حرکت سے کیا ہوا ہے۔"

"ظاہر ہے منگنی ختم ہوگئی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"نہیں بلکہ یہ رشتہ اور مضبوط ہوگیا ہے۔" اس نے بتایا۔ "اور اگلے ہی ہفتے ہماری شادی ہے۔"

"ارے، یہ کیسے ہوگیا۔" میں بوکھلا گیا تھا۔

"تمہاری حماقت سے۔" اس نے بتایا۔ "تمہیں اگر یہی کرنا تھا تو کسی اور انداز سے کرتے۔ میرے گھر جاکر میرے والدین سے بات کرتے لیکن تم تو ہیرو بننے چلے تھے۔"

"حسنہ اب یہ نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا۔ "میں کسی بھی حال میں یہ شادی نہیں ہونے دوں گا۔"

"بکواس بند کرو۔ مجھے تم سے نفرت ہوگئی ہے اور وحشت بھی مہی ہے۔ اب آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔"

وہ چلی گئی اور میں کارواں گزر گیا، غبار دیکھتا رہا۔ اس نے اچھا نہیں کیا تھا۔ یا شاید میں نے ہی اچھا نہیں کیا۔ ایسی حرکت مجھے نہیں کرنی تھی۔ لیکن محبت تو ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس میں نفع اور نقصان کہاں دیکھا جاتا ہے۔

حسنہ کے جانے کے بعد میری زندگی ویران ہوکر رہ گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس سے بے انتہا محبت کی تھی... اور میں ہر حال میں اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا تھا۔ وہ میری پہلی محبت تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوب کر اپنا ساحل تلاش کرلیا تھا۔ لیکن وہ ساحل اب کہاں تھا۔

اب تو میں تھا اور میری اداسیاں تھیں۔

میں اتنا ڈپریس ہوا کہ اس چکر میں میری ملازمت بھی ختم ہوگئی۔ ظاہر ہے دفتر والے کب تک برداشت کرتے کہ ان کے یہاں کوئی مجنوں ملازمت کرے۔

میں ایک تو ویسے ہی اکیلا تھا۔ میری زندگی میں خوشی صرف ایک تھی... اور وہ تھی حسنہ جس کی آمد نے میرے ادھورے پن کو مکمل کرنا شروع کردیا تھا۔ لیکن اب وہ کہاں تھی۔

میں نے سنا کہ اس کی شادی ہوگئی۔ یہ سن کر میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا تھا۔ کسی چمن میں رہو تم۔ بہار بن کے رہو۔

میری کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔

اس کے بعد کا سفر بہت حیرت انگیز ہے۔

طویل عرصے کے بعد قیصر صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے طویل غیر حاضری کی وجہ پوچھی تو میں نے بتادیا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے۔ میری داستان سن کر انہوں نے ایک عجیب بات کی۔ "یاد رکھو، ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔"

"قیصر صاحب، اب کہاں کوئی عورت۔" میں نے کہا۔ "ایک لڑکی تھی، وہ بھی چلی گئی اور میرے پاس اب کامیاب یا ناکامی جیسی تو کوئی چیز ہی نہیں رہی ہے۔"

"اب میں یہ نہیں جانتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ ابھی بہت سا سفر طے کرنا ہے۔"

اس کے بعد کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔

دفتر سے تو فارغ کردیا گیا تھا لیکن انہوں نے اتنی مہربانی ضرور کی تھی کہ دو مہینوں کی تنخواہ دے دی تھی۔ یہ دو مہینے تو گزر ہی جاتے۔ اس کے بعد خدا مالک تھا۔

دس بارہ دن گزرے تھے کہ ایک صاحب میرے پاس آگئے۔ میں اس وقت گھر پر ہی تھا۔ وہ میرے لیے بالکل اجنبی تھے۔ "جی فرمائیں۔" میں نے پوچھا۔ "میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"میں بہت امیدیں لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔" انہوں نے کہا۔ ان کے لہجے سے عاجزی کا اظہار ہورہا تھا۔

"امیدیں لے کر میرے پاس۔" میں حیران ہوگیا تھا۔ "کس قسم کی امیدیں، میں بھلا آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

"جناب، بیوی بچوں والا آدمی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "پچھلے چھ مہینوں سے بے روزگار ہوں۔"

میں ہنس پڑا۔ "بھائی میں تو خود بے روزگار ہوں۔ میں آپ کے لیے کیا کرسکوں گا۔"

"آپ کی بات اور ہے جناب، میری بات اور ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر آپ صرف میرے لیے دعا کردیں نا تو میرا کام بن جائے۔"

"ارے بھائی، دعا تو آپ کسی بزرگ وغیرہ سے کروائیں۔ میرے پاس کیوں آگئے، میں تو ایک گناہگار انسان ہوں۔"

"مجھے سب بتادیا گیا ہے جناب کہ آپ کو دعا کے لیے راضی کرنا بہت مشکل ہوگا۔" اس نے کہا۔ "میں بھی یہ فیصلہ کرکے آیا ہوں کہ آپ سے اپنے لیے دعا کرا کے ہی جاؤں گا۔"

"دیکھیں بھائی، میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ آپ میرے پاس کیوں آگئے ہیں۔ کس نے آپ کو بہکایا ہے۔"

"جس نے یہ کہا ہے اس کی یہ تاکید تھی کہ اس کے بارے میں آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ وہ بھی اللہ کا نیک بندہ تھا جس نے آپ تک میری رہنمائی کردی۔ دیکھیں اب انکار نہ کریں۔"

"چلیں، اگر آپ خوامخواہ ضد ہی کررہے ہیں تو دعا مانگ لیتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے میں جانتا ہوں کہ میری دعا سے کچھ نہیں ہونے والا۔"

میں نے اس بے وقوف کی ملازمت کے لیے اپنے دونوں ہاتھ اٹھادیے۔ اس وقت میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ "یا اللہ، میں نہیں جانتا کہ اس بے وقوف شخص کو کس نے میرے پاس بھیجا ہے۔ جب کہ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ بہر حال اس کی دل جوئی کے لیے میں نے ہاتھ اٹھادیے ہیں اب آگے تیری مرضی۔"

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب ایک ہفتے کے اندر ہی وہ شخص میرے لیے مٹھائی وغیرہ لے کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

آ گیا۔ ”جناب! آپ کی دعا سے میری ملازمت لگ گئی ہے۔“

”ارے بھائی، میرے بارے میں کسی خوش فہمی میں نہ رہو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اتفاق بھی ہوسکتا ہے۔“

”نہیں صاحب، کیسا اتفاق؟ جس کام کے لیے مہینوں سے جوتیاں گھس رہا تھا۔ وہی کام آپ کی صرف ایک دعا سے ہوگیا۔“

”اب میں آپ سے کیا کہوں۔ بہرحال شکر ادا کریں کہ آپ کا کام ہوگیا۔“

اس کے بعد ایک عورت میرے پاس آئی۔ اس عورت کو اسی آدمی نے بھیجا تھا۔ اس عورت کے گھر میں شدید اختلافات تھے اور اس کا شوہر اسے طلاق دینے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

دو بچے بھی تھے۔ بہت جینوین مسئلہ تھا۔ لیکن سوال وہی تھا کہ میں کیا کرتا۔ میں نے اس عورت کے سامنے ہاتھ جوڑ لیے۔ ”خدا کے لیے تم کہیں اور چلی جاؤ۔ میں انتہائی گناہ گار انسان ہوں۔ میں نماز تک نہیں پڑھتا۔ تم کہاں میرے چکروں میں پڑی ہو۔ دعا ہی کروانی ہو تو کسی اللہ والے کو پکڑو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔“

لیکن وہ رونے لگی تھی بہرحال اس کا بھی دل رکھنے کے لیے میں نے دعا کو ہاتھ اٹھادیے۔ میں اس وقت اپنے دل میں سخت شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ کسی اور سے نہیں اپنے اللہ سے۔ یا اللہ یہ کیسا بھید ہے، یہ لوگ مجھے ایسا کیوں سمجھ رہے ہیں۔ تو تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں اور کیسا ہوں۔

بہرحال وہ عورت مطمئن ہوکر چلی گئی اور ایک ہفتے کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ واپس آئی تھی۔ اس کا شوہر راہِ راست پر آچکا تھا اور ثبوت کے لیے اس عورت کے ساتھ آیا تھا۔

اس بار میں اندر سے کانپ کر رہ گیا تھا۔ میرا خدا کس طرح میری لاج رکھ رہا تھا۔ دونوں میرے بہت شکر گزار تھے۔

اور میں اپنی جگہ شرمندگی کے پہاڑ تلے دبا ہوا تھا۔ اس رات شاید میں نے برسوں کے بعد نماز پڑھی ہوگی۔ بہت دیر تک روتا رہا تھا کہ خدایا یہ تیری مہربانی ہے کہ تیرا امتحان ہے۔ میں اس قابل کہاں ہوں کہ میرے ساتھ ایسے واقعات ہوں۔ میری دعا میں اتنا اثر کہاں سے آگیا۔

میں نے ایک بار پھر اپنے استاد قیصر بھائی سے رجوع کیا۔ وہ بھی یہ سب سن کر حیران رہ گئے تھے۔ پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”بھائی میرے لگتا ہے خدا تم کو اپنے راستے پر لانا چاہتا ہے۔ وہ تمہاری دعائیں اسی لیے قبول کررہا ہے۔ اب تم شکر گزاری کے طور پر اس کے قریب ہوجاؤ۔“

”لیکن کیوں؟ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے۔“

”یہ تو خدا بہتر جانتا ہے۔“ قیصر صاحب نے کہا۔ ”دیکھو میرے علم کے مطابق، اس دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں، ایک وہ جو برسوں محنت کے بعد خدا کو پالیتے ہیں اور دوسرے وہ جو خدا کو پالینے کے بعد محنت کرتے ہیں۔ تم دوسری قسم کے انسانوں میں سے ہو۔ اس لیے اس کا جتنا شکر ادا کرو وہ کم ہے۔ اور اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوجاؤ۔ کیونکہ تم کو یہ اشارے اسی لیے دیے گئے ہیں۔“

قیصر کی بات دل کو لگ گئی۔ اس کے بعد میں نے اپنے آپ کو اس کے حکم کے مطابق تراشنے اور ڈھالنے کا عمل شروع کردیا۔

شروع شروع میں تو بہت دشواریاں ہوئیں۔ کئی رکاوٹیں سامنے آئیں لیکن اس کے بعد مزہ آنے لگا۔ سرشاری کی ایسی کیفیت تھی جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے بیان نہیں کرسکتا۔

اور اب برسوں گزر چکے ہیں۔ میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔

اب یہ دنیا میرے نزدیک کسی حیثیت کی نہیں ہے۔ میں نے عشق میں ناکام ہوکر کامیابی حاصل کی ہے۔

”نوٹ، عام طور پر اس قسم کی وارداتیں بیان نہیں کی جاتیں اور نہ ہی انہیں تحریر کیا جاتا ہے لیکن میں نے یہ کہانی صرف اس لیے لکھی ہے کہ شاید کچھ لوگوں کو میری اس کہانی کے ذریعے صحیح راستہ مل جائے۔

اگر آپ خدا کو پانے کے لیے محنت کررہے ہیں تو یہ بہت اچھی بات ہے اور اگر اس کے مل جانے کے بعد شکر گزاری کے طور پر محنت کررہے ہیں تو یہ اور بھی اچھا ہے۔

ویسے میری اس کہانی نے اس بات کو سچ کردیا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اگر میں حسنہ کے عشق میں ناکام نہیں ہوتا تو شاید کبھی اس راستے پر نہیں آسکتا جو راستہ دائمی کامیابی کی منزل کا ہے۔

صندل

جناب معراج رسول

السلام علیکم!

یہ سرگزشت میری نہیں، میرے ایک دوست کی ہے۔ زندگی کے پیچ وخم سے وہ کیسے گزرا یہ میں نے اسی کی زبانی لکھا ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔

حسن رزاقی

(کراچی)

انجینئرنگ کالج میں داخلے کے لیے فارم بھرا تھا۔ آج نتیجہ آنا تھا اس لیے جیسے تیسے ناشتا کیا اور کالج کے لیے نکل پڑا۔

کالج پہنچا تو وہاں نوٹس بورڈ کے سامنے چھوٹا موٹا مجمع سا لگا ہوا تھا۔ ایسے موقعوں پر میرا لمبا قد کام آتا ہے۔ میں تھوڑے فاصلے سے ہی لسٹ میں لکھے ہوئے نام پڑھ سکتا تھا۔ الیکٹریکل کی لسٹ میں نوید کا نام تیسرے نمبر پر تھا۔ اسے کامیابی کی خوشخبری سنانے کے بعد میں اپنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

نمبر "مکینیکل" کی لسٹ میں ڈھونڈھنے لگا۔ دوسرے صفحہ میں آخری چار پانچ ناموں سے پہلے میرا نام مل گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور مجمع سے نکلنے کے لیے پیچھے کی طرف مڑا۔ مڑتے ہوئے میرا پاؤں کسی کے پاؤں سے ٹکرا گیا۔ میں نے "سوری" کہہ کر معذرت کی۔ جواب نسوانی آواز میں ملا "کوئی بات نہیں۔"

میں معذرت کر کے پیچھے مڑا تو اس لڑکی نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "آپ مجھے ایک فیور کردیں گے؟"

میری نظریں اس لڑکی کی نظروں سے ملیں تو مجھے اپنے اسلامیات کے استاد کا مقولہ یاد آ گیا۔ "دو انسان جب آپس میں ملتے ہیں تو سب سے پہلے ان کی آنکھیں ملتی ہیں۔ اگر آنکھیں اوپر چلی گئیں تو رحمان اگر نیچے آ گئیں "شیطان"۔

میں نہ تو آنکھوں سے اوپر گیا اور نہ آنکھوں سے نیچے آیا..... وہیں اٹک کر رہ گیا۔ "میکدے سے جو بچ نکلتا ہے، تیری آنکھوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

"جی بتایئے میں کیا فیور کرسکتا ہوں۔ کوشش کروں گا۔"

"مجھے یہاں سے لسٹ نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ کیا آپ سول انجینئرنگ کی لسٹ میں میرا نام ڈھونڈھ سکتے ہیں۔"

"ضرور ڈھونڈھ دوں گا۔ مگر اس کے لیے آپ کا نام جاننا ضروری ہوگا۔"

"جی میرا نام صندل ہے۔"

میں نے لسٹ دیکھنے کے بعد اسے مخاطب کیا "اس لسٹ میں صندل نام تو کہیں نہیں ہے۔" اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مگر ایک صندل سے ملتا جلتا نام ہے، سندیل پھر میں نے اس نام کے ہجے کیے۔ "ایس، یو، این، ڈی، ای، ایل۔"

اس کے چہرے کی کھوئی ہوئی رونق واپس آ گئی۔ "جی یہ میرا ہی نام ہے۔ میں اپنے نام میں "A" کے بجائے "U" اور "E" لکھتی ہوں ورنہ اگر "A" استعمال کروں تو لوگ اس کو "سینڈل" پڑھیں گے۔" پھر اس کے لہجے میں کچھ تلخی آ گئی۔ "مجھے کسی کے پاؤں کی جوتی بننا پسند نہیں۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہمارے معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ابھی تک موجود ہیں جو عورت کو صرف پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔" پھر وہ تیزی سے پیچھے مڑی اور کالج کے گیٹ کی طرف چل دی۔ میں سوچتا ہی رہ گیا۔ ایسی نازک اندام، تازہ گلاب کی طرح کھلی لڑکی اور ایسی تلخ باتیں۔ ہوسکتا ہے کہ آزادیِ نسواں کی کارکن ہو۔

کلاسیں شروع ہوئے تین چار دن ہو چکے تھے لیکن میری صندل سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ اپنی کلاسوں میں مصروف تھی اور میں اپنی کلاسوں میں۔ یوں تو انجینئرنگ کے مختلف شعبوں کے مضامین اس شعبہ کے لیے مخصوص ہوتے ہیں مگر بعض مضامین مشترک ہوتے ہیں جیسے فزکس، انجینئرنگ ڈرائنگ، سروے وغیرہ۔ فزکس کی پہلی کلاس ختم ہونے کے بعد کلاس روم سے باہر نکل رہا تھا کہ میرے پیچھے سے آواز آئی "سنیے" میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے صندل تھی۔ کلاس سے باہر آ کر وہ میرے قریب آ گئی۔

"میں اپنی بداخلاقی کی معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ اس دن میں آپ کا شکریہ ادا کیے بغیر ہی چلی گئی تھی۔ دراصل مجھے عورت ذات کی بے توقیری پر غصہ آ جاتا ہے۔ آپ کو میری باتیں بری لگی ہوں گی۔ مگر یہ میری کمزوری ہے۔"

"نہیں مجھے آپ کی باتیں بری تو نہیں لگیں۔ تھوڑی بہت حیرت ضرور ہوئی تھی۔ اب تو آپ نے معذرت بھی کرلی۔ بھول جائیں اس بات کو۔" میں نے کہا۔ پھر وضاحت کی "عورت کی بے توقیری کو نہیں..... صرف اس دن کے واقعہ کو بھول جائیں۔"

"ٹھیک ہے بھول گئی۔ مگر آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں!"

"جی میرا نام ارمان علی ہے۔"

"میرا پورا نام صندل ساجد علی ہے۔ میرے اور آپ کے نام میں ایک چیز تو کامن نکل آئی۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

صندل زیادہ وقت کالج کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گزارتی تھی۔ میری اس سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی۔ ہم دونوں میں کچھ جان پہچان ضرور ہوگئی تھی لیکن کوئی خاص دوستی نہیں ہوئی تھی۔

مجھے ایک ڈرائنگ مکمل کرنا تھی جس کے لیے مجھے اس ہال میں جانا پڑا جہاں انجینئرنگ ڈرائنگ کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ جب میں وہاں پہنچا تو صندل وہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ ڈرائنگ بورڈ پر جھکی ہوئی کام کر رہی تھی۔ آس پاس تین چار پھٹے ہوئے ڈرائنگ پیپر رکھے ہوئے تھے۔

میں اس کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا مگر وہ ڈرائنگ بنانے میں اتنی منہمک تھی کہ اسے میرے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ میں نے ہلکے سے میز بجائی۔ اس نے سر اٹھائے بغیر جھنجلا کر پوچھا۔ "کون ہے؟ کیا کام ہے؟"

"اگر آپ اپنا سر اٹھانے کی زحمت کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کون ہے اور ہاں مجھے کام کچھ نہیں ہے صرف صندل ساجد علی کی خیریت مطلوب ہے۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا "دیکھیے اس وقت مجھ سے چھیڑ چھاڑ مت کیجئے گا ورنہ میں کھری کھری سنا دوں گی۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"خیریت!" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ "ایسی کون سی پریشانی ہوگئی کہ آپ اتنی دل برداشتہ ہیں؟"

مجھے دو جواب سننے پڑے "پہلی چیز تو یہ کہ آپ کو اور مجھے اس کالج میں چار سال گزارنے ہیں لہٰذا یہ آپ..... آپ کے ... بجائے اگر تم سے بات کی جائے تو زندگی زیادہ آسان ہو جائے گی۔ پھر دوسری بات مجھ سے یہ منحوس ڈرائنگ کسی طرح سے بن کر نہیں دے رہی ہے۔ مجھے کراس سیکشن بنانے کا کوئی کانسپٹ نہیں ہو رہا ہے۔ خاص طور سے جب سولڈ آبجیکٹ ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔" اس کی غراہٹ بے بسی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"آپ کا..... میرا مطلب ہے تمہارا مسئلہ تو بہت آسانی سے حل ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہارے گھر میں کوئی شیشے کی میز ہے؟"

"ہے۔" صندل نے جواب دیا۔ "مگر اس سے ڈرائنگ کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟"

"بتاتا ہوں۔ پہلے یہ بتاؤ یہ میز کتنی بڑی ہے۔"

"ہماری کھانا کھانے والی میز پوری شیشے کی ہے۔"

"اتنی بڑی میز کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم پانی پت کی لڑائی لڑنے نہیں جا رہے ہیں۔ کوئی شیشے کی سینٹر ٹیبل ہے۔"

"جی ہے۔"

"پھر تمہارا مسئلہ حل ہوگیا ہے۔ تم مجھے آج شام اپنے گھر مدعو کرو۔ چائے کے ساتھ کھانے پینے کی انواع واقسام کی چیزیں مہیا کرو، میں تمہارا مسئلہ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں حل کردوں گا۔"

صندل کا جواب ملا "Done آپ ..... میرا مطلب ہے تم..... آج شام پانچ بجے میرے گھر چائے پر مدعو ہو۔"

ہم دونوں ہنستے ہوئے ہال سے باہر آ گئے۔ صندل اور میری دوستی کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ایک دن یہ ننھی سی نازک سی بیل تناور درخت بن کر ابھرے گی جس کی جڑیں میرے وجود کی گہرائی تک اتر جائیں گی۔

صندل جس ڈرائنگ کے لیے پریشان تھی وہ دراصل ہمارا کلاس اسائنمنٹ تھا جس کو کل تک داخل کرنا تھا۔ میں یہ ڈرائنگ پہلے ہی مکمل کر چکا تھا۔ میں نے اپنی اس ڈرائنگ کو لپیٹ کر بغل میں دبایا اور صندل کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہم لوگ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو صندل نے ایک میز کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے وہ شیشے والی میز۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "اس پر سے سب چیزیں ہٹا کر اس کو خالی کردو۔ اور ہاں ایک لیمپ بھی منگوالو۔"

"لیمپ کا ہم کیا کریں گے۔"

"شاگرد استاد سے سوال نہیں کرتے۔ بے ادبی ہے..... صرف حکم بجالاتے ہیں۔"

"اچھا... اچھا، زیادہ رعب نہ ڈالیں۔ منگواتی ہوں۔"

میں نے اپنی بنائی ہوئی ڈرائنگ کو میز پر پھیلا کر اس کو ٹیپ سے میز پر چپکا دیا پھر اس کے اوپر ایک سادہ ڈرائنگ پیپر رکھ کر اس کو بھی چپکا دیا اور میز کے نیچے لیمپ روشن کردیا۔ اس طرح سے میری بنائی ہوئی ڈرائنگ کی لکیریں سادہ ڈرائنگ پیپر پر نمایاں ہوگئیں۔ ان لائنوں کو میں سادہ پیپر پر ٹریس کرنے لگا۔

صندل نے چیخ کر کہا۔ "یہ بے ایمانی ہے، آپ ڈرائنگ ٹریس کر رہے ہیں۔ یہ چیٹنگ ہے۔"

"پہلی چیز" میں نے جواب دیا۔ "یہ بیشک چیٹنگ ہے لیکن صرف عارضی۔ اگر تم کو کل اسائنمنٹ داخل کرنا ہے تو اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں ہے وقت پر ڈرائنگ بنانے کا۔" آخری بات۔ "اگلے ہفتے میں تم کو کراس سیکشن کا کانسپٹ اچھی طرح سمجھا دوں گا۔ جس کے بعد اس ڈرائنگ کو خود بنا لینا، اس طرح چیٹنگ کا احساس ختم ہو جائے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

صندل نے رضامندی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے مگر جب تک میں خود سے اس ڈرائنگ کو دوبارہ نہیں بنالوں گی مجھے بے چینی رہے گی۔ مجھے چیٹنگ سے نفرت ہے۔ اب تم میرے ساتھ آؤ میں تمہاری مزدوری ادا کردوں۔“

ہم کھانے کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ صندل نے میرے مذاق کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ کھانے کی میز کھانے پینے کے سامان سے لدی ہوئی تھی۔ پانی پت کی لڑائی کا مکمل انتظام کردیا گیا تھا۔

ہمارے پیچھے پیچھے صندل کے والدین بھی کمرے میں داخل ہوچکے تھے۔ چائے کے ساتھ ساتھ باتوں کا سلسلہ بھی شروع ہوچکا تھا۔

ساجد علی صاحب نے بتایا کہ ان کا تعلق اندرون سندھ کے ایک گاؤں سے ہے۔ ان کا خاندان اپنی قوم کا سردار ہے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی، باغات اور بہت سی دوسری جائداد ہے۔ تعلیم پر ان کے خاندان کا زیادہ یقین نہیں ہے۔ سب کاہاریوں پر حکمرانی محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ان کے گھر کی عورتیں اپنی حویلیوں کی چہار دیواری میں محصور رہتی ہیں۔ باہر کی دنیا سے ان کا تعلق برائے نام ہی ہے۔ زندگی کے سارے فیصلے مرد کرتے ہیں۔ عورتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اور تب میری سمجھ میں آیا کہ صندل کے ذہن میں ”پاؤں کی جوتی“ کا تخیل کہاں سے در آیا تھا۔

ساجد علی صاحب کو بچپن ہی سے پڑھنے کا شوق تھا۔ سب سے چھوٹی اولاد ہونے کے ناتے ماں باپ کے بہت لاڈلے تھے۔ باپ نے ان کا شوق پورا کرنے کے لیے کراچی کے ہاسٹل میں رہنے کا انتظام کرکے کالج کی تعلیم مکمل کروائی، پھر ساجد صاحب کے بے انتہا اصرار پر ان کو مزید تعلیم کے لیے انگلستان بھیج دیا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں روشن خیالی آگئی جس کو ان کے بھائیوں نے بغاوت کا نام دے دیا۔

پڑھائی کا شوق صندل کو باپ سے ورثے میں ملا تھا۔ خاندان بھر کی مخالفت کے باوجود ساجد صاحب نے صندل کو خود گھر پر پڑھا کر میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دلوایا۔ مزید تعلیم اس طرح جاری نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ بیٹی کی پڑھائی کی خاطر ایک دفعہ پھر انہوں نے خاندان سے بغاوت کی اور گاؤں کی رہائش چھوڑ کر کراچی آگئے۔ بیٹی کو لڑکیوں کے کالج میں داخل کروادیا اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے ٹریکٹر کی ایجنسی لے لی۔

ان کے خاندان میں خاندان سے باہر شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر مناسب رشتہ خاندان میں موجود نہ ہو تو لڑکیوں کی شادی پانچ سال کے بچے سے لے کر ستر سال کے بوڑھے آدمی سے کرادی جاتی تھی یا پھر وہ کنواری لڑکی سے کنواری بڑھیا بن جاتی تھی۔ صندل کی شادی اس کے تایا کے بیٹے ارباب علی سے ہونا تھی لیکن صندل کسی طور اس سے شادی کے لیے تیار نہ تھی۔ ارباب نے آٹھویں جماعت تک پڑھا تھا اس کے طور طریقے بھی صندل کو ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔

میں نے رخصت کی اجازت چاہی تو وہ تینوں مجھے بیرونی گیٹ تک چھوڑنے آئے۔ ساجد صاحب نے رخصتی کا ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا کبھی کبھی آجایا کرو۔ صندل کا دل بھی بہل جائے گا۔ میں اس کو ہر کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا۔“

جواب میرے بجائے صندل کی طرف سے آیا۔ ”بالکل آئیں گے بابا سائیں۔ انہوں نے مجھ سے چیٹنگ کا جرم کروایا ہے اس کا کفارہ ان کو اگلے ہفتے ادا کرنا ہے۔ یہ مجھے ڈرائنگ بنانا سکھائیں گے۔“

”ضرور۔“ میں نے اقرار کیا۔ ”یہ کفارہ میرے اوپر واجب ہے۔“

حسبِ وعدہ اگلے ہفتے میں صندل کو ڈرائنگ سکھانے اس کے گھر چلا گیا۔

پہلے سال کے امتحان ہوچکے تھے۔ میں، نوید اور صندل اچھے نمبروں سے کامیاب ہوکر دوسرے سال کی پڑھائی شروع کرچکے تھے۔ صندل آہستہ آہستہ مجھ سے قریب سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ اب وہ کالج کی لڑکیوں کے علاوہ کچھ نہ کچھ وقت میرے اور نوید کے ساتھ بھی گزارنے لگی۔ دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس کی بات چیت تھی مگر بہت ہی واجبی سی۔ دوسرا سال بھی اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ اب ہم سب تیسرے سال کی پڑھائی میں مصروف تھے۔ میں کبھی کبھی اس کے گھر بھی چلا جاتا۔ ہم دونوں کو احساس تھا کہ اب ہم ایک دوسرے کے بہت زیادہ قریب آچکے ہیں۔

صندل ان لڑکیوں میں سے تھی جن کو حسن کی نعمت عطا کرنے میں قدرت کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیتی۔ کالج کا تقریباً ہر لڑکا اس کا قرب حاصل کرنا چاہتا تھا مگر وہ ہر ایک

سے مناسب فاصلہ رکھتی۔ ایسی صورتِ حال میں اس کا میرے ساتھ وقت گزارنا سب کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا۔ لوگوں نے کہانیاں گھڑنی شروع کردی تھیں۔ یہ صورتِ حال صندل کے لیے انتہائی پریشان کن تھی۔ ساجد علی کو ویسے ہی ہر وقت اپنے گھر والوں کی باتیں سننی پڑتی تھیں کہ بیٹی کو حد سے زیادہ آزادی دے رکھی ہے۔ اگر خدانخواستہ ہمارے میل جول کو اسکینڈل کی شکل دے کر ان کے گھر والوں کے سامنے پیش کیا گیا تو قیامت کھڑی ہوسکتی ہے۔ مگر ہم دونوں کی... پسندیدگی اس درجہ پروان چڑھ چکی تھی کہ ہم کسی طور ایک دوسرے سے دور رہنے کو تیار نہیں تھے۔ ان ہی حالات میں ایک دن صندل نے مجھے بتایا کہ ساجد علی صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے اپنے گھر بلوایا تھا۔ صندل مجھ سے کوئی بات کھل کر نہیں کہہ رہی تھی صرف تنگ کررہی تھی کہ مجھے اپنے کیے کی سزا ملنے والی ہے۔ ہوشیار ہوجاؤں اور احتیاط کے ساتھ ساجد علی صاحب کا سامنا کروں۔ ”بابا سائیں سب کچھ برداشت کرسکتے ہیں سوائے اس بات کے کہ کوئی میری ذات کو نقصان یا تکلیف پہنچائے۔“

”مگر میں نے تم کو کون سا نقصان پہنچایا ہے۔“ میں کچھ فکرمند تھا۔

”یہ تو تم کو بابا سائیں بتلائیں گے۔ صرف اتنا کہہ سکتی ہوں کہ ان کے آگے حوصلہ مت ہارنا۔“ میری جان پہ بنی تھی۔ اس کو مذاق سوجھ رہا تھا۔

وقتِ مقررہ پر میں بابا سائیں کے سامنے حاضر ہوچکا تھا۔ ساجد علی صاحب بہت زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہے تھے۔ میرا حوصلہ پہلے ہی پست تھا ان کی سنجیدگی کو دیکھ کر مزید پست ہوگیا۔ ساجد علی صاحب نے گفتگو کا آغاز کیا۔

”بیٹا! صندل میری اکلوتی اولاد ہے اور مجھے دنیا کی ہر ہستی سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر اسے انجینئرنگ کی تعلیم دلانے کا بندوبست کیا ہے۔ میری زندگی کا ایک بڑا عرصہ یورپ میں گزرا ہے اس لیے میں مقامی ادب آداب کے خلاف ہوں۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”جی مگر میرے دل میں صندل کے متعلق کبھی کوئی نازیبا خیال نہیں گزرا۔ میں اس کی بہت عزت اور قدر کرتا ہوں۔“

”گھبراؤ نہیں۔“ ساجد علی صاحب نے میری ڈھارس بندھائی۔ ”صندل نے مجھے دبے لفظوں میں بہت کچھ سمجھادیا ہے۔ اشاروں میں بتادیا ہے کہ.....“ ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون سننے کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے باہر جاتے ہی صندل کمرے میں داخل ہوئی۔

”آگئے ہوش ٹھکانے؟“ اس نے شوخی سے کہا۔ ”بہت تیس مار خان بنتے تھے۔“

”تم سے تو میں کالج میں سمجھوں گا۔“

ساجد علی صاحب واپس آچکے تھے۔ صندل کمرے سے باہر جانے لگی تو ساجد علی صاحب نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”تم بھی سن لو۔“ پھر انہوں نے اپنا سلسلۂ کلام وہیں سے دوبارہ شروع کردیا جہاں کمرے سے باہر جاتے ہوئے چھوڑا تھا۔

”صندل کو پریشانی یہ ہے کہ کہیں لوگ اس ملنے جلنے کو غلط رنگ دے کر اسکینڈل نہ کھڑا کردیں جو میرے اور میرے خاندان والوں میں وجہ مخاصمت بنے۔“ اتنا کہنے کے بعد ساجد علی صاحب نے صوفہ کی پشت سے ٹیک لگائی۔ گلاس اٹھا کر پانی پیا پھر مجھ سے دوبارہ مخاطب ہوئے۔ ”اب میں جو بات تم سے کہنے جارہا ہوں وہ شاید مجھے نہیں کہنا چاہیے۔ لیکن ایک بیٹی کا باپ بہت جلد ضعیف ہوجاتا ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی بھلائی کے لیے اپنی انا کو بھی پسِ پشت ڈال سکتا ہے۔“

اب میرے بولنے کی باری تھی۔ ”انکل آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں بلا جھجک.... کہہ دیجیے آپ آج بھی میرے لیے قابلِ احترام ہیں اور انشاء اللہ کل بھی بلکہ ہمیشہ قابلِ احترام رہیں گے۔“

”شکریہ۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میرے پاس اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تین راستے ہیں۔ پہلا راستہ تو یہ ہے کہ تم صندل سے ملنا ترک کردو۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اگر تم صندل سے ملنا ترک نہیں کرسکتے تو میں صندل کو کالج سے اٹھالوں۔ اور اگر تم کو ان دونوں میں سے کوئی بھی قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتا ہے تو تیسرا راستہ یہ ہے کہ تم اپنی والدہ کو صندل کا رشتہ لینے کے لیے میرے پاس بھیجو۔“

”انکل!“ میں نے پورے اعتماد کے ساتھ ساجد علی صاحب کو مخاطب کیا ”آپ کے پاس تین راستے ہیں مگر میرے پاس صرف ایک ہی راستہ ہے۔ میری والدہ انشاء اللہ بہت جلد صندل کو آپ سے مانگنے آئیں گی۔“ ہم لوگ مزید کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر میں گھر واپس آگیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

گھر آکر میں نے ماں کو مکمل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہ بات ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ وہ صندل سے دو چار دفعہ مل چکی تھیں۔ ان کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ میرے دل میں صندل کے لیے نرم گوشہ ہے۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بات اتنی آگے جا چکی ہے۔ ان کا ردِعمل توقع کے مطابق تھا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا ہے۔ تم نے بغیر کسی پیشگی اطلاع کے یہ بم پھینکا ہے۔ تمہارے بابا سے مشورہ کے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔"

بابا سے میری جان نکلتی تھی۔ میں ان کے سامنے ایسی بات کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ کام صرف ماں ہی کر سکتی تھیں۔

اگلے دن کالج میں صندل نے پوچھا۔ "تم نے ماں سے بات کی؟"

"یہ بات ان کے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ بابا سے مشورہ کر کے بتائیں گی۔ مگر تم فکر مت کرو میں تمہارے سحر میں اس طرح سے گرفتار ہوں کہ چھٹکارا مشکل نظر آتا ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔ اور میں اپنی کلاس کی طرف روانہ ہو گیا۔

اگلے ہفتے ماں نے مجھ سے فرمائش کی۔ "ایک ٹوکری لڈو لے آؤ۔"

"خیریت!" میں نے پوچھا۔ "اتنے بہت سے لڈو کون کھائے گا؟"

"صندل کے گھر والے... اور کون۔ خوش ہو جاؤ تمہارے بابا مان گئے ہیں۔ کل ہم ان کی طرف چلیں گے۔ ان کو بتا دینا۔"

اگلے روز ہم ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ ساجد علی صاحب نے بابا کو بتایا کہ رشتہ ان کو منظور ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی جن کو وہ "بڑے سائیں" کہتے تھے اجازت لے کر منگنی کی رسم ادا کر دیں گے۔

کالج میں صندل نے مجھے بتایا بڑے سائیں کو منانا اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ وہ صاف طور پر ارباب سائیں کے رشتے سے انکار کر چکی ہے اور اس کو اس معاملہ میں بابا سائیں کی مکمل حمایت حاصل ہے۔ ارباب سائیں اب بھی رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے۔ خلافِ توقع ارباب سائیں نے اتنا ہنگامہ نہیں کھڑا کیا جس کا صندل کو ڈر تھا۔ ہماری منگنی کی رسم کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ صندل کی... کچھ سہیلیاں بھی مدعو تھیں۔

تقریب کے دوران ماں نے مجھے انگوٹھی نکال کر دی کہ میں اس کو صندل کی انگلی میں پہنا دوں۔ جب میں نے انگوٹھی صندل کو پہنا دی تو ماں نے اس انگوٹھی کی تفصیل بتائی۔

"یہ ہماری خاندانی انگوٹھی ہے۔ ارمان کے دادا نے یہ انگوٹھی ارمان کی دادی کو منہ دکھائی میں دی تھی۔ پھر ارمان کی دادی نے یہ انگوٹھی مجھے دے دی اور میں نے اس کو آج کے دن کے لیے سنبھال کر رکھا تھا کہ اب اس پر میری بہو کا حق ہے۔"

صندل کی آنکھیں مسرت سے چمکنے لگیں۔ تقریب ختم ہو گئی۔ ہم لوگ گھر واپس آگئے۔ اگلے دن کالج میں ہماری منگنی کی خبر سب سے اہم خبر تھی۔

☆☆☆

ہم لوگ انجینئرنگ کے آخری سال میں پہنچ چکے تھے۔ آخری سال کے امتحان میں ایک مہینا باقی تھا۔ امتحان ختم ہونے کے دو تین ماہ بعد ہماری شادی ہو جانی تھی۔

امتحان ختم ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ بابا سائیں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں چند دن ان کے ساتھ ان کے گاؤں میں گزاروں تاکہ اس شادی کے سلسلے میں جو رنجشیں ان کے خاندان میں پیدا ہو گئی ہیں ان کو ختم کر دیا جائے۔

گاؤں پہنچے تو صندل اور صندل کی اماں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ان دونوں کو پہلے زنان خانہ میں اتارنا تھا۔ یہ وہ حویلی تھی جہاں ان کے خاندان کی بیگمات اور لڑکیاں رہتی تھیں۔ اس میں کسی غیر مرد کا داخلہ ممنوع تھا۔ یہاں پر صرف عورتیں اور خواجہ سرا بطور ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان بیگمات کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اسی عمارت میں گزرتا تھا۔ باہر کی دنیا سے ان کا واسطہ بہت کم تھا۔ صندل اسی ماحول کی باغی تھی۔ اس کے لیے اس ماحول کی گھٹن ناقابلِ برداشت تھی۔ وہ ایک آزاد پنچھی کی طرح زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

صندل کو اتارنے کے بعد گاڑی کا رخ مرکزی عمارت کی طرف موڑ دیا گیا۔ یہ ایک سفید رنگ کی پُرشکوہ تین منزلہ عمارت تھی۔ جیسے ہی بابا سائیں نے گاڑی سے قدم باہر نکالا بیسیوں آدمی ان کی طرف دوڑ پڑے۔ کوئی ان سے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر سندھ کا روایتی سلام کر رہا تھا۔ کوئی ان کے ہاتھ چومنے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ لوگ ان کے پاؤں چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔

سندھ میں سلام کرنے کا انداز کچھ منفرد ہے۔ یہاں پر دوسری جگہوں کی طرح سیدھے ہاتھ کا انگوٹھا اندر کی طرف دبا کر باقی چار انگلیوں کو ماتھے سے لگا کر "السلام علیکم" نہیں کہا جاتا۔ اس کے بجائے لوگ دونوں ہاتھوں کو نمستے کے انداز میں جوڑ کر تھوڑی کے نزدیک لے جا کر کہتے ہیں "سائیں بیو خیر، خوش۔" فرق یہ ہوتا ہے کہ "نمستے" کرنے والے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں ملا لیتے ہیں جبکہ سندھ میں دونوں ہاتھوں کو ملا کر پیالے کی شکل بنا دی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ بھی روایت ہے کہ نچلے درجہ کے لوگ اونچے درجہ کے لوگوں کے پیر چھوتے ہیں۔ بابا سائیں کو اس روایت سے سخت اختلاف تھا وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ان کے پیر پڑے مگر روایت روایت ہے۔ اس سے فرار مشکل ہوتا ہے۔ ہم پانچ چھ لوگوں کی معیّت میں دیوان خانے میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بہت بڑا ہال تھا وہاں بڑے سائیں سے ملاقات ہوئی۔

ہم لوگ دائیں ہاتھ والے کونے میں صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بابا سائیں لوگوں سے حال احوال کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں اندر والا دروازہ کھلا اور ایک طویل قامت بارعب نوجوان کمرے میں داخل ہو کر بابا سائیں کی طرف بڑھا۔ اس نے بابا سائیں کے پاؤں چھونا چاہا مگر بابا سائیں نے اس کو روک دیا اور کھڑے ہو کر گلے سے لگا لیا۔ پھر اس نوجوان سے میرا تعارف کروایا۔ یہ نوجوان "ارباب سائیں" تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے ارباب سوچ رہا ہوگا۔

"تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے"

مگر یہ صرف میرا حسنِ ظن تھا ورنہ ارباب کو صندل سے کوئی لگاؤ نہیں تھا اس کو صرف یہ دکھ تھا کہ صندل نے اس سے شادی سے انکار کر کے اس کی توہین کی تھی۔ اس نے خود ہی کہا کہ چلیں آپ کو زمینیں دکھا آؤں اور میں اس کے ساتھ نکل پڑا۔

تا حدِ نظر جو زمینیں اور باغات تھے وہ بابا سائیں کے خاندان کی ملکیت تھے۔ ان زمینوں کو جدید خطوط پر آباد کرنے میں سارے کا سارا ہاتھ بابا سائیں کا تھا۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا بھرپور فائدہ اٹھایا تھا اور بیل اور ہل کی کاشتکاری کو مشینی زراعت میں بدل دیا تھا۔

جب بابا سائیں نے پہلا ٹریکٹر خریدا تھا تو گاؤں میں کسی نے ٹریکٹر کا نام تک نہ سنا تھا۔ پہلے چند مہینے یہ ٹریکٹر بے کار کھڑا رہا کیونکہ اس کو کوئی چلانے والا نہیں تھا۔ بابا سائیں نے اپنے تین چار کارندے ٹریکٹر بیچنے والی کمپنی بھیجے ہوئے تھے جہاں وہ ٹریننگ حاصل کر رہے تھے۔ بابا سائیں نے ٹیوب ویل لگوائے۔ وہیٹ تھریشر اور کمبائنڈ ہارویسٹر خریدے۔ ان سب مشینوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ بابا سائیں کو اپنی ذاتی ورکشاپ بھی بنانی پڑی۔ اس کے علاوہ سویل ٹیسٹنگ اور مختلف اقسام کی کھاد کے استعمال سے زمین کے لحاظ سے اس پر مناسب ترین فصل کی کاشت کروائی۔ ان سب اقدامات کے نتیجے میں پیداوار کئی گنا بڑھ گئی جس کا فائدہ نہ صرف بابا سائیں نے خود اٹھایا بلکہ اس سے اپنے ہاریوں کو بھی مستفید کیا۔ ان کو جھونپڑوں سے اٹھوا کر نئے تعمیر کیے ہوئے کوارٹروں میں منتقل کیا۔ ان میں سے ہر ہاری کو اس کی پیداوار کا اضافی حصہ بھی دیا۔ بابا سائیں نے اس سارے کام میں اپنی جان لڑا دی۔ زراعت کا یہ عظیم پروجیکٹ ان کا خواب تھا۔ وہ دن رات اس کی بہتری اور ترقی میں لگے رہتے۔ مگر اس دنیا میں ایک ایسی ہستی بھی تھی جس کے آگے بابا سائیں کی نظر میں یہ زراعت کا ولولہ بھی ہیچ تھا۔ یہ ہستی ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی صندل تھی۔ اگر بابا سائیں کے پاس کوئی ایسا ترازو ہوتا جس کے ایک پلڑے میں وہ صندل کو کھڑا کر دیتے اور باقی ساری دنیا کو دوسرے پلڑے میں ڈال دیتے تو صندل والا پلڑا پھر بھی بھاری رہتا۔ یہی وجہ ہے جب صندل نے انجینئرنگ پڑھنے کے لیے کراچی میں رہنا چاہا تو بابا سائیں سب کچھ اپنے بھتیجے ارباب کے حوالے کر کے صندل اور اماں کو لے کر کراچی آگئے۔ اپنی مصروفیت کے لیے ایک ٹریکٹر کی ایجنسی لے لی اور ایک ورکشاپ کھول لی۔

ارباب میں بابا سائیں کے پروجیکٹ کو سنبھالنے اس کو چلانے کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ارباب نے صرف آٹھویں تک پڑھا تھا اور اس کے اندر ہر وہ عیب موجود تھا جو دولت کی فراوانی ایک نوجوان امیر زادے میں پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی زندگی صرف لہو و لعب کے لیے مختص تھی۔ یہی وجہ ہے کہ گاؤں کا ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ بابا سائیں گاؤں واپس آجائیں لیکن بابا سائیں صندل کی وجہ سے مجبور تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں گاؤں کے تمام حالات اور بابا سائیں کے گھر والوں کے آپس کے تعلقات کو اچھی طرح جان چکا تھا۔ اب مجھے واپس کراچی جانا تھا کیونکہ صندل اور بابا سائیں گاؤں میں ایک ہفتہ رک رہے تھے۔

کراچی واپس آنے کے ایک ہفتہ بعد میں نے صندل کو فون کیا تو اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ لوگ ابھی گاؤں سے واپس نہیں آئے ہیں چند دن بعد آئیں گے۔ چند دن بعد فون کیا تو پھر وہی جواب ملا "چند دن بعد آئیں گے۔" میں نے فون رکھ دیا۔

اگلے چند روز بعد صندل کا فون آیا "بابا سائیں تم سے بات کرنا چاہتے ہیں" پھر مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون بابا سائیں کو تھما دیا۔

"ارمان بیٹا" انہوں نے کہا۔

"جی بابا سائیں۔"

"بیٹا کل شام دفتر سے واپسی پر تم میرے پاس سے ہوتے ہوئے جانا۔" ان کی آواز میں مجھے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی۔

میں پریشان ہو گیا۔ "ایسی کیا بات ہے بابا سائیں؟"

ان کا جواب مختصر تھا۔ "کچھ اہم معاملات ہیں جو میں فون پر نہیں بتا سکتا۔" میں نے فون بند کر دیا۔ میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

اگلے دن میں دھڑکتے دل کے ساتھ..... دفتر سے واپسی پر بابا سائیں کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خلافِ معمول صندل میرا استقبال کرنے نہیں آئی۔ ملازم نے مجھے ملاقاتی کمرے میں جا کر بیٹھا دیا۔ دروازے سے بابا سائیں کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو رہی تھی۔

"بابا سائیں آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔" میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ہاں بیٹا یاد تو کیا تھا۔ لیکن ایسے یاد کرنے سے نہ یاد کرنا بہتر ہوتا۔ میں جو کچھ تم سے کہنے والا ہوں اسے سننے کے لیے تمہیں بہت زیادہ حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ صرف تم کو ہی نہیں مجھے بھی اس ناخوشگوار کام کے لیے بہت حوصلہ درکار ہے۔" پھر انہوں نے پانی کا جگ میری جانب بڑھا دیا۔ میرا دل حلق میں دھڑکنے لگا کہ آخر یہ کون سی بات ہے جسے سننے کے لیے مجھے نہ صرف بہت زیادہ حوصلہ درکار ہوگا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ پانی کا جگ بھی چاہیے ہوگا۔

میں نے اپنے آپ کو بری سے بری خبر سننے کے لیے نفسیاتی طور پر تیار کر لیا۔ بابا سائیں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"تمہیں یاد ہوگا کہ جب ہم لوگ گاؤں گئے تھے تو ہمارا پروگرام تھا کہ ہم تمہاری واپسی کے ایک ہفتہ بعد کراچی واپس آ جائیں گے۔"

"جی مجھے یاد ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جس صبح ہمیں کراچی کے لیے روانہ ہونا تھا اس سے ایک رات پہلے غفورا..... تم کو شاید یاد ہو میں نے تم کو گاؤں میں غفورا سے ملوایا تھا۔ وہ نہ صرف میرا انتہائی وفادار ملازم ہے بلکہ بچپن میں ہم دونوں ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ وہ جب میرے کمرے میں داخل ہوا تو مجھ سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ "میرے تسلی دینے پر اس نے مجھے بتایا کہ ارباب اس بات کو نہیں بھولا ہے کہ صندل نے شادی سے انکار کر کے اس کی توہین کی ہے وہ اس توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔" بابا سائیں نے اپنا سانس درست کیا پھر بات کو جاری رکھا۔ "اس نے قسم کھائی ہے کہ شادی کی رات وہ تمہیں قتل کروا دے گا۔"

میں نے بابا سائیں کو روکنا چاہا۔ "بابا سائیں یہ صرف دھمکی ہو سکتی ہے، آپ اسے اتنی اہمیت دے کر پریشان ہو رہے ہیں؟"

"میں اس لیے پریشان ہو رہا ہوں کہ میں گاؤں کے لوگوں کی ذہنیت کو جانتا ہوں۔ ان کے لیے کسی بندے کو مار دینا روز کا معمول ہے۔ وہاں شہر کے معمولات لاگو نہیں ہوتے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اگر ارباب تم کو بھری محفل میں بھی گولی مار دے تو پورے گاؤں میں سے ایک آدمی بھی اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے نہیں ملے گا۔ تم ان معاملات کو نہیں جانتے ہو۔ میری بات غور سے سنو۔" بابا سائیں میری مداخلت سے جھنجلا رہے تھے۔ "میں گاؤں سے ایک ہفتہ دیر سے اسی لیے آیا کہ میں صرف غفورا کی بات پر یقین نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس ایک ہفتہ میں پوری طرح تفتیش کروائی اور اب یہ بات یقینی ہے کہ ارباب نے تم کو شادی کی رات قتل کروانے کا منصوبہ پوری طرح تیار رکھا ہے۔"

"پھر اب آپ کا کیا حکم ہے بابا سائیں؟" میں نے ڈرتے ڈرتے معلوم کیا۔

"میرا کوئی حکم نہیں ہے بیٹا۔ اب میرے اوپر ایک فرض ہے۔ نہ میں تم کو جانتے بوجھتے موت کے منہ میں دھکیل

سکتا ہوں نہ ہی صندل کو بیوہ ہوتے دیکھ سکتا ہوں۔ فرض کرو کہ کسی طرح سے ارباب کو اس اقدام سے روک دیا جائے تو یہ رکاوٹ صرف عارضی ہوگی وہ موقع ملتے ہی صندل سے اپنی توہین کا بدلہ لینے کے لیے تم کو اپنی راہ سے ہٹا دے گا۔ کیونکہ میں اپنے لوگوں کی مینٹلٹی جانتا ہوں۔ اگر تمہیں لندن یا امریکا بھی بھیج دوں تو انتقام لینے کی قسم کھانے والے وہاں بھی پہنچ جائیں گے۔"

"پھر اس کا کیا حل ہے بابا سائیں۔"

"اگر بڑے سائیں کی در پردہ اسے حمایت حاصل نہ ہوتی تو بات دیگر تھی۔ اب صرف ایک ناخوشگوار حل ہے۔ تمہاری اور صندل کی جدائی۔"

یہ ناممکن بات تھی۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میرا سر گھومنے لگا۔ ڈرائنگ روم میں رکھی ہر چیز گول گول گھومنے لگی۔

میں اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام کر بیٹھ گیا۔ بابا سائیں میرے برابر بیٹھ کر مجھے تسلیاں دینے لگے۔

"بیٹے بڑے سائیں کا در پردہ دباؤ ہے ورنہ میں ایسا ہونے نہ دیتا۔ مجھ سے نہیں مگر دوسروں سے کہہ رہے ہیں کہ ہماری عزت باہر جا رہی ہے۔ گویا وہ چاہتے ہیں کہ صندل ارباب کی ہو جائے۔"

میں باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایسے نہ جاؤ بیٹا۔" بابا سائیں نے میرا ہاتھ پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا۔ "صندل سے مل لو پھر جانا۔"

بابا سائیں صندل کو میرے پاس بھیجنے کے لیے کمرے سے باہر چلے گئے تھے۔ چند لمحے بعد صندل کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

صندل کو دیکھتے ہی میرا سارا غصہ، نفرت اور ابال، جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں ایسے پگھل گیا جیسے آگ پہ رکھی ہوئی برف۔

صندل نے ہمیشہ کی طرح آج بھی اجرک اوڑھ رکھی تھی۔ وہ ہمیشہ اجرک ہی اوڑھتی تھی، کبھی کبھار اوڑھنی بھی اوڑھ لیتی۔ دوپٹا کبھی نہیں لیتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کل کی لڑکیاں دوپٹا گلے میں پھندے کی طرح ڈال لیتی ہیں یا تہ کر کے ایک کاندھے پر اس طرح ڈال لیتی ہیں جیسے بیرے نیپکن ڈال کر کھانا پروستے ہیں۔ مسلمان عورتوں کو جو اپنے اوپر چادر ڈالنے کا حکم ہے وہ صرف اجرک سے یا اوڑھنی سے ہی پورا ہوتا ہے۔ اس کا اجرک اوڑھنے کا انداز مجھے بھی بھاتا تھا۔

ہم دونوں آمنے سامنے کھڑے تھے۔ لیکن اب آپس میں کہنے سننے کو کچھ نہیں بچا تھا۔ پھر میں نے سکوت توڑا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا "یہ ہاتھ میرے لیے زندگی ہے اگر اس کے لیے مجھے اپنی جان بھی دینی پڑتی تو یہ سودا برا نہیں ہوتا۔"

صندل کی خاموشی ٹوٹی "تم تو جان دے کر سکون پا جاؤ گے۔ مجھے کس کے حوالے کر کے جاؤ گے۔ جان دینا دنیا کا سب سے آسان کام ہے۔ مگر یہ بزدلی ہے ایثار نہیں۔ تم اس ہاتھ کی خاطر جان تو دے سکتے ہو مگر کیا اس کی خاطر جی نہیں سکتے۔ کیا ہمارا دکھ مشترک نہیں ہے کیا میں بھی تمہارے ساتھ ساتھ حالات کا شکار نہیں ہوں۔ کیا مجھے بھی تم سے اتنا ہی لگاؤ نہیں ہے جتنا تم کو مجھ سے ہے کیا جان دے کر تم میرا دکھ کم کر دو گے۔"

صندل کی باتوں میں وزن تھا وہ بھی اسی آگ میں سلگ رہی تھی جس میں میں جل رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو صندل مگر مجھ میں اتنا بڑا سانحہ برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ میں کیا کروں۔"

"ہمت کرو گے تو حوصلہ بھی پیدا ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی استطاعت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔" میں صندل کی ڈھارس بندھاتا کہ یہ نازک سی لڑکی میری ہمت بڑھا رہی تھی۔ میرا مزید وہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

صندل کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا میں نے رخصت ہونے سے پہلے اس کو اپنے ہونٹوں سے لگانے کے لیے اوپر اٹھایا تو اچانک میری نظر اس کی انگلی میں جگمگاتی ہوئی انگوٹھی پر پڑی۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو ماں نے اپنی "بہو" کے لیے اٹھا رکھی تھی اور ہماری منگنی کے دن صندل کی انگلی میں پہنا دیا تھا۔ مجھے اچانک کچھ یاد آ گیا۔

"صندل" میں نے انگوٹھی کی طرف اشارہ کیا "مجھے ایک ناخوشگوار فرض ادا کرنا ہوگا۔"

"کون سا ناخوشگوار فرض؟" صندل نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہ انگوٹھی مجھے ماں کو واپس کرنا پڑے گی۔"

"کیا میں اس کو تمہاری نشانی کے طور پر نہیں رکھ سکتی۔"

"نہیں صندل یہ میری نشانی نہیں ہے۔ یہ ماں کی

نشانی ہے جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ وہ بہو جو اَب انہیں کبھی نہیں مل سکتی۔"

"کیوں نہیں مل سکتی۔"

"اس لیے کہ اس دنیا میں کوئی دوسری صندل نہیں ہے۔ میرے لیے صندل کا اس دنیا میں کوئی بدل نہیں ہے۔ میرا دل وہ سیپی تھا جس کا منہ صرف ایک قطرہ کو اپنے اندر لینے کے لیے کھلا تھا۔ پھر جب یہ قطرہ موتی بن گیا تو سیپی کو توڑ کر اس موتی کو کسی اور کے گلے میں ڈالنے کے لیے نکال لیا گیا۔ ٹوٹی ہوئی سیپی میں موتی نہیں بنا کرتے۔"

صندل نے انگوٹھی اتار کر میری ہتھیلی پر رکھ دی۔ اس کی زبان خاموش تھی مگر اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔

میں باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ صندل مجھے گیٹ تک چھوڑنے آئی۔ "اپنا خیال رکھنا۔" صندل نے کہا اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"کس کی خاطر" میں نے پوچھا۔

"میری خاطر۔ اور کس کی خاطر!"

وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگتی ہوئی گھر کی عمارت میں داخل ہوگئی۔ شاید ضبط کے بند میں دراڑیں پڑنے لگی تھیں۔

صندل کے گھر سے باہر نکلا تو جھٹپٹا ہو چلا تھا۔ دماغ پورے طور پر کام نہیں کر رہا تھا۔ کانوں میں "سائیں سائیں" کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس حالت میں گاڑی چلانا اپنی اور دوسروں کی جان کو خطرہ میں ڈالنا ہوتا۔ میں نے گاڑی وہیں سڑک پر چھوڑ دی اور مین روڈ کا رخ کیا۔ دفتر سے گھر واپس جانے والوں کا رش تھا۔ سڑک پر کوئی خالی سواری نہیں تھی میں پیدل ہی گھر کی جانب چل پڑا۔ کافی دور جانے کے بعد سامنے سے ایک خالی ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ میں اس میں سوار ہوگیا۔

گھر پہنچ کر گھنٹی بجائی تو ماں نے دروازہ کھولا۔ میری ذہنی کیفیت شاید میرے چہرے سے عیاں تھی۔ ماں نے گھبراتے ہوئے سوال کیا۔

"خیریت سے تو ہو بیٹا! یہ تم نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے؟"

میں ماں کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تو ماں اور زیادہ پریشان ہوگئیں "خدارا مجھے بتاؤ بیٹا، کیا ہوگیا۔"

"میری دنیا تہ و بالا ہوگئی ہے ماں۔" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "آج میری متاعِ حیات مجھ سے چھن گئی۔"

ماں نے مجھے صوفہ پر بٹھایا اور پانی لینے چلی گئیں واپس آکر ماں نے میرے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھمایا۔ "سکون سے پانی پی لو پھر مجھے بتاؤ تم کیوں اس قدر پریشان ہو۔" میں نے ماں کو ساری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر جوتوں سمیت بستر پر گر گیا۔ معلوم نہیں کب میں نیند کی وادی میں پھسل گیا۔ ماں کے شانہ جھنجوڑنے سے میری آنکھ کھلی۔ "گاڑی کہاں چھوڑ آئے ہو؟" ماں نے پوچھا۔

میں نے گاڑی کی چابی جیب سے نکال کر ماں کی طرف بڑھا دی۔ "صندل کے گھر کے باہر سڑک پر کھڑی ہے۔ ڈرائیور کو بھیج کر منگوا لیں۔" بس پھر بستر پر دراز ہوگیا مگر نیند اب مجھ سے روٹھ چکی تھی۔ صبح ہوتے ہوتے میری آنکھ لگی۔

آنکھ کھلی تو دوپہر کا وقت ہو چلا تھا۔ میں ناشتا کر کے پھر کمرے میں واپس آگیا۔ سکون کے لمحات خواب و خیال بن چکے تھے۔

شام میں نوید آگیا۔ "میں آیا نہیں ہوں" نوید نے مجھے بتلایا۔ "بھیجا گیا ہوں۔ مجھے صندل نے فون پر ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا اور مجھ سے خاص طور سے تاکید کی کہ میں تم سے ملوں۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہے کہ تم کہیں کوئی غلط قدم نہ اٹھا لو۔"

"نہیں میں کوئی غلط قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ دراصل کل مجھے اتنا زبردست اور غیر متوقع دھچکا لگا کہ میرے ہوش و حواس میرے قابو میں نہیں رہے تھے۔ ہاں البتہ میں دو تین دن دفتر نہیں آؤں گا۔ تم میری یہ چھٹی کی درخواست دفتر میں دے دینا۔" درخواست میں نے نوید کی طرف بڑھا دی۔ نوید اور میں ایک ہی کمپنی میں کام کر رہے تھے۔

تین دن گزرنے کے بعد بھی میرے ذہنی تناؤ میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ رات کھانے کی میز پر میں نے بابا کو مخاطب کیا۔ "بابا میں نوکری چھوڑ رہا ہوں، میں کچھ دن کے لیے کراچی سے باہر جانا چاہتا ہوں۔"

"تمہاری مرضی بیٹا۔" بابا نے کہا۔ "تمہارا ہر فیصلہ مجھ کو اور تمہاری ماں کو قبول ہے۔ صرف ایک مشورہ ہے کہ جو بھی فیصلہ کرو تمام حالات کو مدِنظر رکھ کر کرنا۔ جلد بازی میں کوئی جذباتی فیصلہ مت کرنا۔ جذبات میں بہہ کر کیے گئے فیصلوں پر آدمی ہمیشہ پچھتاتا ہے۔"

بس اگلا ایک مہینا ناران، کاغان مری وغیرہ گھوم کر آیا۔ مگر میرا ذہن پھر بھی منتشر کا منتشر ہی رہا۔ پھر بابا نے ایک حل تجویز کیا "بیٹا میرا مشورہ ہے کہ لندن یا امریکا جا کر مزید پڑھائی کر لو۔ اس طرح تمہارے وقت کا بھی صحیح استعمال ہو جائے گا۔ تم اس ماحول سے بھی نکل جاؤ گے اور تمہارا ذہنی سکون بھی واپس آجائے گا۔"

میں نے کینیڈا کی یونیورسٹی آف ٹورنٹو میں داخلہ لیا اور پہلی جنوری کو ٹورنٹو کے لیے روانہ ہوگیا۔ چھ جنوری سے کلاسیں شروع ہونے والی تھیں۔

میرا کراچی سے لندن تک کا سفر پی آئی اے سے تھا اور لندن سے ٹورنٹو انٹرنیشنل کینیڈا سے۔ بابا کے ایک پرانے دوست ٹورنٹو انٹرنیشنل پورٹ پر مجھے لینے آئے ہوئے تھے۔ ان کا گھر انٹرنیشنل پورٹ کے نزدیک مگر ٹورونٹو شہر سے کافی فاصلے پر تھا۔ رات میں نے ان کے گھر گزاری، صبح دفتر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے مجھے گو بس کے اسٹاپ پر اتار دیا۔ یہ گو بس مجھے ٹورنٹو شہر لے جائے گی جہاں سے میں دوسری بس یا ٹرام سے یونیورسٹی جا سکتا تھا۔

یونیورسٹی میں داخلہ کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد میں نے رہائش کے لیے یونیورسٹی کے نزدیک ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ اگلے روز میں اپنا سامان لے کر اس کمرے میں منتقل ہوگیا۔

میں نے اپنے آپ کو مکمل طور سے پڑھائی میں غرق کر لیا تھا۔ اب میری زندگی اپنے رہائش کے کمرے، یونیورسٹی، لائبریری اور گروسری اسٹور تک محدود ہوگئی تھی۔ صندل کو بھلانے کا صرف یہی ایک ذریعہ تھا مگر میری کوئی کوشش بار آور نہیں ہو رہی تھی میں کسی نہ کسی بہانے اس کو یاد کرنے لگتا۔ اگر اور کچھ نہیں تو یہی کہ اب تو اس کی شادی ہو چکی ہوگی۔ وہ گاؤں میں رہتی ہوگی۔ اسی زنان خانہ میں جہاں ارباب اس کو پاؤں کی جوتی سمجھ کر اس کے ساتھ خدا معلوم کیسا سلوک کرتا ہوگا۔ میں جتنا صندل کو بھلانے کی کوشش کرتا اتنا ہی اس کی یاد میرا پیچھا کرتی۔ اسی آنکھ مچولی میں پہلا سمسٹر ختم ہوا پھر دوسرا سمسٹر بھی اپنے اختتام کو پہنچا۔ اگر میں سمر کورا ٹرم میں بھی پڑھائی جاری رکھوں تو میری ڈگری اگلے تین مہینے میں مکمل ہو جائے گی۔ بابا کا بھی یہی مشورہ تھا۔ میں نے سمر کوارٹر میں بھی پڑھائی جاری رکھی۔ اب میرے ہاتھ میں ڈگری آچکی تھی۔

جس طرح پاکستان میں واپڈا ہے جس کا کام بجلی کی پیداوار اور ترسیل ہے اسی طرح کینیڈا کے صوبہ اونٹیریو میں یہ کام ایک کمپنی اونٹیریو ہائیڈرو کے ذمے ہے۔ ایم ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد مجھے اونٹیریو ہائیڈرو میں نوکری مل گئی۔ میں نے یہاں ایک سال نوکری کی، پیسے جمع کیے پھر دوبارہ یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کرنے کی غرض سے داخلہ لے لیا۔ میں تین سمسٹر کی پڑھائی مکمل کر چکا تھا۔ چوتھا سمسٹر شروع ہو چکا تھا۔

صندل کی یادوں پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ اُدھر ماں کا تقاضا تھا کہ میں جلد از جلد شادی رچا لوں۔ ماں کی ممتا نے اب مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مجھے احساسِ جرم دلا کر شادی پر راضی کرنا چاہتی تھیں۔ ماں کے الفاظ میں "مجھے میرے مرنے سے پہلے پوتا پوتی کو اپنی گود میں کھلانے کی خواہش کو پورا کر دو۔"

مجھے اپنی ماں پہ پیار آگیا کہ یہ ممتا کی ماری کس کس طرح سے میری تنہائی کو دور کرنا چاہتی تھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ میں ماں کی خواہش پوری کر دوں مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مجھے اپنے ایک دوست سے ملنے جانا تھا جو یونیورسٹی سے چند میل کے فاصلے پر رہتا تھا۔ وہاں جانے کے لیے مجھے بس پکڑنا تھا۔ میں بس اسٹاپ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ بس میرے پاس سے گزر کر اسٹاپ پر جا کر رک گئی۔ پہلے اس اسٹاپ پر اترنے والے مسافر اترے پھر جانے والے مسافروں نے بس پر چڑھنا شروع کیا۔ ان چڑھنے والے مسافروں میں ایک لڑکی بھی تھی جس نے سر پر اجرک اوڑھ رکھی تھی۔ میں بے اختیار بس کی جانب دوڑا مگر بس روانہ ہو چکی تھی۔

میں بڑی کوششوں، محنت اور تپسیا کے تین چار سال گزارنے کے بعد اس مرحلہ پر پہنچا تھا کہ صندل کی یادوں سے کافی حد تک پیچھا چھڑا لوں۔ لیکن آج میری یہ ساری محنت مجھے رائگاں ہوتی دکھائی دے گئی۔ ایک اجرک کی چند سیکنڈ کی جھلک میری ساری تپسیا کو اس طرح سے بہا کر لے گئی تھی جس طرح سے پانی کا ریلہ خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ صندل کی یاد اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑی تھی۔ میں دوست کے گھر جانے کے بجائے اپنے کمرے میں واپس آکر ماضی میں کھو گیا۔

چند دن بعد میں لائبریری میں اپنی ریسرچ سے متعلق کتابیں ڈھونڈ رہا تھا۔ لائبریری میں جو کتابوں کے شیلف

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے ان کی لمبائی کافی زیادہ رکھی گئی تھی تاکہ اس کے خانوں میں زیادہ لمبائی والی کتابیں بھی سما سکیں۔ میں جس شیلف میں کتابیں ڈھونڈھ رہا تھا اس میں رکھی ہوئی کتابوں کی لمبائی زیادہ نہ تھی جس کی وجہ سے کتابوں کے اوپر ایک دراڑ سی بن گئی تھی جس کے آر پار دیکھا جاسکتا تھا۔ اس دراڑ میں سے سامنے بچھی ہوئی میزوں کا منظر دیکھا جاسکتا تھا جن کے اطراف بیٹھ کر لوگ کتابوں کا مطالعہ کررہے تھے۔ اس دراڑ کے پار دیکھتے ہوئے میری نظر سامنے والی میز پر پڑی۔ مجھے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہاں پر ایک لڑکی کھڑے ہوکر اجرک کو سمیٹتے ہوئے اپنی کتابوں کو اٹھا رہی تھی۔ میں ماضی کے خیالوں میں کھو گیا۔

صندل سے منگنی ہونے کے بعد میں اکثر کلاس کے اختتام پر صندل کی کلاس کے باہر اس کا انتظار کیا کرتا تھا کہ وہ باہر آجائے تو ساتھ ہولیں۔ اس کی کلاس میں لڑکیوں کی تعداد پانچ پاچھ ہوگی۔ یہ سب کی سب لڑکیاں سب سے آگے والی بینچ پر بیٹھا کرتی تھیں۔ یہ بینچ دروازے کے بالکل ساتھ تھی۔ صندل دروازے کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا کرتی تھی۔ لیکچر جب ختم ہوجاتا تو صندل اپنی اجرک کو سمیٹ کر کتابوں کو اکٹھا کرکے باہر آجاتی۔

صندل کے اجرک اوڑھنے کا انداز منفرد تھا۔ وہ جب بیٹھنے لگتی تو اجرک کو اس طرح اپنے اوپر پھیلا لیتی کہ اس کی اجرک کاندھوں سے لے کر گود تک اس کے دونوں بازو چھپا لیتی۔ جب اٹھتی تو ایک ادائے دلبرانہ سے اپنی اجرک کو سمیٹتی پھر اپنی کتابوں کو اٹھا لیتی۔ مجھے اس کی یہ اجرک اوڑھنے اور سمیٹنے کی ادا بہت بھلی لگتی تھی اور میں اسی نظارے کو دیکھنے کے لیے اس کی کلاس کے باہر کھڑا رہتا تھا۔

جب میں نے شیلف کی دراڑ سے اس لڑکی کو اجرک سمیٹتے دیکھا تو میرے دل میں یہ خیال تھا کہ یہ لڑکی صندل ہے۔ لیکن پکا یقین نہیں تھا کہ وہ لڑکی صندل ہی ہوگی اس لیے کہ شیلف کی دراڑ سے اس کا چہرہ نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے کتابوں کو اسی شیلف پر چھوڑا اور تقریباً دوڑتا ہوا اس میز کی طرف لپکا۔ صندل میرے سامنے کھڑی تھی۔

"تم یہاں کیسے؟" اس نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میز پر دوسری دو اور لڑکیاں مطالعہ میں مصروف تھیں۔ انہوں نے غصیلی نظروں سے ہم دونوں کو گھورنا شروع کردیا۔ لائبریری میں اونچی آواز میں بولنے پر پابندی ہوتی ہے کہ اس طرح دوسرے ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ میں نے "سوری" کہہ کر ان سے معذرت کی۔ صندل کو ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دوسرے ہاتھ سے بیرونی دروازے سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔

باہر نکل کر میں نے صندل سے کہا۔ "میں تو یہاں مکینیکل انجینئرنگ میں پی ایچ ڈی کررہا ہوں مگر تم گاؤں چھوڑ کر یہاں کیسے پہنچ گئیں؟"

"بعد میں بتاؤں گی۔ میری کلاس شروع ہونے والی ہے۔ میں سول انجینئرنگ ڈپارٹمنٹ میں اسٹرکچرز میں ایم ایس کرنے آئی ہوں۔"

"بعد میں چلی جانا۔ اتنے دنوں کے بعد ملی ہو۔ کیا تم میری خاطر ایک کلاس نہیں چھوڑ سکتیں؟" میں نے اس کو روکنا چاہا۔

"اہم کلاس ہے، نہیں چھوڑ سکتی۔ ایک گھنٹے بعد ملوں گی۔" وہ جانے لگی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم دو ہفتے بعد لائبریری میں... مجھ سے ملو۔ ہم لنچ ساتھ کریں گے۔ کچہری بھی کریں گے۔" سندھ میں محفل جمانے کو کچہری کرنا کہتے ہیں۔ صندل نے ہنستے ہوئے لائبریری میں ملنے کا وعدہ کرلیا۔

لائبریری سے نکل کر ہم لوگوں نے کیفے ٹیریا کا رخ کیا۔ لیکن وہاں کچہری لگانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بیٹھنے کی جگہ مشکل سے ملی۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہورہا تھا کہ صندل نے کیسے کینیڈا کا رخ کیا۔ ارباب نے کیسے اس کو یہاں بھیج دیا۔

"ارباب سے اب میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔" صندل نے دھماکا کیا۔

"کیوں کیا ہوا۔ تعلق کیسے نہیں ہے؟" میں نے معلوم کرنا چاہا۔

"لمبی داستان ہے، یہاں نہیں بتا سکتی۔"

"اچھا تو ایسا کرو رات کا کھانا میرے ساتھ کھانا۔ میں تم کو بریانی کھلاؤں گا۔"

"یہاں بریانی کہاں ملتی ہے؟ جب سے آئی ہوں بریانی نہیں کھائی ہے۔" بریانی صندل کی مرغوب غذا تھی۔

"میرے کمرے میں۔"

"تم خود بناؤ گے؟" صندل نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں خود بناؤں گا۔ اور ایسی بناؤں گا کہ تم انگلیاں چاٹتی رہ جاؤ گی۔ مگر سات بجے آجانا۔ میں اپنی لینڈ لیڈی کو بھی بلاؤں گا۔ وہ جلدی کھانا کھاتی ہے اس کو میری بنائی ہوئی بریانی بہت پسند ہے۔" پھر میں نے صندل کو اس گھر کا پتا سمجھایا جہاں ایک کمرے میں میرا قیام تھا۔ "ہاں لینڈ لیڈی سے کہہ دینا کہ تم میری کزن ہو۔ وہ بوائے فرینڈ گرل فرینڈ کے چکر سے الرجک ہے۔"

رات میں جب میری لینڈ لیڈی بریانی کی ڈکاریں لیتی گھر کے اندر جاچکی تھی اور کمرے میں صرف ہم رہ گئے تھے۔ میں نے صندل کو مخاطب کیا۔ "اب بتاؤ ارباب سے تمہارا تعلق کیوں نہیں ہے۔"

صندل نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "ارباب نے مجھ سے دو وجوہات کی بنا پر شادی کی تھی۔ پہلی وجہ تھی انتقام۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے اس کو نیچا دکھانے کے لیے انکار کیا تھا۔ یہ اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا جب تک کہ وہ مجھے رسوا اور ذلیل نہیں کرلیتا اس کے انتقام کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوسکتی تھی۔"

"دوسری وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"بتا رہی ہوں، مجھے ٹوکو نہیں سہولت سے سنو۔ دوسری وجہ تھی گاؤں کی جائداد کی تقسیم۔ اگر میری شادی کسی اور سے ہوجاتی تو وہ بابا سائیں کے حصہ کی ساری جائداد سے محروم ہوجاتا۔ بابا سائیں کے کراچی منتقل ہونے کے بعد ارباب گاؤں کی ساری جائداد سنبھال رہا تھا۔ وہ اس بات کو نہیں برداشت کرسکتا تھا کہ کوئی اور شخص اس جائداد کو سنبھالے۔"

"تم سے شادی کرنے کے بعد تو ارباب کے مقاصد اسے حاصل ہوچکے تھے پھر تم دونوں میں ان بن کیسے ہوگئی۔"

"تم پھر مجھے ٹوک رہے ہو۔"

"اچھا بابا غلطی ہوگئی معاف کردو اب نہیں ٹوکوں گا۔"

"میری اور تمہاری منگنی ختم ہونے کے دو مہینے بعد میرا نکاح ارباب سے ہوگیا۔ شادی کی رات میں صبح چار بجے تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ نہیں آیا پھر میں سوگئی۔ ارباب ساری رات ان رنگ رلیوں میں مصروف رہا جن کا وہ عادی تھا۔ وہ پورے ایک ہفتہ بعد زنان خانے میں داخل ہوا لیکن میرے پاس نہیں آیا، اپنی ماں سے مل کر چلا گیا۔ پھر اگلے چند مہینے میں اس نے گاؤں کی دو لڑکیوں سے نکاح پڑھوالیا اور ان دونوں کو میرے کمرے کے برابر والے کمرے دے دیے۔ ایک کو میرے کمرے کے دائیں جانب والا کمرا اور دوسری کو بائیں جانب والا کمرا۔ اب وہ ہر رات زنان خانے میں آتا کبھی ایک بیوی کے پاس کبھی دوسری کے پاس۔ ان سب کے سامنے مجھے جان بوجھ کر ذلیل کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ میرے پاس نہیں آکر وہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ مگر میں خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔ میری اس سے نفرت اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں سوچتی تھی کہ اگر وہ خدانخواستہ کبھی میرے پاس آگیا تو میں یہ کریہہ منظر کیسے برداشت کروں گی۔"

صندل نے وقفہ لیا پھر بولی۔ "میں اس دور سے گزر رہی تھی جس سے مجھے شدید خوف آتا تھا۔ میں ایک مرد کے پاؤں کی جوتی بن چکی تھی لیکن میں بابا سائیں کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ بابا سائیں کو کچھ نہیں بتایا۔ داستان لمبی ہے..... بس صرف اتنا بتادوں اس نے زدوکوب کرنا اپنا معمول بنالیا۔"

صندل نے پانی مانگا۔ اس کا گلا خشک ہورہا تھا۔

"میں نے تو بابا سائیں کو پھر بھی کچھ نہیں بتایا مگر ان کو پتا چل گیا ایک دن وہ میرے پاس آئے۔"

"صندل۔"

"جی بابا سائیں۔"

"بیٹا آج میں تم سے مشورہ کیے بغیر تمہارے لیے ایک فیصلہ کرکے آیا ہوں۔"

"کیسا فیصلہ بابا سائیں۔"

"بیٹا میں نے فساد کی جڑ کو ہمیشہ کے لیے ختم کردیا ہے۔ میں اپنے حصے کی گاؤں کی ساری جائداد سے دست بردار ہوگیا ہوں۔ ساری جائداد میں نے بڑے سائیں کے نام کردی ہے۔ اب ارباب کو طلاق دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ تم جب چاہو طلاق لے سکتی ہو۔" میں طلاق لے کر بابا سائیں کے ساتھ کراچی آگئی۔

"تم نے کبھی غور کیا ہے صندل کہ بسا اوقات انسان جس چیز سے خوف کھاتا ہے، ڈرتا ہے وہی چیز اس کے سامنے حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے۔ تم کو یاد ہے جب ہم کالج میں پہلی بار ملے تھے تو تم نے کہا تھا۔ "مجھے کسی کے پاؤں کی جوتی بننا پسند نہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں یاد ہے" صندل نے جواب دیا "مگر پھر میں نے اس تلخ کلامی کی معافی بھی مانگ لی تھی۔"

"صندل" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر اُس شام بابا سائیں فیصلہ میرے حق میں کر دیتے تو شاید تم اتنی اذیت سے نہ گزرتیں۔"

"تم بابا سائیں سے کیوں اس طرح بدظن ہوتے ہو۔ وہ فیصلہ میرا تھا۔ بابا سائیں نے صرف میرا ساتھ دیا تھا۔"

"تم نے کیوں ایسا فیصلہ کیا؟"

"اس لیے کہ میں تم کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ تم گاؤں والوں کی دشمنی کو نہیں جانتے ہو۔ ارباب تم کو کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔ میں خود غرض بن کر تم کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتی تھی۔ میرے دل میں بھی تمہارے لیے وہی جذبات ہیں جو میرے لیے تمہارے دل میں ہیں۔ تم میری آنکھوں کے سامنے نہیں تھے تو کیا ہوا سلامت تو ہو۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔"

"بابا سائیں کو فون کیا تو وہ کیا بولے؟"

"جھنجلاؤ مت بتاتی ہوں۔ بابا سائیں نے وہی کہا جس کا مجھے خدشہ تھا۔" اتنا کہہ کر صندل خاموش ہوگئی۔

میرا ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ "میں ہر طرح کی خبر سننے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوں مگر خدا کا واسطہ پھوٹو منہ سے۔ کیا کہا بابا سائیں نے۔"

"انہوں نے کہا۔" اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "یہ سب اس لیے ہوا ہے کہ تم اور ارمان ایک ہوسکو۔"

"صندل کی بچی میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔ میری جان خشک ہو رہی تھی اور تم چسکے لے رہی تھیں۔"

☆☆☆

شادی کی تقریب اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مہمان رخصت ہو چکے تھے۔ صندل دلہن بن کر میرے گھر آچکی تھی۔ میں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور پلٹ کر دیکھا تو مجھے ہنسی آگئی۔ صندل بستر پر بڑا سا گھونگٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

"ہنسی کیوں آرہی ہے۔" گھونگٹ کے اندر سے آواز آئی۔

"ہنسی اس لیے آرہی ہے کہ چھ سات سال دن رات میرے ساتھ گزارنے کے بعد تم کو آج گھونگٹ نکالنے کا خیال آیا؟"

"گھونگٹ نکالنا ہر دلہن کا حق ہوتا ہے" صندل نے جواب دیا۔

"کیوں ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گھونگٹ اٹھاؤ گے تو بتاؤں گی۔" میں نے اس کا گھونگٹ الٹ دیا۔ اس نے اپنا مہندی لگا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ "میری منہ دکھائی؟"

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ گھونگٹ الٹ کر سہری سے جست لگا کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ "ہرگز نہیں۔ تم بالکل یہ نہیں کہو گے۔"

"کیا نہیں کہوں گا۔"

"وہی جو تم کہنے جا رہے تھے۔"

"میں کیا کہنے جا رہا تھا۔ تم کو کیا معلوم؟"

"بتایا نا کہ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ تم کہنے جا رہے تھے" پھر صندل نے حسبِ معمول میری نقل اتاری "صندل! یہ ہاتھ میری زندگی....." اس نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا پھر اس میں ٹانکا لگایا "تم اس طرح میری منہ دکھائی ہضم نہیں کر سکتے۔ نکالو سیدھے ہاتھ سے میری منہ دکھائی۔"

"میں منہ دکھائی لانا بھول گیا۔ اتنے سال سے تمہارا منہ دیکھ رہا ہوں۔ اب کیسی منہ دکھائی؟"

"تم کو تو ٹھیک سے جھوٹ بولنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔ نکالو جلدی سے۔"

میں نے ہار مان لی۔ "تم میرا ہاتھ چھوڑو گی تو نکالوں گا ناں۔" اس نے ہاتھ چھوڑ دیا۔

میں نے شیروانی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیا نکالی۔ ڈبیا میں سے ایک انگوٹھی نکال کر اس کی انگلی میں پہنا دی۔ یہ وہی انگوٹھی تھی جو "میرے دادا نے میری دادی کو.....اور میری ماں نے اپنی بہو کے لیے سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔"

انگوٹھی پہن کر صندل کی آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے۔ معلوم نہیں کہ اس کی آنکھوں کے ستاروں کی چمک نے میری آنکھیں خیرہ کر دیں یا اس انگوٹھی کے ہیروں کی دمک نے۔ مگر ایک بات یقینی تھی ان چمکتی آنکھوں میں پچھلی دفعہ والا شکوہ نہیں تھا!

"کاہے لے لی انگوٹھی ہمار بجنا"

چاند کا داغ

محترم مدیر اعلیٰ
اس بار میں نے ایک سلگتے ہوئے موضوع پر سچ بیانی تلاش کی ہے۔ یہ بھی میرے ایک جاننے والے گھرانے کی داستان ہے جو برسوں قبل ہمارے محلے میں رہتے تھے۔ اب وہ لوگ پتا نہیں کہاں ہیں لیکن ان کی ایک ایک بات میرے ذہن و دل پر نقش ہے۔ انہی باتوں کو میں نے الفاظ کا پیرہن دے کر قابلِ مطالعہ بنایا ہے۔ یقینا یہ سچ بیانی آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

"بہن چائے پانی تو رہنے ہی دیں، پہلے سحرش کو بلائیں، ذرا یہ ماتھا پٹی لگا کر چیک تو کریں کہ یہ ہماری چاندسی بہو پر سج کر کیسی لگے گی ویسے بھی اگر سحرش کو پسند نہ آئی تو مسئلہ نہیں ہم بیٹے کے ویسے میں خود ہی ماتھے پر چپکا کر کھڑے ہو جائیں گے۔" انہوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا چمکتا چہرہ، ہونٹوں کے کنارے سے پھوٹتی شفیق مسکراہٹ، خوشی بھی ایسی جو چھپائے نہ چھپ پائے۔ ان کے ہاتھوں میں جھلملاتی سونے کی جڑاؤ ماتھا پٹی نے بھی ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

کا ساتھ دینے کی ٹھانی، اس کی دمک آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔

"سحرش کو بلوائیے نا بہن...... اب ہم سے صبر نہیں ہو رہا۔" تحسین بانو کے لہجے کا اشتیاق، مانو ان کے جسم سے جان نکال کر لے گیا۔ انیسہ نے مہ وش کی طرف دیکھا، ماں بیٹی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح مشورہ شروع کر دیے۔

جیولرز کے یہاں سے زیور لیتے ہی تحسین اتنی پُرجوش ہوئیں کہ ان کی سواری بادِ بہاری سیدھی صرافہ بازار سے سمدھیانے جا اتری، بھلا کیوں نہ ہوتیں، بیٹے کی شادی میں ایک ہفتہ ہی باقی تھا، وہ پہلے ہی بڑی ارمان بھری تھیں، پانچ بیٹے بیاہنے کے باوجود ان کے جذبات ماند نہ ہوئے، ویسے بھی وہ ہر بیٹے کی شادی کے موقع پر اتنے ہی جوش و خروش سے بازاروں کے چکر لگاتیں، ہر بار نئے ولولہ کے ساتھ بہو کے لیے... خریداری کا کام انجام دیتیں، پھر بری ایک ایک کو دکھا کر رائے مانگتیں کہ "میں نے بہو کے لیے کیسی تیاری کی ہے؟" ان باتوں کے پیچھے بناوٹ نہیں بلکہ ان کی سادہ دلی چھپی ہوتی۔

"ارے آنٹی...... ایسے کیسے؟ آپ تھکی ہاری بازار سے آئی ہیں، کچھ ٹھنڈا، گرم تو چلے گا، میں تو کہتی ہوں کھانا ہی کھا لیں...... امی نے مٹر قیمہ پکایا ہے" مہ وش نے پریشانی کے باوجود پُرخلوص آفر کی۔ وہ پہلی ملاقات سے ہی اس کے دل میں گھر کر گئی تھیں۔

تحسین بانو ہنسوڑ مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ سلجھی ہوئی بھی تھیں۔ سامنے والا پہلی ملاقات میں ان کی خوش اخلاقی کا گرویدہ ہو جاتا، مگر اس وقت ان کی ایک فرمائش نے سحرش کی ماں بہن کو ایک ایسے امتحان میں مبتلا کر دیا جس کے لیے ان کی قبل از وقت تیاری صفر تھی، ویسے بھی وہ لوگ اپنے تئیں یہ سمجھنے لگے تھے کہ "مشکل وقت گزر گیا۔" ورنہ تو سحرش کے سسرال سے کوئی بھی فون آتا، دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا کہ کہیں انکار نہ ہو جائے۔ تاہم اب انہیں یقین ہو چلا تھا کہ اگر ان لوگوں کو منع کرنا ہوتا تو اتنا وقت تھوڑی لگاتے، آخر شادی کی گھڑی سر پر آ ہی پہنچی۔

"نہیں بیٹا... گھر میں کسی کو پتا نہیں...... وہ تو جیولرز کا فون آ گیا تو ہم ڈرائیور اور اپنی ملازمہ کو لے کر نکل پڑے، اگر فوری طور پر واپسی نہیں ہوئی تو تمہارے انکل سے کچھ بعید نہیں ہماری یاد میں جنگلوں کا نہ رخ کر بیٹھیں" وہی مشہور زمانہ بے ریا سا قہقہہ۔

مہ وش نے کچھ سوچا اور ماں کو اشارے کرتی بہانے سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

"میں چائے لاتی ہوں" چند لمحوں میں ہی انیسہ بھی اجازت طلب کرتی اس کے پیچھے چل پڑیں۔

"اب کیا کریں امی...... آنٹی کو ٹالنا بھی مناسب نہیں" مہ وش ہاتھ ملتے ہوئے بولی، اس کی جسمانی حرکات چیخ چیخ کر اس کی منتشر ذہنی کا اعلان کرنے لگیں۔

"میں کیا بتاؤں...... جانتی تھوڑی تھی کہ شادی سے کچھ دن قبل اچانک یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوگا" فکر کے مارے انیسہ کے تو پیٹ میں مروڑ سے اٹھنے لگے۔

"اسی لیے تو میں کہتی تھی کہ سکندر کے گھر والوں کو ہر بات کھول کھول کر بتا دیں، مگر میری سنتا ہی کون ہے؟ اس وقت تو سب نے اچھا ہے کہہ کر مجھے خاموش کرا دیا گیا، اب کیوں ڈر رہے ہیں؟ اف شادی میں کتنے کم دن رہ گئے ہیں۔ اب انہوں نے انکار کیا تو...... میری کتنی رسوائی ہوگی۔" ہونے والی ساس کی فرمائش سن کر سحرش کی حالت الگ خراب ہونے لگی، اس کی زبان چل پڑی، ماں، بہن پر دھیمے دھیمے برستے ہوئے چہرہ سرخ ہو گیا، آنسو نکلنے کو بے تاب ہو گئے، مہ وش نے موقع کی نزاکت کا احساس کیا، بڑی بہن کو جلدی جلدی سمجھانے میں لگ گئی۔

"کوئی تدبیر تو کرنی پڑے گی"۔ انیسہ کا دماغ بھی تیزی کام کرنے لگا، مگر بیٹی کا رونا دھونا جو شروع ہوا ان کے ہاتھ پاؤں مزید پھول گئے۔

"بیٹا...... میں نے ان لوگوں کی پہلی دفعہ آمد پر ہی دبے لفظوں میں سچائی بتانے کی کوشش کی، مگر تحسین بانو تو تمہاری خوبصورتی میں ایسا کھوئی کہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ ہوئی کہ اس بات کو ٹال کر الٹا مجھے ہی دوسری باتوں میں لگا لیا" انیسہ نے سر پر ہاتھ مار کر صفائی پیش کی، سحرش کا دماغ ماؤف ہو گیا، وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہ تھی۔ بس روئے جا رہی تھی۔

"میں اس دفعہ تو سحرش کے ساتھ برا ہونے نہیں دوں گی۔" انیسہ نے سر پر ہاتھ دھر کر سوچا۔

مہ وش خاموش ہو گئی۔ وہ بغور بڑی بہن کو تکنے لگی، بنانے والے نے کوئی کمی بھی نہ چھوڑی تھی۔ بڑی بڑی سنہری آنکھیں، خمدار مڑی ہوئی پلکیں، لمبے گھنے بال اور سانچے میں ڈھلا جسم، چاند چہرہ ستارہ آنکھوں والی سحرش کا شمار خوبصورتوں میں نہ کرنا زیادتی ہوگی، مگر کبھی کبھی، چاند میں بھی تو گہن لگ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی یوں ہی ہوا، کیا

تھا جو ایسا نہ ہوتا تو۔ مہ وش کی آنکھیں بھر آئیں۔

"دبے لفظوں میں کیوں......؟ سب کچھ واضح طور پر بتانا چاہیے نا" سحرش نے تکیہ میں منہ چھپا کر گھٹے گھٹے انداز میں بے قراری سے روتے ہوئے کہا۔

یہاں انیسہ سے چوک ہوئی یا اپنے دل سے مجبور ہو گئیں، بیٹی کو دلہن کے روپ میں دیکھنا، ان کی اور...... انصار احمد کی اولین خواہشوں میں سے ایک تھی مگر اس سے قبل ایک دو جگہ رشتہ تقریباً طے ہونے ہی جا رہا تھا کہ انہیں سچ بولنے کی سزا ملی اور ان لوگوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔

مہ وش سحرش سے ایک سال ہی چھوٹی تھی، جب سحرش کی کہیں بات نہ بنی تو، مجبوراً انصار احمد نے پہلے چھوٹی بیٹی کی ہی شادی کر دی وہ سحرش کی وجہ سے مہ وش کو بٹھا نہیں سکتے تھے، اس کا مناسب رشتہ آیا، انہوں نے سرسری چھان پھٹک کی اور خاندان والوں کی باتوں کی پروا کیے بغیر اس کے فرض سے سبک دوش ہو گئے، سحرش نے اس معاملے میں باپ کا ساتھ دیا، ان کا کوئی بھائی تو تھا نہیں۔ جانتی تھی کہ باپ کے بوڑھے کاندھوں پر بیٹیوں کی کیسی بھاری ذمے داریاں ہیں۔ وہ جلد از جلد ان دونوں کی شادیوں کے فرض کی ادائیگی کے ساتھ اللہ کی نظر میں سرخرو ہونے کو بے قرار رہتے، پھر فضول رسومات کی وجہ سے بڑی کی وجہ سے چھوٹی کی شادی کیوں ٹالتے۔

"اللہ معاف کرے جی...... لڑکے والوں کو تو دن لگے ہوئے ہیں، شاہد کے گھر والوں کو ہی لے لو، بڑے ہی مین میخی نکلے، اس کی ماں منہ پھاڑ کر بولی کہ لڑکی کے ماتھے پر جو کالا نشان ہے نا، اچھا نہیں ہے، ہمیں ایسی لڑکی وارا نہیں کھاتی، کوئی بے داغ حسن والی لڑکی دکھاؤ، میں نے تو سنا دیا کہ تم لوگ ایسا کرو خود ہی سانچے میں ڈال کر اپنی پسند کی لڑکی بنا لو، مگر کم بختوں نے پھر بھی انکار کر دیا۔"

ایک بار پھر سحرش کے رشتے سے انکار ہوا تو رشتے والی ماسی چپکے چپکے بتاتی، خود ہی شرمندہ ہو گئی۔ اس واقعے کے بعد دنوں انیسہ اپنی معصوم بیٹی سے اور سحرش ماں سے نظریں چرائے پھریں، انصار احمد نے ہی بڑھ کر گھر کے جمود کو توڑا اپنی محبت اور فطری اندازِ گفتگو سے دونوں کی ذات پر چڑھایا گیا مصنوعی خول چٹخا دیا۔

ایسے حالات میں جب سکندر کی ماں بہنوں نے اچانک ہی سحرش کو پسند کر لیا تو ان کے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، وہ ایسی کیفیت میں مبتلا ہو گئیں کہ ایسا اعلیٰ رشتہ قائم رکھنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کریں، ماں جو ٹھہریں، مگر بیٹیوں کے دباؤ میں آ کر انہوں نے جب سحرش کے ماتھے پر موجود بدنما نشان کی بابت بتانا چاہا تو تحسین بانو نے سنی ان سنی کر دی، وہ تو سحرش کی بلائیں لیتی فوری شادی پر تل گئیں، اس کے بعد اگر انیسہ پاگل ہوتیں تو دوبارہ یہ ذکر نکالتیں۔ اب تحسین بانو کا یوں اچانک آنا، ان سب کی خوشیوں پر پانی پھیرے دے رہا تھا۔

"کوئی نہیں...... میں ان کو جا کر کہہ دیتی ہوں کہ سحرش تو اپنے ماموں کی طرف گئی ہوئی ہے، رات تک آئے گی" انیسہ نے کچھ سوچ کر لب کھولے اور بیٹیوں کے آگے ایک تجویز پیش کی، ابھی ان کے منہ سے الفاظ پوری طرح سے ادا بھی نہ ہو پائے کہ تحسین بانو زیورات کا سنہری ڈبا تھامے کمرے کے دروازے سے داخل ہوتی نظر آئیں۔ سارے ہکا بکا رہ گئے، تاہم سحرش سب سے پہلے سنبھلی۔ قرینے سے دوپٹا اوڑھتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔ مہ وش ہونٹوں پر زبردستی کی مسکراہٹ سجائے ان کے استقبال کو آگے بڑھی۔

"بہن...... معاف کیجیے گا، وہ انور بیٹے کا فون آ گیا، آپ کو تو پتا ہے کہ شادی بیاہ کے گھر میں لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، کچھ رشتے دار گھر پر آئے بیٹھے ہیں۔ ہمیں فوراً واپس جانا ہوگا، اسی لیے ہم یوں ہی بلا اجازت اندر چلے آئے، امید ہے کہ آپ لوگوں نے برا نہیں منایا ہوگا" وہ اتنی عاجزی سے بولیں کہ کمرے میں موجود نفوس کا سر شرمندگی سے جھک گیا، بدتہذیبی تو ان لوگوں کی طرف سے ہوئی کہ مہمان کو اکیلا چھوڑ کر سارا گھر کھچڑی کرنے لگا، مہمان بھی کون سحرش کی ہونے والی ساس، مگر مجال ہے جو ان کے انداز میں لڑکے والوں جیسی فرعونیت یا کروفر کا شائبہ بھی ہو۔

"نہیں...... نہیں بہن کیوں شرمندہ کر رہی ہیں، وہ بس سحرش کے سر میں صبح سے درد ہے، اس لیے، خیر آپ خود ہی آ گئیں یہ تو اچھا ہوا، آخر ہم ایک ہی خاندان بننے جا رہے ہیں،" نفیسہ نے بیڈ کو جھاڑ کر ان کے بیٹھنے کی جگہ بنائی، سحرش کی سرخ ہوتی آنکھوں کا راز چھپانے کے لیے انہیں بروقت بہانہ سوجھا۔

"اچھا...... میری بچی نے دوا بھی لی؟" ان کے چہرے سے چھلکنے والی فکرمندی اتنی فطری تھی کہ مہ وش کو بہن کی قسمت پر رشک آیا، فوراً ہی گڑگڑا کر رشتے کے برقرار

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہنے کی دعا مانگنے لگی۔

مہ وش کو شروع سے ہی سکندر کا گھرانا بہت پسند آیا، روپے پیسے کی فراوانی کے باوجود ان کا رکھ رکھاؤ اور اپنائیت بھرا انداز دل کو چھو جاتا، سحرش کے مقابلے میں اس کے سسرالی متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، آفتاب بھی معمولی شخصیت کا حامل تھا، مگر بہت ہی طعنے باز اور نخریلا تھا۔ اس کی موجودگی میں تو مہ وش ایٹین شن ہی رہتی۔ ان کی شادی کی تقریب میں دونوں کو دولھا دلہن بنے اسٹیج پر بیٹھا دیکھ کر خاندان بھر میں خوب چہ میگوئیاں ہوئیں کسی نے پھبتی بھی کس دی کہ ''پہلوئے حور میں لنگور'' پھر بھی، آفتاب کی گرد ان میں پڑا سر پاٹس سے مس نہ ہوا۔ اف شادی کے وقت اس کی سسرال والوں نے پورے خاندان کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ مگر اس دفعہ سب کچھ برعکس ہو رہا تھا۔

سکندر کا اپنا آٹو پارٹس کا بزنس کافی ملکوں میں پھیلا ہوا تھا، وہ پاکستان میں کم اور باہر زیادہ وقت گزارتا، اسی وجہ سے مہ وش کی اس سے اب تک بالمشافہ ملاقات نہ ہو سکی، کیوں کہ جن دنوں یہ رشتہ طے پایا، اتفاق سے وہ اپنے شوہر کے ساتھ پاکستان ٹور پر گئی ہوئی تھی، تحسین بانو کی مچائی گئی جلدی اور کچھ اپنے اندر کے ڈر کی وجہ سے انیسہ نے مہ وش سے فون پر ہی مشورہ کر کے ہاں کر دی، اس بات پر آفتاب نے ناک بھوں بھی چڑھائی کہ اس کی غیر موجودگی میں سالی کی بات چیت کیوں طے کی گئی، ہم تو شادی میں نہیں بیٹھیں گے، مگر تین سالہ شادی شدہ زندگی میں پہلی بار مہ وش اس کے سامنے ڈٹ گئی، بیوی کے تیور دیکھ کر آخر آفتاب کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔

بات طے ہونے کے فوراً ہی بعد سکندر بزنس ٹرپ پر سنگاپور روانہ ہو چکا تھا، اور شادی سے دو دن قبل اس کی واپسی متوقع تھی، مجبوراً مہ وش کو ہونے والے بہنوئی کی تصویر سے کام چلانا پڑا۔

بیٹی کی شادی کے لیے انصار احمد صاحب کی کچھ تیاری تھی، کچھ نہیں۔ ویسے بھی اتنے کم وقت میں اتنا بڑا کام .....وہ سوچ میں پڑ گئے، انیسہ کے منع کرنے کے باوجود انہوں نے شادی کے لیے ایک سال کا وقت مانگ لیا، مگر تحسین بانو اور ان کے شوہر شکیل خان نہ مانے، اصل میں ان کی چھوٹی بیٹی کو ساؤتھ افریقا اپنے شوہر کے پاس واپس جانا تھا، اس کی جانے کب دوبارہ آمد ہوتی، اسی لیے وہ لوگ ہتھیلی پر سرسوں جمانے لگے، تاکہ بہن سکندر کی شادی میں شرکت کر سکے، البتہ انصار احمد کی آسانی کے لیے شکیل خان نے خود ہی فالتو رسومات سے انکار کر دیا، سیدھے سیدھے شادی کی تقریب میں اپنے خاندان والوں کو لانے کا عندیہ دیا اب ان کے پاس انکار کا کیا جواز باقی رہ جاتا۔

انیسہ کو خاندان والوں کا منہ بھی بند کرنا تھا۔ چھوٹے پیمانے پر مہندی مایوں کی تقریب اپنے گھر میں ہی منعقد کر لی جس میں قریبی رشتے داروں کو مدعو کر لیا گیا۔

''بیٹا..... ذرا سر سے دوپٹا ہٹانا..... ہم یہ ماتھا پٹی لگا کر دیکھیں، کیسی لگتی ہے؟'' وہیں بیٹھے بیٹھے انہوں نے چائے ختم کی جو مہ وش نے زبردستی لا کر انہیں تھمائی۔

''اف..... تو امتحان کی گھڑی سر پر آ ہی گئی'' اس نے دوپٹا ہٹا کر سر آگے کیا۔ سحرش نے انہیں ایسے دیکھا جیسے وہ اسے سوئے دار جانے کا کہہ رہی ہوں۔

نفیسہ کے ہاتھ الگ کانپ اٹھے۔ مہ وش نے دل ہی دل میں دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔

''لاؤ..... بیٹی ہم پہناتے ہیں'' تحسین نے بڑے اشتیاق سے سحرش کے ماتھے پر سے بال ہٹائے، اور ماتھے پر سونے کی جڑاؤ ماتھا پٹی پہنا دی، سحرش نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

''نہیں..... یہ اتنی اچھی نہیں لگ رہی..... وہ تو جیولر پیچھے پڑ گیا کہ آج کل فیشن میں ہے، اپنی بہو کے لیے بھی بنوا لیں، تو میں نے لے لی، مگر اب میں اسے تبدیل کروا لوں گی، اس کی جگہ اس سیٹ کے ساتھ جھومر لے لوں گی'' تحسین نے جلدی سے وہ زیور سحرش کے ماتھے سے اتار دیا جو اپنی خوبصورتی کھو چکا تھا۔ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد انہوں نے سب سے جانے کی اجازت طلب کی، سب نے بڑے مان سمان سے انہیں رخصت کیا، نفیسہ کا بس نہیں چلا ورنہ ان کے قدموں میں بچھ جاتیں، لڑکی کی ماں جو ٹھہریں، ہزار دھڑکے ان کی اکیلی ذات سے وابستہ۔

انیسہ اپنی پریوں سی چھوٹی بیٹی مہ وش کی شادی کے بعد سے اس کی سسرال والوں کے زیر عتاب رہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان لوگوں نے ہی انیسہ کو لڑکی کی ماں ہونے کا احساس دلایا پھر سحرش کا تو معاملہ ہی الگ ٹھہرا ''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے''۔

''اف میری کروفر والی ماں کو بیٹیوں کی فکروں نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا'' مہ وش نے ماں کا دبلا سا اترا ہوا چہرہ دیکھا، اس کی اداسی بڑھ گئی۔

فکروں نے انیسہ کو بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا، تحسین بانو کو گئے دیر ہو چکی تھی اس کے باوجود نفیسہ ابھی تک دروازے سے باہر جھانکے جا رہی تھیں، جانے کیا دیکھ رہی تھیں؟

''یا اللہ..... کیا تو نے بیٹیوں کو والدین کے لیے امتحان بنا کر اتارا ہے؟ میرے مالک بیٹی کو دنیا میں بھیجنے سے قبل اس کی اچھی قسمت ماں کی جھولی میں ڈال دیا کر کیوں کہ ماں کی خوشیاں بیٹی کی تقدیر سے جڑی ہوئی ہوتی ہیں'' مہ وش نے آسمان کی طرف شکوہ بھری نگاہوں سے دیکھا اور دعا مانگی، اسے نیلا آسمان کچھ دھندلا دھندلا سا نظر آیا، آنسو جو راہ میں رکاوٹ بن گئے تھے۔

زمانے کا یہی چلن ہے نا کہ جو بھی کسی کو کچھ دیتا، سر اٹھا کر دیتا اور لینے والا سر جھکا کر لیتا، پھر معاملاتِ دنیا لڑکی کی وداعی کے وقت کیوں تبدیل ہو جاتے ہیں، لینے والے ماں کی سب سے پیاری چیز بھی لے لیتے ہیں اور اس کا سر بھی جھکا دیکھنا چاہتے ہیں۔

بات تو دل دکھانے والی ہی ہے نا کہ لڑکی کے ماں باپ جگر کا گوشہ دیتے ہوئے اپنی آن بان اور شان بھی لڑکے والوں کے آگے گروی رکھ دیتے ہیں، فی زمانہ والدین بیٹی کا گھر بسانے کے لیے جتنی توانائیاں خرچ کرتے ہیں اتنی تو پیدائش سے اسے پال پوس کر بڑا کرنے میں بھی صرف نہ ہو پاتیں۔

''میں نے آپ لوگوں کو شادی کے لیے کتنا منع کیا؟ مگر آپ لوگ نہیں مانے۔ اب دیکھیے گا یہاں سے بھی انکار ہو جائے گا'' ان کے گھر سے نکلتے ہی سحرش گھٹنوں میں منہ چھپا کر ایسا پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ انیسہ اور مہ وش کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

''اری بنو، چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہو، آڑی مانگ کے جدید ہیئر اسٹائل پر بالوں میں ٹکا جڑاؤ جھومر، اُف کمال ہے، دھمال ہے'' مہ وش نے بہن کا ماتھا چوم کر اسے غور سے دیکھا، وہ سرخ، مسٹرڈ رنگ کا شرارہ ملبوس کیے، حُسن کا شاہکار بنی بیٹھی تھی مگر اس کے ماتھے کا وہ ''برتھ مارک'' چاند پر داغ کے مصداق تھا۔ کالے رنگ کا گول سادہ نشان، جس پر چھوٹے چھوٹے بالوں کی موجودگی اس کی بدصورتی میں اضافہ کا باعث تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا رشتہ ہوتے ہوتے رہ جاتا، لوگ صرف اتنی سی بات کے لیے اسے مسترد کرتے جس میں اس کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔

میسور کی دوسری لڑائی

مرہٹوں نے 1771ء میں ایک بار پھر میسور پر حملہ کیا۔ خلافِ معاہدہ انگریز سلطان کی مدد کو نہ آئے۔ اس کا بدلہ وہ کسی مناسب وقت پر لینا چاہتا تھا۔ یہ موقع اسے اس وقت ملا جب بمبئی کی بندرگاہ فرانسیسیوں کے تصرف سے انگریزوں نے 1779ء میں اپنے قبضے میں لے لی۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد 1780ء میں سلطان نے مزہ چکھانے کے لیے اعلان جنگ کر دیا۔ اس کی اسّی ہزار فوج اور سوتوپوں نے کرناٹک کو نیست و نابود کر دیا۔ کرنل بیلی شکست کھا کر فرار ہو گیا۔ وائسرائے ہند وارن ہیسٹنگز نے کمانڈر انچیف سر آئر کوٹ کو مقابلے کے لیے بھیجا۔ اس نے سازشانہ چال چلتے ہوئے راجا برار اور نظام کو سلطان کے خلاف کر لیا۔ اور 1781ء میں پورٹونووو (Portonovo) کے مقام پر حیدر علی کو شکست دینے میں کامیاب ہو گیا۔ نومبر 1781ء میں سرنگاپٹم پر بھی قابض ہو گیا۔ 1782ء کے آغاز میں فرانسیسی فوج کا آبی دستہ امیر البحر سفرن کی زیر کمان سلطان میسور کی مدد کو آ گیا۔ اسی سال سلطان کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے نے تخت سنبھالتے ہوئے جنگ جاری رکھی۔ آخر مارچ 1784ء میں معاہدہ بنگلور طے پایا جس کی رُو سے مفتوحہ علاقے اور قیدی واپس کر دیے گئے۔

میسور کی تیسری لڑائی

29 دسمبر 1779ء کو ٹیپو سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کر دیا۔ معاہدہ بنگلور کی رُو سے راجا ٹراونکور نے گورنر مدراس جان ہالینڈ سے امداد طلب کی جو بروقت امداد نہ دے سکا۔ اس دوران لارڈ کارنوالس 4 جولائی 1790ء کو مرہٹوں اور نظام سے سازباز کر کے انہیں سلطان ٹیپو سے الگ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جب ٹیپو سلطان نے جنرل میڈوز کو شکست دی تو کارنوالس نے دسمبر 1790ء میں فوج کی کمان خود سنبھالتے ہوئے 21 مارچ 1791ء کو بنگلور پر قابض ہو گیا۔ وہ ٹیپو کے پایہ تخت سرنگاپٹم سے صرف نو میل دور وادی کرہ کے مقام تک پہنچ گیا۔ بعد میں موسم برسات کی بنا پر واپس چلا گیا۔ 5 فروری 1792ء میں دوبارہ سرنگاپٹم پر حملہ آور ہوا۔ ٹیپو، انگریزوں، نظام اور مرہٹوں کی متحدہ قوت کا مقابلہ نہ کر سکا۔ چنانچہ صلح کی پیش کش کی۔ اس کے نتیجے میں اس سال مارچ میں ایک عہد نامہ طے پایا۔ عہد نامہ سرنگاپٹم کی رُو سے سلطان نے مالابار، بارہ محل اور ڈنڈیگل کے علاقے انگریزوں کو، دریائے کرشنا سے دریائے پنار کی کے علاقے نظام کو، اور کچھ علاقے مرہٹوں کو تاوان کے طور پر دیئے۔ 30 لاکھ پونڈ بھی سلطان کو ادا کرنا پڑے۔

مرسلہ: سلطانہ فخر، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچپن سے اب تک انیسہ نے سحرش کے علاج پر بڑے پیسے خرچ کیے، کریموں کا استعمال کرایا مگر وہ داغ ٹس سے مس نہ ہوا، اس کے حسن پر لگا یہ گہن اس کے ساتھ ساتھ جوان ہوا، سحرش کی گوری بھک رنگت پر وہ کالا نشان اور بدنما دکھائی دیتا۔ آخر مہ وش کو ہی ایک حل سوجھا اس نے زبردستی ایک مشہور پارلر لے جا کر بڑی بہن کی بالوں کی کٹنگ اس انداز میں کروادی کہ بالوں کی جھالر نے ماتھے کے دائیں جانب موجود اس داغ کو چھپا دیا، اس ایک نشان نے سحرش کو ہمیشہ احساسِ کمتری میں مبتلا رکھا۔ مہ وش نے بچوں میں گم سحرش کے ساکت حسن کو دیکھا، اس پر موم میں ڈھلی مورت کا گمان ہونے لگا۔

اس نے بہن کے ٹھنڈے برف ہوتے موی ہاتھوں کو نرمی سے تھاما، اپنی محبت اور اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

"ہاں..... مہ وش تم نے ٹھیک کہا، چاند میں ہی داغ ہوتے ہیں نا۔" وہ اداسی سے بولی۔ ایک طرف تفکرات کی آماجگاہ بنا اس کا دل و دماغ اس پر سوچوں کی کڑی ضرب، اسے خوش ہونے ہی نہیں دے رہی تھی، دوسری طرف مہ وش کا شرارتی انداز، انگ انگ سے پھوٹتی خوشی، دلہن بنی سحرش کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، اسے بہن پر ٹوٹ کر پیار آیا جو اس کی خوشیوں کے لیے قسمت سے بھی لڑنے کو تیار رہتی۔

"آپی..... جانتی ہی نہیں کہ قسمت اس پر مہربان ہو چکی ہے، مگر میں بھی اسے کچھ نہیں بتاؤں گی" مہ وش کے دل میں گدگدی سی ہوئی، بہنوئی کو دیکھتے ہی اس کی ساری فکریں جیسے اُڑن چھو ہوئیں، سحرش کا دوپٹا ٹھیک کرتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ لیا۔ سحرش کی آنکھوں میں ڈر کی پرچھائیاں دیکھ کر دل نے چاہا کہ درد کا کچھ مداوا کر سکے، مگر پھر اس نے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا، قاضی صاحب اس کے ماموں کے ساتھ ڈریسنگ روم میں داخل ہونے لگے، تو اس نے سحرش کو چادر اوڑھانے کے ساتھ ساتھ اپنا سر بھی ڈھانپ لیا۔

"یہ کیا..... نکاح کی گھڑی بھی آن پہنچی، سب کچھ نارمل طریقے سے ہونے لگا مگر اس کے دل کو تو جیسے پنکھے لگ گئے، وہ مزاجاً زود رنج نہیں تھی، مہ وش کی طرح بے فکری سے آنے والی خوشیوں کی گھڑی کا استقبال کرنا چاہتی تھی، مگر اندر سے اٹھنے والی خوف کی لہر سارے جذبوں کو تہ و بالا کرنے لگی، رشتہ طے ہوجانے سے شادی کے دن تک اسے یہی خوف تھا کہ پہلے والوں کی طرح یہ لوگ بھی اس چھوٹے سے داغ کو بڑا سا مسئلہ بنا کر انکار نہ کردیں۔

ایجاب و قبول کی رسم کیا ختم ہوئی، ہر طرف مبارک سلامت کا شور مچ گیا، خاندان کی خواتین جوق در جوق دولہا، دلہن کی ماؤں اور اہلِ خانہ سے لپٹ کر مبارک بادیں دینے لگیں، سحرش کو یقین ہی نہیں آرہا تھا مگر دستخط کرتے ہی سارے بند ٹوٹ گئے گھونگھٹ میں ہی زور و شور سے آنسو بہانے لگی، شاید خوشی کے آنسو تھے، انیسہ کا الگ رو رو کر برا حال، مگر اس موقع پر بھی تحسین نے ہی بڑے پن کا ثبوت دیا اور مبارک باد دینے کے بعد خود بھی سمدھن کو لپٹا کر رو دیں،، سحرش کی ساری نندیں ہنستے ہوئے ان دونوں کو خاموش کرانے میں لگ گئیں۔ ایسے وقت میں مہ وش بھی مسکراتے ہوئے ان کا ساتھ دینے لگی۔

نکاح کے بعد مہ وش بڑے اشتیاق سے اسٹیج پر دولہا بنے بیٹھے سکندر سے ملنے اور مبارک باد دینے گئی، سکندر سے مل کر اس کا دل باغ باغ ہوگیا۔ بلیک شیروانی پر کریم کلر کا کلاہ لگائے وہ مردانہ وجاہت کا نمونہ ہی لگا، اس کے چہرے پر پھیلی شرافت کی چھاپ نے اس کے نقوش کو انوکھی سی نرمی بخش دی، وہ مہ وش کے احترام میں جس طرح کھڑا ہوا اور اس کی چھوٹی بیٹی کو پیار سے اپنے برابر میں جگہ بنا کر بٹھایا، اس کا دل خوش ہوا اور پہلی ملاقات میں ہی اپنے بہنوئی کی گرویدہ ہوگئی۔

"سالی جی..... ایک گلاس پانی ملے گا؟" سکندر نے نرمی سے پوچھا دولہا بنا وہ اتنے رش میں گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

"اچھا جی..... ابھی سے چھکے چھوٹ گئے، ابھی تو عشق کے امتحاں اور بھی....." مہ وش نے بیرے سے ایک گلاس پانی منگواتے ہوئے لطیف سی چوٹ کی تو سکندر نے بے اختیار قہقہہ لگایا، بیرا مودب بنا پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔

مہ وش نے خود گلاس تھاما اور سکندر کو پیش کیا۔

سکندر نے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مہ وش چونک اٹھی، اس کی انگلیوں پر سفید سفید نشان، گو کہ اس کی گوری چٹی رنگت کی وجہ سے واضح نہیں ہو پا رہے تھے، مگر غور سے دیکھنے پر پتا چلتے تھے۔ وہ ایک دم چکرا گئی، مگر پیچھے سے داماد کو ہار پہنانے کے لیے اسٹیج پر چڑھنے والے انصار احمد نے جلدی سے بیٹی کو سنبھال لیا۔

"ابو..... یہ نشان؟ آنٹی نے ہم سے چھپایا؟" باپ کے ساتھ وہ اسٹیج سے اتری اور باپ کو لے کر گوشہ تنہائی میں

آگئی۔ اس پر اب تحسین بانو کی خوش اخلاقی کا راز کھلا، منفی سوچوں کی بوچھاڑ اس کی ذات کو نشانہ بنانے لگی۔

"ہاں..... بیٹا..... ان لوگوں کے بارے میں غلط مت سوچنا۔ شکیل بھائی اور تحسین بہن نے مجھے پہلے ہی دن اس بارے میں سب کچھ بتایا تھا، اور میں نے ہی ان سے اس ذکر کو دوبارہ نہ چھیڑنے کی استدعا کی، تمہیں پتا ہے جتنے منہ اتنی باتیں، لوگوں کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے، مگر اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا" انصار احمد بہت مطمئن تھے۔ بیٹی کو بھی مطمئن کرنے میں لگ گئے۔

"کیوں..... ابو، آپ نے ہمیں یہ بات کیوں نہیں بتائی؟" مہوش نے حیرانی سے باپ کو دیکھا اور شکوہ کیا۔

"اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد نہ تھا، بس میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری ماں کسی قسم کے واہمے میں پڑیں، ویسے بھی جب مجھے شکیل بھائی نے بتایا کہ سکندر کا برص کا علاج بہت عرصے سے چل رہا ہے، اب یہ نشان صرف انگلیوں تک ہی محدود ہیں، ڈاکٹر نے انہیں یہ بھی بتایا ہے کہ ہوسکتا یہ جلد ہی ختم بھی ہوجائیں تو میرے اندیشے ہوا ہوگئے، پھر یہ بھی تو دیکھو میں نے جب ان کو سحرش کے ماتھے پر موجود کالے نشان کے بارے میں بتایا تو انہوں نے اس بات کو بڑے نارمل انداز میں لیا، دوسرے لوگوں کے مقابلے میں انہوں نے میری بات آسانی سے سن لی" انصار احمد نے پنڈال کی طرف دیکھتے ہوئے صفائی دی، ان کو وہاں بلوایا جانے لگا تھا۔

"اچھا آنٹی کو پہلے ہی خبر تھی اور ہم یوں ہی دن رات سولی پر لٹکتے رہے..... سکندر کے بارے میں امی کو خبر ہے؟" مہ وش نے پوچھا۔

"پتا نہیں، میرا خیال ہے کہ ان کو اس بات کا اندازہ نہیں یا شاید ہو بھی، کیوں کہ جب ہم پہلی بار سکندر سے ملنے گئے تو ان کی نگاہوں نے لڑکے سے زیادہ اس کے گھر بار کو غور سے دیکھا اور خوش ہوگئیں، ویسے بھی سکندر کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ وہ ہمیں پہلی نظر میں بھا گیا، پھر اس کی شرافت اس کا پلس پوائنٹ بن گیا۔ وہ اعتماد سے بولتے ہوئے اسٹیج کی طرف دیکھنے لگے جہاں سکندر کھڑا ہو کر ان کے بڑے بھائی کو سلام کر رہا تھا۔

"ہاں..... یہ تو ہے، واقعی سکندر کی شخصیت ہی ایسی ہے کہ سامنے والا پہلی نظر میں ہی متاثر ہوجاتا ہے" مہ وش نے باپ کی نگاہوں سے دیکھا تو ہر چیز صاف و شفاف ہوگئی، وہ بھی سکندر کو ہی دیکھ رہی تھی جو اس کے تایا سے بڑی خوش اخلاقی سے مل رہا تھا۔

"ویسے بھی بیٹا جب انہوں نے سحرش کو اس کے تاعمر چہرے پر رہ جانے والے داغ کے ساتھ قبول کرلیا تو میں ان کے بیٹے میں عیب نکالنے والا کون ہوتا ہوں؟" انصار احمد نے بردباری سے کہا تو مہ وش بھی قائل ہوگئی۔

"اگر..... آپی نے کوئی اعتراض کیا تو؟" مہ وش نے اپنی فکر کو فوراً ہی زبان دی، تو وہ مسکرا دیے۔

"تمہیں ایسا لگتا ہے کہ وہ اعتراض کرے گی؟ کیا اسے اعتراض کرنا چاہیے؟" ان کے سوال میں ہی جواب چھپا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی تربیت سے بہ خوبی واقف تھے۔ مہ وش نے ان کی بات پر سر ہلایا اور فخر سے اپنے باپ کو دیکھا جو بوڑھے ہو چکے تھے پھر بھی ہمارے لیے جوانوں سے زیادہ مضبوط بنے ہوئے تھے۔

"بیٹا..... ایسا کچھ نہیں ہوگا، میری بچیاں بہت سمجھ دار ہیں، مجھے تو خوشی ہے کہ یہاں رشتہ طے پایا۔ کیوں کہ جیسے تحسین بہن نے میری بچی کی اندرونی خوبصورتی کو اہمیت دی، ایسے ہی میں نے ان کے بیٹے کی شرافت کو فوقیت دی، یوں پلڑا دونوں طرف برابر ہوگیا۔

ویسے بھی زندگی نشانوں کے ساتھ تو آسانی سے گزر سکتی ہے، مگر کالے دل والوں کا ساتھ مل جائے تو اجیرن ہوجاتی ہے، تمہیں تو اس بات کا تجربہ مجھ سے زیادہ ہے" ان کے لہجے میں چھوٹی بیٹی کے دکھ بولنے لگے، مہ وش کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ سمجھتی تھی کہ باپ اس کے حالات سے بے خبر ہیں، اس نے کبھی ان کے سامنے زندگی کی کٹھنائیوں کا شکوہ نہیں کیا، مگر وہ تو سب کچھ جانتے تھے۔ انصار احمد نے بیٹی کو اپنے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

"سحرش نے بھی اسی طرح زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے،، جس کے چہرے نے اسے بار بار رلایا، اب جبکہ اس کی قسمت نے خوشیوں بھری دستک دے ہی دی ہے تو یقیناً وہ بھی پوری طرح سے لطف اندوز ہوگی" انصار احمد نے بات ختم کر کے بیٹی کو شفیق مسکراہٹ سے نوازا اور ہال کے مردانے حصے کی طرف بڑھ گئے، جہاں سے بہت دیر سے ان کے لیے بلاوے آرہے تھے۔

مہ وش بھی ایک عزم کے ساتھ ہال کے زنانے حصے کی طرف چل دی، ابھی اس کو اپنی بڑی بہن سے بہت سی باتیں کرنی تھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انوکھے لوگ

جناب ایڈیٹر سرگزشت ڈائجسٹ
سلام مسنون!
زندگی کی شاہراہ پر ایسے ایسے لوگ ملتے ہیں جو کسی عجوبے سے کم نہیں، خود میری زندگی گواہ ہے۔ مجھے ایک شخص نے بہت زیادہ حیران کیا ہے اور میری زندگی بدل کر رکھ دی ہے۔ میرے حالات پڑھ کر خود آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔

خیال صدیقی
(حیدر آباد)

اس نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

وہ دوست تھا میرا۔ میری اس کی دوستی زیادہ پرانی نہیں تھی۔ ملاقات کو صرف دو سال ہوئے تھے لیکن اس دوران ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔

وہ ایک تیز بارش والی شام تھی جب میں نے اسے ایک گاڑی کے پاس کھڑا ہوا دیکھ لیا۔ وہ بری طرح بھیگ رہا تھا۔ میں بھی اس وقت اپنی گاڑی میں تھا۔

میں نے ایک شریف اور معقول قسم کے نوجوان کو جب اس طرح بھیگتے ہوئے دیکھا تو اپنی گاڑی اس کے پاس روک لی۔ ''کہاں جانا ہے آپ کو۔'' میں نے پوچھا۔

''جناب' بہادر آباد۔'' اس نے بتایا۔

بہادر آباد میرے راستے ہی میں آتا تھا۔ اسی لیے میں نے آفر کی۔ ''چلیں' میرے ساتھ بیٹھ جائیں۔ میں آپ کو بہادر آباد ڈراپ کر دوں گا۔''

''لیکن میں اپنی گاڑی کا کیا کروں۔'' اس نے کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف بے بسی سے دیکھا۔

''اوہ' تو یہ آپ کی گاڑی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' اس کم بخت کو بھی اسی جگہ خراب ہونا تھا۔'' اس نے کہا۔

''اس وقت تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ بارش رک جائے تو اسے ٹوکرا کے لے جایئے گا۔ آپ بیٹھ جائیں۔''

وہ میرا شکریہ ادا کر کے میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے اس کا نام پوچھا۔ ویسے ہی وہ باتونی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں اپنے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔

خرم نام تھا اس کا۔ ایک بہت اچھی فرم میں منیجر کے عہدے پر کام کر رہا تھا۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اپنا مکان تھا۔ شادی کو ابھی صرف دو سال ہوئے تھے۔ اولاد کوئی نہیں تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک بے ضرر سیدھا سادا سا نوجوان ہے۔

''اور جناب آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''بھئی' میرا نام خیال صدیقی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''خیال صدیقی۔'' وہ چونک اٹھا۔ ''واہ! بہت خوبصورت نام ہے آپ کا۔ خیال، نہ جانے کس کے ذہن میں اتنا خوبصورت خیال آیا ہوگا کہ آپ کا ایسا نام رکھ دیا۔''

''یہ خیال میرے والد کے ذہن میں آیا تھا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس دوران ہم بہادر آباد پہنچ چکے تھے۔ اس نے ایک یک منزلہ مکان کے سامنے گاڑی رکوا دی۔ ''بس جناب' یہی ہے میرا غریب خانہ۔'' اس نے کہا۔ ''اب آپ گاڑی سے اتر کر میرے ساتھ تشریف لے آئیں۔''

''وہ کیوں۔''

''وہ اس لیے کہ میں آپ کو ایک کپ چائے کے لیے اغوا کر رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ارے نہیں بھائی' پھر کبھی سہی۔'' میں جلدی سے بولا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اگر آپ نہیں آئے تو سحرش میری جان کو آ جائے گی۔ آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ سحرش میری ہمسفر کا نام ہے۔''

''ہاں بھئی' میں سمجھ گیا ہوں۔''

''بس تو آ جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''ورنہ میں سحرش کو یہیں بلا لوں گا اور آپ اس سے نمٹتے رہیے گا۔''

اس کے بے پناہ خلوص نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کی بات مان لوں ورنہ کون اتنا اصرار کیا کرتا ہے۔ وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اندر لے آیا تھا۔

اس کا ڈرائنگ روم بھی بہت خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ اس نے سحرش سحرش کہہ کر آواز دی اور ایک خوبصورت لڑکی ہمارے سامنے آ گئی۔

میں تو اسے لڑکی ہی کہوں گا۔ وہ کسی طرح بھی شادی شدہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ خرم نے اس سے میرا تعارف کرواتے ہوئے اپنے انداز میں کہا۔ ''سحرش ان سے ملو۔ یہ ہیں وہ شخص جو آج کے دور میں بھی دوسروں کی مدد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔''

''یہ آپ کے شوہر بہت بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے صرف اتنا کیا ہے کہ ان کو لفٹ دے کر یہاں تک لے آیا ہوں۔ کیونکہ آپ کی گاڑی راستے میں خراب ہو گئی ہے۔''

''چلیں' یہ بھی کوئی کم نہیں ہے۔'' اس کی بیوی نے کہا۔ ''اب آپ تشریف رکھیں۔ میں ابھی چائے لے کر آتی ہوں۔''

وہ دونوں ہی مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ بہت زندہ دل اور خوش گوار زندگی گزارنے والا جوڑا تھا۔ ایسے محبت کرنے والے میاں بیوی ذرا کم ہی ہوا کرتے ہیں۔

ان دونوں سے میری دوستی بڑھتی چلی گئی۔

میں نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ لیکن میرا اپارٹمنٹ بہت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا کرتا تھا۔ میں نے اپنے طور پر بہت Maintain کر کے رکھا تھا۔

ہفتے میں کم از کم ایک شام تو ہم ساتھ گزارہ کرتے۔ کبھی وہ میرے پاس آ جاتے اور کبھی میں ان کے پاس چلا جاتا۔ ان دونوں کو دیکھ کر خوشی ہوا کرتی۔ اور یہ دعا نکلتی کہ خدا ان کی محبت کو اسی طرح سلامت رکھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک دن خرم نے مجھ سے کہا۔ ”یار خیال صاحب، آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے۔“

”ہاں یار، اب واقعی سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں۔ پہلے میں سمجھا کرتا تھا کہ شادی ایک جھنجٹ ہے۔ لیکن تم دونوں سے مل کر میرا خیال بدل گیا ہے۔“

”میں کروادوں آپ کا کوئی رشتہ۔“ سحرش نے کہا۔

”ضرور کرادیں لیکن لڑکی آپ جیسی ہونی چاہیے۔“

”پھر تو بہت مشکل ہے۔“ خرم نے برا سا منہ بنالیا۔ ”پوری دنیا میں ایک پیس تھا۔ وہ میرے پاس آگئی ہے۔“

میں ہنس پڑا۔

میں نے اب واقعی سنجیدگی سے شادی کے لیے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ شادی تو میں پہلے ہی کر چکا ہوتا لیکن ارم کی زندگی نے وفا نہیں کی۔

اس کی موت کے بعد میرا دل ٹوٹ گیا تھا۔ وہ میری محبت تھی۔ میں نے اس کو حاصل کرنے کے لیے بہت جتن کیے تھے۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔

ہم نے بہت خوبصورت لمحات ساتھ گزارے تھے۔ ایک دوسرے کے خوابوں سے شیئر کرتے ہوئے۔ ایک دوسرے کو اپنا بنانے کی قسمیں کھاتے ہوئے۔

زندگی اس کے ساتھ بہت خوبصورت تھی۔ اور ہمیں یقین تھا کہ ایک ہوجانے کے بعد یہ اور بھی خوبصورت ہوجائے گی۔ لیکن نہ جانے خدا کی کیا مصلحت تھی کہ اس کی موت کے بعد وہ ساری کہانی ہی ختم ہوگئی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہمارا یہ سفر اتنی جلدی ختم ہوجائے گا۔ ارم کی موت کے بعد میں تنہا ہو کر رہ گیا۔ اندر سے ایسی ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی کہ بیان سے باہر ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مسکرانا تک بھول گیا تھا اور ان دونوں میاں بیوی کے آنے کے بعد زندگی میں ایک خوش گوار قسم کی تبدیلی آنے لگی تھی۔

ہم دل کھول کر ہنسا کرتے۔ تفریح کرتے۔ عام طور پر ہم ڈنر کے لیے چلے جاتے تھے۔ ان دونوں سے تعلق ایسا ہوگیا تھا جیسے ہم ایک ہی خاندان اور ایک ہی گھر کے ہوں۔

ان سب کے باوجود کبھی کبھی مجھے کچھ عجیب سا احساس ہونے لگتا تھا۔ ممکن تھا کہ یہ میرا وہم ہو۔

ایسا لگتا جیسے سحرش اور خرم باتیں کرتے کرتے، ہنستے ہنستے کہیں گم ہوجاتے۔ اس وقت ان کے لہجوں کا کھوکھلا پن صاف محسوس ہونے لگتا تھا۔ جیسے کوئی دکھ انہیں اندر ہی اندر پریشان کر رہا ہو۔

ایک شام جب میں ان کے گھر گیا تو معمول کے خلاف بہت گہری خاموشی تھی۔ جیسے ان کے درمیان کوئی بات ہوئی ہو۔ سحرش کی آنکھیں اس طرح سوجی ہوئی اور سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ دیر تک روتی رہی ہو۔ کچھ ایسا ہی حال خرم کا بھی ہو رہا تھا۔

میں خاموشی سے جا کر بیٹھ گیا۔ ان دونوں کا موڈ دیکھ کر کوئی مذاق وغیرہ کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ سحرش نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”خیال صاحب، مجھے کچھ گھٹن سی ہو رہی ہے۔ آؤٹنگ کو دل چاہ رہا ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے۔“

”ہاں، ہاں کیوں نہیں۔“ میں جلدی سے بولا۔ پھر خرم سے مخاطب ہوا۔ ”چلیں جناب تیار ہو جائیں۔“

”نہیں خیال صاحب، صرف میں اور آپ۔“ سحرش نے کہا۔ ”خرم کے ساتھ جانا ہوتا تو کب کی چلی گئی ہوتی۔“

یہ ایک نئی بات تھی۔

میں نے پریشان ہو کر دیکھا۔ اس نے اس انداز سے اپنی گردن ہلادی جیسے وہ یہ چاہتا ہو کہ میں اس کے ساتھ چلا جاؤں۔ ”بتائیں، چل رہے ہیں نا۔“ سحرش نے پوچھا۔

”جی ہاں، چل رہا ہوں۔“

خرم نے کچھ نہیں کہا میں سمجھ گیا کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بہت ہی سنجیدہ صورتِ حال ہوگئی ہے۔ بہر حال ہم سی ویو کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ یہ ایک پُرسکون ہوٹل تھا اور ہم بہ آسانی باتیں کر سکتے تھے۔

مجھے یہ اندازہ تھا کہ جب شوہر اور بیوی کے درمیان اس قسم کا کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو کس قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔ یہی شوہر کی شکایات۔ وہ دیر سے گھر آتے ہیں۔ میری طرف توجہ نہیں دیتے۔ شاید کسی اور کو پسند کرنے لگے ہیں۔ بہت غصہ کرنے لگے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

اسی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ سحرش سے بھی مجھے یہی توقع تھی۔

ہم بہت دیر تک خاموش رہے۔ میں اس کی گفتگو شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ بالآخر اس نے بات شروع کی۔ ”خیال صاحب، کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ میں آپ کو کس لیے لے کر آئی ہوں۔“

”نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ آپ کے دل میں کیا ہے۔“

”خیال صاحب، میرے لیے زندگی بہت دشوار ہوتی جا رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خدشہ درست ثابت ہونے لگا تھا۔ اس کو خرم ہی سے شکایت تھی۔ اسی لیے وہ زندگی کی دشواری کا شکوہ کر رہی تھی۔

”نہیں تو۔“ میں نے کہا۔ ”یہ آپ کی غلط فہمی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ ماشاء اللہ آپ دونوں کی زندگی بہت خوش گوار ہے۔ ایسے محبت کرنے والے جوڑے میں نے بہت کم دیکھے ہوں گے۔“

”یہ سب ظاہری باتیں ہیں خیال صاحب۔“ اس نے کہا۔ ”اندر کی کہانی کچھ اور ہے۔“

”اندر کی جو بھی کہانی ہو لیکن یہ میں جانتا ہوں جس قسم کی بھی بات ہو وہ غلط فہمی کا نتیجہ ہوسکتی ہے ورنہ آپ دونوں کی زندگی دوسروں کے لیے قابلِ رشک ہے۔“

”یہ تو آپ کہہ رہے ہیں نا۔“ اس نے کہا۔ ”کاش، میں آپ کو کھل کر بتا سکتی۔ بہر حال چھوڑیں اس بات کو، آپ کے لیے خبر یہ ہے کہ میں نے آپ کے لیے ایک رشتہ تلاش کر لیا ہے۔“

”واہ! یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کون ہے وہ کیسی ہے؟“

”آپ نے کہا تھا نا کہ میں اپنی جیسی ڈھونڈ کر لاؤں۔ تو میں نے اپنی ہی جیسی تلاش کر لی ہے۔“ وہ اب مسکرا رہی تھی۔

کچھ دیر پہلے اس کے چہرے پر جو دکھ کے بادل تھے وہ غائب ہو چکے تھے۔

”تو بتائیں نا، کہاں ہے وہ؟ کم از کم اس سے ملوا ہی دیں۔“

”ہاں، آپ بہت جلد اس سے مل بھی لیں گے۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ خرم انتظار کر رہا ہوگا۔“

”خرم سے آپ کا کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”جھگڑا۔“ اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ ”میرا تو اس سے کوئی جھگڑا نہیں ہوا، یہ آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا۔“

”پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا تھا جیسے آپ روتی رہی ہوں۔“

”ہاں میں روتی تو رہی تھی۔ لیکن وہ کوئی اور بات تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم دونوں کے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا ہے۔“ سحرش نے جو بھی کہا وہ میری توقع کے برعکس تھا۔ تو پھر میں نے ایسا کیوں محسوس کیا۔ بہر حال ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے واپس آگئے۔

خرم گھر پر ہی موجود تھا اپنے اسی انداز اور اسی ہنسی کے ساتھ جو اس کی فطرت کا حصہ بن چکی تھی۔ ”خیال صاحب، میں تو یہ ڈر رہا تھا کہ آپ کہیں میری بیوی کو لے کر غائب نہ ہوگئے ہوں۔“

”نہیں بھائی۔“ میں نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ ”تمہاری مسز صحیح سلامت واپس آگئی ہیں۔“

اس پر سحرش بھی ہنس پڑی۔ اس رات بہت دیر تک ہم گپ شپ کرتے رہے جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو سب کچھ پہلے ہی کی طرح تھا۔

اس طرح اور کئی دن گزر گئے۔

اصل کہانی اس دن شروع ہوئی جب خرم میرے پاس آیا۔ وہ اکیلا ہی آیا تھا۔ ایسا اتفاق بہت کم ہوتا تھا کہ وہ میرے پاس اکیلے آیا ہو۔ عام طور پر سحرش اس کے ساتھ ہی ہوا کرتی تھی۔

وہ اس شام بہت اداس اور پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ”خیال صاحب، اگر آپ کے پاس وقت ہو تو میرے ساتھ چلیں۔“ اس نے کہا۔

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”کہیں بھی۔“ اس نے کہا۔

میں کھٹک گیا۔ اس کی وہی کیفیت ہو رہی تھی جو اس دن سحرش کی تھی۔ وہی اداسی، وہی پریشانی۔ میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ میں سمجھ گیا کہ اس وقت اسے میری ضرورت ہے۔

ہم پھر اسی ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے جہاں میں سحرش کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی۔ اس کے ہونٹ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے وہ بہت کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن سمجھ میں نہیں آرہا ہو۔

بالآخر اس نے جو بات کی، وہ اتنی حیرت انگیز تھی کہ میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”خیال صاحب میں سحرش کو طلاق دینا چاہتا ہوں۔“

”کیا!“ میں جیسے اچھل ہی پڑا تھا۔ ”خرم، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔“ اس کا لہجہ بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

نڈھال ہو رہا تھا۔ ”میں اسے طلاق دے رہا ہوں۔“
”لیکن کیوں؟ کیا وہ ایک اچھی بیوی نہیں ہے۔“
”وہ بہت ہی اچھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ اس دور میں ایسی عورتیں کم ہی ہوں گی۔ اس نے اتنا میرا خیال رکھا ہے، اتنا میرا ساتھ دیا ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔“
”اس کے باوجود اتنی اچھی بیوی کو طلاق دے رہے ہو۔“
”ہاں۔“ اس کی آواز اور بھی بکھری ہوئی تھی۔ ”کیونکہ وہ اتنی اچھی ہے کہ میں اسے مزید دکھ نہیں دے سکتا۔ یہ میں اس کی خوشی کی خاطر کروں گا۔“
”میں نے تو آج تک نہیں سنا کہ کسی شوہر نے اپنی بیوی کو اس لیے طلاق دی ہو کہ وہ اپنی بیوی کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔“
”ہاں، ایسا ہوتا تو نہیں ہے لیکن میرے کیس میں ایسا ہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اس کے ساتھ ہی میں آپ سے ایک درخواست بھی کروں گا۔“
”کیسی درخواست؟“ میری حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔
”میں یہ چاہوں گا کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔“ اس نے کہا۔
”کیا؟“ اس بار تو میں اچھل ہی پڑا تھا۔ ”خرم صاحب کیا آپ کو احساس ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“
”ہاں، پوری طرح احساس ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں کہ آپ اس کا خیال رکھیں گے۔ اس کو کوئی دکھ نہیں ہونے دیں گے۔ کیونکہ آپ اس کے مزاج سے بھی واقف ہو چکے ہیں۔ وہ بہت نازک اور پیار کرنے والی لڑکی ہے۔“
”خدا کے بندے، جب تم یہ سب مان رہے ہو تو پھر کیوں اسے طلاق دے رہے ہو؟“
”اس لیے کہ میں اسے خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”پھر وہی بات۔ دنیا کی ایسی کون سی طلاق ہوگی جو خوشی کے لیے دی جائے۔“
”خیال صاحب، اصل بات یہ ہے کہ میں کسی بھی طور اس کے قابل نہیں ہوں۔“ اس نے گردن جھکاتے ہوئے بتایا۔
اس کی یہ بات سن کر میں تو جیسے سکتے میں رہ گیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اتنا خوبصورت ہینڈسم نوجوان اور اس کے ساتھ اس قسم کی پرابلم ہو۔
”آپ کو شاید میرا یقین نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔
”خرم، میں تو یہ سن کر پاگل ہو گیا ہوں۔“ میں اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”دنیا کا کوئی بھی شخص اپنے بارے میں ایسی بات نہیں کر سکتا۔ اگر ایسا کوئی مسئلہ ہو بھی تو اس کو چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے اور تم بے دھڑک ایسی بات کر رہے ہو۔“
”میں اس لیے کر رہا ہوں کہ میں اس سے بے پناہ محبت کرتا ہوں۔“ خرم نے کہا۔ ”میں اس کو وہ خوشیاں دینا چاہتا ہوں جن سے وہ آج تک محروم رہی ہے۔ اگرچہ اس نے میری خدمت اور مجھ سے محبت میں کبھی کمی نہیں کی۔ اس کے باوجود میں جانتا ہوں کہ وہ اندر ہی اندر کتنی گھلتی جا رہی ہے۔ موم کی طرح پگھل رہی ہے۔ خیال صاحب، اس کے اندر جو طوفان پرورش پا رہا ہے وہ غیر حقیقی نہیں ہے بلکہ قانونِ فطرت کے عین مطابق ہے۔ کیا میں آپ سے غلط کہہ رہا ہوں۔“
”خرم، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن کیا تم جو کہہ رہے ہو۔ اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔“ میں نے پوچھا۔
”نہیں خیال صاحب۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ میں نے علاج میں کوئی کسر اٹھا رکھی ہوگی! جی نہیں میں اس کے لیے یورپ تک جا چکا ہوں۔ کہاں کہاں علاج نہیں کروایا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“
”عجیب بات ہے۔ یہ کمزوری کب سے ہے۔“
”شروع ہی سے۔“ اس نے بتایا۔ ”برسوں ہو گئے۔“
”کیا شادی سے پہلے سحرش کو معلوم نہیں تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”معلوم تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”ہم دونوں ایک ساتھ یونیورسٹی میں تھے۔ ہمارے درمیان پہلے دوستی تھی۔ پھر یہ دوستی محبت میں بدل گئی۔ میں نے یہ سوچا تھا کہ دوستی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا لیکن اس نے ایک دن شادی کی خواہش ظاہر کر دی۔ میں تو بوکھلا کر رہ گیا۔ مجھے تو اپنی کمزوری معلوم تھی۔ میں اس سے شادی کیسے کر سکتا تھا۔ میں اسے مختلف بہانوں سے ٹالتا رہا۔ لیکن جب ایک دن اس نے بے پناہ ضد کرنی شروع کر دی تو مجبوراً مجھے بتانا پڑا کہ میرے ساتھ کیا پرابلم ہے۔“
”اوہ۔۔!“ میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھتا اور

سوچتا رہا کہ یہ شخص کتنے جبر سے کام لے کر اپنی یہ کہانی مجھے سنا رہا ہوگا۔ اس وقت اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کیا سوچ رہا ہوگا۔ اس کو کتنی شرم آ رہی ہوگی۔
”خیال صاحب، اس نے جب بہت زیادہ ضد کی تو میں نے مجبور ہو کر اپنی یہ کمزوری اسے بتا دی۔ اس وقت میرا دل ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ بہرحال میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔“
”میرا خیال تھا کہ وہ سب سن کر بھڑک جائے گی۔ مجھ سے دور ہو جائے گی۔ اس کے برعکس وہ اور بھی زیادہ قریب آ گئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”خرم، مجھے صرف تمہارے ساتھ کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہیے۔“ میں اسے سمجھاتا رہا کہ ایسا مت کرو۔ تم کیوں میری خاطر اپنے فطری جذبوں کو کچل رہی ہو۔ ایک نہ ایک دن تمہیں اس کمی کا احساس ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ لیکن اس کی ضد برقرار رہی تھی۔“
”پھر مجھے اس سے شادی کرنی ہی پڑی۔ دنیا والوں کی نگاہ میں یہ ایک مکمل شادی تھی۔ ہم نے ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کی اور آج بھی ہماری محبت کچھ کم نہیں ہوئی ہے۔ ہم پہلے دن کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس نے کبھی مجھ سے کوئی شکایت نہیں کی۔“
”خدا کے بندے! جب اس بے چاری نے کبھی کوئی شکایت نہیں کی تو پھر تم اسے اپنی زندگی سے کیوں الگ کر دینا چاہتے ہو۔“
”اس لیے کہ اب مجھ سے اس کی محرومیاں نہیں دیکھی جاتیں۔“ اس نے کہا۔ ”سحرش نے کبھی مجھ سے کچھ نہیں کہا اور شاید وہ اسی طرح زندگی بھی گزار لے گی۔ لیکن میں اسے راتوں کو بے چین دیکھنے لگا ہوں۔ آہیں بھرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ وہ بیٹھی بیٹھی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی ہے۔ اور یہ سب علامات کس وجہ سے ہیں، یہی نا کہ اس کی فطرت اسے پکار رہی ہے۔ اس کے اندر کی عورت بے دار ہو گئی ہے۔“
خرم بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے اس کے پاس بولنے کے لیے رہ کیا گیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے راز میں مجھے شامل کر لیا تھا۔
کیسی حسرت تھی۔ کیسی اداسی تھی اس کے لہجے میں۔ ورنہ ایسا کون کہہ سکتا ہے۔
”خیال بھائی، میں سحرش کی حفاظت چاہتا ہوں۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اسے ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ اسے یہ خوشیاں آپ دے دیں۔ اس کا ہاتھ تھام لیں۔ اپنا لیں اس کو۔“
ایک بار پھر ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ یہ اور بھی تکلیف دہ خاموشی تھی۔
”خرم، تم جو کچھ کہہ رہے ہو، وہ بہت بڑی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”پھر یہ کیا ضروری ہے کہ سحرش تیار ہی ہو جائے۔“
”اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس کے علاوہ آپ سے یہ درخواست کرنے میں میری ایک بہت بڑی غرض بھی پوشیدہ ہے۔“
”وہ کیا؟“
”بہت ممکن ہے کہ اگر وہ کسی اور کے پاس چلی جائے تو پھر میرا اور اس کا تعلق ہی ختم ہو جائے۔ ہم ایک دوسرے سے مل بھی نہ سکیں۔ سحرش آپ کے ساتھ رہی تو کم از کم ہفتے میں ایک دو بار میں اس سے ملاقات تو کر سکوں گا۔ اس لیے کہ آپ ساری کہانی سے واقف ہوں گے۔“
عجیب کہانی تھی اس کی۔ عجیب داستان تھی۔ سب کچھ بہت مختلف تھا۔ ایسا کہاں ہوتا ہوگا۔ لیکن ہو رہا تھا۔

کیمائس (Chamois)

ہرن کی طرح کا ایک جانور۔ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا میں پایا جاتا ہے۔ قد میں بکری کے برابر لیکن پھرتیلا اس قدر کہ مشکل سے قابو میں آتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں میں رہتا ہے اور چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں کو آسانی سے پھلانگ جاتا ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے اور اس کی کھال سے کیمائس چمڑا بنتا ہے۔ جس سے دھاتی چیزوں کو پالش کر کے چمکایا جاتا ہے۔ نر اور مادہ اکتوبر اور نومبر میں اختلاط کرتے ہیں اور مئی اور جون میں بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک دن کے بعد ہی بچے اپنی ماں کے پیچھے دوڑنے لگتے ہیں۔ اس عجیب جانور کی عمر طبعی 20، 25 برس ہوتی ہے چونکہ اس کے گوشت اور چمڑے کی مانگ زیادہ ہے۔ اس لیے اس کے شکار پر پابندیاں لگائی گئی ہیں تاکہ کہیں معدوم نہ ہو جائے۔ شمالی ایران اور روس کا کیمائس عمدہ قسم کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: حسین فرجاد، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے سوچنے کے لیے ایک دو دن کا وقت مانگا۔ میری پوزیشن اس وقت بہت کمزور تھی۔ میں اس سے یہ کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہاں بھائی میں تیار ہوں۔

دو چار دنوں کے بعد جب خرم نے جواب مانگا تو میں نے اس سے کہا۔ ''میرے دوست! اس سے پہلے کہ تم یہ انتہائی قدم اٹھالو میں سحرش سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔''

''اعتراض کیسا، میں تو خود یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس سے مل کر اپنا اطمینان کرلیں۔''

دو دنوں کے بعد ہم پھر سی ویو کے اس پُرسکون ریستوران میں بیٹھے تھے۔ یعنی میں اور سحرش۔ وہ بہت اداس اور مضطرب ہورہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اپنی گفتگو شروع کروں۔ بالآخر میں نے اس سے کہا۔ ''خرم نے پچھلے دنوں مجھ سے کچھ باتیں کی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا ہوگا۔''

''ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے آپ سے کھل کر گفتگو کرلی ہے۔'' سحرش دھیرے سے بولی۔ ''خرم بہت ہی اچھے ہیں۔ اتنے اچھے ہیں کہ میں بیان نہیں کرسکتی۔ میرے لیے وہ پیار کا سمندر ہیں۔ اور یہ ان کے پیار کی انتہا ہے کہ وہ صرف میری خوشی کے لیے مجھ سے الگ ہونے کو تیار ہیں۔''

''یہ پیار کی سب سے انوکھی داستان ہے۔'' میں نے کہا۔ ''محبت کرنے والے ایک لمحے کے لیے بھی الگ ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ اور یہاں حال یہ ہے کہ.....''

میں خاموش رہ گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ کچھ بولنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ کیسی محبت تھی۔

بہرحال مختصر یہ کہ وہی سب ہوا جو خرم نے کہا تھا۔ اس نے سحرش کو طلاق دے دی اور عدت گزارنے کے بعد میرے ساتھ اس کا نکاح ہوگیا۔

اس دوران کیا کیا ہوا۔ کیسے کیسے طوفان کھڑے ہوئے۔ کتنی دفعہ ارادے تبدیل ہوئے۔ کتنی بار ہم ایک دوسرے سے گھنٹوں مباحثہ کرتے رہے یہ ایک الگ داستان ہے۔

لیکن ہوا وہی جو ہونا تھا۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ سحرش جیسی لڑکی میری بیوی بن گئی تھی۔ میں اسے لڑکی ہی کہوں گا کیونکہ وہ لڑکی ہی تھی۔

شادی کے بعد خرم ہفتے میں ایک دو بار میرے گھر آنے لگا تھا۔ اس موقع پر میں ان دونوں کو باتیں کرنے کا موقع دینے کے لیے گھر سے باہر چلا جاتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ اگر سحرش اس کے ساتھ بھی ہو تو کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ ویسے ان دونوں کو دیکھ کر خود میرے دل کی کیفیت بہت عجیب ہوجاتی تھی۔

یہ دونوں میاں بیوی تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزارنے والے۔ ان کے شب و روز ایک ہی جیسے تھے۔

ایک جیسے خواب دیکھنے والے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی۔ لیکن اب دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے غیر ہوگئے تھے۔ اور کمال یہ تھا کہ غیر ہوجانے کے باوجود ان کی محبت اپنی جگہ برقرار تھی۔ ہوسکتا تھا کہ میرے چلے جانے کے بعد دونوں جی بھر کر روتے بھی ہوں۔

نہ جانے قدرت کی کیا مصلحت تھی کہ اس نے محبت کی ایسی قسم میں ان کو حصہ دیا جو شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔

یہ سلسلہ کئی مہینوں چلتا رہا۔ پھر ایک دن خرم غائب ہوگیا۔ وہ کہیں چلا گیا تھا۔ ہم دونوں نے اسے تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی۔ لیکن کوئی پتا نہیں چلا۔

اس نے جاب بھی چھوڑ دی تھی۔ اپنا مکان بھی چھوڑ دیا تھا۔ پھر بہت دنوں کے بعد کسی اور شہر سے میرے لیے اس کا خط آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ''خیال بھائی! میں جانتا ہوں کہ آپ دونوں میرے اس طرح غائب ہوجانے پر بہت پریشان ہوں گے۔ لیکن ہمارے لیے یہی بہتر تھا کہ میں پوری طرح راستے سے ہٹ جاؤں۔ ورنہ ہم سب ڈسٹرب رہتے۔ میں بھی، آپ بھی اور خود سحرش بھی۔ میرے ہٹ جانے کے بعد وہ اب پوری طرح آپ کی طرف توجہ دے سکے گی۔''

مجھے امید ہے کہ آپ اس کا بہت خیال رکھیں گے۔ اور وہ بھی آپ کے ساتھ خوش رہ سکے گی۔ کیونکہ وہ خوشیاں میں اسے نہیں دے سکا ہوں جو خوشیاں آپ سے مل رہی ہوں گی۔''

''مجھے تلاش مت کیجیے گا۔ میں یہ ملک چھوڑ کر بہت دور جارہا ہوں، میرا ڈھیر سا پیار سحرش کے لیے۔''

یہ خرم سے آخری رابطہ تھا۔

اس کے بعد اس کا پتا نہیں چلا۔ نہ جانے وہ بدنصیب محبت کرنے والا کہاں ہوگا۔ اب ہمارے تین بچے ہیں اور میں سحرش کے ساتھ ایک اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔

دل کی دنیا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
انسان کی کایا پلٹ کب اور کس وقت ہوجائے کوئی نہیں جانتا۔ میرا دوست بادشاہ کراچی کا نامور جعلساز تھا مگر آج اسے دیکھ کر کوئی یقین ہی نہیں کرسکتا کہ کبھی وہ اس خصلت کا مالک تھا۔ اس میں کیسے یہ تبدیلی آئی آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ناصر عزیز
(کراچی)

ہوسکتا ہے کہ یہ کہانی عقیدتوں کی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا ایک پہلو یہ ہو کہ عقیدتیں ہمیں وہ سب کچھ دکھا دیتی ہیں جو ہمارے تصور میں ہوں۔ ممکن ہے کہ ایسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

لیکن میں نے جو کچھ دیکھا وہ بیان کررہا ہوں اور اس کے گواہ بھی موجود ہیں۔

یہ کہانی ہے ایک ایسے شخص کی جو بہت دھوکے باز قسم کا انسان تھا۔ دوسرے الفاظ میں آپ اسے چیٹر بھی کہہ سکتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں یعنی وہ ایک بڑا فراڈیا تھا۔

وہ بہت سائنسی انداز میں دھوکے دیا کرتا۔ انتہائی چرب زبان۔ اسی لیے لوگ بہت جلد اس کی باتوں میں آجایا کرتے۔ بادشاہ نام تھا اس کا۔

ہاتھ پاؤں کا صحت مند، یار باش قسم کا۔ اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ دل کھول کر خرچ کیا کرتا۔ اسی لیے محلے کے نوجوان اس کے آس پاس ہوا کرتے۔

جب وہ دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھتا تو اس کی فیاضی دیکھنے والی ہوا کرتی۔ چائے، بسکٹ، کیک۔ اور وہ کبھی کسی اور کو بل ادا کرنے نہیں دیتا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ محلے کے ضرورت مندوں کی مدد بھی خاموشی سے کر دیا کرتا تھا۔ دوستوں میں بھی اگر کسی کو مدد کی ضرورت ہوتی تو وہ اس کے لیے حاضر ہو جاتا۔

ہم سب اس کے اس جذبے کو سراہا کرتے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بادشاہ کا ذریعۂ معاش کیا ہے۔ وہ کیا کرتا ہے۔

جب ہم اس سے دریافت کرتے، تو وہ مسکرا کر پوچھتا۔ ”اچھا یہ بتاؤ“ اس دنیا میں بے وقوف زیادہ ہیں یا عقلمند۔“

”ظاہر ہے بے وقوفوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔“

”تو بس ہم عقل مند ان کی بے وقوفی سے فائدہ اٹھا کر اپنا مطلب نکال لیتے ہیں۔ راوی ہمارے لیے عیش ہی عیش لکھتا ہے۔“

”صاف صاف بتاؤ یار، کرتے کیا ہو۔“

”صاف بتا رہا ہوں، ہیرا پھیری۔“

وہ یہ کہتا تو تھا لیکن ہم میں سے کسی نے اسے ہیرا پھیری کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ محلے کے دوستوں کا لحاظ کر جاتا ہو۔ یا ہمارے پاس ہوتا ہی کیا تھا جو وہ ہم سے ہیرا پھیری کرتا۔

میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ وہ جب اپنی ہیرا پھیری کی باتیں کرتا ہے، وہ یوں ہی ڈینگیں مارنے کے لیے ہے۔ لیکن ایک دن مجھے اس کے فراڈیے ہونے کا ثبوت مل گیا۔

ہمارے علاقے سے بہت فاصلے پر ایک ہوٹل تھا۔ میں چائے پینے اس ہوٹل میں داخل ہوا تھا۔ وہاں میں نے بادشاہ کو دیکھا۔ وہ ایک میز کے پاس بیٹھا ہوا تھا.... ہوٹل کا منیجر یا کوئی اور بندہ اس کے پاس کھڑا تھا۔

جب بادشاہ نے مجھے دیکھا تو جلدی جلدی ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں جب اس کے پاس پہنچا تو اس نے سنسنی خیز انداز میں آنکھ ماردی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔ ”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ تمہارے ہوٹل کو بند ہونا پڑے گا۔ میں ایک بار پہلے بھی وارننگ دے چکا ہوں۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس ہوٹل اور کس وارننگ کی بات کر رہا تھا۔ وہ بولتا چلا جا رہا تھا۔ ”اس بار میں نے اگر شکایت کر دی تو تمہارا ہوٹل ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔ تماشا بنا رکھا ہے تم لوگوں نے۔“ پھر اس نے ہوٹل والے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اب آپ جائیں اور رسید بک لے کر آئیں۔“

ہوٹل والا کچھ کہنے کی کوشش میں دبک کر رہ گیا۔ پھر وہ تیزی سے کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ ”اس کے جانے کے بعد میں نے بادشاہ سے پوچھا۔ ”یار، یہ کیا چکر ہے۔ تم کیا کہہ رہے تھے۔“

”یار، اب میری لاج رکھنا۔“ اس نے کہا۔ ”میں نے یہاں خود کو فوڈ انسپکٹر ظاہر کیا ہے اور یہ سمجھو کہ یہاں چھاپا ڈالنے آیا ہوں۔“

”لیکن تم فوڈ انسپکٹر کب سے ہو گئے۔“

”یار، سمجھا کرو نا۔“ اس نے میرا ہاتھ دبا دیا۔ ”روٹی تو کسی طور کما کھانے دو، اور تم کو بھی ڈانٹ ڈپٹ اسی لیے کر رہا ہوں کہ تمہارا بھی ایک ہوٹل ہے اور میں اسے بند کروا رہا ہوں، سمجھے۔“

”بادشاہ، یہ تو تم بہت خطرے والا گیم کھیل رہے ہو۔“

”میری جان اپنا کام ہی یہی ہے۔“ اس نے پھر اپنی آنکھ دبا دی۔

اس دوران وہ ہوٹل والا ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔ ”جناب، صرف دو منٹ کے لیے میری بات سن لیں۔ اس کے بعد جو کارروائی چاہے آپ کر سکتے ہیں۔“

”اچھا چلو بتاؤ، کیا کہنا چاہتے ہو۔“

”آپ ذرا میرے ساتھ آئیں، پلیز۔“

بادشاہ ہوٹل والے کے ساتھ ایک طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ وہ ہوٹل والا بھی اس کے ساتھ ہی چل رہا

تھا۔ ”جناب، آپ یقین کریں، ہم آئندہ سے ہر طرح خیال رکھیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ بادشاہ غرایا۔ ”اس بار موقع دے رہا ہوں۔ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔“ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ”آپ ذرا میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو اس وقت آفس لے جانا ہے۔“

ہم باہر آ گئے۔ کچھ دور پیدل چلنے کے بعد بادشاہ نے ایک ٹیکسی کر لی۔ لیکن گھر کے بجائے اس نے کہیں اور کے لیے کہا تھا۔ میں نے پوچھا تو اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ ”یار، پہلے کسی اچھے ہوٹل میں چل کر کچھ کھائیں گے۔ اس کے بعد گھر ہی تو جانا ہے۔“

ہوٹل میں بیٹھ کر میں پھٹ پڑا۔ ”بادشاہ، یہ سب کیا چکر تھا۔“

”یار، یہ ہوٹل والے سالے ملاوٹ کرتے ہیں۔ اپنے گاہکوں کو دو نمبر کی چیزیں کھلاتے ہیں۔“

”لیکن تمہارا کیا تعلق۔“

”میرا تعلق یہ ہے کہ میں ان سے دو ہزار روپے لے آیا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”رشوت کے طور پر۔“

”لیکن تم فوڈ انسپکٹر کہاں ہو۔“ میں نے پوچھا۔

”یہی تو فنکاری ہے پیارے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنا تو کام ہی اسی طرح چلتا ہے۔ میں نے بتایا تھا نا کہ اس دنیا میں اٹھانوے فیصد بے وقوف ہیں۔ تو ہم دو فیصد عقل مندوں کا گزارہ اسی طرح چلتا ہے۔“

مختصر یہ کہ اس دن پتا چل گیا کہ وہ واقعی ایک بہت بڑا فراڈیا تھا۔ اس دن اس کے فراڈ کا ایک واقعہ سامنے آیا تھا۔ اور بھی وہ نہ جانے کیا کچھ کرتا ہو گا۔

اس دن کے بعد سے میں اس سے کچھ کھنچا کھنچا سا رہنے لگا تھا۔ وہ چیٹر قسم کا آدمی تھا۔ نہ جانے کس وقت کس کو پھنسا دے۔ لیکن اس نے ایک دن مجھے پکڑ ہی لیا۔ ”کیا بات ہے یار، تم آج کل کیوں دور دور رہنے لگے ہو۔“

”نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”میں سب سمجھتا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تم شریف قسم کے بندے ہو۔ تم یہ سوچتے ہو گے کہ یہ بندہ کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنسا دے۔ لیکن میری جان، میں ایک بات بتا دوں۔ بادشاہ کبھی اپنے دوستوں کے لیے پرابلم نہیں بن سکتا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

”لیکن بھائی، تم یہ سب کرتے کیوں ہو۔“

میسر

جوا، قمار، پیسے یا کوئی چیز لگا کر شطرنج، تاش وغیرہ کھیل یا کوئی اور ایسا ہی کام جیسے گھڑ دوڑ پر روپیا لگانا، لاٹریاں، قرعہ یا فال نکلوانا، اس سے ایمان خراب ہوتا ہے۔ پیسا برباد ہوتا ہے۔ اسلام میں ایسے کام کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس نام کا ایک کھیل ہوتا تھا جو اسلام سے قبل عرب میں رائج تھا جس میں ایک مویشی کے دس یا اٹھائیس حصے کر کے تیروں کے ذریعے جس آدمیوں میں بانٹا جاتا تھا۔ دس میں سے آخری تین کو کچھ نہیں ملتا تھا۔ قرآن مجید اور نبی کریمؐ نے شراب بت پرستی جیسے بڑے گناہوں کے ساتھ اسے بھی حرام قرار دے کر سخت قابلِ سزا کہا ہے۔

مرسلہ: احمر ملتان

”بادشاہوں کا کام ہی یہی ہوتا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”اب سیدھی سادی نوکری میں تو بادشاہی نہیں چل سکتی نا۔ اسی لیے اس قسم کے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔“

”اور اگر پکڑے جاؤ تو۔“

”ہر کام میں رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”لیکن ایک بات یاد رکھو، اگر تم نے مجھ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا، یا مجھ سے کترانے لگے تو اگر کبھی پکڑا گیا تو اپنے ساتھیوں میں تمہارا نام لے دوں گا۔“

اس نے تو یہ بات مذاق میں کہی ہو گی لیکن میں واقعی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے ملنا جلنا شروع تو کر دیا لیکن پہلے کی طرح نہیں بلکہ بہت کم۔

کچھ دنوں سے بادشاہ بھی محلے میں کم دکھائی دے رہا تھا۔ ہوٹل کی طرف بھی اس کا آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ نہ جانے کن چکروں میں پڑا ہوا تھا۔

ایک بار وہ ملا تو پہلے کی طرح بہت گرم جوشی کے ساتھ۔ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے یوں ہی سرسری طور پر پوچھ لیا۔ ”کیا بات ہے بادشاہ، آج کل تم بہت کم دکھائی دے رہے ہو۔“

”ہاں یار، ایک لمبا کام مل گیا ہے۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں اپنی ایک آنکھ دبا کر بولا۔

”کیا کام پکڑ لیا۔“

”یار، اب تم سے کچھ نہیں چھپا ہوا ہے۔“ وہ ہنس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پڑا۔ ''یار، کچھ بندوں کو عمرے کے لیے بھیج رہا ہوں۔''

''عمرے کے لیے بھیج رہے ہو۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یار۔'' اس نے بتایا۔ ''سالے عمرے پر جانا چاہتے ہیں۔''

''لیکن تم کیسے بھیجو گے۔ تمہارا کیا تعلق؟''

''ارے بھیجے گا کون۔'' وہ بدمعاش ہنس پڑا۔ ''سالے دھکے کھا کر واپس آجائیں گے۔''

''لیکن بادشاہ، یہ تو بہت بری بات ہوگی۔ تم عمرے کے نام پر ان سے فراڈ کرو گے۔ اللہ رسولؐ کے نام پر دھوکا دو گے۔''

''اس لیے کہ وہ خود بھی تو اللہ رسولؐ کے نام پر دھوکا دینا چاہتے ہیں۔'' بادشاہ نے کہا۔

''وہ کیسے۔'' میں نے پوچھا۔

''سالے بغیر ویزا پاسپورٹ کے جانا چاہتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''لانچ کے ذریعے اسمگل ہوکر۔ اور مقصد یہ ہے کہ وہاں جاکر سلپ ہوجائیں۔ اب یہ سراسر دھوکا ہے یا نہیں۔ جب وہ دھوکا دے رہے ہیں تو ایسوں کے ساتھ تو دھوکا ہی ہونا چاہیے۔''

''تم کون سا دھوکا دو گے ان کو۔''

''ایک بہت پرانے واقعہ کی یاد تازہ کروادوں گا۔'' وہ مزے لے کر بولا۔ ''ان سالوں کو دو چار دنوں تک لانچ میں اِدھر اُدھر گھمانے پھرانے کے بعد کسی جزیرے پر اتار دوں گا کہ دیکھو دبئی آگیا۔ میں نے لانچ والوں سے بھی بات کر رکھی ہے۔ ان کو بے شمار ایسے جزیرے معلوم ہیں جن پر ان بے وقوفوں کو اتارا جائے۔''

''تم آگ سے کھیل رہے ہو بادشاہ۔''

''اسی گیم میں تو مزہ ہے۔ ہر بندہ پانچ پانچ ہزار دے رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میرے حصے میں پچاس ہزار آجائیں گے۔ خود سوچو یہ کتنی بڑی رقم ہے۔''

اس زمانے میں پچاس ہزار واقعی بہت بڑی رقم تھی۔

''بادشاہ، اب میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔''

''مجھے نہیں، ان لوگوں کو سمجھاؤ جو اللہ رسولؐ کے نام پر دھوکا دینے کی سوچ رہے ہیں۔ اگر میں ایسوں کو چونا لگا رہا ہوں تو کیا برائی ہے۔''

میں جانتا تھا کہ اس پر میری باتوں کا اثر نہیں ہوسکتا۔ اس نے جو سوچ لیا ہے وہی کرے گا کیونکہ اس کا تو کام یہی تھا۔ میرے سمجھانے یا نہ سمجھانے سے کیا فرق پڑ جاتا۔

وہ پھر کچھ دنوں کے لیے غائب ہوگیا۔ شاید وہ اپنی مہم کے سلسلے میں مصروف ہوگا۔ وہ لوگ اس کی کمی ضرور محسوس کیا کرتے ہوں گے جن کو کھلاتا پلاتا تھا۔

کئی دنوں کے بعد جب دکھائی دیا تو ایک بار پھر ہوٹل کا وہ گوشہ آباد ہوگیا جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ اس کی بادشاہی پھر شروع ہوگئی۔ وہی کیک بسکٹ چائے وغیرہ۔

موقع پاکر میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''ہاں بادشاہ، کیا ہوا تمہاری مہم کا۔''

''کامیاب! پچاس ہزار میری جیب میں آگئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''فرض کرو اگر انہوں نے پولیس کو بتادیا تو کیا ہوگا۔''

''بتا ہی نہیں سکتے۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ وہ خود پھنس جائیں گے۔ بغیر ویزا اور پاسپورٹ باہر جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا یہ جرم ہی ان کو ٹھکانے لگادے گا۔''

''اور اگر انہوں نے مار پیٹ کی تو۔''

''بھائی، تم کیوں پریشان ہو رہے ہو۔ ان کو معلوم ہی نہیں ہے کہ میں کون ہوں۔ کہاں رہتا ہوں۔ میرا اصل نام کیا ہے۔ وہ تو مجھے ڈھونڈتے ہی پھریں گے۔ اور اگر مل بھی گئے تو کیا ہوگا۔ بادشاہ چار پانچ آدمیوں کو تو سنبھال ہی سکتا ہے۔''

اور ہوا بھی یہی۔ بادشاہ کو کوئی نہیں پکڑ سکا۔

میں یہ سوچا کرتا تھا کہ اس آدمی کا انجام کیا ہوگا۔ چلو یہ اپنی ہوشیاری اور قسمت کی وجہ سے لوگوں سے بچ نکلتا ہے۔ لیکن خدا کے یہاں کیا ہوگا۔ وہاں تو اس کی کوئی ہوشیاری کام نہیں آئے گی۔

ایک بار بادشاہ نے ایک ایسی بات کی کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ اس کو مجھے یہ سب نہیں بتانا تھا۔ لیکن جوش میں بتاتا چلا گیا۔ ''یار میں نے اب ایک دوسری لائن پر کام شروع کردیا ہے۔''

''وہ کون سی۔''

''ایک بوڑھا ہے جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ لیکن بہت پیسے ہیں اس کے پاس۔ بینکوں میں پڑے ہوئے۔ پرائز بانڈز کی صورت میں۔''

''تو تم اس کے یہاں چوری کرنا چاہتے ہو۔''

''نہیں۔ بادشاہ چوری جیسا گھٹیا کام نہیں کرتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں فراڈ کے ذریعے پیسے لیتا ہوں۔ اور لوگ خود اپنے ہاتھوں سے دیتے ہیں۔ اگر میرے سامنے کسی کے لاکھوں بھی پڑے ہوں تو اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں ہوں۔''

''چلو مان لیا۔ لیکن تم اس بوڑھے کے ساتھ کرنا کیا چاہتے ہو۔''

''وہ معذور بھی ہے۔ اور عمرے پر جانا چاہتا ہے۔''

''خدا کی پناہ! ایک معذور بوڑھے کو دھوکا دو گے۔''

''نہیں یار، بات تو سن لو۔ اس کو اس سفر میں کسی ایسے بندے کی ضرورت ہے جو اس کی دیکھ بھال کرسکے۔ اور میں اس سفر میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ وہ مجھے معاوضہ دے گا۔''

''چلو، یہ تو سیدھا سادا کام ہوا۔'' میں نے کہا۔ ''اس میں تمہارے فراڈ کی گنجائش نہیں نکلتی۔''

''بات تو سن۔ اصل کہانی تو عمرے سے واپسی کے بعد شروع ہوگی۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ ''اس کا مکمل اعتماد حاصل کرلینے کے بعد میرے لیے اس کی دولت پر ہاتھ صاف کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

میں کانپ کر رہ گیا۔ برا بھلا کہتا رہا۔ لیکن وہ ہنستا ہی رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کو سمجھایا نہیں جاسکتا۔ اس نے جو سوچ لیا ہے وہی کرے گا۔

میں نے اس بار اس سے ملنا جلنا چھوڑ ہی دیا۔ میں کیوں ایسے آدمی سے دوستی کرکے اپنی عاقبت خراب کرتا۔

پھر وہ غائب ہی ہوگیا۔

اس دفعہ وہ واقعی غائب ہوگیا۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا لیکن ہفتے دس دنوں کے بعد اس کی واپسی ہوجاتی۔ اس بار کئی مہینوں تک اس کا پتا نہیں چلا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

اور ایک شام اچانک مجھے وہ دکھائی دے گیا۔

اپنے محلے میں نہیں۔ بلکہ بہت دور کی ایک مسجد میں۔ میں مغرب کی نماز کے لیے گیا ہوا تھا کہ میں نے بادشاہ جیسے ایک آدمی کو دیکھا۔

فرق یہ تھا کہ اس آدمی کے چہرے پر داڑھی تھی جو اس کی شخصیت کو بہت خوبصورت بنا رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ ہاتھ اٹھائے دعائیں مانگ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کی اگلی صف میں، میں تھا۔ میں نے اس کی آواز سن کر مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں ... وہ بادشاہ ہی تھا۔

میرے خدا! یہ کیسی تبدیلی تھی۔

نمازی ایک ایک کرکے مسجد سے جانے لگے تو میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ ''بادشاہ اتم بادشاہ ہونا۔''

اس نے بھی پہچان لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ''ہاں یار، میں وہی ہوں۔''

''کیا کوئی نئی کہانی شروع کرنے جارہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بھائی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''کہانی تو اب ختم ہونے والی ہے۔''

''تو پھر یہ سب کیا ہے۔ تم اور مسجد، نماز داڑھی، کیا ہے یہ سب۔''

''تمہیں یاد ہوگا میں ایک بوڑھے کو عمرے کے لیے لے کر گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں یاد ہے مجھے۔ کیا اس کی دولت نہیں ملی۔''

''مل گئی۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ جو میں نے سوچا تھا۔'' اس نے کہا۔ ''ہوا یہ کہ عمرے کے دوران مکہ کی گلیوں میں یوں ہی گھومتے ہوئے میں کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔ یار، وہاں کوئی بلڈنگ بن رہی تھی۔ زمین کھود کر بہت سی مٹی نکال کر ایک طرف ڈال دی گئی۔ میں مٹی کے اسی ڈھیر پر جاکر گر پڑا تھا۔ بہرحال کپڑے جھاڑتا ہوا کھڑا ہوگیا اور اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔''

مجھے اس کی کہانی میں اب دل چسپی ہونے لگی تھی۔ ''ہاں بادشاہ بتاؤ کیا ہوا۔''

''یار، اس کے بعد تو میرے دل کی دنیا ہی بدل گئی۔'' اس نے کہا۔ ''میری کیفیت تو ایک شعر میں ہے اگر سمجھنا چاہو تو سمجھ سکتے ہو۔''

''ہاں سناؤ۔'' میں بے پناہ حیرت زدہ تھا۔

''ہے اس گلی کی خاک میں تاثیر کچھ ایسی۔ اٹ جائے جو بدن تو سراپا دمک اٹھے۔''

شعر سنانے کے بعد اس نے رونا شروع کردیا۔ اس وقت مجھے ایسا لگا جیسے اس کا سراپا دمک اٹھا ہو۔ میں نے پوچھنا چاہا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ لیکن اس نے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ وہ چلا گیا، نہ جانے کہاں۔ اور آج تک بادشاہ مجھے یاد ہے۔ دل کی دنیا بدلتی ہے تو پھر اسی طرح بدلتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

کاروانِ زیست

جناب معراج رسول
آداب ونیاز!
لوگ کہتے ہیں ناول اور کہانیوں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ فرضی ہوتا ہے لیکن میں ببانگِ دہل کہتی ہوں کہ ایسا نہیں، انسان کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہی کچھ لکھا جاتا ہے۔ خود میری آپ بیتی پڑھ لیں۔ بالکل کسی ناول جیسی کہانی لگے گی۔ قسمت نے مجھے کس کس طرح حیران کیا آپ بھی ملاحظہ کریں۔
نسرین
(کراچی)

کار بڑی سبک خرامی سے رواں دواں تھی۔ میں اورنیو ٹیلنٹ کلب کے منیجر راحت علی گزشتہ رات حیدرآباد کے ایک بڑے میوزیکل پروگرام "شامِ موسیقی" میں شرکت کے بعد کراچی واپس جارہے تھے۔ میں اپنی پرفارمنس سے کافی خوش اور مطمئن تھی۔ شائقین نے میری گائی ہوئی غزلوں اور گیتوں کو اتنا پسند کیا تھا کہ مجھے تین بار اسٹیج پر واپس جانا پڑا تھا اور یہ مجھ جیسی اوسط درجے بلکہ ایک حد تک نو آموز گلوکارہ کے لیے بڑی حوصلہ افزا بات تھی۔ راحت صاحب بہت کم کسی کی تعریف کرتے تھے مگر انہوں نے بھی فنکشن سے ہوٹل واپس جاتے ہوئے جہاں ہمارا قیام تھا دل کھول کر داد دی تھی اور کہا تھا کہ اگر تم اسی طرح محنت اور لگن سے کام لیتی رہیں تو ایک دن ملک کی صفِ اول کی گلوکارہ بن جاؤ گی۔

میں ان ہی خیالات میں گم تھی کہ کار کے انجن نے دو تین جھٹکے لیے اور خاموش ہوگیا۔ ڈرائیور نے کئی بار اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

"کیا بات ہے فیض محمد؟" راحت علی صاحب نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"معلوم نہیں جناب۔" فیض محمد نے جواب دیا۔ "مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے شاید پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔"

"تم نے حیدرآباد سے روانگی کے وقت پیٹرول کا میٹر چیک نہیں کیا تھا؟"

"میٹر تو ایک ماہ سے خراب ہے۔ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا مگر آپ نے کہا کہ اس کے خراب ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کار تو اس کے بغیر بھی چل سکتی ہے۔"

یہ راحت صاحب کی کنجوسی کا ایک پہلو تھا کہ جب تک کوئی خرچ ناگزیر نہ ہوجائے وہ اسے ٹالتے رہتے تھے۔

"اچھا اب بحث ہی کرتے رہو گے یا اتر کر دیکھو گے بھی۔" وہ کچھ خفت آمیز لہجے میں بولے۔ "ممکن ہے کوئی دوسری خرابی ہو۔"

مگر پندرہ منٹ کی دیکھ بھال کے بعد فیض محمد کا خیال ہی درست نکلا۔ پیٹرول واقعی ختم ہوچکا تھا۔

"اب کیا کیا جائے؟" راحت صاحب نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔" فیض محمد نے جواب دیا۔ "یا تو میں کسی پیٹرول پمپ سے پیٹرول لاؤں اور میرا خیال ہے کہ نزدیک ترین پیٹرول پمپ بھی پندرہ بیس میل دور ہوگا یا پھر کراچی جانے والی کسی کار کو روک کر درخواست کی جائے کہ وہ ہماری کار کو کسی پیٹرول پمپ تک پہنچانے میں ہماری مدد کرے۔"

دوسری ترکیب نسبتاً زیادہ قابلِ عمل تھی مگر فیض محمد کا خیال تھا کہ اس کے یا راحت صاحب کے بجائے مجھے کوئی کار روکنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں کامیابی کا زیادہ امکان ہے۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ایک کار گزری۔ میرے اشارے پر رک بھی گئی مگر صورتِ حال کی وضاحت کے بعد کار کے مالک نے بڑی شرمندگی سے جواب دیا کہ

اس کے پاس کوئی رسی وسی نہیں ہے جس سے وہ ہماری کار کو باندھ کر کسی پیٹرول پمپ تک لے جائے اور یہ کہ اسے بے حد افسوس ہے کہ وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرسکتا پھر ایک ٹیکسی نظر آئی۔ میں نے جھجکتے ہوئے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور بہت خوب صورت اور شکل وصورت سے پڑھا لکھا نوجوان معلوم ہورہا تھا۔

"ہماری کار کا پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "کیا آپ ہمیں کسی پیٹرول پمپ تک پہنچانے میں مدد دے سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے مہذب لہجے میں دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے جواب دیا۔

"ڈرائیور...!" پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تین خواتین میں سے ایک نے کہا۔ "ہم جلد سے جلد کراچی پہنچنا چاہتے ہیں تم بلاوجہ دیر کررہے ہو۔"

"کسی ضرورت مند کی مدد کرنا انسانیت کی دلیل ہے۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ "آپ اسے بلاوجہ خیال کرتی ہیں تو بہ صد شوق کسی دوسری ٹیکسی میں تشریف لے جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی سوچیں کہ اگر ہم ان خاتون کی جگہ ہوتے اور کوئی ہماری مدد کرنے سے انکار کردیتا تو آپ کے جذبات کیا ہوتے؟"

ڈرائیور کے اس جواب اور مہذبانہ لب ولہجے نے مجھے کافی متاثر کیا۔ وہ اپنی ٹیکسی کی ڈکی کھول کر رسی نکال رہا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سلیم۔" مختصر سا جواب ملا۔

"پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو؟" ڈرائیور رسی نکال کر ہماری کار میں باندھ رہا تھا۔

"اتفاق سے بی کام ہوں۔" اس نے سرسری لہجے میں بتایا۔

"بی کام...!" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "اور بی کام ہوکر ٹیکسی چلاتے ہو؟"

"مجبوری ہے بیگم صاحبہ۔" اس نے جواب دیا۔ "آج کل معقول نوکری سفارش اور رشوت کے بغیر نہیں ملتی۔ پہلی چیز میرے پاس ہے نہیں اور دوسری کا میں قائل نہیں ہوں۔"

اتنی دیر میں اس نے ہماری کار میں رسی باندھ کر اسے اپنی ٹیکسی کے پچھلے حصے سے جوڑ دیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

"آپ کار میں تشریف رکھیں۔" وہ بولا۔ "اور اپنے ڈرائیور کو ہدایت کردیں کہ وہ ہوشیاری سے ٹیکسی کے ساتھ کار ڈرائیو کرتا رہے۔"

نزدیک ترین پیٹرول پمپ واقعی بیس میل سے زیادہ فاصلے پر تھا۔ میں تمام راستہ سلیم کے بارے میں سوچتی رہی تھی اور یہ خاصی عجیب بات تھی۔ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں مجھے کئی مردوں سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان سے بھی جو خالص میری ذات سے دلچسپی رکھتے تھے۔ کچھ نے تو شادی کی پیشکش بھی کردی تھی مگر ان میں سے کوئی بھی مجھے اس انداز میں متاثر نہیں کرسکا تھا کہ میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگتی مگر سلیم میں کوئی ایسی بات تھی جسے میں دل کی گہرائیوں میں محسوس کررہی تھی۔ پیٹرول پمپ کے پاس اس نے اپنی ٹیکسی روک دی اور نیچے اترا میں اس سے پہلے ہی کار سے باہر آچکی تھی۔

"تم حیدرآباد میں رہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"اکیلے؟" پتا نہیں کیوں میری زبان سے نکل گیا۔

"نہیں، میرے ساتھ میری والدہ بھی رہتی ہیں۔" سلیم نے رسمی لہجے میں جواب دیا۔

"کبھی کراچی بھی آتے ہو یا آج اتفاق سے کراچی کی سواریاں مل گئی تھیں۔"

"میں زیادہ تر حیدرآباد اور کراچی کے درمیان ہی ٹیکسی چلاتا ہوں۔"

"میرا نام نسرین ہے۔" میں بولی اور اپنے پرس سے وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ "یہ میرا کارڈ ہے جس پر نام پتا اور فون نمبر بھی تحریر ہے۔ آیندہ کبھی کراچی آنا ہو تو مجھ سے ضرور ملنا۔ ممکن ہے کہ میں تمہارے لیے کسی اچھی ملازمت کا بندوبست کرسکوں۔"

سلیم نے اتنی دیر میں رسی کھول کر دوبارہ ٹیکسی کی ڈکی میں رکھ دی تھی۔ میرا کارڈ لے کر اس نے ایک نظر ڈالی اور پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔

"اچھا بیگم صاحبہ اب اجازت دیں۔" وہ بولا۔

"تمہاری بروقت امداد کے لیے میں ممنون ہوں۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ، انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھولنا مت۔" میں نے کہا۔ "جب بھی کراچی آنے کا موقع ملے تو مجھ سے ضرور ملنا۔"

سلیم نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا اور اس وقت جبکہ راحت صاحب کار میں پیٹرول ڈلوا رہے تھے سلیم کی ٹیکسی تیزی سے چلتی ہوئی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

میرا خیال ہے کہ آگے بڑھنے سے پہلے قارئین سے اپنا مختصر تعارف کروادوں چونکہ میرے ماضی کا اس داستان سے کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے اس بارے میں کچھ کہنا بے سود ہی ہوگا پھر بھی پس منظر بتانے کے لیے یہ کہنا ضروری ہے کہ میرے والد کا تعلق کراچی کے ایک شریف اور دولت مند خاندان سے تھا اور میری والدہ اپنی تمام پاکیزگی کے ساتھ اس ماحول سے تعلق رکھتی تھیں جہاں طبلے کی تھاپ اور گھنگروں کی جھنکار میں حسن و جوانی کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یہ بات ممکن ہے عجیب معلوم ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بازار میں شب و روز رہتے ہوئے بھی انہوں نے اپنی آواز سے آگے بڑھ کر کسی اور چیز کا سودا نہیں کیا۔ میری نانی نے بیٹی کو راہ پر لگانے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر میری ماں ان کے ہر ظلم و ستم کے آگے مضبوط چٹان کی طرح قدم جمائے کھڑی رہیں۔ نانی کو ہوش اس وقت آیا جب میری ماں نے ایک بوالہوس امیر زادے کی دسترس سے بچنے کے لیے خواب آور دوا کی گولیاں کھالیں اور مرتے مرتے بچیں۔ اس حادثے کے بعد سے نانی نے انہیں پھر کبھی گانے، مجرے کے علاوہ کسی اور بات پر مجبور نہیں کیا۔ وہ اکثر کہتی تھیں کہ خون کی تاثیر اتنی شدید ہوتی ہے یہ انہیں معلوم نہیں تھا اس لڑکی کی رگوں میں ایک نجیب الطرفین باپ کا لہو دوڑ رہا ہے۔ یہ مرجائے گی مگر اس کے قدم غلط راستے پر نہیں اٹھیں گے۔

پھر ایک حسنِ اتفاق کے تحت میرے ابو اور ان کی ملاقات ہوگئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے پھر ابو نے اپنے خاندان کی مخالفت کے باوجود میری والدہ سے شادی کرلی۔ اس شادی کے بعد ان کا خاندانی بائیکاٹ کیا گیا۔ جائداد کی تقسیم کے لیے مقدمے بازی ہوئی۔ عدالت کے فیصلے کے مطابق جو کچھ ابو کے حصے میں آیا وہ بھی اتنا کافی تھا کہ ابو نے اس رقم سے ایک مکان خرید کر امی کے نام کردیا اور باقی روپے سے تجارت کرنے لگے۔ دو سال کے بعد میں پیدا ہوئی۔ میرا نام نسرین رکھا گیا اور حسبِ مقدور بڑی خوشی منائی گئی مگر ابو اور امی کی رفاقت زیادہ دیر

تک قائم نہیں رہی۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ ہاتھ کس کا تھا۔ کس نے ایک ہی جھٹکے سے ان کے سر سے سہاگ کا دوپٹا اتار دیا۔ ایک رات ابو دکان بند کرکے گھر واپس آرہے تھے کہ ایک اندھیری گلی میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اور اسپتال لے جاتے ہوئے راستے میں ہی ابو دم توڑ گئے۔ لوگوں کا خیال تھا ان کے خاندان والے جائداد کی تقسیم کے معاملے میں اس قدر مشتعل تھے کہ یہ حرکت ان کے علاوہ کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی مگر امی نے پولیس کی تفتیش میں کسی کے خلاف شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ مدعی خود سست ہو تو پولیس کی چستی کیا کرسکتی تھی۔ چند ماہ کے بعد یہ واردات بھی پولیس کی فائلوں میں کہیں دفن ہوگئی۔

ان حالات میں امی نے میری پرورش، تعلیم و تربیت کے سلسلے میں کیا کیا تکالیف اٹھائی ہوں گی ان کا اندازہ کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ اپنی امی کی طرح خدا نے مجھے بھی بہترین آواز دی تھی۔ مجھے بچپن سے ہی موسیقی سے بے حد لگاؤ تھا۔ امی نے میرے رجحان کو دیکھتے ہوئے اسکول اور کالج کی تعلیم کے علاوہ موسیقی کی تعلیم بھی دی۔ زمانہ بھی بہت بدل گیا تھا۔ اب گلوکاری کا مظاہرہ کرنے والے فنکار کہلانے لگے تھے۔ معاشرہ انہیں مناسب عزت و احترام دیتا تھا۔ نیو ٹیلنٹ کلب کے منیجر راحت علی نے کالج کے ایک فنکشن میں میرا گانا سنا۔ خود امی سے ملاقات کی اور کلب کے فنکاروں میں میری شرکت پر انہیں آمادہ کرلیا۔ اس بات کو کئی سال گزر چکے تھے۔ میں نے اپنی محنت اور خداداد صلاحیتوں سے بہت جلد خاصی شہرت حاصل کرلی۔ موسیقی کے پروگراموں میں مجھے مدعو کیا جانے لگا۔ ریڈیو سے گانے کا موقع بھی ملا۔ جلد ہی میں اس قابل ہوگئی کہ اس ذریعے سے ہونے والی آمدنی سے اپنی اور امی کی جملہ ضروریات پوری کرنے کے علاوہ معقول رقم پس انداز کرنے لگوں۔

☆☆☆

حیدرآباد سے واپسی پر مجھے ہفتوں سلیم کی آمد کا انتظار رہا مگر وہ نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ شاید ٹیکسی چلاتے ہوئے وہ اپنی مرضی سے کام کرنے یا نہ کرنے کا اتنا عادی ہوچکا ہے کہ اسے ملازمت کی پابندی گوارا نہیں۔ دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ میں اپنی مصروفیات میں اسے بھولنے کی کوشش کرتی رہی مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ میں اسے اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ خاص طور سے ان راتوں میں جب میرا کہیں کوئی پروگرام نہیں ہوتا تھا تو اپنے کمرے کی تنہائی میں مجھے سلیم کی یاد ضرور آتی تھی اور جب چھ سات مہینے گزر گئے تو میں تقریباً مایوس ہوکر یہ سوچنے لگی کہ شاید وہ کبھی نہیں آئے گا۔ یہ میری دیوانگی تھی کہ پندرہ بیس منٹ کی نامکمل سی ملاقات سے اتنی زیادہ متاثر ہوگئی اور کون جانے یہ تاثر یک طرفہ ہی ہو۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس مختصر سی ملاقات میں سلیم نے ایک دو مرتبہ سے زیادہ میری طرف دیکھا ہو۔

ان چھ سات مہینوں کے درمیان مجھے دوبارہ حیدرآباد جانے کا بھی اتفاق نہیں ہوا۔ سلیم نے کہا تھا کہ وہ زیادہ تر کراچی اور حیدرآباد کے درمیان ہی ٹیکسی چلاتا ہے اس لیے یہ عین ممکن تھا کہ حیدرآباد جائے یا وہاں سے واپس آتے ہوئے اس سے دوبارہ ملاقات ہوجائے اور میں سچ مچ دعائیں مانگنے لگی کہ حیدرآباد میں کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ہی ہوجائے جس میں مجھے بھی مدعو کرلیا جائے۔ شاید میری دعا قبول ہوگئی تھی کہ ایک دن راحت صاحب نے بتایا کہ حیدرآباد کی کسی ادبی سنگت نے شامِ غزل کے نام سے ایک پروگرام ترتیب دیا ہے جس میں وہ لوگ کراچی کے چند دوسرے فنکاروں کے ساتھ مجھے بھی بلانا چاہتے ہیں۔

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"یہ ہی سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دوں۔"

"اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ان سے کہہ دیں کہ میں ضرور آؤں گی۔"

"مگر وہ لوگ جو معاوضہ پیش کررہے ہیں وہ اس کا تقریباً نصف ہے جو ہم دوسروں سے لیتے ہیں۔" راحت صاحب نے گویا اعتراض کیا۔

"پھر کیا ہوا۔" میں نے فوراً کہا۔ "یہ بھی تو دیکھیے کہ مجھے ایک ادبی انجمن نے مدعو کیا ہے۔ آدمی کو علم و ادب کی خدمت کے لیے بھی کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ ممکن ہے انہوں نے یہ فنکشن صرف اس لیے ہی رکھا ہو کہ اس کی آمدنی سے اپنے کسی ادبی پروگرام کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا چاہتے ہوں۔ آپ ان سے کہہ دیں کہ میں ضرور آؤں گی۔"

شامِ غزل کا وقت جمعرات کی شام کو آٹھ بجے رکھا گیا تھا۔ میرا سابقہ تجربہ یہ تھا کہ اس قسم کا کوئی بھی پروگرام اپنے وقت پر شروع نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود میں کراچی سے پانچ بجے ہی روانہ ہوگئی۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ مجھے رات کے وقت کار میں سفر کرنے سے ڈر لگتا تھا۔ اس لیے جب بھی کبھی حیدرآباد جانا ہوتا میں دن میں روانہ ہونے کو ترجیح

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیتی تھی۔ حیدرآباد پہنچ کر ہوٹل میں قیام کرتی تھی اور پھر مناسب وقت پر فنکشن میں پہنچ جاتی تھی۔ اسی طرح فنکشن ختم ہونے پر ہوٹل واپس آتی۔ رات وہاں گزارتی اور دوسرے دن اطمینان سے ناشتا کر کے گیارہ بجے تک کراچی روانہ ہو جاتی تھی۔

ابھی ہم کراچی سے دس پندرہ میل ہی کے فاصلے پر تھے کہ میں نے سڑک کے دائیں جانب ایک الٹی ہوئی ٹیکسی کو بری طرح آگ کے شعلوں میں گھرا ہوا دیکھا۔ میں نے جلدی سے کار رکوائی۔ میں اور راحت صاحب نیچے اتر کر ٹیکسی کی طرف چلے۔ صاف ظاہر تھا کہ کسی دوسری کار یا ٹرک نے ٹیکسی کو ٹکر ماری اور حادثہ کر کے ٹھہرا نہیں بلکہ بھاگ نکلا۔ غالباً اسے اتنا نقصان نہیں پہنچا تھا کہ رکنے پر مجبور ہوتا۔ میرا دل نہ جانے کیوں گھبرا رہا تھا۔ میں نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ ٹیکسی میں کوئی سواری تو موجود نہیں ہے مگر شعلے اتنے تیز اور بلند تھے کہ قریب جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اگر اندر کوئی تھا بھی تو اب اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ راحت صاحب آس پاس کی جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھے آواز دی۔ وہ ٹیکسی سے تقریباً دس گیارہ فٹ کے فاصلے پر جھکے ہوئے کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں جلدی سے ان کی طرف بڑھی اور قریب پہنچنے سے پہلے ہی دیکھ لیا کہ کوئی آدمی ڈرائیور کی وردی پہنے منہ کے بل زمین پر پڑا ہوا ہے۔ اس کے سر یا دوسری چوٹوں سے بہنے والے خون نے آس پاس کی زمین کو سرخ کر دیا تھا۔

راحت صاحب نے بہت احتیاط سے اسے سیدھا کیا اور مجھے اپنا دل سینے میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میں نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا، وہ سلیم ہی تھا۔

"یہ ابھی زندہ ہے۔" راحت صاحب نے کہا۔ "اگر بروقت طبی امداد مل جائے تو شاید اس کی جان بچ جائے مگر سوال یہ ہے کہ اسے اسپتال تک پہنچایا کیسے جائے۔ مجھے امید نہیں کہ یہاں قریب میں کوئی فون ہوگا جہاں سے ہم ایمبولینس کو فون کر سکیں۔"

میں اتنی دیر میں ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ "آپ اور ڈرائیور مل کر اسے میری کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا دیں۔" میں نے کہا۔ "ہم کراچی واپس جا رہے ہیں۔"

اس کے سر سے ابھی بھی خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اپنے دوپٹے کا پلو پھاڑ کر اس کے سر پر پٹی باندھ دی۔

"مگر ہم تو فنکشن میں جا رہے ہیں۔" راحت صاحب نے اعتراض کیا۔

"کوئی فنکشن کسی انسان کی جان بچانے سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتا۔" میں بولی۔ "اب آپ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہیں جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کریں۔"

ڈرائیور اور راحت صاحب نے سلیم کو پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔

"آپ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھیں۔" میں نے کہا۔ "میں سلیم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر ہوں، راستے میں اس کی دیکھ بھال کرتی رہوں گی۔"

"سلیم۔" راحت صاحب چونکے۔ "اس کا مطلب ہے تم اسے جانتی ہو۔"

"وقت ضائع نہ کریں۔" میں نے پچھلی سیٹ پر سلیم کے پیروں کی طرف بیٹھ کر دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "یہ باتیں ہم راستے میں بھی کر سکتے ہیں۔"

راحت صاحب خاموشی سے اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی واپس موڑی اور تیزی سے کراچی کی طرف چلے۔ ہمیں جائے حادثہ پر پانچ چھ منٹ سے زیادہ نہیں لگے تھے اور اس درمیان دونوں طرف سے کوئی ٹریفک نہیں گزری تھی، راحت صاحب ابھی تک اسی الجھن میں مبتلا تھے کہ میں سلیم کو کیسے جانتی ہوں۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔

"تم اسے کیسے جانتی ہو؟"

"شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ پچھلی مرتبہ حیدرآباد سے کراچی آتے ہوئے ہماری کار کا پیٹرول ختم ہو گیا تھا اور ایک ٹیکسی ڈرائیور نے ہماری مدد کی تھی، یہ وہی شخص ہے۔"

"ہاں مجھے یاد آ گیا۔" راحت صاحب نے جواب دیا۔ "چند منٹ کی ملاقات کے بعد کوئی کیسے کسی کو یاد رکھ سکتا ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے اسے کس طرح یاد رکھا؟"

"جو شخص ہماری کسی پریشانی میں کام آیا ہو اسے اتنی آسانی سے نہیں بھلایا جا سکتا۔" میں نے کہا۔

میں سلیم کو لے کر سیدھی ڈاکٹر سعید کے پرائیوٹ اسپتال پہنچی۔ ڈاکٹر سعید بہت ہمدرد، مخلص اور معاملہ فہم انسان تھے۔ انہوں نے کوئی سوال پوچھے بغیر پہلے مریض کا معائنہ کیا اور اسے ضروری طبی امداد دینا مناسب سمجھا۔ سلیم کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا۔ میں باہر بے چینی سے سلیم کی خیریت معلوم کرنے کے انتظار میں ٹہل رہی تھی۔

"تم نے اپنا انسانی فرض ادا کر دیا۔" راحت صاحب میرے قریب آ کر بولے۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں حیدرآباد چلنا چاہیے ورنہ ہم وقت پر فنکشن میں نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"میں سلیم کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ ان لوگوں کو فون کر دیں کہ ایک عزیز دوست کے حادثے میں زخمی ہونے کی وجہ سے مجھے افسوس ہے کہ میں پروگرام میں شامل نہیں ہو سکوں گی۔"

راحت علی صاحب نے غور سے میری طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموشی سے فون کرنے چلے گئے۔ ڈاکٹر سعید باہر نکلے وہ کافی فکرمند نظر آ رہے تھے۔

"ان کا کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"شاید کوئی ایکسیڈنٹ کیس ہے۔" انہوں نے میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"تم نے پولیس میں رپورٹ کی۔"

"جی نہیں، میں ایک پروگرام میں شریک ہونے حیدرآباد جا رہی تھی۔" میں نے بتایا۔ "یہ مجھے سڑک پر اسی حالت میں پڑے ملے۔ قریب ہی ایک الٹی ہوئی ٹیکسی آگ کے شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں انہیں جانتی ہوں۔ پولیس میں رپورٹ کرنے کا آپ کو بھی کچھ نہ کچھ تجربہ تو ضرور ہوگا۔ میں نے پہلے ان کی جان بچانا ضروری سمجھا اور یہاں لے آئی مگر آپ بتاتے کیوں نہیں کہ ان کا کیا حال ہے؟"

"سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔" ڈاکٹر سعید نے جواب دیا۔ "باقی جسم پر بھی کچھ چوٹیں اور کچھ معمولی خراشیں ہیں۔ فوری طور پر آپریشن کی ضرورت ہے۔"

"تو آپ آپریشن کرتے کیوں نہیں جو کچھ بھی خرچ ہوگا میں دینے کے لیے تیار ہوں۔"

"بات خرچ کی نہیں ہے، آپریشن خطرناک ہے۔ موت بھی واقع ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں ضروری کاغذات کی خانہ پُری....." ڈاکٹر سعید کہتے کہتے رک گئے۔

"اتنا وقت نہیں ہے کہ حیدرآباد میں سلیم کے عزیز و اقارب کو تلاش کیا جائے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔ لائیے کہاں ہیں آپ کے ضروری کاغذات، میں ان پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں اور اس سلسلے میں ہر قسم کی ذمے داری قبول کرتی ہوں۔ آپ اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ آگے جو خدا کی مرضی۔"

شکر ہے کہ اس وقت تک راحت صاحب فون کر کے واپس نہیں آئے تھے ورنہ مجھے ان کے ساتھ بھی بحث کرنا پڑتی اور چونکہ وہ ڈاکٹر نہیں تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ حالات کی نزاکت نہیں سمجھ سکتے۔

چند منٹ میں کاغذی کارروائی مکمل ہو گئی۔ ڈاکٹر سعید مجھے تسلی دیتے ہوئے دوبارہ ایمرجنسی وارڈ میں چلے گئے۔ میں بے حد گھبرائی ہوئی اور پریشان تھی۔ میں نے خدا سے یہ دعا ضرور مانگی تھی کہ حیدرآباد جاتے یا واپس آتے ہوئے سلیم سے ملاقات ہو جائے مگر وہ ملاقات اس انداز میں ہوگی میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دس پندرہ منٹ کے بعد راحت صاحب بھی آ گئے۔ میں نے انہیں سلیم کی نازک حالت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ڈاکٹر سعید اپنے اسپتال کے سرجن کرامت کے ساتھ سلیم کے سر کا آپریشن کر رہے ہیں۔ غنیمت تھا کہ انہیں آپریشن سے پہلے قانونی کارروائی کا خیال نہیں آیا اور غالباً وہ یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ ایسی نازک حالت میں سلیم کو چھوڑ کر گھر میں نہیں جاؤں گی چنانچہ وہ خاموشی سے انتظار کرنے والوں کے لیے بچھی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔

رات کے تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر سعید آپریشن روم سے باہر نکلے۔ میں جو برآمدے میں ٹہل رہی تھی جلدی سے ان کی طرف بڑھی۔ راحت صاحب بھی آ گئے۔ میں کچھ پوچھتے ہوئے ڈر رہی تھی مگر ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ نے مجھے حوصلہ دیا۔

"اب کیا حال ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپریشن کامیاب رہا۔" انہوں نے جواب دیا۔ "اگرچہ اب بھی اس کی حالت خطرے سے باہر نہیں ہے، آنے والے دو دن فیصلہ کن ہیں۔ اگر اس نے یہ وقت گزار لیا تو انشاء اللہ ضرور بچ جائے گا۔"

"میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ابھی بے ہوش ہے اور اسے دو تین دن اسی حالت میں رکھنا ضروری ہے لیکن تم دور سے اسے ایک نظر دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتی ہو۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ سلیم کا جسم ایک سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا اس لیے یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ اسے جسمانی طور پر کتنی چوٹیں آئی تھیں البتہ اس کے سر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا سرخ و

WWW.PAKSOCIETY.COM

سپید چہرہ زرد مائل ہو رہا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری آنکھیں بھیگنے لگیں۔ میرے لیے زیادہ دیر تک ٹھہرنا مشکل ہوگیا اور میں رومال سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات میں اس حادثے کے بارے میں بڑی مختصر سی خبر شائع ہوئی تھی جس کی تفصیل صرف اتنی تھی کہ نیشنل ہائیوے پر ایک جلی ہوئی ٹیکسی سے تین ناقابلِ شناخت لاشیں برآمد ہوئی تھیں جن میں سے ایک اگلی سیٹ پر تھی اور باقی دو پچھلی نشست پر۔ فطری طور پر اگلی سیٹ کی لاش کو ڈرائیور کی لاش سمجھ لیا گیا تھا۔ حادثے کے بارے میں پولیس کا نظریہ یہ تھا کہ غالباً کسی ٹرک کی ٹکر سے ٹیکسی الٹ گئی اور اس میں آگ لگ گئی۔ ٹرک کو شاید زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا اور وہ اس قابل تھا کہ ایکسیڈنٹ کے بعد اس کی ذمے داری سے بچنے کے لیے فرار ہوجائے۔

میرے لیے اس خبر میں تشویش کا پہلو یہ تھا کہ ڈرائیور کو مردہ تصور کرلیا گیا تھا اور یہ خبر سلیم کی والدہ تک پہنچی ہوگی تو غم اور صدمے سے ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ پولیس سے رجوع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ ایسی صورت میں میرے علاوہ ڈاکٹر سعید سے بھی باز پرس کی جاسکتی تھی۔ میں بے تابی سے سلیم کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی کہ پھر اس سے اس کے گھر کا پتا معلوم کرکے اس کی غمزدہ ماں کو اس کی زندگی کی خوش خبری سنائی جاسکتی تھی۔

تیسرے دن سلیم کو نہ صرف ہوش آگیا بلکہ وہ اس قابل بھی ہوگیا تھا کہ باتیں کرسکے۔ ڈاکٹر سعید نے اسے پہلے ہی بتادیا تھا کہ میں اسے کس خطرناک حالت میں اسپتال لائی تھی اور صرف میری وجہ سے یہ ممکن ہوسکا کہ زیادہ تاخیر ہونے سے قبل ہی اس کا آپریشن کیا جاسکے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ بھی مجھے بھولا نہیں تھا۔ حادثے کے بارے میں اس نے بتایا کہ وہ بڑی مناسب رفتار سے کراچی جارہا تھا کہ ایک ٹرک نے اسے اوورٹیک کرنے کی کوشش میں سائڈ سے ٹکر ماری۔ ٹکر اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ وہ ٹیکسی کا توازن نہیں سنبھال سکا۔ سر پر کسی چیز سے شدید چوٹ لگنے کے بعد وہ بے ہوش ہوگیا اور اس بے ہوشی میں اسے صرف اتنا احساس ہوا کہ کسی زبردست قوت نے اسے ٹیکسی سے باہر اچھال دیا۔

"میری زندگی کی گاڑی میں نہ صرف پیٹرول ختم ہوگیا تھا بلکہ پیٹرول کی ٹنکی بھی لیک کرنے لگی تھی۔" اس نے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مگر آپ نے مجھے ایسی ورکشاپ تک پہنچادیا جہاں نہ صرف پیٹرول دستیاب تھا بلکہ ٹنکی کی مرمت کا بھی انتظام تھا۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔"

"کیسی باتیں کررہے ہو سلیم۔" میں نے جواب دیا۔ "یہ میرا انسانی فریضہ تھا۔ یہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ ہم لوگ پہلے بھی مل چکے تھے اور میں تمہاری احسان مند تھی۔" میں نے سلیم کو اخبار میں آنے والی خبر کے بارے میں بتایا۔ "اب اگر تم اپنے گھر کا پتا بتادو تو میں تمہاری والدہ کو تمہارے زندہ ہونے کی خوش خبری خود جاکر دینا چاہوں گی۔"

"میری امی کا ہی نہیں بلکہ میری بیوی کا بھی رنج و غم سے برا حال ہوگا۔" سلیم نے کہا۔

"تمہاری بیوی....." میرے دل کو جیسے ایک دھچکا سا لگا۔

"جی ہاں، میں تو ابھی اس جنجال میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔" سلیم نے جواب دیا۔ "مگر امی نے میری ایک نہ سنی۔ چار مہینے ہوئے کہ وہ اپنی پسند سے اپنی بہو لے آئیں۔"

میرا خیال ہے کہ راحت صاحب نے میرے چہرے پر یقیناً کچھ ایسے تاثرات دیکھ لیے ہوں گے کہ وہ جلدی سے بولے۔ "اب اگر تم ہمیں اپنے گھر کا پتا بتادو تو میں ان تک تمہاری خیریت پہنچادوں۔"

سلیم نے راحت صاحب کو اپنے گھر کا پتا لکھوادیا۔

ڈاکٹر سعید نے زیادہ باتیں کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ہم لوگ کمرے سے باہر نکل آئے اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا کیونکہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے میرے پاس اب کرنے والی کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔

اسپتال سے باہر نکل کر راحت صاحب نے ہمدردانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"میرے خیال سے تم اب گھر چلی جاؤ۔" وہ بولے۔

"آپ کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے حیدرآباد۔ سلیم کے گھر والوں کو اس کی خیریت بتانا ضروری ہے۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"کیوں، کیا جو کچھ ہوا وہ کافی نہیں ہے؟"

"وہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں سلیم کی بیوی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔" راحت صاحب نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

حیدرآباد پہنچ کر سلیم کا مکان تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا مگر مکان میں قفل لگا ہوا تھا۔

"سنیے گا بھائی صاحب۔" راحت صاحب نے گزرتے ہوئے ایک شخص سے پوچھا۔ "کیا سلیم صاحب کا مکان یہی ہے؟"

"مکان تو یہی ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "یا یوں کہنا چاہیے کہ تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"آپ سلیم کو کیسے جانتی ہیں؟" اس آدمی نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل سلیم صاحب کی اور ہماری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی۔" راحت صاحب جلدی سے بولے۔ "انہوں نے ہمیں گھر کا پتا دیا تھا اور بڑے اصرار سے کہا تھا کہ جب بھی ہمارا حیدرآباد آنا ہو تو ان کے گھر ضرور آئیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو کچھ پتا نہیں ہے۔"

"کیا پتا نہیں ہے؟" راحت صاحب نے پوچھا۔

"سلیم کی ٹیکسی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا جس کے بعد اس میں آگ لگ گئی۔" اس آدمی نے بتایا۔ "وہ سواریاں لے کر کراچی جارہا تھا۔ آگ اتنی شدید تھی کہ سلیم سمیت کوئی زندہ نہیں بچا۔ ان کی لاشیں جل کر ناقابلِ شناخت ہوگئی تھیں۔ یہ خبر جب یہاں پہنچی تو اس کی ماں جو پہلے دل کی مریض تھیں اتنا صدمہ ہوا کہ وہ اسی وقت انتقال کرگئیں۔"

"اور اس کی بیوی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ غریب دو تین دن گم صم ایک سکتے جیسی کیفیت میں رہی اور پھر پرسوں رات نہ جانے کس وقت گھر سے نکل کر غائب ہوگئی۔ ہم لوگوں..... میرا مطلب ہے محلے والوں نے اسے بہت تلاش کیا مگر اس کا کوئی پتا نہیں چلا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے دریا میں گر کر خودکشی کرلی۔"

"یہ خیال کیسے ہوا؟"

"محلے کا ایک آدمی کوٹری اسٹیشن پر ملازم ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔ "اس کا کہنا ہے کہ اس نے رات کے ایک ڈیڑھ بجے ایک جوان لڑکی کو کوٹری کے ریلوے پل سے دریا میں کودتے دیکھا تھا۔ وہ اسے بچانے کے لیے بھاگا بھی مگر جب تک وہ پل پر پہنچا لڑکی دریا میں چھلانگ لگا چکی تھی۔ رات کے وقت یہی طور پر شناخت کرنا تو مشکل تھا مگر وہ کہتا ہے کہ وہ لڑکی سلیم کی بیوی ناہید ہی تھی۔"

"سلیم کی بیوی کا نام ناہید تھا۔" میں نے آہستہ سے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

"پھر تم لوگوں نے اسے دریا میں تلاش کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟" راحت صاحب نے پوچھا۔

"آج کل برسات کا موسم ہے۔ دریا میں پانی بھی زیادہ ہے اور بہاؤ بھی بہت تیز ہے اس کے علاوہ ہمیں ناہید کی گمشدگی کا علم دوسرے دن ہوا۔ ناہید کے غائب ہونے کی خبر سننے کے بعد ہی اس آدمی کو بھی جس نے اسے پل پر دیکھا تھا یقین ہوگیا کہ وہ ضرور ناہید ہی ہوگی۔ تب تک اتنی دیر ہوچکی تھی کہ کچھ کرنا نہ کرنا برابر تھا پھر بھی ناہید کے گھر والے کل دن بھر اسے غوطہ خوروں کی مدد سے دریا میں تلاش کرتے رہے مگر ان کی تلاش بے سود ثابت ہوئی۔"

"ہمیں یہ تمام حالات سن کر بہت افسوس ہوا۔" راحت صاحب نے افسردگی سے کہا۔ "مگر ظاہر ہے کہ تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوتا ہے وہ پیش آکر رہتا ہے۔"

ہم واپس کراچی روانہ ہوئے تو راحت صاحب نے کہا۔ "کیا یہ سب باتیں سلیم کو بتانی مناسب ہوں گی؟"

"چھپا بھی تو نہیں سکتے۔" میں نے جواب دیا۔

میں اگر اس وقت کے اپنے جذبات کا تجزیہ کرنا چاہوں بھی تو نہیں کرسکتی۔ سلیم کے شادی شدہ ہونے کی بات سن کر دل کو جو ایک بے نام سی افسردگی کا احساس ہوا تھا، وہ اس کی ماں اور بیوی کے مرنے کی خبر سن کر ایک طرح کی خودغرضی معلوم ہورہا تھا اور میں اس خیال سے پریشان تھی کہ ایک ساتھ دو عزیز ترین ہستیوں سے جدا ہونے کا غم وہ کس طرح سہار سکے گا۔

شمارہ جنوری 2014ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش..... آپ کا انتخاب
☆اول: سلطانہ بیگم.....رخسانہ (کراچی)
☆دوم: لاحاصل.....ڈاکٹر عدنان (کراچی)
☆سوم: عشق عشق ہے.....منزہ (لاہور)
پہلے، دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ اپنی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

"میرے خیال سے ہمیں ڈاکٹر سعید سے مشورہ کرنا چاہیے۔" راحت صاحب نے کہا۔ "سلیم کی دماغی چوٹ اور آپریشن کی وجہ سے وہ زیادہ بہتر فیصلہ کرسکیں گے کہ اس وقت اس کی حالت ان جذباتی صدموں کی متحمل ہوسکے گی یا نہیں۔"

ڈاکٹر سعید نے بتایا کہ ابھی کم سے کم ایک ہفتے تک سلیم کو کچھ بتانا مناسب نہیں ہوگا۔

"ساتھ ہی آپ لوگ بھی اس سے ملنے نہ آئیں۔" انہوں نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر وہ ضرور سوالات کرے گا اور مجھے اندیشہ ہے کہ آپ زیادہ دیر تک بہانہ بازی نہیں کرسکیں گے۔"

"لیکن ہماری ایک دم غیر حاضری کا کوئی نہ کوئی جواز تو ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو بہت آسان بات ہے۔" ڈاکٹر سعید نے جواب دیا۔ "میں کہہ دوں گا کہ آپ لوگوں کو پہلے سے طے شدہ کسی پروگرام کے لیے اسلام آباد جانا پڑا۔ آپ جاتے ہوئے اس سے ملنے آئے تھے مگر وہ اس وقت سو رہا تھا اور میں نے آپ کو اسے اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔"

ڈاکٹر سعید نے ایک ہفتے کی بات کی تھی مگر میں اتنے دن سلیم کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکی۔ یوں تو میں دن میں دو مرتبہ ڈاکٹر سعید کو فون کرکے اس کی خیریت معلوم کرلیتی تھی اور ڈاکٹر صاحب کے بقول سلیم تیزی سے صحت یاب ہورہا تھا مگر ساتھ ہی وہ اپنی ماں اور بیوی کی طرف سے فکرمند بھی تھا۔ آخر پانچویں دن ڈاکٹر سعید نے خود مناسب انداز میں .... یہ قیامت خیز خبریں سلیم کو بتادیں۔

توقع کے برعکس سلیم نے ان المناک خبروں کو بڑے صبر و تحمل سے سنا۔

"کوئی نئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب۔" وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "بارہ برس کا تھا تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ چچا نے بیوہ بھاوج اور مرحوم بھائی کے بچوں کی کفالت اپنے ذمے لے لی اور اس ذمے داری کو ایسی فرض شناسی سے نبھایا کہ خود اپنا گھر بسانا بھول گئے۔ چند سال سکون سے گزرے تھے کہ تقدیر نے انہیں بھی ہم سے چھین لیا۔ بڑے بھائی کو کالج کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر کا خرچ چلانے کی فکر کرنا پڑی۔ کالج میں ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں تھا مگر لسانی تعصب بڑھ رہا تھا۔ میں بی کام فائنل کا امتحان دے رہا تھا کہ موٹر سائیکل پر سوار دو شرپسندوں نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کردی۔ اس حادثے کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ چھوٹی بہن کالج کے سامنے بس سے اترنے نہیں پائی تھی کہ ڈرائیور نے بس چلادی۔ وہ گری اور پچھلے پہیوں کے نیچے آکر کچل گئی۔ میری تو ساری زندگی ایسے ہی حادثوں کو برداشت کرتے گزر گئی ہے۔ سچ پوچھیے تو اب عادت سی ہوگئی ہے۔ میں ٹیکسی کے حادثے سے بچ نکلا تو کیا ہوا کسی نہ کسی کو تو قربانی دینا ہی تھی۔ مجھے والدہ کی طرف سے اندیشہ تھا مگر ناہید نے بھی خودکشی کرلی۔ کبھی کبھی گیہوں کے ساتھ گھن بھی تو پس جاتا ہے۔ آپ میری فکر نہ کریں میں تو یوں بھی دنیا والوں کے لیے مرچکا ہوں۔"

خدا کی پناہ ہیں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ سلیم اپنی مسکراہٹوں کے پردے میں اتنے کاری زخم چھپائے بیٹھا ہے۔ مجھ سے ضبط نہ ہوسکا تو اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے کمرے سے باہر نکل آئی۔

☆☆☆

سلیم کو مکمل طور پر صحت یاب ہوکر اسپتال سے ڈسچارج ہونے میں تقریباً ایک مہینا لگ گیا۔ بظاہر ماں اور بیوی کے مرنے کی خبر کو اس نے بڑے حوصلے سے برداشت کیا تھا مگر دنیا میں بالکل تنہا رہ جانے کے احساس نے اسے ڈپریشن کی جانب مائل کردیا۔ اسے اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر سعید نے اس کی کیفیت دیکھتے ہوئے کچھ نفسیاتی دوائیں بھی استعمال کروائیں۔ دوسری طرف میں ایک دن اپنی امی کو اس سے ملوانے لے گئی۔ میں نے امی کو سلیم کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا چنانچہ وہ خود بھی اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھیں۔ اب یہ امی کے لہجے کی شفقت اور خلوص تھا یا یہ حقیقت کہ سلیم کے بقول اس کی ماں میری امی سے بہت مشابہت رکھتی تھیں کہ جب امی نے سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا کہ آج سے تم مجھے اپنی ماں سمجھو تو ضبط کا وہ بندھن جس نے اب تک اس کی آنکھوں میں نمی بھی پیدا نہیں ہونے دی تھی اچانک ٹوٹ گیا۔ اس نے میری امی کی گود میں سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اس حسنِ اتفاق سے سب ہی خوش ہوئے۔ خاص طور پر میں۔ جیسے جیسے سلیم صحت یاب ہورہا تھا مجھے یہ اندیشہ پریشان کررہا تھا کہ اسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں اسے کیسے روک سکوں گی۔ میں اسے دوسری مرتبہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ یہ سچ ہے کہ وہ میرا احسان مند تھا کہ میں اسے زخمی حالت میں اٹھا کر لائی۔ اس کا علاج کروایا مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ میں نے اسے خرید لیا ہے اور میں چاہتی

بھی نہیں تھی کہ ایک پل کے لیے بھی اس کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہو۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہورہا تھا کہ جیسے میں سلیم سے محبت کرنے لگی ہوں مگر اس کے جذبات و خیالات میرے بارے میں کیا ہیں اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ جہاں تک میرے ساتھ اس کے برتاؤ کا تعلق تھا وہ میری بڑی عزت کرتا تھا مگر مجھے اس کی آنکھوں میں ابھی تک اس جذبے اور اس تاثر کی ایک جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی جو اس وقت نمودار ہوتا ہے جب کوئی کسی کے دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے مگر اب صورتِ حال بالکل ہی بدل گئی تھی۔ امی نے سلیم کو بڑے یقینی لہجے میں بتادیا تھا کہ اسپتال سے چھٹی پانے کے بعد وہ ان کے ساتھ گھر چلے گا۔ آخر بیٹا ماں کو چھوڑ کر بھی کہیں جاسکتا ہے۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سلیم اسپتال سے ہمارے گھر آگیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر اسے اس احساس سے بچانا ہے کہ وہ ہم پر کوئی بوجھ بن رہا ہے تو اس کے لیے کوئی اچھی مصروفیت پیدا کرنا لازمی تھی۔

"میں نے آپ کو اپنا کارڈ دیا تھا۔" ایک دن صبح ناشتے کی میز پر میں نے سلیم سے کہا۔ "مگر میں انتظار ہی کرتی رہی اور آپ نہیں آئے۔"

"دراصل میں وہ کارڈ گم کر بیٹھا تھا ورنہ ضرور حاضر ہوتا۔" سلیم نے قدرے شرمندگی سے جواب دیا۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ کارڈ دیتے ہوئے میں نے ملازمت کا ذکر بھی کیا تھا۔" میں نے کہا۔ "دراصل ہمارے منیجر راحت علی صاحب کے بڑے بھائی فصاحت علی صاحب بجلی کے پنکھے بنانے کی ایک بڑی فیکٹری کے مالک ہیں۔ میں نے کل ان سے بات کی تھی۔ اب اسے حسنِ اتفاق کہیے کہ ان کے اسسٹنٹ منیجر ایک ہفتہ قبل ملازمت سے استعفیٰ دے کر بیرونِ ملک چلے گئے چنانچہ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ اگر آپ اسسٹنٹ منیجر کی جگہ سنبھالنے پر آمادہ ہوں تو آج ہی سے اپنی ڈیوٹی جوائن کرسکتے ہیں۔"

"مگر مجھے کسی پنکھا ساز کمپنی میں کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔" سلیم نے جواب دیا۔

"تجربہ کام کرنے سے ہی آتا ہے، مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے ذہین اور محنتی آدمی ہفتے عشرے میں ہی اپنے جملہ فرائض بہ خوبی سنبھال سکتے ہیں۔ ویسے میں نے فصاحت صاحب کو بھی یہ بات بتادی تھی اور ان کا کہنا تھا کہ آپ تشریف تو لائیں وہ آپ سے ہر ممکن تعاون کریں گے۔"

میسرہ

حضرت خدیجہؓ کا آزاد کردہ غلام اور انہی کی تجارت کا مہتمم، جب حضرت خدیجہؓ نے حضورؐ پُرنور کو غرضِ تجارت سے شام بھیجا تو یہ آپ کا ہمسفر رہا۔ راستے میں حضور نامی عیسائی نے میسرہ سے پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں۔ میسرہ نے جواب دیا۔ اہلِ قریش اور ہمارے سردار، اس پر عیسائی پادری نے کہا کہ بے شک، یہ سارے جہان کے سردار ہوں گے۔ اس نے کہا بے شک، یہی وہ ہیں جو نبی آخر الزماںؐ ہوں گے، کیونکہ ان کی آنکھوں میں عجیب سرخی ہے اور سوائے نبی کے، اس درخت کے نیچے اور کوئی نہیں بیٹھا۔ اس نے تاکید کی کہ میسرہؓ آپؐ کے ساتھ رہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق یہ دورانِ سفر ہر دم آپؐ کے ساتھ رہا۔

مرسلہ: سلطانہ فخر، کراچی

"تم پے در پے مجھ پر اتنے احسانات کیے جارہی ہو کہ میں حیران ہوں کہ کبھی ان کا بدلہ بھی اتار سکوں گا یا نہیں۔"

"اب آپ نے پھر غیریت کی باتیں شروع کردیں۔" میں بولی۔ "احسان کا سوال غیروں کے ساتھ ہوتا ہے، اپنوں کے ساتھ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ ابھی تک ہمیں غیر ہی سمجھتے ہیں۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" سلیم نے جلدی سے کہا۔ "اچھی بات ہے کہ امی سے مشورہ کرلوں انہوں نے اجازت دے دی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" اور یوں سلیم نے اگلے ہفتے سے فیکٹری میں اپنے فرائضِ منصبی سنبھال لیے۔

☆☆☆

وقت گزرتا گیا۔ دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے یہاں تک کہ ان واقعات کو چھ سال بیت گئے۔ اس دوران میں سلیم اسسٹنٹ منیجر سے منیجر ہوگئے۔ انہوں نے تو ترقی کی منزل طے کرلی مگر میرا اور سلیم کا تعلق جیسے ایک مقام پر ٹھہر کر رہ گیا تھا۔ امی سلیم کو بے حد چاہنے لگی تھیں اور ان کی دلی خواہش تھی کہ میں اور سلیم رشتہ مناکحت میں منسلک ہوجائیں مگر ہمارا باہمی تعلق کچھ اس طرح گڈمڈ ہوکر رہ گیا تھا کہ سلیم کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

خیالات کا تو پتا نہیں مگر میں اور امی دونوں اشارتاً بھی یہ بات زبان پر لانا نہیں چاہتی تھیں۔ مزید یہ کہ امی لڑکی کی ماں تھیں فطری طور پر ان کی خواہش تھی کہ تحریک سلیم کی جانب سے ہو۔ غالباً راحت صاحب نے اس کشمکش کو محسوس کرلیا تھا اور انہوں نے امی سے کہا کہ اگر وہ انہیں اجازت دیں تو وہ اپنے طور پر سلیم کے خیالات کو ٹٹول کر دیکھیں۔

اور انہوں نے وقتاً فوقتاً سلیم سے اس موضوع پر بات بھی کی، شروع میں اس کی باتوں سے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے وہ زندگی کو ایک ناگوار فرض سمجھ کر جی رہا ہے۔ اس کی آنکھیں مستقبل کا کوئی خواب دیکھنے کے لیے آمادہ ہی نہیں تھیں۔ اس نے راحت صاحب کو بتایا کہ اگر امی (میری امی) نہ ملتیں تو وہ خدا جانے کہاں کہاں کی خاک چھان رہا ہوتا اور اس نے جو غم اٹھائے تھے ان کے پیش نظر اس کا یہ طرزِ عمل غیر متوقع بھی نہیں تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ سلیم کے دل میں زندگی کی حرارت پیدا ہونے تک مجھے بڑے صبر سے انتظار کرنا ہوگا۔

پھر رفتہ رفتہ گزرتے وقت کے ساتھ سلیم کے دل و دماغ پر چھایا ہوا جمود بھی ٹوٹنے لگا۔ راحت صاحب اس دوران برابر گاہے بہ گاہے سلیم کو ایک نئی زندگی، ایک نیا آغاز کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے اور جب انہوں نے سلیم کو اپنے مشورے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہوئے محسوس کیا تو خود ہی اپنی جانب سے تجویز پیش کردی کہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کے لیے نسرین سے بہتر ہمسفر نہیں ملے گا۔ سلیم نے تسلیم کیا کہ وہ خود بھی یہی محسوس کرتے ہیں کہ مگر یہ کہ ان لوگوں (مراد میں اور امی) کے اتنے احسانات ہیں کہ وہ فیصلہ نہیں کرپاتے کہ وہ یہ درخواست امی سے کریں یا نہ کریں۔ راحت صاحب نے فوراً جواب دیا کہ آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں میں نسرین کی امی کو راضی کرنا اپنے ذمے لیتا ہوں۔

☆☆☆

جن دنوں یہ صلاح مشورے جاری تھے میں ان ہی دنوں ایک غریب بستی میں گئی۔ اب تک میں نے خود ستائی سے بچنے کے لیے یہ ذکر نہیں کیا تھا کہ میں حسب مقدور کچھ غریب بیواؤں کی پوشیدہ طور پر مدد بھی کرتی رہتی تھی اور اس سلسلے میں ان کی عزتِ نفس کو ٹھیس نہ لگنے کے خیال سے میں نے انہیں کبھی یہ زحمت نہیں دی کہ وہ اپنی امدادی رقم میرے گھر سے آکر لے جائیں بلکہ جب بھی مجھے فرصت ملتی ہر ماہ خود ان کے گھروں پر جا کر جو کچھ دینا ہوتا دے آتی

تھی۔ اس دن بھی میں اپنے کام سے فارغ ہو کر بستی سے نکل رہی تھی کہ (میں اپنی کار مین روڈ پر ہی چھوڑ دیتی تھی) میں نے ایک چھ سات سالہ خوب صورت بچی کو ایک کریانے کی دکان سے ہاتھ میں تیل کی شیشی پکڑے باہر نکلتے دیکھا۔ ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان جس کی تمام تر توجہ دس پندرہ قدم آگے چلتی ہوئی ایک حسین لڑکی پر مرکوز تھی اچانک اس بچی سے ٹکرا گیا۔ بچی کے ہاتھ سے تیل کی شیشی گری تو نوجوان کی پتلون پر تیل کے دھبے پڑ گئے۔

''اندھی ہے کیا، دیکھ کر نہیں چل سکتی۔'' نوجوان نے بچی کے گال پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے کہا۔

بچی جو تیل کی شیشی گر جانے سے پہلے ہی سہمی ہوئی تھی تھپڑ کھا کر رونے لگی۔ مجھے ایک دم غصہ آگیا۔ تیزی سے آگے بڑھی اور قریب پہنچتے ہی نوجوان کے منہ پر ایک زبردست تھپڑ رسید کردیا۔

''اندھی یہ بچی نہیں اندھے تم ہو۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''تمہاری آوارہ نگاہیں اس خوب صورت لڑکی کا تعاقب کررہی تھیں، تمہیں ہوش ہی نہیں تھا کہ تمہارے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ دفع ہوجاؤ ورنہ ابھی پولیس کو بلا کر آوارگی کے الزام میں بند کروادوں گی۔''

سیر کو سوا سیر مل گیا تھا نوجوان اتنی پھرتی سے قدم بڑھا کر لوگوں کے ہجوم میں گم ہوگیا کہ مجھے بھی حیرت ہوئی پھر میں نے بچی کو پیار کیا۔ اتفاق سے شیشی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ میں نے اسے دوبارہ تیل دلوایا اور پھر پوچھا کہ وہ کہاں رہتی ہے، اس کا نام کیا ہے؟ بچی نے بتایا کہ اس کا نام عارفہ ہے اور کچھ فاصلے پر ایک عمارت کی طرف اشارہ کرکے بتایا کہ وہ اور اس کی ماں وہاں رہتی ہیں۔ اس نے جس عمارت کی طرف اشارہ کیا تھا میں اسے پہچانتی تھی۔ اس کا نام نشیمن تھا اور وہ بے سہارا عورتوں کی قیام گاہ تھی اور ایک رفاہی ادارہ اس کے نظم و نسق کا ذمے دار تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس بچی سے اتنی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس کی امی سے ملنے چلی گئی۔

مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس کی ماں اپنی آنکھوں کی بینائی کھو چکی تھی۔ عارفہ نے اپنی ماں کو بتایا کہ ایک آدمی نے اس کا تیل گرادیا تھا مگر یہ کہ میں نے اس آدمی کو مارا اور اسے دوبارہ تیل دلوادیا۔ عارفہ کی ماں نے میرا شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ اس کا نام صابرہ ہے۔

''آپ کی بچی بہت پیاری ہے۔'' میں نے کہا۔

''اسے دیکھ کر مجھے آپ سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ ویسے میرا نام نسرین ہے اور میں ایک گلوکارہ ہوں۔''

صابرہ سے کچھ دیر کی گفتگو کے بعد اندازہ ہوا کہ وہ یقیناً تعلیم یافتہ بھی ہے۔

''میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' میں بولی۔ ''کوئی اعتراض نہ ہو تو کیا آپ مجھے بتائیں گی کہ یہاں تک کیسے پہنچیں اور یہ کہ آپ کی آنکھوں کی روشنی کیسے زائل ہوئی؟''

''آپ کس کس کی کہانی سنیں گی؟'' صابرہ نے ایک اداس مسکراہٹ سے جواب دیا۔ ''یہاں جتنی عورتیں ہیں وہ کسی نہ کسی المیے کے نتیجے میں ہی یہاں پہنچی ہیں۔''

''آپ نے سچ کہا اسی کو ذرا وسیع مفہوم میں لیں تو کہا جاسکتا ہے کہ ہر المیہ داستان کا کسی نشیمن تک پہنچنا ضروری نہیں۔'' میں بولی۔ ''اس چہار دیواری سے باہر ابھی آپ کو ایسے بہت سے افراد مل جائیں گے جو اپنے زخموں کو چپ چاپ سینے سے لگائے زندگی گزار دیتے ہیں بہرحال یہ ایک طویل گفتگو ہوسکتی ہے۔ آپ مجھے اپنے بارے میں کچھ بتائیں۔''

''میرے والدین بچپن میں ہی انتقال کرگئے تھے۔'' صابرہ نے بتایا۔ ''ایک رشتے کے چچا نے مجھے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ اپنی ذات سے وہ ایک اچھے انسان تھے مگر ہر بات اور ہر معاملے میں زیادہ تر چچی کا حکم ہی چلتا تھا۔ چچا کی مدد سے ہی میں بی اے تک تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکی مگر پھر اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ میری چچی اور ان کے لالچی بھائی نے مجھے ایک بوڑھے زمین دار کے ہاتھ فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ بظاہر یہ خرید و فروخت شادی کے مقدس رشتے کی آڑ میں ہورہی تھی مگر مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ چچی نے زمین دار سے پچیس ہزار روپے کا مطالبہ کیا ہے جو کہ نکاح سے قبل ادا کیے جانے تھے۔ اسی محلے میں ایک شریف خاتون اپنے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک دن وہ ہمارے گھر آئیں۔ چچی زمین دار سے ملنے گئی ہوئی تھیں اور میں اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہی تھی۔ انہوں نے مجھے روتے دیکھا تو بڑی ہمدردی سے وجہ پوچھی۔ میرا دل تو پہلے ہی بھرا ہوا تھا انہیں اپنا ہمدرد پاکر میں نے سب کچھ بتادیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر تم اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہو تو حوصلے سے کام لینا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ میں زندہ درگور ہونے سے بچنے کے لیے سب کچھ کرنے پر تیار ہوں۔ وہ بولیں کہ اب تمہاری چچی جس دن زمیندار سے ملنے جائیں تو تم میرے پاس آجانا۔ اتفاق سے یہ موقع دو دن بعد ہی مل گیا۔ میں ان کے گھر پہنچی تو وہ مجھے اور اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر سٹی مجسٹریٹ کی عدالت میں گئیں اور ایک وکیل کی معرفت میری جانب سے درخواست دی کہ میں قانونی طور پر بالغ، عاقل اور تعلیم یافتہ ہوں اس لیے مجھے اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کا حق دیا جائے۔ میرے تعلیمی سرٹیفکیٹ اور میڈیکل معائنے کے بعد مجسٹریٹ صاحب نے میری درخواست منظور کرلی۔ اس کے بعد ان شریف خاتون نے میری مرضی سے میرا نکاح اپنے بیٹے سے کردیا۔ میری چچی اور ان کے بھائی کو یہ حالات معلوم ہوئے تو وہ سوائے ہاتھ ملنے کے کچھ نہ کرسکے۔ میرے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔ میرے شوہر بہت ہی شریف اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ میں بہت خوش تھی لیکن مجھے یہ خوشی چار پانچ مہینوں سے زیادہ راس نہیں آئی۔ ایک حادثے میں میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ ساس بیٹے کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکیں۔ ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ بھی چل بسیں۔ میری چچی غالباً ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھیں۔ آنسو بہاتے ہوئے مجھے گلے سے لگایا اور بولیں چل بیٹی گھر چل اب یہاں ہمارے سوا کون ہے۔ میں نے انکار کردیا، پاس پڑوس کی عورتیں گھر میں موجود تھیں۔ وہ ان کے سامنے مجھ پر زبردستی نہیں کرسکتی تھیں، کہنے لگیں اچھا بیٹی تیری مرضی مگر وہ گھر بھی تیرا ہی ہے۔ جب چاہو بے تکلف آجانا۔ شوہر اور ماں جیسی ساس کے غم میں میرا دماغ ماؤف ہورہا تھا۔ مجھے احساس ہوچکا تھا کہ مجھے اکیلا پاکر انسان نما درندے چیر پھاڑ دیں گے اس لیے زندہ رہنا بیکار ہے۔ بس میں ایک معمول کی طرح بغیر سوچے سمجھے گھر سے نکلی اور دریا میں کود گئی۔ گرتے ہوئے سر پر چوٹ لگی اور میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو میں کسی درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ سے لپٹی دریا کے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ رہی تھی اور میری آنکھوں کی روشنی جاتی رہی تھی۔ تب اس وقت مجھے خیال آیا کہ قدرت نے مجھے ڈوبنے سے بچا کر دو بڑے گناہوں سے بچالیا۔ خود کشی کرنا حرام موت ہے ایک تو میں اس گناہ سے بچی تھی دوسرے یہ کہ میں ماں بننے والی تھی میں مرتی تو اپنے ساتھ ایک اور زندگی کو ختم کرنے کی گناہ گار ہوتی۔ مچھلیاں پکڑنے والوں ..... نے مجھے دریا سے نکالا۔ کراچی لائے میں نے انہیں بتایا کہ میں دنیا میں بالکل بے سہارا رہ گئی ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

انہوں نے نشیمن کے مالک حاجی دین محمد صاحب کو اطلاع دی تو مجھ سے ملنے آئے اور میری کہانی سن کر بہت متاثر ہوئے۔ جب سے میں یہاں رہ رہی ہوں۔ پانچ چھ ماہ کے بعد میری بیٹی عارفہ پیدا ہوئی۔ حاجی صاحب کا خیال ہے کہ میری آنکھیں کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائی جائیں تو ممکن ہے میری گئی ہوئی بینائی واپس آجائے بلکہ وہ تو ایک دن مجھے آنکھوں کے کسی اسپتال میں بھی لے گئے تھے۔ ڈاکٹر کا خیال تھا کہ آپریشن سے آنکھیں ٹھیک ہونے کا امکان تو ہے مگر اس آپریشن پر خرچ بہت آئے گا۔ یوں تو میں نے صبر کرلیا ہے مجھے دنیا کو دیکھنے کی بھی کوئی خواہش نہیں ہے مگر کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ کاش ایک پل کے لیے میری آنکھوں کی روشنی واپس آجائے تو میں اپنی بیٹی عارفہ کو ایک نظر دیکھ لوں۔"

☆☆☆

مجھے صابرہ کی آپ بیتی نے بہت متاثر کیا تھا اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ میں عارفہ کی طرح صابرہ کے لیے بھی اپنے دل میں بڑی انسیت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا کہ صابرہ کی آنکھوں کا آپریشن میں کرواؤں گی۔ اس سلسلے میں، میں نے پہلے نشیمن کے منتظم خورشید صاحب سے ملنے کا فیصلہ کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ ایک مہینے کی چھٹی لے کر اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔ ان سے ملاقات نہ ہوسکی تو میں حاجی دین محمد صاحب کے گھر گئی اور ان سے پوچھا کہ اگر میں اپنے خرچ سے صابرہ کی آنکھوں کا علاج کرواؤں تو انہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئے بولے۔ "بیٹی اعتراض کی کیا گنجائش ہے' یہ تو ایک بڑی نیکی ہوگی اور اگر نشیمن کے وسائل اجازت دیتے تو وہ خود بہت پہلے یہ کام کرچکے ہوتے۔"

پھر میں صابرہ سے ملی اور اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ فطری طور پر اسے حیرت ہوئی کہ میں ایک اجنبی ہونے کے باوجود اس پر یہ احسان کیوں کر رہی ہوں۔

"یہ کچھ پہلی نگاہ میں محبت جیسا معاملہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں نے عارفہ کو دیکھا اور یوں محسوس کیا کہ اگر میری شادی ہوگئی ہوتی تو شاید اس ہی جیسی میری بھی کوئی بچی ہوتی۔ اس خیال نے میرے دل میں اس کے لیے شفقت پیدا کردی پھر میں نے تمہیں دیکھا اور مجھے یوں لگا اگر میری کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو شاید تم جیسی ہی ہوتی۔ اس خیال نے میرے دل میں تمہارے لیے وہی محبت پیدا کردی جو ایک بہن کے لیے دوسری بہن کے دل میں ہوتی ہے۔ اب بتاؤ کیا اب بھی تم مجھے اجنبی ہی سمجھو گی۔ تمہاری بڑی بہن اور عارفہ کی خالہ ہونے کی حیثیت سے اگر میں تمہارا علاج کروانا چاہتی ہوں تو اس میں کیا غلط بات ہے۔"

"آپ نے تو مجھے لاجواب کردیا۔" صابرہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے آپ سے کہا تھا کہ میری دلی خواہش ہے کہ میں عارفہ کو ایک نظر دیکھ سکوں مگر اب میری دعا ہے کہ خدا مجھے آنکھوں کی روشنی ضرور واپس کردے تاکہ میں عارفہ کے ساتھ ہی اپنی فرشتہ سیرت ... باجی کو بھی دیکھ سکوں۔"

"انشاء اللہ تمہاری آنکھوں کا آپریشن ضرور کامیاب ہوگا۔" میں نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے جواب دیا۔

"باجی ایک بات تو بتائیے؟" صابرہ نے اچانک پوچھا۔

"پوچھو۔"

"کیا آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی؟"

"نہیں، کچھ حالات ہی ایسے رہے کہ قریب رہتے ہوئے بھی کوئی اتنے قریب نہ آسکا۔" میں نے جواب دیا۔ "مگر اب بات تقریباً طے ہوچکی ہے اور میں سوچ رہی ہوں کہ کامیاب آپریشن کے بعد جس دن تمہاری آنکھوں کی پٹی کھلے گی اسی ہفتے منگنی یا شادی کی تقریب کا اعلان کردوں گی۔"

"مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ نے کسی کی محبت پانے کے لیے بڑا انتظار کیا ہے۔"

"کچھ پانے کے لیے انتظار تو کرنا ہی پڑتا ہے میری بہن اور اس کے بعد بھی یہ ضروری نہیں کہ آدمی کو اس کی من پسند چیز مل ہی جائے۔" میں نے جواب دیا اور بعد میں بڑی دیر تک حیران ہوتی رہی کہ میں کچھ اور بھی کہہ سکتی تھی میرے منہ سے یہی جواب کیوں نکلا۔

☆☆☆

صابرہ کا آپریشن بہت کامیاب رہا۔ سرجن شریف جنہوں نے یہ آپریشن کیا تھا نتیجے کے بارے میں بہت پُرامید تھے۔ عارفہ اسپتال میں اپنی ماں کے ساتھ نہیں رہ سکتی تھی اس لیے اسے اپنے گھر لے گئی تھی۔ عارفہ دو چار دن میں ہی میری امی اور سلیم سے اتنی گھل مل گئی تھی جیسے ہمیشہ سے ان کے ساتھ ہی رہتی رہی ہو۔ میں صبح شام دونوں وقت صابرہ کی خیریت معلوم کرنے اسپتال جاتی تھی۔ غالباً آپریشن ہوئے تیسرا دن تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ کوئی خورشید صاحب مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے یاد آگیا کہ خورشید صاحب نشیمن کے منتظم تھے۔ میں ان سے ملنے باہر گئی تو یہ

دیکھ کر حیرت ہوئی کہ میرے اندازے کے برعکس نوجوان اور بڑی وجیہہ شخصیت کے مالک تھے جبکہ میں انہیں کوئی معمر بزرگ خیال کر رہی تھی۔

"کیا آپ ہی نسرین صاحبہ ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ نے انجانے میں مجھے ایک ایسی نیکی کرنے سے محروم کردیا ہے جو میری دلی خواہش تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"میں صابرہ کی آنکھوں کا آپریشن کروانا چاہتا تھا۔" خورشید نے افسردہ سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میرے پاس گاؤں میں زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا میں چھٹی لے کر اس زمین کو فروخت کرنے گیا تھا۔ وہ زمین ایک لاکھ بیس ہزار روپے میں فروخت ہوگئی۔ میں بے حد خوش تھا کہ اس رقم سے آپریشن کے تمام اخراجات بہ خوبی پورے ہوجائیں گے مگر یہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ صابرہ کی آنکھوں کا آپریشن تو ہوگیا۔" میں نے غور سے خورشید صاحب کی طرف دیکھا۔ اس لمحے وہ مجھے سلیم سے بے حد مشابہ معلوم ہوئے۔

"اگر صابرہ کی جگہ نشیمن کی کوئی اور لڑکی ہوتی تو کیا آپ تب بھی اپنی زمین فروخت کردیتے؟"

"شاید نہیں۔" خورشید نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"میں صابرہ اور اس کے حالات سے بے حد متاثر تھا۔"

"صرف متاثر مت کہیے۔" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "غالباً آپ اس سے محبت کرنے لگے ہیں؟"

"شاید یہ ہی بات ہو۔"

"کیا صابرہ بھی آپ کو پسند کرتی ہے۔"

"مجھے نہیں معلوم، ہمارے درمیان کبھی اس انداز سے گفتگو نہیں ہوئی۔"

"آپ کی تعلیم کہاں تک ہے؟"

"میں نے پرائیوٹ امتحان دے کر دو سال قبل بی اے پاس کرلیا ہے۔"

"تب آپ نے کسی اچھی ملازمت کے لیے کوشش کیوں کی نہیں؟"

"ایک بیوہ پھوپھو کے علاوہ جو گاؤں میں رہتی ہیں میں دنیا میں تقریباً اکیلا ہوں۔ میری ضرورتیں محدود ہیں۔ مجھے کبھی زیادہ آمدنی کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی پھر یہ کہ حاجی دین محمد نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میں میٹرک

کیمیائی نشان

Chemical Symbols

کیمیا میں عناصر کو ظاہر کرنے کے لیے عام طور پر ان کے ناموں کا اختصار کرکے انگریزی نام کا پہلا حرف لے لیا جاتا ہے۔ اسے کیمیائی نشان کہتے ہیں۔ مثلاً ہائیڈروجن کو H سے، آکسیجن کو O سے اور کاربن کو C سے ظاہر کرتے ہیں۔ جب دو یا دو سے زیادہ عناصر ایک ہی حرف سے شروع ہوں تو پہلے دو حروف بطور نشان لے لیے جاتے ہیں تاہم کسی ایک عنصر کو ایک ہی حرف سے ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً بورون (boron) بیریم (barium) بسمتھ (Bismuth) اور برومین (Bromine) سبھی B سے شروع ہوتے ہیں۔ انہیں بالترتیب، BiB, Ba, اور Br سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ بعض عناصر کے کیمیائی نشان ان کے انگریزی ناموں کے بجائے لاطینی ناموں سے اخذ کیے گئے ہیں مثلاً سوڈیم کو Na کاپر کو Cu، آئرن کو Fe اور گولڈ کو Au سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان کے لاطینی نام بالترتیب نیٹرم (natrum) کیوپرم (Cuprum)، فیرم (ferrum) اور آرم ہیں۔ یہ نشانات محض مختصر نام ہی نہیں ہوتے بلکہ متعلقہ عنصر کے ایک جوہر (atom) کو ظاہر کرتے ہیں اور ان کے ایٹمی وزن (atomic weight) کی مناسبت سے اس کی مقدار کو بھی ظاہر کرتے ہیں مثلاً نشان C صرف کاربن ہی ظاہر نہیں کرتا بلکہ C سے مراد کاربن کا ایک جوہر ہے اور یہ کاربن کے وزن کے 12 حصوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ کیونکہ کاربن کا جوہری وزن بارہ ہے۔

مرسلہ: نسرین بنت فہیم، کراچی

پاس کر کے گاؤں سے شہر آیا اور ملازمت کی تلاش میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ملازمت ہی کے دوران میں نے پرائیوٹ امتحان ۔۔۔ دے کر پہلے انٹر اور پھر بی اے کر لیا۔ ممکن تھا کہ مجھے کوئی اچھی نوکری مل جاتی کیونکہ میں ٹائپ اور شارٹ ہینڈ بھی جانتا ہوں مگر مجھے نشیمن کی سروس چھوڑنا احسان مندی کے منافی معلوم ہوا۔"

"ممکن ہے آپ صابرہ سے دور نہ جانا چاہتے ہوں۔"

"ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ نے صابرہ کے لیے اپنا خلوص ثابت کر دیا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ صابرہ کی آنکھوں کا آپریشن نہیں کرا سکے۔ صابرہ آپ سے شادی کرنے پر راضی ہو جائے تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ اگر ایسا ہو تو آپ کے اخراجات بڑھ جائیں گے۔ نشیمن سے ملنے والی معمولی تنخواہ گزر اوقات کے لیے کافی نہیں ہوگی اس لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا سرمایہ موجود ہے۔ آپ اس سے کوئی تجارت کر سکتے ہیں۔ میں صابرہ سے آپ کی سفارش ضرور کروں گی مگر شادی کے لیے آمادہ کرنا آپ کی ذمے داری ہوگی۔ میں مناسب موقع دیکھ کر صابرہ کو یہ بتا دوں گی کہ آپ نے اس کے آپریشن کے لیے اپنی زمین بھی فروخت کر دی ہے۔"

"نہیں اس بارے میں آپ صابرہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہیں گی۔ یہ میری درخواست ہے۔" خورشید نے مضبوط لہجے میں کہا۔

میں خورشید کو صابرہ کے کمرے میں لے گئی اور ان دونوں کو بے تکلفی سے گفتگو کرنے کا موقع دینے کے لیے خود کمرے سے باہر نکل گئی۔ مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ خورشید پہلی ملاقات پر ہی شادی کی پیشکش کر دے گا پھر اتفاق سے ایسا بھی ہوا کہ یا تو وہ میرے آنے سے پہلے صابرہ سے مل کر جا چکا تھا یا میرے جانے کے بعد آیا چنانچہ دو تین دن تک اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ ایک شام میں اسپتال میں داخل ہو رہی تھی تو وہ واپس جاتے ہوئے مجھے سیڑھیوں پر مل گیا۔ بڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"کہیے خورشید صاحب۔" میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "منزل کتنی دور ہے۔"

"اتنی کہ میری دسترس میں نہیں آ سکتی۔" خورشید نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

تفصیل پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ایک دن پہلے اس نے صابرہ سے بات کی تھی مگر صابرہ نے اس کی پیشکش کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑے نرم اور ہمدردانہ لہجے میں انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ خورشید کے جذبات کی قدر کرتی ہے لیکن اس کے دل میں جو مقام اس کے مرحوم شوہر کا ہے وہ اس کی جگہ کسی اور کو نہیں دینا چاہتی۔ آنکھیں ٹھیک ہوں یا نہ ہوں وہ اپنی باقی زندگی اپنی بیٹی عارفہ کو کسی اچھے مقام تک پہنچانے کی جدوجہد میں گزار دے گی۔ یہ گزشتہ کل کی بات تھی آج جب خورشید اس سے ملنے گیا تو صابرہ نے افسردہ لہجے میں کہا کہ وہ روز اس شرمندگی کا سامنا نہیں کر سکتی جو خورشید کی پیشکش کے جواب میں انکار کر کے وہ محسوس کر رہی ہے اس لیے اس کے اور خورشید دونوں کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ وہ آئندہ اس سے ملنے نہ آئے۔

"آپ ہمت نہ ہاریں۔" میں نے کہا۔ "میں صابرہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔"

"آپ کی ہمدردی کا شکریہ نسرین صاحبہ۔" خورشید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "مگر اب مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ اس نے اپنے دل و دماغ میں اپنے مرحوم شوہر کی جو تصویر سجا رکھی ہے میں ہزار کوشش کے باوجود کبھی اسے مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔"

اتنا کہہ کر وہ سر جھکائے باقی سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس لمحے نہ جانے کیوں میرے دل میں بے اختیار یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں کسی طرح اس شریف مخلص انسان کا دکھ بانٹ لیتی۔

☆☆☆

بات کچھ یوں تھی کہ فصاحت علی سلیم کو پاکستان کے بزنس ٹور پر بھیجنا چاہتے تھے کہ وہ ہر بڑے شہر میں جا کر فیکٹری کے مقرر کردہ ہول سیل ڈسٹری بیوٹرز سے ملاقات کر کے مارکیٹ کا جائزہ لے اور پھر فیکٹری کے تیار کردہ مختلف اقسام کے پنکھوں کی زیادہ سے زیادہ مارکٹنگ کے لیے تجاویز اور مشورے پیش کرے۔ صابرہ جب آپریشن کے لیے اسپتال میں داخل ہوئی تھی تو سلیم اسی بزنس ٹور کے انتظام کے سلسلے میں بے حد مصروف تھے۔ عارفہ کو دیکھ کر ان کے دل میں صابرہ سے ملنے کا خیال آیا تھا مگر اپنی حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت کے باعث وہ وقت نہ نکال سکے۔ اپنی روانگی سے ایک دن پہلے میرے بے حد اصرار پر وہ اسپتال گئے بھی مگر معلوم ہوا کہ آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کچھ

ڈھیلی پڑ گئی تھی اس لیے نرس صابرہ کو پٹی کی ری ڈریسنگ کے لیے لے گئی ہے۔ سلیم نے پندرہ منٹ انتظار کیا۔ زیادہ انتظار کرنا مشکل تھا اس لیے وہ معذرت خواہ ہوتے ہوئے آفس چلے گئے اور دوسرے دن اپنے ٹور پر روانہ ہو گئے۔

خورشید صابرہ کے منع کرنے کے باوجود روزانہ پابندی سے اسپتال آتا تھا اور مجھ سے اس کی خیریت معلوم کر کے بغیر ملاقات کیے واپس چلا جاتا تھا۔ آخر ہفتے عشرے کے بعد وہ دن بھی آ گیا جس روز صابرہ کی پٹی کھلنے والی تھی۔ میں، امی، عارفہ، حاجی دین محمد اس کے پلنگ کے چاروں طرف جمع تھے۔ میں عارفہ کو ساتھ لیے ٹھیک پلنگ کے سامنے کھڑی تھی کہ صابرہ کی نگاہیں سب سے پہلے اپنی بیٹی کو اور پھر مجھے دیکھیں۔ خورشید بھی اسپتال کے کمرہ انتظار میں موجود تھا اور بے قراری سے میری آمد کا منتظر تھا کہ میں کب آ کر اسے صابرہ کی بینائی واپس ملنے کی خوشخبری سناتی ہوں۔

سرجن شریف نے کمرے کی تمام کھڑکیوں پر پردے گرا دیے تھے پھر بھی کمرے میں ٹیوب لائٹ کی اتنی روشنی تھی کہ صابرہ بغیر آنکھوں پر زور ڈالے سب کو دیکھ سکے۔ پٹی کھلی تقریباً ہم سب ہی کے دل دھڑک رہے تھے اور دل سے ایک ہی دعا زبانوں پر آ رہی تھی کہ پروردگار اپنی رحمت سے صابرہ کی بینائی بحال کر دے۔ سرجن صاحب کی ہدایت کے مطابق پٹی کھلنے کے بعد صابرہ نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور فوراً بند کر لیں۔ یہ اچھی علامت تھی۔ اس کی اندھیرے کی عادی آنکھوں کے لیے کمرے کی موجودہ روشنی بھی چکا چوند پیدا کرنے کے لیے کافی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں اور خوشی سے اچھل پڑی۔

"نسرین باجی۔" اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا میں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور..... اور یہ میری بیٹی عارفہ؟" صابرہ کے منہ سے نکلا اور اس کے بازو پھیل گئے۔ عارفہ جلدی سے آگے بڑھ کر اپنی ماں کے سینے سے لپٹ گئی۔

"میں سب کچھ دیکھ رہی ہوں باجی۔" صابرہ، عارفہ کو پیار کرتے ہوئے بار بار کہہ رہی تھی۔ "خدا نے میری دعا سن لی میری آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔"

☆☆☆

مزید ایک دو دن بطور احتیاط صابرہ کو اسپتال میں رکھنے کے بعد اسے چھٹی دے دی گئی۔ میں اسے اپنے ساتھ گھر لانا چاہتی تھی مگر خود صابرہ نے واپس نشیمن جانے پر اصرار کیا۔ چار دن کے بعد سلیم بھی اپنے سفر سے واپس آ گئے۔ مجھے صابرہ سے کیا ہوا وعدہ یاد تھا۔ امی نے راحت صاحب کے ذریعے سلیم کو پیغام بھجوایا کہ نسرین دو روز بعد صابرہ کی آنکھیں ٹھیک ہونے کی خوشی میں ایک تقریب کا اہتمام کر رہی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ اسی تقریب کے موقع پر سلیم اور نسرین کی منگنی کا اعلان بھی کر دیا جائے۔ سلیم نے جواب دیا کہ امی جو مناسب سمجھیں کریں انہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔

میں نے اس تقریب میں حاجی دین محمد کے ساتھ صابرہ، عارفہ اور خورشید صاحب کے علاوہ نشیمن کی تمام خواتین کو بھی دعوت دی تھی۔ صابرہ مجھ سے گلے مل چکی تو اس نے چپکے سے پوچھا۔

"باجی وہ خوش نصیب کون ہے جسے آپ کی رفاقت حاصل ہونے والی ہے؟"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا سلیم راحت صاحب کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ میں نے صابرہ کو اشارے سے بتایا اور تقریباً اسی وقت ایک اور معزز مہمان کی پذیرائی کے لیے آگے بڑھ گئی اس لیے سلیم کو دیکھ کر صابرہ کے چہرے پر جو تاثرات ابھرے تھے انہیں نہ دیکھ سکی۔ اتفاق سے اسی وقت سلیم نے بھی صابرہ کو دیکھ لیا اور تیزی سے اس کی طرف بڑھے۔ میں نے انہیں صابرہ کی طرف جاتے دیکھ لیا مگر مجھے کچھ حیرت ہوئی جب میں نے صابرہ کو عارفہ کا ہاتھ پکڑے تیزی سے واپس لوٹتے دیکھا مگر سلیم مسلسل اس کے تعاقب میں تھے۔ میں بھی جلدی سے ان دونوں کے پیچھے چل دی۔

مہمانوں کی بھیڑ سے نکل کر سلیم نے صابرہ کو ناہید کے نام سے پکارا۔

"ناہید، خدا کے لیے رک جاؤ۔" آخر انہوں نے قریب پہنچ کر کہا تو اس کا چہرہ بالکل سفید ہو رہا تھا۔

"سلیم صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس نے بھرائی آواز میں جواب دیا۔ "میرا نام ناہید نہیں صابرہ ہے۔"

"ساری دنیا تمہیں صابرہ تسلیم کر لے تب بھی میں جانتا ہوں کہ تم ناہید ہو۔" سلیم نے اٹل لہجے میں کہا۔ "تم کہاں غائب ہو گئی تھیں؟ مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ تم نے خودکشی کر لی ہے۔"

"آپ جس ناہید کو جانتے تھے وہ واقعی مر چکی ہے۔"

"میں کیسے مان لوں جبکہ تم میرے سامنے جیتی جاگتی کھڑی ہو۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

''ہوش میں آیئے سلیم صاحب وہاں شامیانے میں سارے مہمان اور باجی نسرین آپ کو تلاش کررہی ہوں گی۔ آج ان کے ساتھ آپ کی منگنی کا اعلان ہونا ہے۔''

''مگر اب منگنی نہیں ہوسکتی' میں نے جسے گم کیا تھا اسے پالیا ہے۔''

''ٹوٹے ہوئے خواب دوبارہ نہیں دیکھے جاسکتے۔'' ناہید نے جواب دیا۔''

مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ناہید ہی ہے جس نے کسی نامعلوم مصلحت سے نشیمن والوں کو اپنا نام صابرہ بتایا تھا۔

''پھر ذرا سوچیں نسرین باجی نے آپ کے لیے کیا کچھ نہیں کیا اور صرف آپ ہی نہیں میں بھی ان کی احسان مند ہوں۔ میں جانتی ہوں وہ آپ سے بے حد محبت کرتی ہیں۔ درد انگیز ماضی کے لیے حسین وخوشگوار مستقبل کو نہ ٹھکرایئے۔''

''نسرین بڑی مخلص، ہمدرد اور وسیع القلب لڑکی ہے۔'' سلیم نے کہا۔''اور مجھے یہ بھی احساس ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اس کی عزت کرتا ہوں، احترام کرتا ہوں مگر محبت میں نے صرف تم سے کی ہے اور اب بھی کرتا ہوں۔''

''خدا کے لیے مجھے گناہ گار اور احسان فراموش بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اب آپ پر میرا نہیں نسرین باجی کا حق ہے۔''

''اچھا تو یوں کرو کہ ہم دونوں نسرین کے پاس چلتے ہیں۔ سارے حالات اسے بتاتے ہیں اور پھر وہ جو بھی فیصلہ کرے مجھے منظور ہوگا۔''

''یہ آپ اس لیے کہہ رہے ہیں کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ باجی نسرین کبھی آپ کے اور میرے راستے میں آنا منظور نہیں کریں گی۔ کم از کم اس معاملے میں آپ کو میرا فیصلہ تسلیم کرنا پڑے گا اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ... آپ فوراً یہاں سے واپس اس مقام پر چلے جائیں جہاں نسرین باجی آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔''

اس وقت میرے دل کی جو کیفیت تھی وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ میں اب بھی سلیم سے شادی کرسکتی تھی مگر میں نے اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے پوچھا کہ کیا یہ کوئی انصاف ہوگا۔ سلیم کا جسم بلاشبہ میرا بن سکتا ہے مگر کبھی میں ایک بے روح جسم کو پاکر خوش رہ سکوں گی اور میں ایک دم ان دونوں کے سامنے آگئی۔

''سلیم صاحب اور ناہید بہن آپ دونوں بہت خوش نصیب ہیں کہ تقدیر نے آپ کو دوبارہ ملوادیا۔'' میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔''حقیقت جاننے کے بعد میں ہرگز آپ سے شادی نہیں کرسکتی۔ کسی بھی عورت کو اپنی محبت میں کوئی دوسرا شریک گوارا نہیں ہوتا۔ آپ دونوں نے چھ سات برس ایک دوسرے کی جدائی میں سلگتے ہوئے گزار دیے۔ اب یہ ملاپ قدرت کی طرف سے آپ کا انعام ہے۔''

میں نے آگے بڑھ کر سلیم کے ہاتھ میں ناہید کا ہاتھ دے دیا۔

''خدا آپ دونوں کو ہمیشہ خوش اور شاد آباد رکھے اور اب خدا کے لیے جلدی سے یہاں سے چلے جایئے' میں مہمانوں کو سنبھال لوں گی۔''

''نسرین باجی.....'' ناہید نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے بات پوری کرنے کا موقع نہیں دیا۔

''کیا تم ہم سب کو دنیا کے سامنے تماشا بنانا چاہتی ہو؟'' میں نے تیز لہجے میں کہا اور دونوں کو پکڑ کر گیٹ تک لائی۔

سلیم نے عارفہ کو گود میں اٹھالیا اور ناہید کے ساتھ سر جھکائے چلتے ہوئے اپنی کار کی طرف بڑھ گئے۔ میں بھیگی آنکھوں کو رومال سے خشک کرتے ہوئے واپس لوٹی تو سامنے خورشید صاحب کھڑے تھے۔ غالباً انہوں نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔

''آپ بہت عظیم ہیں نسرین صاحبہ۔'' انہوں نے کہا اور ایک دم سے میرے ذہن میں ایک بہت ہی انوکھا خیال بجلی کی طرح چمک گیا۔

''آپ چاہیں تو آپ بھی اس عظمت میں حصے دار بن سکتے ہیں۔'' میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔''آپ نے ناہید کو چاہا وہ آپ کو نہیں ملی' میں نے سلیم کو چاہا اور وہ مجھے نہ مل سکا۔ اس اعتبار سے ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں' کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ ہم اس کشتی کو زندگی کی آخری منزل تک لے جائیں؟''

''اگر آپ خلوص سے ایسا ہی سمجھتی ہیں تو کیوں نہیں ہوسکتا۔'' خورشید نے جواب دیا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے مہمانوں کے جھرمٹ میں داخل ہوئے۔ مجھے امی اور راحت صاحب کو سمجھانے میں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگے البتہ جب میری اور خورشید صاحب کی منگنی کا اعلان ہوا تو مہمانوں کو اپنی حیرت پر قابو پانے میں شاید کچھ زیادہ وقت لگ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM